دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کراچی
اکتوبر 2014
معراج رسول
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول، مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن، مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

سنسنی، ... اور ... سے بھرپور ایک اچھوتے ناول کا انتخاب

مفلسی کے مصائب کو بھگتنا صاحبِ کردار لوگوں کا ہی نصیب ہے... عام آدمی جلد ہی گھبرا کر جرم کی راہ اختیار کرتا ہے... اگر حصولِ زر کا موقع جلد ہی جیب میں آ گرے تو مجرمانہ ذہن خیر و شر کے متعلق سوچنے کی زحمت نہیں کرتا۔ اس کم عمر بچے کا بھی... کم سن بچہ... اور قتل کی جواب اس پر چسپاں ہو گئی... تاہم وہ قتل کے بھی مقصد میں تھا۔ بہ فکر بات تھی کہ اس کی تجوری... صرف بہ صحت الزامات پڑتی رہی... وہ تنہا اور بے یار و مددگار تھا... اسے بھاگنا ہی تھا اور بہت کرنے بھاگتے رہنا تھا... پولیس اس کے پیچھے تھی... کچھ اور لوگ بھی اس کی جان کے پیاسے تھے... جو اسے خوش قسمتی تو بہت دور جا چکی تھی... وہ حیران تھا کہ آخر کتنا لڑکے آخر کیوں شکاری کتوں کے مانند اس کی بو سونگھتے پھر رہے ہیں؟ اس کے بچنے کے امکانات صفر تھے... تاہم وہ بار بار موت کو چکمہ دیتا رہا... بالآخر... وہ تھک گیا، نڈھال ہو گیا... ایک بے وسیلہ، تنہا بچہ کب تک حالات کے جبر کا مقابلہ کرتا؟ کب تک...؟ کیا واقعی قسمت لڑنے والوں کا ساتھ دیتی ہے... جان گلسٹریپ کا سنسنی خیز اور عبرت الاثر ناول پڑھیے اور فیصلہ کیجیے...

مسافت گزیدہ

امجد رئیس

وہ اندھا دھند بھاگ رہا تھا۔ وحشت اور خوف سے اس کا بدن لرز رہا تھا۔ وہ ننگے پاؤں تھا۔ اسے پتا نہیں تھا کہ اسے کہاں جانا ہے؟ سوائے اس کے کہ بھاگنا ہے اور بھاگتے رہنا ہے۔ اس کے کچے ذہن میں ایک ہی بات تھی کہ JDC (JUVENILE DETENTION CENTRE) سے جتنا دور جا سکتا ہے، چلا جائے۔ منزل نامعلوم تھی لیکن بچے کا ذہن جے ڈی سینٹر سے بہت دور نکل جانے پر یکسو تھا۔ رات کا وقت تھا۔ اندھیرے کے باعث وہ کئی جگہ گرا۔ تاہم زخمی ہونے سے بچ گیا۔ وہ اپنے ذہن کی واحد ''کمانڈ'' پر عمل کر رہا تھا ''بھاگو... اور بس بھاگو...'' تیز ایسے تھے جیسے جہنم کی سیکڑوں بلائیں اس کے تعاقب میں ہوں... بھاگتے رہو... زیادہ سے زیادہ دور نکل جاؤ۔

☆☆☆

ہانگل کو چھوٹے سے ہال میں چند عورتیں اور مرد ایک جگہ کھڑے نظر آئے۔ لباس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ JDC کا عملہ ہے۔ ہانگل کئی برس پہلے یہاں آیا تھا۔ یہ سینٹر، متشدد یا بگڑے

ہوئے بچوں کی اصلاح کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ یہ تعین کرنا مشکل تھا کہ وہ اسکول تھا یا قید خانہ... یہ جگہ ویروک فیلڈ، ورجینیا کی ایک کاؤنٹی تھی۔

مائیکل نے دیکھا کہ جے ڈی سینٹر کے عملے کی توجہ کا مرکز ایک چھوٹے سے کمرے کا دروازہ تھا۔ جس پر ''کرائسز یونٹ'' کی پلیٹ آویزاں تھی۔

JDC میں چند آفیسرز پہلے سے اس کے منتظر تھے۔ مائیکل کمرے کے اندر دیکھ نہیں پایا تھا۔ تاہم وہ بہ آسانی سمجھ گیا کہ واردات اسی کمرے کے اندر ہوئی تھی۔

''لیوٹنٹ مائیکل پہنچ گئے ہیں۔'' یہ سنتے ہی مرد و زن کا مختصر ہجوم دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ اعلان کرنے والا پولیس اہلکار ہی تھا۔

مائیکل اس کی جانب دیکھ کر دوستانہ انداز میں مسکرایا۔

''ہیلو آفیسر بورشو'' مائیکل نے اس کی وردی پر نام پڑھ لیا تھا۔

''ہیلو سر۔'' بورشو نے احترام سے جواب دیا۔

وہ باوقار انداز میں چلتا ہوا کرائسز یونٹ والے دروازے تک پہنچ گیا۔ کمرا زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن اندرونی منظر دیکھ کر مائیکل کے تاثرات میں ناقابل فہم تبدیلی در آئی۔ کمرے کا ہولناک منظر عام آدمی کو خوف زدہ کردینے کے لیے کافی تھا۔

مقتول ایک سفید فام تھا۔ مائیکل نے اس کی عمر کا اندازہ 30 برس لگایا۔ اس کے بدن پر جے ڈی سینٹر کی وردی اس بات کی واضح علامت تھی کہ وہ وہاں بطور گارڈ ملازمت کرتا تھا۔ لاش کے قریب خون کا چھوٹا سا تالاب بن گیا تھا۔ مائیکل ساکت کھڑا تھا۔ اس کی حسیات، بصارت اور قوت شامہ میں سمٹ آئی تھیں۔ چھوٹے بچوں کا سبز فوم ''کاٹ'' ایک جانب الٹا پڑا تھا۔ کمرے کا بیشتر حصہ خون آلود تھا۔ کسی بچے کے قدم کا نشان ایک جگہ لہو رنگ فرش پر پرنٹ ہو گیا تھا۔ نشان کا رخ اندر سے باہر دروازے کی جانب تھا۔ کمرا صاف ستھرا نہیں تھا۔ پسینے اور خون کی ملی جلی بو... پھر بھی مائیکل نے ہضم ہوتی شراب کی بو کو محسوس کرلیا تھا۔

مائیکل کا ذہن کمرے میں ہونے والی دلخراش واردات کی تصویر کی منظر کشی کر رہا تھا۔ پہلے سوال نے اس کے ذہن پر دستک دی کہ آخر بچے کی عمر کیا تھی؟ جو وہ ایک گارڈ سے بھڑ گیا۔

آلۂ قتل چھری تھی جو دستے تک گارڈ کے سینے میں پیوست تھی۔ یہ آخری وار تھا اور چھری کو سینے میں ہی چھوڑ دیا گیا تھا۔ چھری کے مزید زخم بھی نمایاں تھے۔ مائیکل نے جمے ہوئے خون کو غور سے دیکھا اور اندازہ لگایا کہ واردات کو کم سے کم بھی دو گھنٹے گزر چکے ہیں۔

چھری کہاں سے آئی؟ اور ڈیوٹی کے دوران گارڈ نشے میں کیوں تھا؟ اتنی دیر بعد بھی مائیکل نے شراب کی بو کو محسوس کرلیا تھا۔ یعنی وہ بری طرح نشے میں دھت تھا۔ مائیکل کی پیشانی پر ایک اور سلوٹ نمودار ہوئی۔

معاً اس کا تجزیاتی ذہن اور آنکھوں کی گردش تھم گئی، کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تھا۔ ''برا منظر ہے، مائیکل۔''

مائیکل پلٹا۔ وہ جیف ہیگر تھا۔ وہ مائیکل کا ماتحت بھی تھا اور دوست بھی۔ دونوں اکیڈمی میں ہم جماعت رہے تھے۔

''ہاں، سب ایک خونی کھیل کا منظر ہے۔'' مائیکل نے اعتراف کیا۔ ''تفصیل بتاؤ۔''

ہیگر نے جیب سے نوٹ بک نکالی اور بولنا شروع کیا۔ ''مقتول کا نام رچرڈ ولیم ہیرس۔ رکی کے نام سے مشہور تھا۔ عمر ستائیس سال۔ ساڑھے چار سال سے ملازم تھا۔ چائلڈ کیئر سپروائزر۔''

''سپروائزر یا گارڈ؟'' مائیکل نے ٹوکا۔

''ہاں، دونوں سمجھ لو۔'' ہیگر نے کہا۔ ''مبینہ طور پر سات بجے رکی ایمریا کی بچے سے تکرار ہوئی اور اس نے بچے کو ''کرائسز یونٹ'' میں منتقل کردیا۔''

''بچے کا نام؟''

''ہاکن نیکلی۔''

''عمر؟'' مائیکل نے فوراً استفسار کیا۔

''بارہ سال۔'' ہیگر کا جواب سن کر مائیکل کی آنکھیں سکڑ گئیں۔

''کرائسز یونٹ کا مطلب؟'' مائیکل نے سوال کیا۔

''قید تنہائی سمجھ لو۔''

''مصرف؟''

ہیگر نے چونک کر اسے دیکھا۔ تاہم خاموش رہا۔

''چاقو کہاں سے آیا؟''

''کچن سے۔''

''کیمرا کیا کہتا ہے؟'' مائیکل نے کمرے کی چھت کے ایک کونے میں نصب سیکیورٹی کیمرے کی جانب اشارہ کیا۔

''وہ پوسٹ مارٹم کرا رہا تھا۔ تحقیق باقی ہے۔''

''وجہ قتل؟''

''نامعلوم۔ شاید لڑکا یہاں رہنا نہیں چاہتا تھا۔''

''اس وجہ سے اس نے ایک بندہ مار دیا؟'' اینگل کی آواز میں مدھم سا طنز تھا۔ ہیکر نے خجالت محسوس کی۔

''واردات کو کتنا عرصہ گزرا ہے؟ کتنے گھنٹے ہوگئے؟''

''ہاں، دو سے تین گھنٹے۔''

''ہمیں اطلاع دیر سے نہیں ملی؟''

''رات والا گارڈ نو بجے آتا ہے اور رکی ہیریس کی چھٹی ہوتی ہے۔ دوسرا گارڈ 9:10 پر آیا اور اس نے لاش 9:40 پر دریافت کی۔'' ہیکر نے جواب دیا۔

''گویا مفرور ہم سے دو گھنٹے آگے ہے۔'' اینگل نے قاتل کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ اس کی آواز بلند ہوگئی تھی اور لہجے میں اقرار بھی۔

''تقریباً۔'' ہیکر نے ہامی بھری۔ ''میں نے پندرہ منٹ قبل قاتل کی تلاش کی ہدایات جاری کر دی تھیں۔'' ہیکر نے بھی آواز بلند کر لی۔ وہ اینگل کے انداز تفتیش سے بخوبی آگاہ تھا۔

''تم کیونکر یقین سے 'مفرور' کو 'قاتل' کہہ رہے ہو؟'' اینگل کی نگاہ بدستور اسٹاف پر تھی۔ بظاہر اس نے ایک بے تکا سوال کیا تھا اور اس کا ردعمل تلاش کر رہا تھا۔

''کیا تم سمجھتے ہو کہ ایک بچہ کسی گارڈ کو قتل کر سکتا ہے جو کہ بھی ایک معمولی ہتھیار سے؟''

''تمام آثار و شواہد تاحسن ڈی مفرور کے خلاف ہیں۔ بھرتی پر انگلیوں کے نشانات کی تصدیق کے بعد کیس کلوز ہو جانا چاہیے۔'' ہیکر نے کہا۔

''شاید ایسا نہ ہو۔'' اینگل نے اطمینان سے کہا۔ ہیکر سمیت جس نے بھی سنا، حیرانی کا ردعمل ظاہر کیا۔

''بہرحال تاحسن کو جلد از جلد پکڑنے کی کوشش کرو۔'' اینگل نے شراب کے متعلق کوئی بات نہیں کی۔

''تمام متوقع مقامات پر نفری تعینات کر دی گئی ہے۔'' ہیکر نے کہا۔ ''ویٹر اپنے کتوں کو لے کر پہنچنے والا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ہمیں تاحسن کو گرفت میں لینے کے لیے کوئی خاص جدوجہد کرنی پڑے گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' اینگل نے آواز دھیمی کر لی۔ ''میرے لیے پیکی پر انٹرویو کا بندوبست کرو۔ میں JDC کے اسٹاف سے فرداً فرداً بات کرنا چاہتا ہوں۔ نیز میڈیا بگل انگزامنر کب تک پہنچ رہا ہے؟''

''بہت جلد۔''

''دوسرے گارڈ کی مصروفیات پر کسی کو تعینات کر دو۔ رکی ہیریس کے ملنے جلنے والوں کو کھنگالو۔ کمرے کی تو نیچ حاصل کرو۔'' اینگل بولتا رہا۔ ''تاحسن کے کمرے کے پڑوسیوں سے پوچھ تاچھ کرو۔ تاحسن کو یہاں کس نے کب؟ اور کیوں بھیجا؟ اس کا سرپرست کون ہے؟ والدین یا کوئی اور؟ رکی ہیریس عادی شرابی تھا۔ پوسٹ مارٹم کے بعد واضح ہو جائے گا۔ واردات کے وقت بھی وہ سخت نشے میں تھا۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ تاحسن ڈی کڈ کو فوراً گرفت میں لینا ہے۔'' اینگل نے وقفہ لیا۔

''کوئی سوال؟''

''فی الحال نہیں۔''

☆☆☆

رات سرد نہ ہونے کے باوجود اس کا چھریرا بدن کانپ رہا تھا۔ تاحسن پتلی دیواروں سے بنی دیوار کے ساتھ موجود باڑھ کے عقب میں مختصر سی جگہ میں گھسا ہوا تھا۔ اس کے نارنجی رنگت والے لباس پر پشت کی جانب JDC لکھا تھا۔

تاحسن کو پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔ جے ڈی سینٹر کی عمارت سے نکلتے ہی اس نے دوڑنا شروع کر دیا تھا۔ وہ ننگے پاؤں تھا تاہم وہ پوری رفتار سے دوڑ رہا تھا، خوف زدہ ہرن کی طرح۔ اس کے ذہن میں صرف دو باتیں تھیں۔ ایک خوف و دہشت اور دوسری چیز کہ اسے واپس کسی صورت جے ڈی سینٹر نہیں جانا۔

دائیں جانب اچانک دھماکا ہوا۔ کوئی اسے نشانہ بنا رہا تھا۔ تاحسن بری طرح بھڑک اٹھا۔ اس کی عقل نے کہا کہ یہاں سے نکل بھاگے لیکن اندر گہرائی سے آواز آئی۔

''دبکے رہو۔'' مختصر سی جائے پناہ میں سمٹتے ہوئے اس نے جھانکا۔ وہاں کوئی ہتھیار بند نہیں تھا۔ سڑک پر بچوں کا ایک گروہ فائر کریکر چلا رہا تھا۔

تاحسن کا ذہن ماضی کی طرف لوٹ گیا جب وہ اپنے باپ کے ساتھ گھر کے سامنے آتش بازی کا مظاہرہ کرتا تھا۔ ہزاروں عکس اور خیالات اس کے تصور میں گھوم گئے۔ زندگی نے اس کے ساتھ ٹھیک برتاؤ نہیں کیا۔ باپ اسے ''جہنم'' میں چھوڑ کر آسمانی جنت میں چلا گیا۔ وہ انکل مارک کے رحم و کرم پر رہ گیا۔ لوگ اسے کچرا سمجھ کر سلوک کرنے۔ اس کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں تھا۔ اس کی ہر بات غلط تھی۔ محض اس لیے کہ وہ بچہ تھا۔ ''میرا قصور کیا ہے؟'' اس نے سوچا۔

حواس کی سوچ کا زاویہ مڑ گیا۔ اسے خیال آیا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ وہ پہلے بھی مشکلات کا شکار ہوا تھا لیکن کسی ایسے خوف کے سامنے سے اس کا کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اسے بھاگنا تھا لیکن وہ کہاں جائے؟

اس کا بدن پھر کانپنے لگا۔ اس کی سانس تیز چلنے لگی۔ ناتھن نے ایک گہرا سانس لیا اور دھیرے دھیرے باہر نکالا۔ اس کا پرسکون رہنا ضروری تھا۔ اگر وہ بوکھلاہٹ اور سراسیمگی کا شکار رہا تو حماقتیں سرزد ہوں گی۔ اپنے بچاؤ کے لیے اسے ٹھنڈے دماغ سے درست قدم اٹھانا تھا۔

فوری طور پر اسے پانچ چیزوں کی ضرورت تھی ایک منصوبہ، دوسرے کھانا اور تیسری چیز نقد، چوتھی چیز محفوظ پناہ گاہ اور پانچویں JDC کے نارنجی لباس سے چھٹکارا۔ منصوبہ بنانے سے پہلے چاروں اشیا کے حصول کے لیے اسے کسی مکان میں داخل ہونا پڑے گا لیکن کیسے؟ اور اس میں کتنا خطرہ ہے؟

دروازے اور کھڑکیاں لاک ہوں گی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کسی گھر میں داخل نہیں ہوسکتا۔ اس نے اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے۔ اس نے احتیاط سے اطراف میں موجود گھروں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ تمام گھر خوب صورت اور روشن تھے۔ گاڑیاں آجا رہی تھیں اور لوگوں کی آوازیں بھی۔ ان آوازوں میں بچوں کا شور بھی شامل تھا۔

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر سڑک کے دوسری جانب اسے ایک گھر نظر آیا جس میں نہ روشنی تھی نہ اس کے سامنے کا منظر خوش نما تھا۔ لان کی گھاس کا ایک حصہ اسے نظر آرہا تھا۔ گھاس کافی بڑھ چکی تھی۔ ڈرائیو وے پر کم از کم درجن کے قریب اخبارات کے رول پڑے تھے۔ ناتھن فوراً سمجھ گیا کہ گھر کئی روز سے یا شاید ہفتوں سے خالی پڑا ہے۔ کچھ نہیں تو ایک رات تو وہ آرام سے وہاں گزار سکتا ہے۔ وہ اطمینان سے بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔

☆☆☆

میڈیا تک خبر پہنچ گئی تھی۔ JDC کا داخلی دروازہ رپورٹرز کی وجہ سے بلاک ہو گیا تھا جبکہ مزید کی آمد جاری تھی۔ چینل والے زیادہ پرجوش تھے۔ یونیفارم میں جو بھی دکھائی دیتا، وہ سوالات کی بوچھاڑ کر دیتے۔ ان کی کوشش تھی کہ کسی طرح بکنے والی خبروں کے لیے کوئی بڑی اسٹوری ہاتھ آجائے۔

مائیکل جہاں بیٹھا تھا، اس ڈیسک کے نام کی تختی پر میرالڈ پی جانسن، سپرنٹنڈنٹ لکھا تھا۔ جانسن نے خوش دلی کے ساتھ پولیس کو اپنا دفتر استعمال کرنے کی اجازت دی تھی۔ ڈیسک کی دوسری جانب ہیکر بیٹھا اپنے باس کو تفصیلات سے آگاہ کر رہا تھا۔ دوسروں کی موجودگی میں یا کام کے دوران میں وہ دوستانہ رویہ اختیار کرنے سے پرہیز کرتے تھے۔

مائیکل بریف نوٹس کی چھان بین کرتے ہوئے جزئیات کو ذہن نشین کر رہا تھا۔ اس نے 'زکی ہیرن' کی جیل کے بارے میں معلوم کیا۔

"یہاں نہیں ہے۔ منتقل 'مسوری' سے آیا تھا۔" ہیکر نے جواب دیا۔

"کتوں کا کیا بنا؟"

ہیکر نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ "بوڑھے ہیٹر کے ساتھ کوئی دشواری آن پڑی ہے۔ ہاؤنڈز کے ساتھ یہاں پہنچنے میں اسے چند گھنٹے لگ سکتے ہیں۔"

"بارش کی پیش گوئی ہے۔ مفرور کے کھوج تب تک تلف ہو جائیں گے۔ خیر چھوڑو۔" مائیکل نے ایک نوٹ علیحدہ کرتے ہوئے پلٹایا۔ "ناتھن کنڈ پر چوری کا الزام بھی ہے؟"

"ایسا ہی ہے۔"

"کمال ہے۔" مائیکل نے تعجب کا اظہار کیا۔

"ناتھن یتیم ہے اور اپنے چچا کے پاس رہتا تھا؟"

"چچا کا نام؟"

"مارک بیلا۔"

"کیا تم اسے قاتل نہیں سمجھتے؟" ہیکر نے استفسار کیا۔

"قاتل تو غالباً وہ ثابت ہو جائے گا۔" مائیکل نے بائیں ہاتھ سے کان کو سہلایا۔ "تاہم کچھ باتیں مجھے ہضم نہیں ہو رہی ہیں۔ میں نے جو الفاظ نمایاں لکھ دیے تھے ان میں ایک لفظ تھا TROUBLE تم کیا سمجھے؟"

"میرا اندازہ ہے کہ تمہارے خیال میں ہمیں کسی مشکل صورت حال کا سامنا کرنا ہوگا۔" ہیکر نے سوالیہ نظروں سے مائیکل کو دیکھا۔ "اگر وضاحت ہو جائے تو؟"

"یہاں سے فارغ ہوتے ہی وضاحت کرتا ہوں۔" مائیکل نے جواب دیا۔ "فی الحال یوں سمجھو کہ ناتھن کو تحویل میں لینے میں جتنی دیر ہوگی، یہ کیس اتنا ہی پریشان کرے گا۔"

"ہم اس کے چچا سے ملاقات کریں گے۔ ترجیحات میں یہ ملاقات ضروری ہے۔"

"بالکل، بنیادی ضرورت ہے۔" مائیکل نے کہا۔

☆☆☆

برینڈک کاؤنٹی کے جنوب مغربی کونے میں، بروک فیلڈ سے بارہ میل دور مارک بیلی اپنے مکان میں بوسیدہ صوفے پر بیٹھا تھا۔ ہاتھ میں بوربن کی بوتل تھی جس میں تین انچ کے قریب سیال باقی تھا۔ نیم تاریک مکان میں فقط اسٹیریو اور ٹی وی کی روشنی اعلان کر رہی تھی کہ مکان ویران نہیں ہے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ باقی ماندہ رہنے کو قصداً تاریکی کے سپرد کیا گیا ہے۔ مارک تنہائی چاہتا تھا۔ کم از کم آج کی رات وہ کسی سے ملاقات کے موڈ میں نہیں تھا۔ پردے گرا کر اس نے مدھم روشنی کو بھی باہر جانے سے روک دیا تھا۔

اس نے جس گند میں ہاتھ ڈال دیا تھا اس سے جلد از جلد چھٹکارا پا کر وہ نئی زندگی کے آغاز کا منتظر تھا۔ بوربن کی بوتل اس کے احساسات کو تنومندی کو دوچند کر رہی تھی اور اب تین انچ بچی ہوئی الکوحل ختم کرنا دشوار ہو رہا تھا۔ یہ بوتل اس نے چار سال قبل خریدی تھی۔

آج کے لیے اس نے یہ بوتل سنبھال کے رکھی تھی۔ اب تک وہ قدرے پرسکون تھا۔ اس کی نگاہ ٹی وی پر جمی تھی۔ بالآخر گیارہ بجے کی خبر میں ایمرجنسی کا رپورٹر کا چہرہ نمودار ہوا۔

”جے ڈی سینٹر میں قتل، تفصیلات کچھ دیر بعد۔“

یہ نو الفاظ پانچ سیکنڈ میں نشر ہو گئے۔ مارک کے نزدیک نو الفاظ اس کے لیے نئی زندگی کی ضمانت تھے۔ اس کا ذہن ماضی کی طرف چلا گیا۔ اپنے مرحوم بھائی اسٹیو کی جانب...

”معاف کرنا بھائی۔“ اس نے تصور میں بھائی کی روح سے معذرت کی۔ ”مجھے ایسا کرنا پڑا لیکن میں مجبور تھا۔ تم نے میرے لیے کچھ نہیں چھوڑا تھا۔ میرے لیے کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ میں تم سے معذرت خواہ ہوں۔“

مارک نے غربت کی مجبوریوں اور کربناک پہلوؤں کو بڑا اور بے بہا جھیلا تھا۔ منشیات ایک بھیانک عفریت کی طرح تھی جب سوشل سروس والوں نے اس کے جنم بھیجنے کو مارک کے در پر لا ڈالا تھا۔ مارک نے اس حادثے کو ایک ”موقع“ میں تبدیل کرنے کی ٹھان لی۔ وہ جتنے دن زندہ رہتا، مفلس زندگی کی بے رحم حقیقتوں کو بھگتنا پڑتا۔ اس کے لیے زندگی کی یہ قیمت ادا کرنا دشوار تر ہوتا جا رہا تھا۔ حالانکہ اس میں اس کی اپنی غلط کاریوں کا بھی قصور تھا۔

آج چار سال سے محفوظ کی ہوئی بوتل کے کھلنے کا دن تھا۔ نو الفاظ کی خبر نے تصدیق کر دی تھی کہ ماتھن بیلی کا کام ہو گیا ہے۔ ”ماضی کے بارے میں مت سوچو۔“ اس نے خود کو دلاسا دیا۔ ”تم اور کر بھی کیا سکتے تھے؟“

وہ بوتل ختم کرنے ہی والا تھا کہ اسکرین پر تفصیلات آنا شروع ہو گئیں۔

”بروک فیلڈ کے جے ڈی سینٹر میں اسٹاف ممبر کے بھیانک قتل نے قانون نافذ کرنے والے ادارے کے اہلکاروں کو ششدر کر دیا۔ رچرڈ ہیرس نامی چائلڈ کیئر سپروائزر جس کی عمر 27 سال تھی، آج رات نو بجے کے لگ بھگ سینٹر کے ایک کمرے میں مردہ پایا گیا۔ ذرائع کا کہنا ہے کہ قاتل ایک بارہ سالہ لڑکا ہے جو موقع واردات سے فرار ہونے میں کامیاب رہا۔ ملزم کی تلاش جاری ہے جو ابھی تک مفرور ہے۔“

مارک بیلی کو جو پہلا خیال آیا، وہ بوربن سے متعلق تھا۔ اس نے سوچا کہ شاید وہ زیادہ چڑھا گیا ہے۔ کیونکہ اس نے جو کچھ سنا تھا وہ ناقابل یقین تھا۔ اس نے پلکیں جھپکا کر سر کو جھٹکا تاکہ ذہن صاف ہو جائے۔ وہ ٹی وی سے مزید قریب ہو گیا اور نشریات کے ہر لفظ پر دھیان رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

اسکرین پر اب جان اونگی کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ پس منظر میں جے ڈی سینٹر کی عمارت کا عکس تھا۔ اسپیکرز سے جان اونگی کی آواز آنا شروع ہوئی۔ ادھر بوربن کی بوتل نے مارک کے ہاتھ سے پھسلنا شروع کر دیا۔ اس کی ہتھیلیوں کے ساتھ پیشانی بھی عرق آلود ہو گئی۔ وہ دانت بھینچے ہوئے ماتھن کو گالیاں دے رہا تھا۔ بوتل اس نے ٹی وی پر کھینچ ماری۔ ہاتھ سے پھسلتی ہوئی بوتل ٹی وی کے بجائے دیوار سے جا ٹکرائی۔

یہ کیسے ہو گیا؟ یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ اس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا اور بوسیدہ صوفے کے ساتھ ہی لپٹ گیا۔

مارک کا غصہ اور بے یقینی ختم ہو گئی۔ اب وہ سسک رہا تھا۔ فریاد کر رہا تھا۔ ”ماتھن! تم نے ہیری کو کام کرنے دینا تھا۔ یہ ہم دونوں کے لیے بہتر تھا۔ او ماتھن تم نے یہ کیا کر دیا؟ تم نے رکی کو کیسے مار دیا؟“

اس کے اوپر غنودگی چھا رہی تھی۔ آخری خیال اسے یہی آیا کہ سزرک مجاپ مارک بیلی عمر بھر کے اس منحوس دار سے اب بار بچ نہیں سکتا۔

☆☆☆

رات اپنے شباب کی طرف جا رہی تھی۔ بیشتر مکانات تم تاریک ہو چکے تھے۔ سڑک پر اکا دکا گاڑی دقفے سے گزر جاتی۔ سناٹا بڑھتا جا رہا تھا۔

ناخن کے متحرک ہونے کا وقت آ گیا۔ وہ کہنیوں کے بل اپنی پناہ گاہ سے نکل کر گھاس پر آیا۔ وہ بلی کی طرح گھات لگائے سڑک پر دیکھ رہا تھا۔ اس نے سڑک کے پار اپنے مطلوبہ مکان کے ہیولے کو تاڑا۔ فاصلے کی صحیح تفریق کی۔ اسے تقریباً پچاس گز طے کرنے تھے۔ اسے اسکول کی پچاس گز کی اسپرنٹ دوڑ یاد آ گئی۔ وہ اپنی کلاس میں تیز ترین تھا اور اسکول میں سات آٹھ سیکنڈ میں پچاس گز عبور کر لیتا تھا۔ ناخن کے دونوں ہاتھ گھاس پر تھے، پنجوں کے بل ٹانگوں کی پوزیشن اسٹریک پر دوڑنے کی ابتدائی حالت میں تھی۔ وہ ساکت ہو گیا۔ اس نے اطراف کے گھروں اور کھڑکیوں کو دیکھا پھر سڑک پر دائیں بائیں نگاہ دوڑائی۔ اس نے تصور کیا کہ وہ میدان میں ہے۔ دماغ میں گنتی شروع کی ایک۔۔۔ دو۔۔۔ تین۔۔۔

ناخن یکلخت اٹھ کر بھاگا۔ چھٹے قدم پر وہ سڑک پر تھا۔ سڑک پار کرتے ہی اس نے گھاس پر لوٹ لگائی۔ قبل اس کے وہ دوبارہ اٹھتا، دفعتاً اس کی سابقہ پناہ گاہ کے قریب ایک مکان کی بتی روشن ہو گئی۔ ناخن اپنی جگہ پر جم گیا۔ وہ نیم دراز حالت میں تھا۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ ایک آدمی مکان سے کچرے کا ڈبا لے کر ڈسٹ بن کی جانب جا رہا تھا۔ اس نے سڑک کی دوسری جانب دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ اسی دوران ناخن لڑھک کر عمارت کے سامنے میں لیٹ گیا۔ تاہم وہ پوری طرح ایک کھلی جگہ پر پڑا تھا۔ کبھی کبھی چھپنے کے لیے بہترین جگہ کھلا رقبہ ہوتا ہے۔ اسے اپنے باپ کی پرانی بات یاد آ گئی۔ ناخن نے آڑ میں جانے کے لیے حرکت کرنے کی حماقت نہیں کی۔ تاہم اس کی گھبراہٹ اپنی جگہ برقرار تھی۔

نامعلوم شخص کچرا پھینک کر واپس ہو گیا۔ فوراً ہی روشنی بھی غائب ہو گئی اور ناخن کا رکا ہوا سانس پھیپھڑوں سے آزاد ہوا۔ اگلا مرحلہ مکان میں داخل ہونے کا تھا۔ اگلے تین منٹ میں اس نے خود کو مکان کے اندر پایا۔ اس کے لیے اسے عقبی فریج ڈور کا ایک شیشہ کٹنگ سے توڑنا پڑا۔ پھر اس نے ہاتھ ڈال کر دروازہ کھول لیا تھا۔ کچھ دیر تک وہ اندر ایک ہی جگہ کھڑا رہا جب اس کی نگاہ تاریکی سے ہم آہنگ ہو گئی تو اس نے محتاط انداز میں حرکت شروع کی۔ یہ ایک کافی بڑا مکان تھا۔

وہ جلد ہی کچن تک پہنچ گیا۔ اس کی پہلی منزل ڈبل ڈور فریزر تھا۔ اس کی بھوک نے کھل کر چیخنا شروع کر دیا تھا۔ فریج کھولتے ہی وہ جم سا گیا۔ فریج کی مدھم روشنی اس کے ہاتھوں پر پڑی۔ جن پر گھاس کی پتیاں، مٹی اور خون لگا تھا۔ وکی ایبری کا خون۔ اس کی بھوک معاً غائب ہو گئی۔ اس کی جگہ واش روم کی طلب نے لے لی۔ فریج بند کر کے وہ واش روم کی تلاش میں نکلا۔ لاؤنج میں سیڑھیوں کے قریب اسے پہلا واش روم ملا۔ اندر آ کر دروازہ بند کرنے سے پہلے اس نے اندرونی سوئچ بورڈ کا جائزہ لیا پھر روشن دان کے لیے نگاہ دوڑائی۔ روشن دان نہیں تھا۔ دروازہ بند کر کے اس نے اس سوئچ کو دبایا، جو مرر کے اوپر ایک چکی ٹیوب کو روشن کرنے کے لیے تھا۔ ٹیوب کے اوپر شیڈ تھا جو روشنی کو نیچے اور سامنے کی جانب محدود کرتا تھا۔ آئینے میں اپنی شکل دیکھ کر وہ ٹھٹھک گیا۔ آنکھیں اندر چلی گئی تھیں اور ایک آنکھ کے قریب سوجن تھی۔ بھورے بال مٹی اور پسینے سے آلودہ ہو کر خاکی دکھائی دے رہے تھے۔

ناخن نے فی الفور خون آلود لباس اتار پھینکا اور گرم شاور میں غسل کی تیاری کرنے لگا۔ گرم پانی اسے سکون بخش رہا تھا۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ باپ کی ایک اور بات یاد آئی کہ ”مسکراہٹ اداس ترین شخص کے لیے بھی کچھ نہ کچھ مددگار ثابت ہوتی ہے۔“ اس وقت اس کے باپ کے گمان میں نہ تھا کہ اس کا بیٹا ایک دن اداسی اور پریشانی کی انتہائی حد کو چھونے لگا۔ وہ بھی کم عمری میں۔

”ڈیڈ! مجھے تمہاری ضرورت ہے۔“ اس نے سرگوشی کی۔ ”میں مصیبت میں ہوں۔ پلیز ڈیڈ میری مدد کرو۔ ڈیڈ۔۔۔ ڈ۔۔۔ ڈ۔“ ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ وہ چپکے چپکے رونے لگا پھر ہتھیلیاں آنکھوں پر رکھ لیں۔ سسکیوں اور آہوں کا سلسلہ طویل ہو گیا۔

باہر موسلا دھار بارش شروع ہو گئی تھی۔

☆☆☆

”ہینکر! مجھے بتاؤ اب تک ہم کیا کر پائے ہیں۔“ انجل نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر ٹانگیں پھیلا دیں۔ صبح ہو گئی تھی۔

”تلاش اور دورہ ناکس نے ابھی تک کوئی نتیجہ نہیں دیا ہے۔“ ہینکر نے کہا۔ ”رات کی بارش نے کتوں کو بھی ناکارہ کر دیا ہے۔ ڈاکٹر کو پر چھٹی پر ہے۔ لاش کا پوسٹ مارٹم شاید کل دوپہر تک متوقع ہے۔ ہمارے محترم کاؤنٹی پولیس چیف ٹرزٹ اب سے ڈبل پیٹرولی کا آخری بار تذکرہ تمام

چینلز کے صبح کے ٹاک شوز میں چلا ہے۔"

مائیکل نے ایک کراہ کے ساتھ آنکھیں مسلیں۔"مسٹر پیٹرولی کیا فرماتے ہیں؟"

"وہ لڑکے کو بالغ بتا رہے ہیں اور مقدمہ چلا کر تاحیات جیل میں سزا نے کا پروگرام رکھتے ہیں۔"ہیکر گویا ہوا۔"مزید یہ کہ رپورٹرز کے رابطوں پر موصوف نے اعتراف کیا کہ سزائے موت کا امکان اپنی جگہ پر ہے۔"

"خوب، یعنی وہ ایسا جج تلاش کرے گا جو ایک بارہ سال کے نابالغ بچے کو قتل کر رکھ دے۔" مائیکل نے پیٹرولی کے خلاف اپنے ناگوار لہجے کو چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

دیگر وکلا کے برخلاف پیٹرولی نے کبھی اس بات کو چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی کہ وہ الیکشن میں یو ایس سینیٹر کا امیدوار ہے اور ورجینیا کی نمائندگی کرے گا۔ پیٹرولی دہرے معیار کا قائل تھا... اور اپنی کیسز میں بالخصوص ایسا تھا، جو نہ صرف اس کی شہرت میں اضافے کا باعث بنیں بلکہ اس کی جیت بھی یقینی ہو۔ اس کی انتخابی مہم کا مرکزی تھیم "منافقت" پر مبنی تھا۔ یعنی نوجوانوں میں گرتی ہوئی اخلاقی اقدار، جبکہ غرور و شہرت اور جیت کا بھوکا تھا۔ اس کے لیے وہ کیس کی میرٹ کے بجائے اپنے مفادات پر نظر رکھتا تھا۔ الیکشن فقط چار ماہ کے فاصلے پر تھے، ناتھن کیس اس کی شہرت کو چار چاند لگانے کا بہترین موقع تھا۔ مائیکل کو پہلے ہی توقع تھی کہ... پیٹرولی اس واردات کو استعمال کرنے کی پوری کوشش کرے گا۔

"اور کچھ؟" مائیکل نے سوالیہ نظروں سے ہیکر کو دیکھا، جواب میں اس نے ناتھن کا ایک فوٹو اسے پکڑا دیا۔ مائیکل سیدھا ہو گیا اور دلچسپی سے فوٹو کو دیکھ رہا تھا۔

"یہ تو کسی زاویے سے قاتل نہیں دکھائی دیتا۔" اس نے تبصرہ کیا۔ لڑکا کیمرے کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ چمکتے دانت اور نیلی روشن آنکھیں، بالوں کا رنگ سنہری مائل بھورا تھا۔ وہ ایک خوب صورت فوٹو تھا۔ چہرے پر معصومیت کے ساتھ ذہانت کا امتزاج تھا۔ جے ڈی سینٹر کی فائل سے مائیکل کو جو تصویر ملی تھی یہ فوٹو اس کے بالکل برعکس تھا۔ مائیکل نے ایک گہری سانس لی۔"کہاں سے حاصل کیا؟"

"فقط گرینڈ کی ایئر بک سے۔"

"گڈ۔" مائیکل کی آواز میں ستائش کا عنصر تھا۔

"سب آگئے ہیں؟"

"تقریباً۔"ہیکر نے جواب دیا۔"اور منتظر ہیں۔"

دونوں ایک ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کا رخ کانفرنس روم کی جانب تھا جہاں تینوں ڈویژن کے سربراہ موجود تھے۔

"مختصر نوٹس پر پہنچنے کا شکریہ۔" مائیکل سیدھا اصل موضوع کی طرف آیا۔"جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ رات JDC میں کیا ہوا اور یہ کہ ملزم ایک بارہ سالہ لڑکا ہے جو مفرور ہے۔" اسی دوران میں ہیکر نے مذکورہ تصویر کی کاپیاں تقسیم کر دیں۔

"میں آپ سب پر زور دوں گا کہ یہ کیس مجھے جلدی ختم کرنا ہے۔ لڑکا زیادہ دور نہیں جا سکتا۔ اسے آج ہی تحویل میں لینا ہے۔ اگرچہ یہ مقامی کیس ہے تاہم سارجنٹ ہیکر کے مشورے اور اب تک کی ناکامی کے بعد میں نے اسٹیٹ پولیس کی مدد لینے کا فیصلہ کیا ہے۔"

حاضرین نے تصویر کا جائزہ لیتے ہوئے تعاون کا یقین دلایا۔ مائیکل نے شکریے کے ساتھ رخ پھیر لیا۔

☆☆☆

ناتھن کنگ سائز مسہری پر کمبل کے نیچے عریاں حالت میں بیدار ہوا۔ صبح کے نو بجنے والے تھے۔ ناتھن نے کروٹ لے کر سر تکیوں میں گھسیڑ دیا۔ اس کا دل کر رہا تھا کہ وہ مزید آرام کرے۔ رات ریفریجریٹر سے پیٹ بھرنے کے لیے اسے کئی معقول اشیا مل گئی تھیں۔ وہ دیر سے سویا تھا۔ کیبل پر اس کو پسندیدہ کارٹون دیکھنے کو مل گئے تھے۔ قسمت اب تک غیر معمولی انداز میں اس کا ساتھ دے رہی تھی۔

ماسٹر بیڈروم میں دیوار سے بسترکے بالمقابل ریموٹ اور ٹی وی اسکرین نصب تھا۔ اس نے تکیوں سے سر نکالا۔ ذہن بیدار تھا اور خیالات کی آمد شروع ہو گئی تھی۔ ناتھن نے خود کو سمجھایا۔ بہت وقت ہے منصوبہ بندی کے لیے اور پریشان ہونے کے لیے بھی۔ اس نے بیڈ سائڈ سے ریموٹ اٹھا کر مدھم آواز کا خیال رکھتے ہوئے ٹی وی آن کیا۔ نیوز چینل پر اسی کی خوب صورت سی بڑے سائز میں تصویر اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ ناتھن کو طمانیت محسوس ہوئی۔ اس نے تصویر پہچان لی۔ اچھی تصویر ڈھونڈی ہے پولیس نے۔ اسے خوشی ہوئی۔

تصویر سمٹ کر اسکرین کے بالائی کونے میں چلی گئی اور ایک آدمی کا چہرہ سامنے آگیا جس کے عقب میں JD سینٹر کی عمارت دکھائی دے رہی تھی۔ ناتھن کا منہ بن گیا۔ خاص طور پر اسے آدمی کی آنکھوں کا کرخت تاثر پسند نہیں

آیا۔ اسکرین کے زیریں حصے میں رینگتی ہوئی سلائیڈز اور نظر آنے والے عکس کے کیپشن پر نظر دوڑانے کے بعد ناتھن کے علم میں آیا کہ یہ شخص کاسن ویلتھ کا اٹارنی جے ڈی پیٹرولی تھا۔

"ہم مبالغے سے کام نہیں لے رہے ہیں اور تفتیش جاری ہے۔" پیٹرولی نے سنجیدگی سے براہِ راست کیمرے کی آنکھ میں آنکھ ڈالی۔ "تاہم یہ امر یقینی ہے کہ ناتھن بیلا نے مسز ہیری کی جان لی ہے اور مفرور ہے۔ اس پر فردِ جرم، واردات کی سنگین نوعیت کے حساب سے نافذ ہوگی۔"

"اس کے پکڑے جانے پر کیا اقدام ہوگا؟" کسی رپورٹر کا سوال تھا۔

پیٹرولی نے بلاتوقف جواب دیا۔ "میری منشا ہے کہ اس پر ایک بالغ فرد کی حیثیت سے مقدمہ چلے گا۔ بڑے لڑکوں کو بڑے جرم کی بڑی قیمت ادا کرنی چاہیے۔"

"یقیناً آپ سزائے موت کی سفارش نہیں کریں گے؟" ایک اور سوال آیا۔

"پہلے اسے سلاخوں کے پیچھے لانا ہے پھر ٹرائل ہو گا۔ سزائے موت پر بات کرنا قبل از وقت ہوگا۔" اٹارنی کی سرد مہری برقرار رہی۔

"سزائے موت!" ناتھن کا منہ کھل گیا۔ "اس کا مطلب الیکٹرک چیئر!" وہ مکمل طور پر سکتے کی کیفیت میں آ گیا۔

منظر تبدیل ہو گیا۔ ایک ڈیسک پر اینکر مین "جان اوگلی" نظر آیا۔ جان، پولیس کی سرگرمیوں کو ٹریک کر رہا تھا۔

"بریڈک کاؤنٹی کی پولیس اب تک ملزم کو پکڑنے کے لیے جو کچھ کرتی رہی ہے، اس کی اطلاعات ہمارے پاس ہیں تاہم دیگر تفتیش کے بارے میں پولیس نے بہت کم معلومات فراہم کی ہیں۔"

منظر تبدیل ہوا۔ مائیکروفونز کی قطار کے سامنے دوسرا چہرہ نمایاں ہوا جس پر تھکن کے آثار تھے۔ یہ شخص بریڈک کاؤنٹی پولیس ڈپارٹمنٹ کا ماٹیگل تھا۔ ماٹیگل کی تصویر کے ساتھ آواز جان اوگلی کی نشر ہو رہی تھی۔ "ڈیکر ماٹیگل نے صبح کے ابتدائی گھنٹے میں رپورٹرز کو بریف کیا تھا جس میں پولیس کے کریڈٹ پر کوئی اچھی خبر نہیں تھی۔"

ناتھن نے ٹی وی بند کر دیا۔ ناتھن کو محسوس ہوا کہ نیوز چینل نے اسے خوف زدہ کر دیا ہے... ساتھ ہی اسے کچھ فخر بھی محسوس ہوا کہ وہ اب تک متلاشی افراد کی پہنچ سے دور ہے۔ اسے پہلی مرتبہ یہ ادراک ہوا کہ اس نے ابتدائی مرحلے میں پولیس کو مات دے دی ہے۔

ناتھن نے بستر چھوڑ دیا۔ وہ ایک متمول گھرانے کے پُرآسائش گھر میں تھا۔ گھر میں متعدد کمرے تھے۔ بیشتر لاک تھے۔ بچوں کے کمرے کھلے تھے۔ وہ جس کمرے میں داخل ہوا وہ کسی چھوٹی لڑکی کا کمرا تھا۔ تیسرا کمرا اس کے مطلب کا تھا۔ اس کو اطمینان ہوا کہ اس کمرے کا رہائشی اس کا ہم عمر لڑکا تھا۔ اس نے اپنے پہننے کے لیے کپڑے منتخب کیے۔ اس نے بیلٹ تلاش کی۔ وہاں اتنی اشیا تھیں کہ اسے لگا کہ وہ شاپنگ کے لیے نکلا ہے۔ اس نے "ری بوک" کے جوتے منتخب کیے جو پرانے لیکن آرام دہ تھے۔ سائز بھی ٹھیک تھا۔ وہ تیار ہو کر ماسٹر بیڈ میں واپس آ گیا۔ قدِ آدم آئینے میں اپنے سراپا کا جائزہ لیا۔ اس کی اصل شخصیت واپس آ رہی تھی۔ بال شیمپو کے بعد نکھر گئے تھے۔ آنکھ کا ورم کم ہو رہا تھا۔ ناتھن کا اعتماد بحال ہونے لگا۔

اس نے منتشر خیالات اور مصائب زدہ ماضی کو ذہن سے نکالا۔ اس بار اس نے ٹی وی کی جگہ کار ریڈیو آن کیا۔ پانچ سیکنڈ بعد اسے احساس ہوا کہ یہاں بھی ٹاک شو چل رہا تھا اور اسی کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔

☆☆☆

زیرونی کارپینٹر دو بیٹوں اور دو بیٹیوں کی ماں تھی۔ وہ ریڈیو پر نیوز ٹاک 990 پانچ سال سے چلا رہی تھی۔ نیوز ٹاک 990 ریڈیو کے چند گنے چنے ہٹ ٹاک شوز میں سے ایک تھا۔

زیرونی نے اپنے پروگرام میں ہمدردانہ چیز پیش کی جو ریڈیو پر اس سے قبل نہیں ہو چکی تھی۔ اس کے مداحوں کا ایک وسیع حلقہ تھا۔ اس کے مداحوں کے مطابق زیرونی کارپینٹر زندگی سے متعلق عام آدمی کا حقیقی نقطۂ نظر پیش کرتی تھی۔ وہ اپنے خیالات کو زبان پر لانے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتی اور اس کی آواز میں سچائی عیاں ہوتی جسے اس کے مداح اور سننے والے محسوس کر لیتے تھے۔

ناتھن ایک اجنبی گھر کی خواب گاہ میں زیرونی کو سن چکا تھا۔ زیرونی کا شو "سنڈیکیٹ" ہو کر وسیع تر ہو چکا تھا اور ملک کے طول و عرض میں سنا جاتا تھا۔

"اس کیس میں اٹارنی کہہ رہے ہیں۔" وہ ناتھن کے حوالے سے بول رہی تھی۔ "کہ بچے پر مقدمہ بالغ لڑکے کی حیثیت میں چلے گا۔"

☆☆☆

ناتھن بستر کے کنارے پر بیٹھا اجنبیوں کے فیصلے سن

رہا تھا۔ جبکہ وہ وہاں سے جا چکی تھی۔ ان لوگوں کی پھیلائی ہوئی ہیرا پھیری کی جھلکیوں کے بارے میں۔ وہ محسوس نہیں کر سکتے کہ اس کے ساتھ میرا کاروبار رہے تھے۔ یہ لوگ کچھ نہیں جانتے۔ نہ ان کو اس کی پروا ہے۔ میں اس کو مارنے میں کامیاب نہ ہوتا تو وہ مجھے مار چکا ہوتا۔ یہ کیسی ناانصافی ہے۔ ماتھن کے ذہن میں خیالات کی آمدورفت جاری تھی۔ پولیس کو حقائق معلوم کرنے چاہئیں یا میں پولیس کے پاس جاؤں... کیا وہ میری بات کا یقین کر لیں گے؟

ٹی وی اور ریڈیو پر کی جانے والی باتیں حقائق سے دور تھیں۔ اس کی بات کون سنے گا؟ تو وہ کیا کرے بھاگتا رہے؟ کب تک؟ کہاں تک؟ کانٹوں بھری مسافت کہاں ختم ہو گی؟ ایک دن وہ اسے پکڑ لیں گے۔ ریڈ کیب اینڈ فرینڈ کی ریس نہیں ہے۔ کیا وہ کچھ نہیں کر سکتا؟ "میں کر سکتا ہوں۔" وہ بڑبڑایا۔ میں بلکہ فون ریکارڈ کو ٹھیک کر سکتا ہوں۔ ایک فون کال میں کوئی نقصان نہیں ہے۔ کوئی گڑبڑ ہوئی تو وہ فون بند کر دے گا۔

اس نے چینل کے بجائے ریڈیو کو فون کرنے کا فیصلہ کیا۔ ماتھن کے ذہن میں پہلا نام ڈیزی کا رپورٹر کو آیا۔ ماتھن نے کارڈلیس اٹھا کر نیٹ آن کیا۔ اسٹیشن کا نمبر ملایا۔ دوسری جانب مصروف لائن کا سگنل آرہا تھا۔ اس نے پھر ملایا۔ پھر ملایا۔ تیسری کوشش میں دوسری جانب گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔

"آپ "کیپ لائن" پر آگئے ہیں۔ کیا بات کرنا چاہیں گے؟"

"میں ماتھن بیلی کے معاملے میں بات کروں گا۔"

"سب ہی کر رہے ہیں۔" دوسری جانب سے آواز آئی۔ "آر یو کڈنگ؟ بلی بچوں سے بات نہیں کرتی۔"

"بلی؟" ماتھن الجھ گیا۔ پھر اسے کچھ یاد آیا۔ "لیکن وہ مجھ سے بات کرے گی۔ آئی ایم ماتھن بیلی۔"

ڈیزی گیئر بدلنے والی تھی۔ ماتھن پر سوال جواب کرتے ہوئے اسے پینتالیس منٹ ہو گئے تھے۔ پروڈیوسر نے اس موضوع پر ایک چٹ بھیج کر دی تھی۔ "پریذیڈنٹ کس طرح خارجہ پالیسی کو ہینڈل کر رہے ہیں؟" اس موضوع پر لب کشائی کے لیے ابھی اس نے منہ کھولا ہی تھا کہ ائرفون میں ایمرک زمورا کی ہیجانی آواز سنائی دی۔ "تمہیں لائن نمبر چھ پر ایک کال اٹینڈ کرنی چاہیے۔"

ڈیزی ڈی گیٹ نے بجھا کر شعلہ بار آنکھوں سے پروڈیوسر کو گھورا۔ نگاہ پہچان کر بوکھلا گیا۔ اس نے ایک اور بار ہی ڈیزی کو عالم غضب میں دیکھا تھا۔ اس نے وضاحت پیش کرنے میں دیر نہیں کی۔ "لائن چھ پر لڑکا ہے۔ ماتھن بیلی اور میرے اندازے کے مطابق وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔"

ڈیزی کے خیالات کی ٹرین ایک لمحے کے لیے مکمل طور پر رک گئی۔ اگر یہ ٹھیک ہے تو اس کا شو ایک دھماکا کرنے کے بہت قریب ہے۔ ڈیزی کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس نے دو بار خود کو کمپوز کیا۔

"پیارے سامعین ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لائن پر کوئی سلیبریٹی ہے۔" اس نے میٹھی زبان میں سسپنس کا عنصر شامل رکھا اور مشکوک نظروں سے زمورا کو دیکھا۔ زمورا نے فوراً ہی ہاتھ کا انگوٹھا بلند کیا۔

"ماتھن بیلی، تم بات کر رہے ہو؟" ڈیزی کی آواز نرم اور دوستانہ تھی۔

"یس میم۔" دوسری جانب سے ایک جھجکتی لیکن مستحکم آواز آئی۔

ڈیزی کو فخر تھا کہ چار سال میں اس کی صلاحیت نے غیر معمولی ترقی کی تھی۔ وہ آواز سن کر شخصیت کے عادات و خصائل جان لیتی تھی۔ آواز کے ذریعے جھوٹ سچ کو الگ کرنا اس کے لیے معمولی بات تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ یہ آواز ایک بوائے اسکاؤٹ اور لٹل لیگ بیس بال پلیئر کی ہے اور جو کوئی بھی ہے وہ دیانت دار ہے۔ اس نے فوراً ہی ماتھن کے بارے میں تصور میں مزید بلڈنگ کی۔

☆☆☆

مانگلی کم خوابی کے اثرات محسوس کر رہا تھا۔ فون کی گھنٹی بجی۔ پیشانی مسلتے ہوئے اس نے فون اٹھایا۔ "لیفٹیننٹ مانگلی۔"

"مانگلی! میں پیٹرولی بات کر رہا ہوں۔"

مانگلی کے منہ کا مزہ مزید خراب ہو گیا۔ "صبح بخیر، تو آپ کیمروں کا سامنا کرنے کے لیے جلدی اٹھ گئے۔"

پیٹرولی واضح طور پر بدمزہ ہوا تاہم مزاج کے برخلاف اس نے جوابی حملہ کرنے کے بجائے مانگلی کا تبصرہ نظرانداز کر دیا۔

"ریڈیو آن کرو۔" پیٹرولی بلند آواز میں بولا۔ اس کی آواز کی سنسنی مانگلی سے چھپی نہ رہی۔ "بلی کو سنو، وہ بیلی کڈ سے بات کر رہی ہے۔ میں پھر فون کروں گا۔"

☆☆☆

ماتھن کی گھبراہٹ غائب ہو گئی وہ ماسٹر بیڈ میں ٹہلتے ہوئے کارڈلیس پر بات کر رہا تھا۔

’’جو کچھ بھی ہوا، جب تک جرم ثابت نہ ہو جائے میں معصوم ہوں۔‘‘ اس نے مطالبہ کیا۔

’’جو کچھ بھی ہوا، اس میں ایک اصول زندگی کا چراغ گل ہو گیا۔ کیا تم نہیں سمجھتے کہ کلنگ ایک غلط کام ہے؟‘‘

’’یقیناً میں اسے برا سمجھتا ہوں۔‘‘ ناتھن نے جواب دیا۔ ’’لیکن آپ کو نہیں پتا کہ درحقیقت وہاں کیا ہوا۔‘‘

’’کیا تم نے گارڈ کی جان نہیں لی؟‘‘ ڈیزی کی آواز نرم تھی۔ وہ قتل یا قاتل، مقتول کے الفاظ استعمال نہیں کر رہی تھی۔

ناتھن کی آواز اونچی ہو گئی، اس میں فرسٹریشن کا عنصر داخل ہو گیا۔ ’’ہاں، لیکن...‘‘

ڈیزی نے بات کاٹ دی۔ ’’کوئی لیکن ویکن نہیں، ناتھن! تم نے ایک انسانی جان لی ہے۔ آگے کیا بچا ہے کہنے کے لیے... اس سے پہلے کہ کسی اور کو کسی قسم کا جانی نقصان پہنچے تمہیں واپس آ جانا چاہیے۔‘‘

ناتھن بستر کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ ’’میں واپس نہیں جا سکتا۔‘‘ اس کی آواز میں بھرپور مضبوطی تھی۔ فیصلہ کن۔ ’’اگر میں واپس گیا تو وہ مجھے مار دیں گے... رکی ہیرس بھی چاہتا تھا... میں واپس جا کر ان کا ادھورا کام پورا نہیں کر سکتا... کیا میری زندگی کی کوئی قیمت نہیں ہے؟‘‘ لائن کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔

’’میں سادہ الفاظ میں پوچھتی ہوں۔‘‘ ڈیزی نے سلسلۂ تکلم کو جوڑا۔ ’’کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ ہیرس نے تمہیں ختم کرنے کی کوشش کی تھی؟‘‘

’’یس میم۔‘‘

’’ٹھیک ہے ناتھن۔‘‘ ڈیزی نے کہا۔ ’’ہم اسے دوسرے الفاظ میں پھر سے دہراتے ہیں... تم کہنا چاہتے ہو کہ تم نے ذاتی دفاع میں ہیرس کو ہلاک کیا؟‘‘

’’نہیں، رائٹ۔ سوائے اس کے کہ وہ گارڈز نہیں سپروائزر کہلاتے ہیں۔‘‘ ناتھن بولا۔ ’’اور یہ کہ میں تو صرف خود کو بچا رہا تھا... لیکن حادثہ اس طرح ہو گیا...‘‘

ڈیزی کو اپنی آواز سن کر حیرت ہوئی جس میں ہلکی سی ہمدردی جھلک رہی تھی۔ ناتھن کوئی عام بچہ نہیں تھا۔ اس میں کچھ خاص بات تھی۔ وہ اس کی تصویر پہلے ہی دیکھ چکی تھی اور تصور میں اس شخصیت کا پورا اسکیچ بنا چکی تھی۔

’’کیا تم بتاؤ گے کہ درحقیقت گزشتہ رات کیا ہوا تھا؟‘‘

’’مشکل ہے کہاں سے شروع کروں۔‘‘ وہ تکیوں کے سہارے لیٹ گیا۔ ’’میں اسی جگہ پر ایسے بچوں کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ میں ذہنی اور جسمانی طور پر صحت مند تھا اور JDC صحت مند بچوں کے لیے نہیں۔ وہ جیل ہے دوسرے بچوں کے لیے تفریح یہ تھی کہ وہ میری چیز یں چرا لیتے اور مختلف طریقوں سے مجھے تنگ کرتے۔ شاید ان کو بھی پتا چل گیا تھا کہ میں ان جیسا نہیں ہوں۔ میں نے دفاع کی کوشش کی... لیکن میں اکیلا تھا۔‘‘

’’تم نے کسی کو بتایا کیوں نہیں؟‘‘ ڈیزی نے مداخلت کی۔

ناتھن نے کڑواہٹ سے جواب دیا۔ ’’ہاں میں نے پہلے ہی دن شکایت کی تھی۔ یہ میری ایک بڑی غلطی تھی۔ وہ رکی ہیرس تھا جسے میں نے بتایا۔‘‘ ناتھن نے وقفہ لیا۔

’’میں پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا جب ایک دن ہیرس میرے پاس آیا اور مجھے ساتھ چلنے کو کہا، میں سمجھ گیا کہ میں مصیبت میں پڑنے والا ہوں۔ لیکن میں یہ نہیں جانتا تھا کہ کیسی مصیبت...‘‘ ناتھن اپنی بات سمجھانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

پھر وہ اٹھارہ منٹ مزید بولتا رہا۔ ہزاروں لاکھوں لوگ جگہ جگہ... وہ دور تک سن رہے تھے، ناتھن کے پاس الفاظ کی کمی تھی، پھر بھی ڈیزی نے صرف تین یا دو مداخلت کی، سمجھنے کے لیے کہ فلاں بات سے اس کا کیا مطلب ہے۔

ناتھن نے بات ختم کی تو اس وقت تک یا وہ اشتہار چھوٹ چکے تھے لیکن وہ براڈ کاسٹ اتنا غیر متوقع اور سنسنی خیز تھا کہ مشتہرین نے شکایت نہیں کی۔

ناتھن نے اٹھارہ منٹ میں جو انکشافات کیے، وہ کچھ اس طرح تھے۔ اس رات ہیرس، ناتھن کے پاس آیا اور اسے کان سے پکڑ کر اٹھایا۔ ’’میرے ساتھ آؤ۔‘‘ اس نے کہا۔ اس کی سانس میں شراب اور سگریٹ کی بو بسی ہوئی تھی۔ ’’ایک رات ’’کرائسز یونٹ‘‘ میں، تمہیں سکھا دے گی کہ دیواروں پر نہیں لکھا جاتا۔‘‘

ناتھن نے دونوں ہاتھوں سے رکی ہیرس کی کلائی پکڑ لی اور ایڑیاں اٹھا کر پنجوں کے بل چلنے لگا کہ کہیں اس کا کان ہی نہ اکھڑ جائے۔ ’’مجھے چھوڑ دو، پلیز۔‘‘ اس نے فریاد کی۔ ’’میں نے کچھ نہیں کیا۔‘‘ رکی نے جواب نہیں دیا اور اسے کرائسز یونٹ تک لے آیا۔ بیلٹ سے چابیاں الگ کر کے ایک چابی اس نے دروازے کے لاک میں داخل کی۔ ناتھن سخت ہراساں تھا۔ یہ ایک چھوٹا کمرا تھا، تاریک سیل کی طرح... کمرا دوسرے کمروں سے الگ تھلگ

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھا۔ درحقیقت اسے سزا کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ جہاں کپڑے، کھانا حتیٰ کہ روشنی بھی چھین لی جاتی تھی۔ اگرچہ اسے کم ہی استعمال کیا جاتا تھا تاہم بچوں میں اس کی دہشت پھیلی ہوئی تھی۔ ناتھن خوف زدہ ہو گیا۔

دروازہ کھلتے ہی وہ بلند آواز میں نوسولود کی طرح رونے لگا۔ ”رکی، مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔“

”اگر تم نے مزید شور مچایا تو تمہیں پتا چل جائے گا کہ اصل تکلیف کیا ہوتی ہے۔“

ناتھن نے دوبارہ ہاتھ پیر مارنے شروع کر دیے۔ وہ اپنا بازو رکی ہیرس کی گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ رکی نے اس کو سر کے بالوں سے پکڑ کر اٹھا لیا۔ ”تمہیں کمرے میں جانا پڑے گا۔ چاہے مجھے تمہاری ہڈیاں توڑنی پڑیں۔“ اس نے ناتھن کو اندر پھینک کر دروازہ لاک کر دیا۔ اس کے منہ سے شراب کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔

”جوتے اتار دو۔“ رکی نے حکم دیا۔ ”اور موزے بھی۔“

”لیکن یہاں ٹھنڈ ہے۔“ سنگریٹ کا فرش بھی سرد تھا۔

جواب میں رکی صرف گھورتا رہا اور ایک ہاتھ آگے کر دیا۔ ناتھن کاٹ (COT) کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا رونے لگا اگرچہ اسے رونا پسند نہیں تھا۔ بہرحال اسے جوتے موزے اتارنے پڑے۔ اس نے وہ رکی کے حوالے کر دیے۔ رچرڈ ہیرس دروازہ لاک کر کے فوراً ہی غائب ہو گیا۔

ناتھن نے ٹانگیں جوڑ کر گھٹنے اوپر کیے اور سر گھٹنوں میں لگا دیا۔ وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دس مہینے، صرف دس مہینے اور باقی ہیں پھر وہ اس قید خانے سے آزاد ہو جائے گا۔ آٹھ مہینے پہلے ہی گزر چکے تھے۔ باقی دس مہینے بھی وہ گزار لے گا۔ اس نے حوصلہ پکڑنے کی کوشش کی۔

☆☆☆

تالے میں گھومنے والی چابی نے اسے بیدار کیا۔ اس کے سیل کی بتی روشن تھی۔ چابی گھومنے کے بعد دروازہ دیر سے ہی بند پڑا تھا۔ ناتھن نے اٹھ کر دوبارہ گھٹنے جوڑ لیے۔ وہ خود کو سمجھا رہا تھا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے لیکن خوف کی لہراس کے انگ انگ میں راستہ بنا رہی تھی۔ اس کا دل سینے میں ایسے دھڑک رہا تھا جیسے ڈھول بج رہا ہو۔ کیا اسے دروازے کی جانب جانا چاہیے؟ کیا کوئی اندر آ رہا ہے؟

ناتھن اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ دروازہ اندر کی جانب کھل رہا تھا۔ رکی ہیرس دروازے میں اکیلا کھڑا تھا۔ نشے میں دھت۔ ناتھن نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ ایک ہاتھ کمر کے پیچھے کیے ہوئے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

ناتھن کی کسی اندرونی حس نے کہا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ زندگی میں پہلی بار اسے شدت سے احساس ہوا کہ اس کی زندگی خطرے میں ہے۔ اس کے ذہن میں آیا کہ اسے لڑنا ہے۔ رکی کے چہرے پر لکھا تھا کہ فائٹ ہوگی۔ ناتھن کو زندگی کی جنگ لڑنا پڑے گی۔ رکی حجرے سے اندر آیا اور مسکرایا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ یہ لڑائی یک طرفہ ہوگی۔

”تمہیں یہاں کبھی نہیں آنا چاہیے تھا، بچے۔“ وہ بولا۔ ”یہ جگہ تمہارے لیے نہیں ہے۔“

”جلد یا بدیر کوئی نہ کوئی تمہیں مار دے گا۔“ وہ پھر بولا۔

ناتھن کا ذہن برق رفتاری سے سوچ رہا تھا۔ اس کا خدشہ ٹھیک تھا۔ رکی ہیرس کی آنکھیں اب اس کے عزائم کا کھلا اظہار کر رہی تھیں۔ ایک قدم بڑھا کر اس نے آدھا فاصلہ طے کر لیا۔ ناتھن اضطراری طور پر پیچھے ہو کر اینٹوں کی دیوار سے چپک گیا۔ وہ پھنس چکا تھا۔

”میں تمہیں زیادہ تکلیف نہیں دوں گا بچے۔“ رکی کی پُراسرار مسکراہٹ پھیل گئی۔ ناتھن نے سراسیمگی کے عالم میں بھاگنے کا راستہ ڈھونڈا۔ رکی نشے میں تھا اور ناتھن جھکائی دے کر نکل سکتا تھا۔ ایسا اس نے بہت دفعہ انکل مارک کے ساتھ کیا تھا۔ یا تو رکی کو خود پر پورا اعتماد تھا یا پھر نشے کی وجہ سے اس نے دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ بنجناہ و بزدل کی طرح سوچ رہا تھا کہ بچہ کہاں بھاگ سکتا ہے۔ ناتھن کا ذہن تیزی سے جمع تفریق کر رہا تھا۔ یہ انکل مارک کا مکان نہیں تھا بلکہ ایک چھوٹا سا سیل نما کمرا تھا۔ اسے جھکائی یا جھکی دے کر نکلنے کی جگہ نہیں مل رہی تھی۔ پھر اسے رکی کے ہاتھ میں چھری بھی نظر آ گئی۔ ناتھن کی دہشت بڑھ گئی اور بچاؤ کے امکانات بھی مزید محدود ہو گئے۔ اس نے چھری ناتھن کے چہرے کے سامنے لہرائی۔ ناتھن کے پاس یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ اس کا ذہن، جسم، آنکھیں اور تمام حسیات ایک نکتے پر مرکوز تھیں کہ جان کیونکر بچائی جائے۔ زندگی... پیاری زندگی...

ناتھن دیوار کے ساتھ لگا تھا۔ اس نے بلا جھجک پوری جان سے دائیں ٹانگ رکی کی رانوں کے درمیان ماری۔ اذیت سے رکی کی سانس رک سی گئی۔ وہ لڑکھڑا کر ایک قدم پیچھے ہٹا پھر گھٹنوں کے بل گرا۔ ناتھن نے اس کے جھکے ہوئے کندھوں پر سے جب لگا کر نکلنا چاہا لیکن اس کا اندازہ

تھوڑا غلط ہو گیا۔ دونوں گھٹنے رکی ہیری کے سر سے ٹکرائے اور دونوں زمین بوس ہو گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ قدموں پر کھڑا ہوتا، چھری قوس بناتی ہوئی اس کے سر پر سے آئی۔ یہ مہلک وار اضطراری طور پر اس نے کنپٹی اور کلائی کے درمیانی حصے پر روکا۔ وہ براہ راست طاقتور وار کو نہیں روک سکتا تھا۔ چنانچہ ناتھن نے بازو پر سہارا تھا۔ رکی کی کلائی وہاں سے ٹکرا کر اچٹ گئی پھر بھی ناتھن کا بازو جھنجھنا اٹھا۔ قاتل دوسرا وار کرنے جا رہا تھا۔ اس اثنا میں ناتھن گھٹنوں کے بل اٹھ گیا اور جھپٹ کر رکی کی کلائی میں دانت گاڑ دیے۔ جتنی طاقت تھی اس نے جبڑوں میں منتقل کر دی۔ رکی کرب و اذیت سے بلبلایا اور دیوانہ وار ہاتھ کو جھٹکا تاہم دانت گہرائی تک اتر گئے تھے۔ البتہ چھری اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ بائیں ہاتھ سے اس نے ناتھن کے چہرے پر گھونسا مارا۔ ناتھن کاٹ (COT) سے ٹکرایا۔ کاٹ پہلو کے بل گر گیا۔ پورے پانچ سیکنڈ تک دونوں ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ ناتھن نے زبان کی گلی کی۔ یہ رکی کا خون تھا۔ رکی نے دائیں کلائی بائیں ہاتھ سے جکڑی ہوئی تھی۔ وفتاً دونوں کی نظریں ایک ساتھ زمین پر گری چھری کی طرف گئیں۔ دونوں جھپٹے۔ شراب اور کلائی کے گہرے زخم نے رکی کو متوقع کارکردگی کے مظاہرے سے روکا اور پھر پلا ناتھن سبقت لے گیا۔ اس کی تو ویسے ہی جان پر بنی ہوئی تھی۔ ناتھن نے اندھا دھند چھری گھمائی۔ رکی بہت قریب پہنچ گیا تھا۔ چھری اس کے پیٹ میں جا گھسی۔ رکی نے آخری لمحے میں بچنے کی کوشش کی تاہم بہت دیر ہو گئی تھی۔ وہ پشت کے بل بے خبر زمین پر گرا۔ سر بری طرح زمین سے ٹکرایا۔

''آئی ایم سوری۔'' ناتھن چیخا۔ ''اوہ گاڈ، رکی، آئی ایم سوری۔''

ناتھن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس نے پڑھا نہیں کیا تو رکی مر جائے گا۔ اپنی سمجھ کے مطابق.... آنکھیں بند کر کے اس نے پہلے چھری پیٹ سے نکالی۔ چھری نکالتے ہی اسے فوراً احساس ہوا کہ اس نے غلطی کی ہے۔ پیٹ کے زخم سے خون کا فوارہ چھوٹا۔ اضطراراً ناتھن نے خون بند کرنے کے لیے زخم پر ہاتھ رکھا۔ وہ بھول گیا تھا کہ رکی ہیری چھری سے اسے ذبح کرنے والا تھا۔ اچانک رکی کے دونوں ہاتھ بلند ہوئے اور اس نے ناتھن کا گلا جکڑ لیا۔ ناتھن کی سانس رکنے لگی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے رکی کی کلائیاں پکڑ کر گلا چھڑانا چاہا تب اسے پتا چلا کہ بچے اور بڑے کی طاقت میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ وہ خونی زخم کھانے کے بعد بھی رکی نے اسے چوہے کی طرح دبوچ لیا تھا۔ اس کی آنکھیں قاتل کی آنکھیں بن گئی تھیں۔ وہ خود مر رہا تھا لیکن ناتھن کو بھی ساتھ ہی مارنا تھا۔ بجلی اس کے کہ ناتھن کے حواس ساتھ چھوڑ جانے والے، اس نے ایک ہاتھ ہٹا کر چھری کو ڈھونڈا۔ دستہ ہاتھ میں آتے ہی اس نے بچی کھچی توانائی جمع کرتے ہوئے پوری یکسوئی کے ساتھ چھری کا تیز پھل رکی کے سینے میں اتار دیا۔

ناتھن ہوش میں نہیں تھا۔ اس نے اوپر تلے بار بار وار کیے اور پانچویں وار میں چھری رکی کے سینے میں چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے چکر آیا اور وہ لڑکھڑا کر دیوار سے ٹک گیا۔ چھوٹے سے کمرے میں ہر طرف خون ہی خون تھا۔ ایک منٹ بعد وہ حرکت کرنے کے قابل ہوا۔ وہ ایک بھیانک جرم کا مرتکب ہو چکا تھا۔

اس نے رکی کی بیلٹ سے چابیوں کا گچھا الگ کیا اور کھلے دروازے سے باہر نکل گیا۔ بقیہ رکاوٹیں بھی اس نے چابیوں کی مدد سے عبور کیں۔ اب وہ عمارت سے باہر پچاس گز چوڑے گھاس کے قطعے پر تھا جو پہاڑی کے دامن میں ختم ہو رہا تھا۔ چابیاں اس نے جھاڑیوں میں پھینکیں اور دوڑ لگا دی۔ پہاڑی کے اوپر سے اس نے مڑ کر JDC کی عمارت کو دیکھا۔ کتنی پرسکون اور پیار بھری جگہ تھی اور خوب صورت بھی۔ پودوں اور پھولوں سے آراستہ۔ مگر اندر نفرتوں کا باغ تھا۔ رکی جیسے افراد نے نفرتوں کے بیج بو کر ان کی آبیاری کی اور پروان چڑھایا تھا۔

''کبھی نہیں آنے گا۔ وہ یہاں کبھی واپس نہیں آئے گا۔'' ناتھن کے دماغ میں بس ایک خیال تھا۔

☆☆☆

نیوز ڈیسک 990 کا عملہ تیزی سے شیڈول میں رد و بدل کر رہا تھا۔

''کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ بیس منٹ بعد پھر فون کرے گا؟'' زمورا نے سوال کیا۔ زیبی نے خشمگیں نظروں سے اسے دیکھا۔

''اس نے کہا ہے تو کرے گا۔ کیا تم میری صلاحیت پر شک کر رہے ہو؟''

''نہیں، نہیں۔ سب جانتے ہیں کہ آواز پرکھنے میں تمہارا کوئی دوسرا تو مقابل نہیں ہے۔'' زمورا جھینپ گیا۔ دراصل وہ بھی سب کی طرح ہیجان کا شکار ہو گیا تھا۔

دور دور تک ان گنت سامعین زیبی وی کیٹ کی آواز سننے کے لیے بے قرار تھے۔ زیبی پوری طرح تیار

تھی۔ 30 منٹ گزر گئے تھے۔ پیرزبوسر پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔ تاہم زیزی پُرسکون تھی۔

32 منٹ بعد کال آئی۔ زسورا نے انگوٹھا ادپر کر کے لائن زیزی کو دی۔

"ناتھن۔"

"یس میم۔"

"کیا تم ٹھیک ہو؟" زیزی کی آواز میں بے چینی فکر تھی۔

"تقریباً، بس میری آنکھوں میں رکھن ہے، ویسے میں ٹھیک ہوں۔"

"تمہارے خیال میں ہیرلڈ تمہیں کیوں مارنا چاہتا تھا؟" زیزی کو اس کی ماں جیسی غمگین کہانی پر پورا یقین تھا۔

"میرے خیال میں وہ پاگل ہو گیا تھا۔ اس نے خوب شراب پی رکھی تھی۔ بڑے لوگ پینے کے بعد عجیب ہو جاتے ہیں۔"

"کون بڑے؟" زیزی نے پوچھا۔ "کیا تمہارے والدین بھی...؟"

"نہیں، ہرگز نہیں۔ وہ بہت اچھے آدمی تھے۔ انہوں نے کبھی نہیں پی۔ نہ انہوں نے کسی کو مارا۔"

"تو کیا کسی نے زندگی میں تمہاری پٹائی کی؟"

"میں اس بارے میں بات نہیں کروں گا۔" ناتھن نے ناگواری سے کہا۔

"کیوں نہیں؟ اس سے تمہیں مدد ملے گی۔ لوگ سمجھ سکیں گے کہ تم کن حالات سے گزر رہے ہو؟"

"نہیں، ایسا نہیں ہے۔" ناتھن نے رک کر کہا۔ "میں کچھ مختلف بتاؤں گا تو لوگ کہیں گے میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ بچوں کو ویسے بھی جھوٹا سمجھا جاتا ہے۔ بڑے لوگ بچوں کو مارتے ہیں... بچے چیختے ہیں، روتے ہیں پھر چپ ہو جاتے ہیں۔ یہ سب ٹھیک ہے لیکن جب کوئی چھوٹا، بڑے کو جواباً مارتا ہے تو اسے جیل میں ڈال دیتے ہیں۔"

"تمہارا مطلب JDC سے ہے؟"

"یس میم۔"

"لیکن وہ جیل تو نہیں ہے۔"

"جیل کی طرح ہے۔ میں نے وہاں وقت گزارا ہے۔"

"تو کیا تم نے کسی کو جواباً مارا تھا؟"

لائن پر خاموشی تھی۔ ناتھن کو انکل مارک کے ساتھ مار پیٹ یاد آرہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا، کیا وہ اس خاتون کو سب کچھ بتا رہے؟ وہ ناتھن کو اچھی خاتون لگ رہی تھی۔

"ناتھن تم لائن پر ہو؟"

"جی۔" اس نے جواب دیا۔

"ناتھن۔" زیزی نے نرمی سے پکارا۔ "کیا یہ کال ٹریس کی جا سکتی ہے؟" اس کی آواز آئی۔

"نہیں۔" زیزی نے یقین دلایا۔ "یہ ریڈیو اسٹیشن ہے۔ جب تک بجلی کا سسٹم موجود ہے کوئی ٹریس نہیں کر سکتا۔"

"کیا آپ کو یقین ہے؟"

زیزی نے زسورا کی جانب دیکھا۔

"شیور، وائی ایم شیور۔" اس نے ایک معقول جواب دیا۔ ورنہ بکطرفہ شو نہیں کر سکتی تھی۔

"زیزی، میں نے کچھ پوچھا تھا؟"

ناتھن ماضی کی جانب لوٹ گیا۔ اس نے بھی ایک نارمل زندگی گزاری تھی۔ اس کے باپ نے اسے ایک اچھے گھر میں اچھی طرح پالا تھا۔ صرف وہ دوستوں سے اور اچھے پڑوسی تھے۔ کیا وہ لاکھوں لوگوں کو ستارے کہ اس کے باپ کے انتقال کے صرف تین دن بعد انکل مارک نے اسے لیونگ روم میں ایک پنجرے جیسی جگہ میں قید کر دیا تھا۔ صرف اس کا مضحکہ اڑانے کے لیے۔ وہ مدد کے لیے چلّا رہا تھا تو پہلی بار اسے انکل کے ہاتھوں بیلٹ کی مار کا ذائقہ چکھنا پڑا۔ انکل کو خراب لوگوں کے ساتھ گھر میں آنے رن بنا کر پسند تھا۔ بہت ساری خراب باتیں تھیں۔

"نہیں، میں نے جواباً کسی کو نہیں مارا۔"

"لیکن تم نے ہیرلڈ کو مارا؟"

"وہ مجھے جان سے مار دینا چاہتا تھا۔ میں نے اپنی جان بچائی۔ اور... اور..." ناتھن سسکنے لگا۔ "آپ بھی مجھے سب کی طرح الزام دے رہی ہیں؟"

"نہیں، بیٹی۔" زیزی کا دل پگھل گیا۔ "مجھے تمہاری بات پر یقین ہے اور میں جھوٹ نہیں بولتی۔" زیزی نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "میں تمہاری اور بہت سے لوگوں کی مدد کرنا چاہتی ہوں۔ لیکن میں کسی غلط بات کی حمایت نہیں کر سکتی۔"

"یس میم۔" ناتھن نے خود پر قابو پایا۔ اس خاتون میں اس کے باپ کی طرح کوئی بات تھی۔ زیزی کے لیے اس کی پسندیدگی پہلے سے بڑھ گئی۔

"تو مجھے ٹھیک بتاؤ کہ تم نے بارہ سال کی عمر میں کار چرائی تھی؟"

"جی، میں اس وقت گیارہ سال کا تھا۔"

"ناتھن! کیا یہ خراب بات نہیں تھی؟"

"جی یہ غلط کام تھا۔" ناتھن نے اعتراف کیا اور زیزی کو خوشی ہوئی کہ وہ اس کی توقع کے مطابق متواتر سچ بول رہا تھا۔

"پھر تم نے ایسا کیوں کیا؟"

ناتھن نے اپنا فیصلہ تبدیل کر دیا اور انکل مارک کی تمام باتیں بتا دیں پھر کہا۔ "اس دن میں نے ان کی شراب کی بوتل توڑ دی تھی اور بھاگ گیا تھا۔ انہوں نے میرے پیچھے کتا چھوڑ دیا تھا۔ میں ڈر گیا تھا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا اور میں نے پڑوسی کی کار کے ذریعے جان چھڑائی۔ سب کہتے ہیں، میں نے کار چرائی۔ کوئی نہیں کہتا کہ میں نے کچھ دیر بعد کار چھوڑ دی تھی اور پڑوسیوں کو بتا دیا تھا۔ سب بڑے لوگ، بچوں کو جھوٹا سمجھتے ہیں... آپ انکل کے پڑوسی سے پوچھ لیں۔"

زیزی کو نئے انکشافات پر دکھ ہوا۔ "زیزی مجھے افسوس ہے لیکن میں تمہیں بتا رہی ہوں کہ مجھ سمیت بہت سے لوگ تم کو جھوٹا نہیں سمجھتے۔" زیزی نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔

"نہیں صرف آپ میری بات کا یقین کرتی ہیں۔"

"جب میں اپنے سامعین سے باتیں کروں گی تو تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ سب لوگ تم کو جھوٹا نہیں سمجھیں گے۔"

"او کے میم۔"

"کیا تم بتانا پسند کرو گے کہ تم نے انکل کی بوتل کیوں توڑی تھی؟" زیزی نہایت احتیاط سے شو کو متوازی رکھتے ہوئے نہ صرف ناتھن کا نقطہ نظر سامنے لا رہی تھی بلکہ رائے عامہ کو بھی تبدیل کر رہی تھی۔

"وہ اور ان کے عجیب دوست شراب پی کر خراب حرکتیں کرتے تھے۔" ناتھن نے جواب دیا۔

"کیا تمہارے ساتھ کچھ خراب حرکت کرتے تھے؟" زیزی نے بمشکل محتاط الفاظ چنے۔ وہ بچے سے براہ راست اصل بات نہیں پوچھ سکتی تھی جبکہ بچہ جانتا تھا کہ لاکھوں لوگ سن رہے ہیں۔ اسے ناتھن کی ذہانت کا ادراک تھا۔ کچھ وقفے کے بعد ناتھن کی آواز آئی۔

"میم... میم... یہ گندی بات ہے۔ میں اس پر بات نہیں کروں گا۔" اس نے دردناک الفاظ میں کہا اور رونے لگا۔

زیزی سناٹے میں رہ گئی۔ اس کو اور سامعین کو جواب مل گیا تھا۔ چاہے اس کی اصل نوعیت کسی قسم کی بھی ہو۔

"دیکھو بیٹے! تم بہت پیارے بچے ہو۔ میں نے تمہارا فوٹو دیکھا ہے، تم سے باتیں کی ہیں۔ تم بہادر بھی ہو۔ بہادر بچے روتے نہیں ہیں۔ پلیز ایسا مت کرو... تم اتنا بتا دو کہ کیا تمہیں کار چوری کی وجہ سے JDC بھیجا گیا تھا؟"

"یس میم۔" وقفے کے بعد ناتھن کا مخصوص جواب آیا۔

"اب تم کیا کرو گے؟ کتنی مسافت طے کر کے بھاگ بھاگ کر؟"

"کیا میں غلط کر رہا ہوں؟"

"دیکھو تم پکڑے جاؤ گے۔"

"اگر میں خود کو پولیس کے حوالے کر دوں تو بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" ناتھن نے کہا۔

"تم کیوں سوچتے ہو ایسا؟"

"میں نے اٹارنی کو کہتے سنا تھا کہ وہ مجھے بڑا لڑکا سمجھتے ہیں اور سزائے موت دیں گے۔ وہ شخص اچھا نہیں ہے۔" ناتھن نے کہا۔ "پولیس اور لوگ بھی مجھے مارنا چاہتے ہیں۔ ان میں اور رکی ہیرس میں کوئی فرق نہیں۔" اس نے آخری فقرہ بلند آواز میں کہا۔

"ناتھن تم خوف زدہ ہو؟" زیزی نے کہا۔

"یس میم، اسی لیے مجھے بھاگتے رہنا ہے۔"

"کیا تم مجھ پر شک کرتے ہو؟"

"نو، یو آر گڈ میم۔"

"شکریہ، کیا تم میرا ایک کام کرو گے؟"

"یس میم۔"

"تم مجھ سے دوبارہ بات کرو گے؟" زیزی نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی ہے۔

"یس میم۔" ناتھن نے آہستہ سے کہا اور لائن ڈیڈ ہو گئی۔

زیزی نے زسودا کو دیکھا۔ وہ بھی اسے دیکھ رہا تھا۔ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ زیزی نے دل سے ناتھن کے لیے دعا کی۔

☆☆☆

پیٹرولی نے تیس منٹ کے وقفے سے دوسرے شو کے بعد پھر رانگیل سے رابطہ کیا۔ "لڑکا عوام کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے جھوٹ بول رہا ہے۔ اس نے اعتراف جرم کر لیا ہے۔ بس یہ کافی ہے۔" پیٹرولی بھڑکا ہوا تھا۔ زیزی کی ریٹنگ کے پروگرام نے اس کے عزائم میں روڑے

انکا نے سر دبا کر دیے تھے۔

مائیکل کچھ دیر تک محتاط انداز میں اس کے ساتھ بحث کرتا رہا پھر اکتا کر گفتگو کا سلسلہ ختم کر دیا۔

☆ ☆ ☆

مدھم سا آواز نے مائیکل کو خیالات کے بھنور سے نکال لیا۔ اس نے سر اٹھا کر ہیکٹر کو دیکھا جو مسکرا رہا تھا۔ ”اپنے دوست ہیروولی سے بات کر رہے تھے؟“

”ٹھیک سمجھے ڈیئر۔“ مائیکل نے کہا۔ ”ناتھن بیلی کے اچانک ریڈیو پر نمودار ہونے سے وہ بدحواسی میں مبتلا ہو گیا ہے۔“ پھر اس نے دفعتاً موضوع بدل دیا اور سوال کیا۔

”کام کا کیا ہوا؟ کوئی اچھی خبر؟“

”ابھی کچھ بار کہنا بہرحال دلچسپ خبر ہے۔“ ہیکٹر نے بتایا۔ ”اول یہ کہ بچے کے چچا سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ فون پر اور براہ راست بھی کوشش کی گئی۔ لگتا ہے وہ ملنا نہیں چاہتا۔“

”کیا وہ ناتھن کی روپوشی میں مدد کر رہا ہے؟“

”ممکن نہیں لگتا ہے۔ دونوں میں کوئی انسیت نہیں ہے۔“ ہیکٹر نے نوٹ بک نکالی۔ ”یہ مواد JDC کی فائلوں سے لیا ہے۔ وہ بری سیدھی اسٹوری تھی۔ ابتدائی دس سال ناتھن بیلی کی اس کے باپ نے پرورش کی۔ جب وہ نومولود تھا تو اس کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ باپ وکیل تھا اور خاصا خوش حال تھا۔ وہ دو سال قبل کار کے حادثے میں ہلاک ہو گیا۔ ناتھن کی زندگی کے وارثان انتہائی کم اس کا تعین کرنے کا باپ کو موقع ہی نہیں ملا۔ اس طرح بچہ مارک بیلی کی تحویل میں آ گیا۔ مارک کے ذہن میں ہو گا کہ وہ ٹرسٹ فنڈ کی مدد سے ناتھن کی ضرورت بات پوری کرے گا لیکن یہ اس کی خام خیالی تھی۔ ممکن ہے کہ خود اس کی نظر بھی ناتھن کے باپ کے کئی ملین ڈالرز پر ہو۔ تاہم سب رقم رئیل اسٹیٹ میں انویسٹ تھی۔ ناتھن کا باپ وکالت اور سرمایہ کاری دونوں میں اچھی ساکھ رکھتا تھا۔ خوش حال ہونے کے باوجود اور ضرورت کے برخلاف اس نے دوسری شادی نہیں کی۔ وہ ناتھن بیلی سے پیار تھا۔ جس کی پرورش اور تربیت خود اس نے کی۔ جائیداد میں جتنی رقم تھی کئی گنا بڑھ کر مناسب وقت پر ناتھن کو ہی ملنی تھی۔“ ہیکٹر نے بات جاری رکھی۔

”یہ کہنا بے معنی ہو گا کہ مارک بیلی اس صورت حال سے ناخوش تھا جبکہ اسے پیسے کی ضرورت بھی تھی۔ نتیجتاً اس نے ناتھن کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ مارک فرسٹریشن کا شکار تھا۔ مارک کے خلاف ناتھن کے دل میں نفرت بڑھنے لگی۔

ریڈیو پر اس نے جو کچھ کہا وہ سچ معلوم ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اس کی متعدد باتوں کی تصدیق بھی کی جا سکتی ہے۔ مثلاً پوسٹ مارٹم کے بعد رکی ہیرنا کے بارے میں یہ بات ثابت ہو جانے کی کہ اس نے شراب پی رکھی تھی۔۔۔

”سوشل سروس والے اس دوران چھ مرتبہ مارک کے گھر آئے تھے۔ بالآخر ایک برس قبل ناتھن نے کار چرائی، جس کے بارے میں اس نے ”مسٹنگ“ (بلی) کے کوڈ میں بتایا اور ہم اس کے الفاظ کی تصدیق کر لیں گے۔ وہ اپنے چچا کے چنگل سے نکلنا چاہتا تھا۔“

”کیسے کہتے ہو؟“ مائیکلا نے پہلی بار مداخلت کی۔

”JDC فائل میں ناتھن کی نوٹ بک میں کہیں کہیں اس بات کے اشارے ہیں جن کو ریڈیو پروگرام سے بھی تقویت ملتی ہے۔ کار چوری کے بعد مارک نے کورٹ میں ناتھن پر مخالف الزام لگائے۔ تاہم کار چوری کے علاوہ کچھ بھی ثابت نہ ہو سکا۔ یہ ایک اچھی پیش رفت ہے۔“

”وہ کیا؟“ مائیکلا تصور میں اصل کہانی کی کڑیاں جوڑ رہا تھا۔

”ہمیں وڈیو ٹیپ مل گئی ہے۔“ ہیکٹر نے انکشاف کیا۔ ”میں سمجھا تھا کہ کیمرا ٹوٹ گیا ہے یا توڑا گیا ہے۔ مگر کچھ بھی حقیقت ہے ہم مکمل نہیں تو کچھ نہ کچھ ٹیپ پر دیکھ سکتے ہیں۔“

مائیکل سنبھل گیا۔ ”بہت اچھا کام کیا ہے تم نے مختصر وقت میں۔“ اس نے ہیکٹر کی کاوش کو سراہا۔ ”چلو دیکھتے ہیں۔“ وہ دونوں کانفرنس روم میں آ گئے۔ یہ کانفرنس روم مائیکلا کے آفس سے ملحق تھا۔

”وہاں متعدد کیمرے ہیں۔“ ہیکٹر نے کہا۔ ”یہ کیمرہ ”گرانسٹن ہوٹ“ کے باہر تھا۔ تاہم کار کی ریکارڈنگ اچھی نہیں آ سکی۔“

مائیکلا نے اسکرین کے بالائی دائیں کونے سے ایک ہیولا نکلتے دیکھا۔ جو ننگے پاؤں تھا۔ ٹیپ بلیک اینڈ وائٹ تھی۔ ہیرولی رقبے میں روشنی کا معقول انتظام نہیں تھا۔ قد، حلیہ اور پیروں سے مائیکل نے بآسانی ناتھن کو پہچان لیا۔ ہیولے کی حرکات سے خوف عیاں تھا۔ وہ عجلت اور گھبراہٹ کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس کا لباس ڈھیلا ڈھالا تھا جس پر دھبے بلیک اینڈ وائٹ فلم کی وجہ سے روشنائی کے نشانات معلوم ہو رہے تھے۔ تاہم دونوں دوست جانتے تھے کہ یہ ہرکی کے خون کے نشانات ہیں۔

”یہاں رک جاؤ۔“ مائیکل نے ہیکٹر سے کہا۔ ”بیلی

۔ قور یڈیو پر کہا تھا کہ اس کے جوتے موزے اتروائے گئے تھے، کیا یہ معمول کی کارروائی تھی؟"

ہیکٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ "کہا نہیں جا سکتا، ممکن ہے ماں کی بہری خراب ہو رہے کا مظاہرہ کر رہا ہو یا اسے مزید خوف زدہ کر رہا ہو۔"

"ٹھیک ہے، آگے چلو۔"

ماتھن ہر قدم پر اطراف میں دیکھ رہا تھا۔ کیمرے پر نظر پڑنے پر وہ ہراساں نظر آیا اور پوری طرح گھوم گیا کہ کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا... پھر اس نے کیمرے کو دیکھا اور مائیکل کا دل بری طرح دھڑکا۔ ماتھن کی آنکھوں کے تاثرات واضح تھے۔ یہ تاثر مائیکل نے پہلے بھی دیکھے تھے... کہاں... کس کی آنکھوں میں؟

"اشلی۔" وہ بلند آواز میں بولا... اور ماتھن کا چہرہ اسکرین پر جم گیا۔ ہیکٹر، مائیکل کے قریب ہو گیا۔

"کیا تم ٹھیک ہو؟" اس نے مائیکل کو دیکھا۔

"اس کے چہرے کو دیکھو، ہیکٹر دیکھو، اس کی آنکھیں برائن کی جیسی ہیں۔ بالکل برائن جیسی۔"

ہیکٹر نے بھی دیکھ لیا۔ "میں معذرت خواہ ہوں دوست۔ میں اسے آف کر دیتا ہوں۔" ہیکٹر نے کہا۔

"نہیں، ایسا نہ کرو۔" مائیکل نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "میں سمجھا تھا کہ میں نے ماضی کو بھلا دیا ہے۔ چلنے دو، باقی ٹیپ بھی دیکھ لیتے ہیں۔"

ہیکٹر نے بغور مائیکل کو دیکھا اور ٹیپ دوبارہ چلا دی۔ کیمرے سے نظر ہٹا کر ماتھن نے دوڑنا شروع کر دیا تھا۔ وہ سبائی دروازوں کو کھولتا ہوا وہ بیرونی دروازے تک پہنچا... اسے بھی کھول کر تاریکی میں گم ہو گیا۔ ہیکٹر نے ویڈیو ٹیپ بند کر دی۔

"کیا خیال ہے، باس؟"

مائیکل نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "کاش میں یہ سب نہ دیکھتا۔ میرا کام اب پہلے سے مشکل تر ہو گیا ہے۔ کیا یہ ٹیپ پولیس کے پاس بھی ہے؟"

"دوست، بیجروئی کے دستے پہلے ہی اس ٹیپ پر ٹوٹ پڑے تھے اور اسے ایک بھیانک مرد ومسودی کی شکل میں نیوز اسٹیشنز پر چلوانے کی تیاری کر رہے تھے۔"

"مجھے نہیں پتا، ہیکٹر تم کیا سوچ رہے ہو؟ لیکن میں نے جو کچھ دیکھا اس میں مجھے قاتل کہیں نظر نہیں آیا۔ سوائے ایک ہراساں، دہشت زدہ ہرن کے بچے کے۔" مائیکل افسردہ تھا۔ اسے اس معصوم کو پکڑنا تھا جس نے بیجروئی جیسے مفاد پرست کے لیے نکلوا دیے تھے۔ وہ اپنے فرض سے روگردانی نہیں کر سکتا تھا۔ "ہیکٹر! نیلی فون ریکارڈ چیک کرو... کتنی بار 800 پر کال آئی، کہاں سے آئی۔ کہیں نہ کہیں کمپیوٹر نے کال پکڑی ہو گی، ریکارڈ ملنا چاہیے۔ تمام گفتگو کمپیوٹر سے ٹیپ کر لو۔" مائیکل نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔

ہیکٹر کراہا۔ "ہمیں کورٹ آرڈر کی ضرورت پڑے گی۔ کورٹ آرڈر کے بغیر ہم ایک ریڈیو اسٹیشن کی مرضی کے خلاف نہیں جا سکتے۔"

"جانتا ہوں۔" مائیکل نے کہا۔ "ایسا کرو پہلے ریڈیو والوں کو رضاکارانہ طور پر راضی کرو، کوئی معقول حوالہ دو۔ جیسے ان کا یہ تعاون کمپنی کے لیے ایک بیش بہا خدمت ہو گی۔ وغیرہ وغیرہ۔"

"اوکے، باس۔"

"اور ہاں ایک آخری بات۔ مارک بیلی کے اپنے مالی معاملات کیسے ہیں؟"

"وارنش۔" ہیکٹر نے ایک لفظ میں جواب دیا۔

مائیکل کو اسی جواب کی امید تھی۔ اس کی پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئیں۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

☆☆☆

پانچ سال قبل ڈیزنی نے سیکڑوں پروگرام کیے۔ سیکڑوں معروف اور غیر معروف لوگوں کے انٹرویو کیے۔ لیکن ماتھن کے ساتھ جو پروگرام ہوا، وہ اپنی نوعیت کا واحد پروگرام تھا۔ شیشے کی دوسری جانب ڈسوزا کی کھوپڑی بھی گھومی ہوئی تھی۔ چند کالز مزید موصول ہوئی تھیں۔ کال لگنے پر پہلے ڈسوزا کو سننا پڑتا تھا۔ وہ نام، نمبر وغیرہ کے بارے میں معلوم کر کے پوچھتا کہ کال کرنے والا کیا چاہتا ہے۔ نام وغیرہ کے ساتھ مقصد کا مختصر خلاصہ وہ کمپیوٹر چینل کے ذریعے ڈیزنی تک پہنچاتا تھا۔ وہ تمام نام وغیرہ اسکرین پر دیکھ کر خود فیصلہ کرتی کہ پہلے کس سے بات کرنی ہے۔

ڈسوزا کے شانے پر اچانک کسی نے ہاتھ رکھا، وہ چونک کر مڑا۔ ایک افسر جو نمبر اس کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں نیلی فون کے پیغام کی گلابی پرچی تھی۔ اس مداخلت نے ڈسوزا کو برہم کر دیا۔ اس نے ایک کان کا ایئرپیس نکالا۔ "یہ کیا ہے؟ نظر نہیں آ رہا کہ ہم شو کے درمیان ہیں۔"

"پ... پولیس سر۔" نوجوان ہڑبڑا گیا۔ "وہ ہاٹ لائن پر بات کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بہت اہم ہے۔"

"ان سے کہو کہ میں پروگرام ختم کر کے بات کرتا ہوں۔"

"میں نے کوشش کی تھی سر! ان کا کہنا ہے کہ انصاف کے معاملے میں رکاوٹ مت بنو۔"

"واٹ۔" زموراکے جبڑے بھنچ گئے۔ "میں دیکھتا ہوں۔" اس نے سرخ رنگ کا فون ہک پر سے اتارا۔

"ابن رک زمورا اِن ہیئر، کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

☆☆☆

بریڈک کاؤنٹی پولیس ڈپارٹمنٹ کا پیٹرول مین بیرالڈ تھامس جو ابھی تک اپنا نام نمایاں کرنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ شفٹ روٹین، ٹریفک ڈیوٹیز اور متفرق کام... وہ کوئی خاص پولیس والا کارنامہ سرانجام دینا چاہتا تھا۔ وہ کسی بڑے کیس میں نام روشن کرنے کا خواہش مند تھا۔

جب ہیگر اس کے پاس ماتھن ہیلی کو ٹریک کرنے کا ہدف لے کر آیا تو اس نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ یہ اس کے لیے ایک بہترین موقع ہے۔ اگرچہ فون ریکارڈز کے ذریعے ماتھن تک پہنچنا ایک محنت طلب کام تھا۔ تاہم یہ ایک ہائی پروفائل کیس تھا۔ اس موقع کو کھونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے فوراً حامی بھر لی۔

تاہم اس نے غلطی کر دی اور زمورا سے بول بیٹھا کہ اگر اس نے مرڈر کیس میں تعاون نہیں کیا تو اسے جیل بھی ہو سکتی ہے۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اس کے پاس ایسا کوئی اختیار نہیں ہے۔ یہ بھی جانتا تھا کہ امریکی عوام حیرت انگیز طور پر اپنے جینٹرز حقوق سے نابلد ہیں۔ تاہم اس کا یہ کارڈ پٹ گیا۔ زمورا ریڈیو اسٹیشن کا پروڈیوسر تھا اور مذکورہ شو کا تعلق بھی زیزی جیسی آفت کی پرکالہ سے تھا۔

☆☆☆

شیشے کی دوسری جانب زیزی ڈائٹ کوک کی چسکیاں لے رہی تھی۔ کمرشل چلانے کے لیے اس کے ہیڈ فون میں زمورا کی آواز آئی۔ اس کو زمورا کے تاثرات عجیب لگے۔ کمرشل اسٹارٹ کر کے اس نے پھر زمورا کو دیکھا اور ایک فون اٹھایا۔ "کیا بات ہے؟" وہ کچھ سنتی رہی پھر بولی۔ "شو کے دوران میں" ہاٹ لائن " نہیں لینی چاہیے۔"

"کوئی پولیس والا ہے اور ہمارے فون ریکارڈز کے ذریعے ماتھن تک پہنچنا چاہتا ہے۔" زمورا نے فوراً جواب دیا۔

زیزی نے اتنے عرصے میں جو ذاتی ذرائع قائم کیے تھے' سب معطل ہو جانے، یہ ممکن نہیں تھا۔

"اس سے کہو کہ ہمارے ریکارڈز تک رسائی ممکن نہیں ہے اور غیر قانونی بھی ہے۔" وہ رسائی دینا بھی چاہتی تو ماتھن کی وجہ سے نہ دیتی۔ لہٰذا اس نے دوٹوک فیصلہ سنا دیا۔

"وہ کہتا ہے کہ جرم کی اعانت کے الزام میں تمہیں قانون کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

زیزی کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ "اوہ، رئیلی؟ ہم اسے بھی آن ائر جانے دیتے ہیں لگ پتا جائے گا۔ ویسے نام کیا ہے اس کا؟"

"آفیسر تھامس۔"

پندرہ سیکنڈ کا اشتہار ختم ہو گیا تھا۔ زیزی نے اپنا مائیکروفون آن کیا۔

"ویلکم بیک، امریکا... آپ کا پسندیدہ پروگرام۔ یہ ایک غیر معمولی شو بنتا جا رہا ہے۔ آپ لوگوں نے ماتھن ہیلی کے ساتھ میری جو گفتگو سنی' ایسا لگا جیسے بھونچال آ گیا ہے۔ سامعین کی تعداد اور کالز بڑھتی ہی جا رہی ہیں۔ لائن پر اس وقت ہمارے ساتھ بریڈک کاؤنٹی کا پولیس آفیسر موجود ہے جو مجھے اور میرے اسٹاف کو جیل کی سیر کرانے کا ارادہ ظاہر کر رہا ہے کیوں؟ ماتھن کے معاملے میں... آفیسر سے بات کرتے ہیں کہ اس کے ذہن میں کیا ہے؟" اس نے ایک جلتے بجھتے بٹن کو دبا دیا۔ "آفیسر تھامس! تم اس وقت آن ائر ہو؟"

معقول وقفے تک کوئی آواز نہیں آئی۔ غالباً تھامس کو توقع نہیں تھی کہ تیز طرار زیزی اسے شو میں گھسیٹ لے گی اور بات چیت آن ائر سنی جائے گی۔ بالآخر ایک آواز سنائی دی۔

"ہیلو۔"

"آفیسر تھامس! میں سمجھ رہی ہوں کہ تم مجھے جیل میں دیکھنا چاہتے ہو' کس لیے؟ ارے مجھے یہاں ریڈیو اسٹیشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔ کیا خیال ہے؟" زیزی نے جارحانہ آغاز کیا۔

دوسرے جانب سے ایک مائل بہ شکستہ آواز آئی۔

"میں... میں، کیا میں ریڈیو پر ہوں؟"

"تم نے ایک ریڈیو اسٹیشن کال کی ہے آفیسر... تو ظاہر ہے اب تم کو ریڈیو پر سنا جا رہا ہے۔" زیزی ہولے سے مسکرائی۔ اس نے بہ آسانی محسوس کر لیا کہ آفیسر پچھلے قدم پر چلا گیا ہے۔

"میں معذرت خواہ ہوں۔ میرا خیال تھا کہ ہم

پرائیویٹ گفتگو کر لیتے۔"

جواباً زیزی کی آواز میں مخصوص کھلنڈرا پن شامل ہو گیا۔ "میرے پروڈیوسر نے مجھے بتایا تھا کہ تم اس پروگرام کے ٹیلی فون ریکارڈز میں دلچسپی رکھتے ہو تا کہ ناگن بیلی تک رسائی حاصل کر سکو۔ ٹھیک کہہ رہی ہوں؟"

"ہاں، آں... ایسا ہی خیال تھا میرا۔" تھامس کی آواز میں ٹالنے کا تاثر تھا۔ کم از کم زیزی خوب لطف اندوز ہوئی۔

"کیا یہ ٹھیک ہے کہ تم نے پروڈیوسر کو انکار کی صورت میں فردِ جرم عائد کرنے کی دھمکی دی تھی؟" زیزی کی بے باک چھیڑ خانی جاری تھی۔

"میں سمجھتا ہوں کہ میرا مطلب کچھ اور..." تھامس کا لہجہ واضح طور پر ٹوٹتا ہوا لگ رہا تھا۔

زیزی نے اس کی بات کاٹی۔ "میں سمجھ رہی ہوں... کیا تم یہ بتانا پسند کرو گے کہ آئین اور قانون ہمیں جو تحفظ اس معاشرے میں دیتا ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟" زیزی ذرا بھی دبنے پر آمادہ نہیں تھی۔ دوسری جانب خاموشی تھی۔

"آفیسر تھامس، میں سیدھی صاف بات پسند کرتی ہوں کہ تم نے مجھے جو دھمکی دی ہے وہ تمہارے لیے مسئلہ بن سکتی ہے یا تم بلف کھیل رہے ہو؟ ہمیں بتاؤ، ڈر رہے ہو؟"

عوام میں وہ ایسے ہی "جنگلی بلی" کی شہرت نہیں رکھتی تھی۔ تھامس کو شدت سے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ "بلی" نے نہ صرف اس کو بلکہ پورے ڈپارٹمنٹ کی ساکھ کو [illegible] خطرے میں ڈال دیا تھا۔ وہ بھی لاکھوں افراد کے سامنے، چند منٹ قبل وہ پُراعتماد تھا اور سہانے خواب دیکھ رہا تھا اور اب اسے اپنا کیریئر ڈوبتا ہوا دکھائی دے رہا تھا... اس نے فون پٹخ دیا۔

زیزی نے کلک کی آواز سنی اور زمورا کی جانب فاتحانہ انداز میں دیکھ کر مسکرائی۔ پھر مائیک کے قریب منہ کر کے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "رابطہ منقطع کرنا کوئی جواب نہیں ہے، کیا خیال ہے سامعین کا؟... ہمیں ایک اشارہ مل گیا ہے آپ اسے پیغام بھی کہہ سکتے ہیں۔"

☆☆☆

"لائل پوائنٹر" کی شہرت "ہٹ مین" کی تھی۔ اسے یہ پسند بھی تھا۔ اس کا قد پانچ فٹ گیارہ انچ تھا۔ خاصا بھاری بھرکم بھی تھا... وہ کسی فلمی ولن کی طرح خوفناک نہیں تھا لیکن جیسا بھی تھا اس کی شخصیت میں کوئی وحشت ناک بات تھی۔ باوجود اس کے کہ وہ ایک بظاہر اسمارٹ اور حسِ مزاح رکھنے والا شخص تھا۔ اس کے کاروبار میں کم از کم حسِ مزاح کی خوبی تو مفقود ہی تھی۔ اس نے ایک جدوجہد کے بعد اپنی ساکھ بنائی تھی جس میں حیوانی درندگی کا عنصر شامل تھا اور اس کے جاننے والے بلکہ اجنبی بھی اس کی اسمارٹ شخصیت کے باوجود اس سے ڈر کر بات کرتے تھے۔

پوائنٹر مسٹر سلیٹر کے لیے کام کرتا تھا۔ سلیٹر کے لیے پوائنٹر سے بڑھ کر کوئی وفادار نہیں تھا۔ سلیٹر کے احکامات پر جس خوبی اور صفائی سے پوائنٹر عمل کرتا تھا، اس جیسا کوئی دوسرا نہیں تھا۔ سلیٹر کا ہر حکم ایک نسبت کی طرح تھا جس میں غلطی کی گنجائش نہیں تھی۔

پوائنٹر اپنے باس سے اکثر سنتا تھا کہ "ہر آدمی کو دوسرا موقع ملنا چاہیے، لیکن نمبر انہیں۔"

آج پہلی بار پوائنٹر دوسرا موقع حاصل کرنے جا رہا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ پوائنٹر کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو سلیٹر خود ہی اپنے "دوسرے چانس" کے قول کو غلط ثابت کر دیتا۔

تین گھنٹے قبل پوائنٹر نے سلیٹر کو بھرپور عالمِ طیش میں دیکھا تھا۔ پوائنٹر کو دوسرا موقع اس کی وفاداری (جو کسی پالتو کتے کی طرح تھی) اور برسوں کی بے داغ کارکردگی کی وجہ سے مل گیا تھا۔

سلیٹر سے ملاقات کے بعد پوائنٹر عجلت میں وہاں سے رخصت ہوا۔ اس کے اندر غصہ پل رہا تھا۔ اس نے ماضی میں بڑے مشکل ہدف صفائی سے اڑائے تھے اور اب ایک بچے نے اسے سلیٹر کے سامنے ذلیل کر دیا تھا بلکہ پوائنٹر کی زندگی کو بھی خطرے میں ڈال دیا تھا۔

مارک بیلی اور اس کے بھتیجے کا معاملہ قابو سے باہر ہو گیا تھا اور پوائنٹر کے سر پر خون سوار تھا۔ اس نے مارک کے منصوبے کو زیادہ غور سے نہیں سنا تھا۔ نہ اس کی ضرورت تھی کیونکہ تمام عناصر اپنی جگہ فٹ تھے۔ اندرونِ خانہ ایک گارڈ، ایک بچہ اور چھوٹا سا کرائم آخر یہ سب کیونکر ہو گیا؟

پندرہ منٹ میں اسے سب معلوم ہو جاتا تھا۔

☆☆☆

تیس منٹ قبل مارک بیلی نے اپنی کھٹارا گاڑی "مل بیلا نیورن" میں فاصلے پر پارک کی، پارکنگ ایریا تقریباً سنسان ہی تھا۔ وہ انتظار کرتا رہا اور احتیاط سے اطراف کا جائزہ لیتا رہا۔

"پُرسکون رہو، مارک۔" اس نے خود سے کہا۔ "وہ تم کو قتل نہیں کر سکتے۔ کم از کم اس وقت نہیں... تمہارے بغیر ان کے ہاتھ کچھ نہیں آ سکتا۔"

جب صبح پوانٹر کی کال آئی تھی۔ جب سے وہ درجنوں بار خود کو اس بات کا یقین دلا چکا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اتنا معمولی اور سیدھا سادہ منصوبہ ایسا بدنما موڑ کاٹے گا۔ اسے کئی بار خیال آیا کہ وہ رجینا سے نکل جائے بلکہ ملک سے نکل جائے۔ تاہم وہ جانتا تھا کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ حل ایک ہی تھا کہ رقم سلیٹر کو مل جائے اور یہ ڈیل ختم ہو جائے۔

بل بجلی تیورن ایک ایسا علاقہ تھا جو رجینا کے نواح میں واقع تھا۔ جہاں خفیہ منصوبے اور سازشیں تراشی جاتی تھیں۔

ناسا انتظار کر کے مارک گاڑی سے اُترا اور بار کی طرف چل پڑا۔ وہ بار کے دروازے پر رک گیا۔ اب بھی دیر نہیں ہوئی ہے۔ بھاگ چلو لیکن یہ اس کی خام خیالی تھی۔ ایک جھوٹ تھا۔ وہ یہ تو اسی رات ہو گئی تھی جب اس نے پہلی بار پوانٹر سے رابطہ کیا تھا۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور بار میں داخل ہو گیا۔ بغیر کھڑکی کے اندرونی ماحول نے وقتی طور پر اسے اندھا کر دیا۔ مارک کچھ دیر تک دروازے میں کھڑا رہا۔

”کون ہو تم؟“ ایک آواز آئی۔

”مارک بیلی! مجھے پوانٹر سے ملنا ہے۔“

آگے کوئی سوال جواب نہیں ہوا۔ مارک نے کونے کی ایک میز سنبھال لی اور بیئر کا آرڈر دے دیا۔

تیورن میں سگریٹ، پسینے اور مختلف شرابوں کی ملی جلی بو موجود تھی۔ مارک کی آنکھیں کافی حد تک ماحول کی عادی ہو گئیں تو اس نے بار کو کھنگالا۔ اس کو اور بارٹینڈر کو ملا کر تین آدمی اور تھے۔

مارک کو کچھ انتظار کرنا تھا۔ وہ اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا تھا۔ جانے نہیں چلا پوانٹر کب اور کہاں سے آ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ کوئی تمہید باندھے بغیر اس نے کہا۔

”تم نے میرے ساتھ وعدہ خلافی کی۔“ اس کی آواز میں غصے کی آمیزش بھی تھی۔ ”تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم سنبھال لو گے لیکن معاملہ بگاڑ کر رکھ دیا۔“

مارک کی پیشانی پر آبلہ سا ابھر آئے۔ وہ پہلی تیاری سے آیا تھا۔ رضا حسین اور وجوہات، یکدم وہ سب بھول گیا۔

”مارک! میری طرف دیکھو۔“ پوانٹر نے نرمی سے کہا۔ ”صبح میری سلیٹر سے بات ہوئی تھی۔ وہ شدید برافروختہ ہے اور تم جانتے ہو کہ جب وہ کسی سے ناراض ہوتا ہے تو کیا ہوتا ہے؟“

مارک لرز اٹھا۔ ”نہیں، نہیں... میں نہیں جانتا... مم... مم... میرا خیال ہے...“

پوانٹر آگے کی جانب جھکا۔ اس کے منہ میں چیونگم تھی۔ ”مارک! وہ تم سے نہیں مجھ سے ناراض ہے۔ سخت غصے میں ہے کہ میں اتنا احمق تھا کہ تمہارے ”فول پروف“ منصوبے پر یقین کر لیا کہ ایک چھوٹے سے کمرے میں لڑکا گارڈز کے ہاتھوں بہ آسانی مارا جائے گا۔“

”دیکھو پوانٹر، مجھے وضاحت کرنے دو۔“

پوانٹر نے اسے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔ ”اس نالائق گارڈز کی ناکامی کے بعد تم نے خود کو شراب میں ڈبو دیا؟“

مارک نے سر ہلایا اور گہری سانس لی۔ ”تم سمجھتے ہو کہ تم نے کوئی غلطی نہیں کی؟“

”نہیں۔“ مارک نے کہا۔ وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا تاہم لاحاصل تھا۔ وہ اب تک زندہ تھا تو اس کی واحد وجہ پھنسے ہوئے لاکھوں ڈالر تھے۔

”دیکھو مارک! اگرچہ مجھے یہ اچھا نہیں لگے گا لیکن ہم دونوں جانتے ہیں کہ اگر میں مسٹر سلیٹر کو بتاتا ہوں کہ ہماری رقم حاصل کیے بغیر مارک کو مارنے کا کیا فائدہ؟ ہمیں اسے ایک موقع اور دینا چاہیے تو پتا ہے کیا جواب ملے گا؟“

پوانٹر نے مارک کی گردن پکڑ لی اور اس کا چہرہ اپنے قریب کر لیا۔ دونوں کے چہروں میں چند انچ کا فاصلہ تھا۔ ”سلیٹر... جواب... دے گا۔“ پوانٹر نے الفاظ چبائے۔ ”میری عزت اور ساکھ پیسے سے زیادہ اہم ہے۔ وہ مجھے تمہارے قتل کے احکامات جاری کر دے گا۔“ پوانٹر کی قاتل آنکھیں مارک کی آنکھوں کو چھید رہی تھیں۔ وہ مارک کی گردن چھوڑ کر کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔ ”لیکن میں اسے قائل کر دوں گا کہ اگر تمہارا بھتیجا ہلاک ہو جاتا ہے اور رقم ہمیں مل جاتی ہے تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے بصورت دیگر تم خود کو مردہ خیال کرو۔“

مارک کو امید کی کمزور سی کرن نظر آئی۔ ”مجھے ایک موقع درکار ہے۔“

درمیان میں سکوت کا وقفہ آیا اور مارک کو گھبراہٹ ہونے لگی۔

”ایک اور بات۔“ پوانٹر دوبارہ گویا ہوا۔ ”بلکہ دو باتیں... پہلی بات تمہارا حصہ بہت کم رہ جاتا ہے۔ وہ تین مسٹر سلیٹر کے ہیں۔ 2 ملین اور شامل کر لو جو میرے تمہارے اوپر واجب الادا ہیں... پھر تمہارے لیے کیا بچے گا؟“ وہ

بولا۔ "کل 4.5 ملین بنتے ہیں۔"

مارک نے اعتراض کرنا چاہا تاہم اس کا حلق خشک ہو گیا۔ "میں 1/2 ملین سے کام چلا لوں گا۔"

پوائنٹر ہنس پڑا۔ "اب دوسری بات کی طرف آتے ہیں۔ اس نے پھرتی سے ہولسٹر سے پسٹل برآمد کیا۔ پسٹل کی نال مارک کی دائیں آنکھ سے ایک انچ نیچے تک تھی۔ پوائنٹر کرسی کھسکا کر کھڑا ہو گیا۔

"دایاں ہاتھ استعمال کرتے ہو؟ یا کھبے ہو؟"

"بایاں ہاتھ۔" مارک نے لرزتے ہوئے جواب دیا۔ پوائنٹر نے قلم اور ایک کاغذ کا ٹکڑا اس کے حوالے کیا۔

"اپنے دستخط دکھاؤ ذرا۔"

"میں معذرت خواہ ہوں، پوائنٹر۔" مارک نے التجا کی۔ "میری غلطی ہے۔ مم... م... میں دایاں ہاتھ استعمال کرتا ہوں۔"

"دایاں ہاتھ میز پر رکھ دو۔" پوائنٹر نے حکم دیا۔ اس کی آنکھوں کا رنگ بدل گیا۔ نیم تاریکی میں مارک نے قاتل آنکھوں کی شیطانی چمک دیکھ لی تھی۔

تاہم اس کے پاس حکم کی تعمیل کے سوا کوئی دوسرا چارۂ کار نہیں تھا۔ میز پر رکھا اس کا دایاں ہاتھ بری طرح لرز رہا تھا۔ اس کے اعصاب ٹوٹ گئے۔ وہ باقاعدہ سسک رہا تھا اور آنسو رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

پوائنٹر نے اس کی پہلی انگلی مٹھی میں جکڑ لی۔ دائیں ہاتھ کی انگلی توڑنے میں پوائنٹر نے پانچ سیکنڈ لیے۔

مارک کا پورا جسم بل کھا رہا تھا۔ اذیت کی لہر دوڑتی ہوئی شانے تک گئی۔ پوائنٹر نے مخصوص تکنیک کے ذریعے دوسری انگلی بھی توڑ دی۔

اصولاً پوائنٹر نے مارک کو ختم کرنا تھا لیکن اس نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ جب اس نے ٹوٹی ہوئی انگلیوں کو جھنجھوڑا تو مارک کی چیخیں نکل گئیں اور وہ کرسی سے پھسل کر گندے فرش پر جا پڑا۔ اس کے ہاتھ پر ورم چڑھنے لگا تھا۔ پوائنٹر نے میگنم واپس جیکٹ کے نیچے ہولسٹر میں رکھ لیا۔

"مسٹر مارک بیلی! تمہارے ساتھ کاروبار میں مزہ آیا۔ ضرورت پڑنے پر ہی تمہیں کال کریں گے۔" وہ جیسے آیا تھا ویسے ہی ہوا ہو گیا۔

☆☆☆

ناتھن بیلی، اجنبی مکان میں مزے کر رہا تھا۔ اس وقت وہ اسنارٹر بیگ کو دوبارہ چلا کر دیکھ رہا تھا۔ ہر بیگ میں اسے اپنا چہرہ پھر نظر آیا۔ ناتھن کو لگا کہ وہ شہرت کے ساتھ ساتھ کسی ایڈونچر سے گزر رہا ہے۔

اس نے ٹی وی بند کر دیا۔ وہ غیر معینہ مدت تک یہاں نہیں رک سکتا تھا۔ اسے کیا کرنا چاہیے؟ وہ اتنا جانتا تھا کہ اس کی پہلی ترجیح JDC سے زیادہ سے زیادہ دور چلے جانا ہے۔

اس کا اگلا قدم کیا ہونا چاہیے؟ وہ سوچ رہا تھا کہ بگی پکی ڈرائیو تک تو وہ کر سکتا ہے۔ یہ بھی اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے ایک بہتر پناہ گاہ بغیر کسی تگ و دو کے مل گئی تھی۔ حتیٰ کہ گیراج میں ایک سرخ رنگ کی بی ایم ڈبلیو کنورٹیبل بھی موجود تھی۔

اس نے گیراج میں پہنچ کر کار کا جائزہ لیا۔ اس کے پیر بمشکل پیڈل تک پہنچ رہے تھے۔ تاہم کھینچ کھانچ کر کام چل سکتا تھا۔

☆☆☆

اس روز کے شو پر ڈیزی کارپینٹر کو ان گنت فون کالز اور ٹیکسٹ مل رہے تھے۔ لوگ بے قرار تھے، مزید کچھ جاننے کے لیے۔ مارننگ ٹاک شوز کے تین نیٹ ورکس ڈیزی کے انٹرویو کے خواہش مند تھے۔ تاہم صرف "گڈ مارننگ امریکا" سے دعوت لیموزین کے ہمراہ آئی تھی۔ یہ دعوت واشنگٹن کے اسٹوڈیو کی تھی۔ ڈیزی کو وہاں جانا تھا۔

زسورا ابھی خوابوں کی دنیا میں پہنچا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی نے اسے ہڑبڑا دیا۔ دوسری گھنٹی پر اسے احساس ہوا کہ یہ ڈیزی کی لائن تھی اور لگ رہا تھا کہ وہ وصول نہیں کرے گی۔ چنانچہ تیسری گھنٹی پر اس نے ریسیور کان سے لگا لیا۔ اور دوسری جانب آواز سنتے ہی پوری طرح بیدار ہو گیا۔ وہ آواز زارف مین کی سیکریٹری کی تھی۔

"مسٹر زارف، ڈیزی کارپینٹر سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"ایک منٹ، پلیز۔" زسورا نے جواب دیا۔ رونالڈ زارف مین، اومیگا براڈکاسٹنگ کا پریذیڈنٹ تھا۔ اومیگا کا صدر دفتر نیویارک میں تھا۔

تین منٹ بعد ڈیزی زارف کی سیکریٹری سے ہمکلام تھی۔

"برائے مہربانی، مسٹر زارف کا انتظار کیجیے۔" سیکریٹری نے کہا۔

زسورا ابھی چھوٹے سے آفس میں موجود تھا۔ بے قرار اور بے چین۔

”ہیلو ویزی! دس از دان ڈارف مین۔“ اس کی آواز دوستانہ تھی۔ ”کیسی ہو؟“

”ٹھیک ٹھاک، استفسار کا شکریہ۔“ اس نے جواب دیا۔ ”شو بہت اچھا جا رہا ہے۔“

”میں اتفاق کرتا ہوں۔“ ڈارف مین نے کہا۔ ”درحقیقت مجھے آج سننے کا موقع ملا۔ میری مصروفیات حارج ہوتی ہیں ورنہ میں تمہارا شو مس نہ کرتا۔“

”ہاں، میں سمجھ سکتی ہوں۔“ ویزی نے ہلکا سا تناؤ محسوس کیا۔

”اس لڑکے ہاتھن کے بارے میں، میں تمہاری رائے جاننا چاہتا ہوں۔“

”اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میں لڑکے کی بات پر یقین رکھتی ہوں تو مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ واقعی بات ایسے ہی ہے۔“

”یعنی تم اس کی باتوں کو سچ تسلیم کرتی ہو؟“

”یقیناً۔“

”کوئی خاص وجہ، جبکہ عام لوگوں کی رائے مختلف ہے۔“

”جناب! ادب سے کہوں گی کہ ایسی رائے رکھنے والوں نے ہم کو فون نہیں کیا۔“

”مجھ پر بھروسا رکھو۔ ایسے لوگ ہیں اور ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جن کی وردیوں پر بیج لگے ہیں۔ میں امید رکھتا ہوں کہ تم وہ وجہ بتاؤ گی کہ جو تمہیں لڑکے کے بیانات کو سچ تسلیم کرنے پر مجبور کر رہی ہے؟“

ایک ایسے شخص کے سامنے جو 700 ملین ڈالر کی کارپوریشن کا مالک ہے، وہ ... ”چھٹی حس“ یا ”ذاتی احساسات“ کا حوالہ دے سکتی ہے۔ مناسب الفاظ کی تلاش میں ویزی نے وقفہ لیا۔

”ٹیک یور ٹائم۔“ روڈلف ڈارف مین نے کہا۔ یعنی وہ گفتگو جاری رکھنا چاہتا تھا۔

بہرحال کسی نہ کسی طرح ویزی نے اسے کسی حد تک مطمئن کر دیا۔ اس نے دو باتوں پر زور رکھا۔ اول اپنا تجربہ۔ (واکس ریڈنگ)، دوم تجربے کے حق میں ماضی کی چند تسلیم شدہ مثالیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر نیڈ بیکر نے اپنے نئے مریض کے ایکسرے کلپ میں لگائے۔ اس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ اس نے نرس کو کہا یہ کیس سب سے آخر میں لگا دو۔

عام طور پر ایمرجنسی روم میں ٹوٹی ہوئی انگلیوں کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی لیکن اس مریض کا معاملہ بالکل علیحدہ نوعیت کا تھا۔ ڈاکٹر نے اسکرین پر ایکسرے شیٹ کے مطالعے سے جو نتیجہ اخذ کیا، وہ عام حادثات سے مختلف تھا۔ انگلی عام انداز میں نہیں ٹوٹی تھی۔ ڈاکٹر کو یقین تھا کہ مریض شدید اذیت کا شکار ہوا ہے۔ شاید اس کا کسی سے جھگڑا ہوا تھا۔

ڈاکٹر نیڈ نے اپنے چہرے کے تاثرات کو نارمل اور نرم رکھا جب وہ پہلی بار بیڈ نمبر 4 پر پہنچا۔

”کیا حال ہیں مسٹر بیلی؟ میں ڈاکٹر بیکر ہوں، میں نے تمہارا چارٹ دیکھا ہے۔ تمہارے ساتھ حادثہ پیش آیا ہے اور ہاتھ زخمی ہے۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”کیا ... “

مارک نے چند سیکنڈ تک ڈاکٹر کے چہرے کا جائزہ لیا پھر بائیں ہاتھ کے سہارے سے دایاں ہاتھ دھیرے سے آگے بڑھایا۔

”بہت تکلیف ہے، ڈاکٹر۔“

”یقیناً، ہو گی۔“ ڈاکٹر نے اتفاق کیا۔ ”میں نے ایکسرے دیکھا تھا، کیا حادثہ پیش آیا تھا؟“

”میں گاڑی کے بریک چیک کر رہا تھا۔ اچانک جیک، سلپ کر گیا۔“ مارک نے کہا۔ ”میں عجلت میں تھا۔“

ڈاکٹر مسکرایا۔ وہی پرانی کہانی، وہ سمجھ گیا کہ مریض جھوٹ بول رہا ہے۔ اس کے تجربے اور ایکسرے کے مطابق یہ انگلیاں قصداً توڑی گئی تھیں۔ کس نے توڑی تھیں؟ کیوں توڑی تھیں؟ بہرحال جو بھی تھا، وہ اپنے کام میں ماہر تھا۔

”تو تمہارا ہاتھ وہیل کے نیچے آ گیا تھا؟“ ڈاکٹر نے نرمی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پلٹ کر دیکھا۔

”جی ہاں۔“ مارک نے کہا۔ اس کے جسم میں تناؤ آ گیا اور وہ تکلیف کے ڈر سے ہاتھ واپس لینا چاہ رہا تھا۔

ڈاکٹر نیڈ نے مریض کی بے کلی محسوس کر لی اور نرمی سے مسکرایا۔ ”گھبرائیے نہیں۔ آپ کو تکلیف نہیں ہو گی۔“

مارک نے اطمینان کی سانس لی مگر ڈاکٹر کے اگلے سوال نے اسے چونکا دیا۔

”کسی نے تمہیں زخمی کرنے کی کوشش تو نہیں کی؟“

مارک نے ہنسنے کی اداکاری کی۔ ”کوئی اور نہیں، وہ میں خود تھا۔“

”تمہارا پورا ہاتھ بچ گیا۔ صرف دو انگلیاں ... “

ڈاکٹر نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

مارک کو احساس ہوا کہ اس کی کہانی میں جھول ہے۔ ''میں کیا کہہ سکتا ہوں... شاید یہ خوش قسمتی تھی۔''

ڈاکٹر نے بغور مریض کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کی... ''میری پیشہ ورانہ رائے ہے کہ کسی نے تمہاری انگلیاں قصداً توڑی ہیں۔''

''کیا تم تجویز کر رہے ہو کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں؟''

ڈاکٹر شنیڈر چند ثانیے تک بغور اسے دیکھتا رہا۔ ''یقیناً تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو گے۔'' شنیڈر نے سوچا کہ یہ تمہارا یا مجھ سے تمہاری زندگی ہے۔ ''میں نے اپنا کام کر لیا ہے اب آرتھوپیڈک کا کام ہے۔ تم آرام کرو، میں وقت پر رابطہ کر دوں گا۔'' ڈاکٹر شنیڈر وہاں سے ہٹ گیا۔

☆☆☆

دس بج رہے تھے۔ تاریکی نے چادر کھول دی تھی۔ ناتھن نے اپنے اجنبی میزبانوں کے نام ایک خط چھوڑا اور کچن سے گیراج میں آ گیا۔ نئی مسافت اور نئی منزل کی تلاش میں اس نے پچھلے دروازے بند کر دیے تھے۔ بظاہر قسمت اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ اسے مکان میں ایک نقشہ بھی ملا تھا۔ تاہم سڑک پر آنے کے بعد اسے پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے اور اسے کدھر کا رخ کرنا چاہیے۔

سوچنے کے بعد بالآخر اس نے دائیں سمت کا رخ کیا۔ دس منٹ بعد اسے غلطی کا احساس ہوا۔ وہ کیپٹن پال پارک روڈ پر تھا۔ جہاں سے مارک بیلی کا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ البتہ اگر وہ یہاں سے روٹ 66 سیدھا پکڑتا تو روٹ 81 تک پہنچ جاتا۔ وہاں سے شمال کی سمت کینیڈا کی سرحد تھی۔

گاڑی اس کے قابو میں تھی۔ ناتھن کی کوشش تھی کہ گاڑی کی چال رواں رہے۔ تقریباً 15 منٹ بعد اس نے محسوس کیا کہ ٹریفک دھیما ہوتا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ گاڑیاں رک گئیں۔ فاصلے پر شب کی سیاہی میں گاڑی کی روشنی جگمگا رہی تھی۔ ناتھن کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ شاید کوئی ایکسیڈنٹ ہو۔

ٹریفک رینگتا رہا پھر ناتھن کی نظر بھی دور ہو گئی۔ ایکسیڈنٹ نہیں وہ ''روڈ بلاک'' تھا۔ ابھی تک کسی نے اس کی جانب دھیان نہیں دیا تھا۔ وہ ناکے پر آن پہنچا تھا۔ پولیس والے فلیش لائٹس کے ذریعے چھان بین کر رہے تھے۔

''خود کو قابو میں رکھو۔'' اس نے خود کو تسلی دی۔ دن رات وہ جو منصوبہ بندی کرتا رہا تھا، سامنے کا منظر اس کے قطعی برعکس تھا۔ خاصا ڈراؤنا۔

ناتھن جس جانب تھا وہاں 23 گاڑیاں اور دو موٹر سائیکلیں اس کے اور ناکے کے درمیان حائل تھیں۔

ناتھن کی ہتھیلیوں سے پسینا پھوٹ پڑا اور ٹانگیں لرزنے لگیں۔ وہ خاموشی سے دل ہی دل میں خدا کے سامنے گڑگڑانے لگا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے فرار ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔

کار چیکنگ کا کوئی اصول نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اندازے سے کسی بھی گاڑی کو روک لیتے تھے۔

اب آٹھ گاڑیاں درمیان میں حائل تھیں۔ پولیس نے تین گاڑیوں کو جانے دیا اور چوتھی کو روک لیا... پھر دو گاڑیاں رہ گئیں جبکہ تیسری میں وہ خود تھا۔ بدحواسی نے ناتھن کو تقریباً جکڑ لیا تھا۔ عالم دہشت میں ناتھن نے اگلی گاڑی کو دیکھا پھر اس کا نمبر تھا۔ اس نے سوچنے کی کوشش کی۔ پولیس والے ظاہر ہے پیدل تھے۔ ناتھن نے فیصلہ کیا کہ نظر ملتے ہی وہ کار بھگا لے جائے گا۔ اس کے علاوہ اس کی سمجھ میں کوئی اور ترکیب نہیں آ رہی۔

آفیسر اگلی کار میں خصوصی دلچسپی لے رہا تھا۔ اس کی فلیش لائٹ گاڑی کے اندرونی حصے میں چکرا رہی تھی۔ پھر پورے تیس سیکنڈ تک وہ ڈرائیور سے بات کرتا رہا۔ الفاظ ناتھن کی سماعت تک نہیں پہنچ رہے تھے تاہم اس نے دیکھ لیا کہ معاملہ گفتگو کر کے گرمی میں تبدیل ہو رہا ہے۔

آفیسر نے ذرا جھک کر سائڈ کا دروازہ کھول دیا اور ڈرائیور کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ ڈرائیور نے شرافت سے باہر آ کر دونوں ہاتھ کار کی چھت پر رکھ دیے۔

آفیسر نے ایک ہاتھ میں ہتھکڑیاں سنبھالیں اور دوسرے ہاتھ سے ناتھن کی کار کو گھوم کر آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ اس موقع پر سیکنڈ کے دسویں حصے میں دونوں کی نگاہ ٹکرائی۔ نگاہ کے تصادم کا انتہائی طویل وقفہ تھا۔

اگر آفیسر کی آنکھوں میں کوئی تاثر ابھرا بھی تھا تو وہ ذرا ہی غائب ہو گیا۔ کیونکہ ان کے قیدی نے احتجاج کرنا شروع کر دیا تھا اور اس کے ساتھ الجھ پڑا۔

ناتھن نکلتا چلا گیا۔ حلق میں دھڑکتا ہوا دل اور جان اپنی جگہ پر بیٹھ رہا تھا۔ کئی میل آگے جانے کے بعد اسے یقین آیا کہ وہ ناکے سے بچ نکلا ہے۔ فتح مندی کے احساسات اس کے تصور میں جگہ بنا رہے تھے۔ اس نے ایک بار پھر یاس انگیز صورتحال کو شکست دے دی تھی۔

ہر گز ردتا ہوا سبل اسے آزادی سے قریب تر کر رہا تھا۔ اس کا مستقبل اس کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ وہ نئے سرے سے آغاز کرے گا جہاں ماضی کی کوئی جھلک نہیں ہو گی۔ انکل مارک، وکی، پولیس، جج، کوئی اس کی زندگی میں دخل دینے والا نہیں ہوگا۔

کھڑکیاں بند تھیں۔ اے سی فل پر تھا۔ ریڈیو سے موسیقی خارج ہو رہی تھی۔ آزادی کا یقین اور احساس فتح اس کے حواس پر چھا رہا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ اٹھا کر نعرہ لگایا۔ ''بس۔''

☆☆☆

مونیکا مائیکل نے کروٹ لی، معا اسے احساس ہوا کہ اس کا شوہر بستر پر نہیں ہے۔ وہ فوراً ہی بیدار ہو گئی۔ ڈیجیٹل گھڑی میں ساڑھے تین کے ہندسے جھلملا رہے تھے۔ وہ کہنی کے بل اٹھ گئی۔ اس کی سماعت کچھ سننے کی کوشش کر رہی تھی لیکن گھر میں مکمل سناٹا تھا۔ وہ مائیکل کے بارے میں فکرمند تھی۔

آج وہ دوسری مرتبہ اچانک غائب ہوا تھا۔ کوئی چیز اسے اندر سے کھا رہی تھی اور اس نے اپنی پریشانی کو ابھی تک بیوی سے شیئر نہیں کیا تھا۔ مونیکا نے غصہ اور غم، دونوں محسوس کیا۔ ان کا بیٹا برائن نو ماہ قبل ایک حادثے میں اس جہانِ فانی سے چلا گیا تھا۔ مونیکا اور اس کی بیٹی غم و اندوہ کی اذیت جھیلنے کے لیے تنہا رہ گئے۔

مائیکل نے اب تک ایک آنسو نہیں بہایا تھا۔ وہ ہر قسم کی مشکل سے نبرد آزما رہا تھا۔ مونیکا کی خواہش تھی کہ وہ آپس میں شیئر کریں ایک دوسرے کا غم بانٹیں، تاہم اب دیر ہو گئی تھی۔ مائیکل بظاہر معمول کی دنیا میں لوٹ آیا تھا۔

وہ گاؤن لپیٹ کر بستر سے اتر آئی۔ عام طور پر شب بیداری کی صورت میں مائیکل ٹی وی کے ہمراہ ہوتا تھا۔ تاہم وہ نہیں تھا۔ ٹی وی بند پڑا تھا۔ مونیکا فکرمند ہو گئی۔ اس نے خاموش گھر میں دھیرے سے پکارا۔ ''مائیکل؟'' کوئی جواب نہیں ملا۔

پھر اس نے سامنے پورچ میں حرکت محسوس کی اور دروازہ کھلتے دیکھا۔ ''کیا بات ہے، ہنی؟'' مونیکا اس کے قریب ہو گئی۔ مائیکل ٹی شرٹ میں ملبوس تھا۔ ہاتھ میں اسکاچ کا گلاس تھا۔ وہ ایک طرف بیٹھ گیا۔

''کچھ نہیں۔'' وہ بولا۔ ''تم پریشان مت ہو۔ مجھے کچھ مسئلے نمٹانے ہیں۔ تمہیں آرام کرنا چاہیے۔''

''مجھے بتاؤ، آخر تمہارے اندر کیا چیز پک رہی ہے؟'' مونیکا نے انگلیوں سے اس کی کنپٹی سہلائی۔ ''تم نے وعدہ کیا تھا کہ پھر کبھی تم مجھے بے خبر نہیں رکھو گے۔''

مائیکل نے ایک گہری سانس لی۔ پھر رک رک کر بولا۔ ''مجھے... کچھ پریشانی ہے... وہ... مائحن بیلی کے سلسلے میں۔'' اس نے بیوی کو JDC کی ویڈیو کے بارے میں بتایا کہ مائحن کی آنکھیں، برائن کی ہیں... بلکہ وہ برائن لگتا ہے۔

مونیکا کے دل میں غم کی لہر اٹھی۔ ''تمہارا مطلب ہے وہ برائن جیسا ہے؟''

''ہاں۔'' مائیکل نے گہری سانس لی۔ ''اور مجھے اسے پکڑنا ہے۔ جبکہ اصل معاملہ واضح طور پر کچھ اور ہی ہے۔''

''یہ بات ہے۔ اور ہنی، میں معذرت خواہ ہوں۔ میں کیا کیا سوچتی رہی۔'' مونیکا نے اطمینان محسوس کیا۔ اس کی الجھن دور ہو گئی تھی۔ ''کبھی کبھی تمام بچے ایک طرح دکھائی دیتے ہیں۔'' مونیکا نے مسکرانے کی کوشش کی۔

''شاید۔'' مائیکل نے کہا۔ ''لیکن یہ زیادتی ہے کہ مائحن کو بچوں کی جیل نما جگہ پر پھینک دیا جائے۔ تمہیں پورے حالات کا علم نہیں ہے۔ دو سال میں مائحن نے ہر شے کھو دی ہے۔ اتنی کم عمری میں۔ غالباً ایک سال میں، میں نے بھی بہت کچھ کھو دیا ہے۔'' مائیکل نے پہلی بار برائن کی جدائی کا اشارہ دیا اور مونیکا کی آنکھیں بھر آئیں۔

اسے وہ لمحہ یاد آیا جب ہیگر نے آ کر بذاتِ خود برائن کے بارے میں اندوہناک اطلاع دی تھی۔ مونیکا نے اپنے شوہر کا چہرہ دیکھا۔ وہ اندر سے وقتاً مر گیا تھا۔

مائیکل میں بے پناہ ٹیلنٹ تھا۔ اس کی متنوع دلچسپیاں تھیں۔ تاہم برائن اس کی زندگی تھا۔ برائن کی وجہ سے مائیکل جوان تھا۔

اکتوبر کا وہ منحوس دن، جب وہ ایک ناگہانی ٹریفک حادثے میں جانبر نہ ہو سکا۔ بظاہر سب کچھ پہلے جیسا تھا لیکن مائیکل کے اندر کوئی چیز تبدیل ہو گئی تھی۔ وہ اور اس کی بیوی دونوں جانتے تھے کہ اب وہ پہلے جیسا کبھی نہیں ہو سکتا۔

مائیکل کی آنکھوں کا تاثر، مونیکا کے ذہن میں ان بدترین دنوں کی یاد جگا گیا۔ وہ دن جو برائن کی موت کے بعد آئے تھے... اذیت ناک، رنج و غم میں ڈوبے ہوئے۔

''یہ انصاف نہیں ہے۔'' کافی دیر بعد مائیکل بڑبڑایا۔ دونوں اپنی سوچوں میں غلطاں تقریباً ایک گھنٹے تک خاموش بیٹھے رہے۔

مونیکا نے مائیکل کا ہاتھ تھام لیا۔ مہینوں سے رکا غم کا پانی مائیکل کی آنکھوں سے نزب کر آزاد ہوا اور رخساروں پر رینگنے لگا۔ مونیکا نے کن انکھیوں سے دیکھا تاہم شفاف پانی کو صاف کرنے کی کوشش نہیں کی۔ خود اس کے حلق میں گرہ لگ چکی تھی۔

اس نے شوہر کے لیے محبت کی شدت اس دن سے زیادہ محسوس کی جس دن مائیکل نے اسے پروپوز کیا تھا۔

☆☆☆

سوا چار کا وقت تھا۔ ناتھن، بیبرس برگ اور وکس بری، پنسلوانیا کے درمیان کہیں تھا۔ وہ اگلے اسٹاپ کی تلاش میں تھا۔ چھ گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد وہ حسب توقع بہت دور تک نہیں آسکا تھا۔ اسے کہیں رکنا تھا۔ فیول گیج بتا رہا تھا کہ ٹنکی تقریباً خالی ہو چکی ہے۔ وہ ہائی وے سے اتر گیا۔

اس کا رخ رہائشی علاقے کی جانب تھا۔ اسے بھوک اور پیاس محسوس ہو رہی تھی اور دائیں پنڈلی کی اینٹھن بھی پریشان کر رہی تھی۔ اس کا دایاں پاؤں بمشکل کھنچ کر ایکسلریٹر تک پہنچتا تھا۔ بہت دیر سے اسی حالت میں رہنے کی وجہ سے اس کی پنڈلی کا پٹھا اکڑ گیا تھا۔

سائن بورڈز کی مدد سے اسے اندازہ ہوا کہ "لٹل روک ڈیلپا" تعمیراتی کمپنی ہائی وے سے ہٹ کر زیریں سڑک کے قریب سستے مکان بنا کر فروخت کر رہی تھی۔ ارزاں قیمت کے مکان والے پروجیکٹ کے قریب وہ پکی سڑکوں پر چکرا رہا تھا۔

ناتھن کو ایک مکان کے گیٹ میں ٹھنسے ہوئے چند بل پھنسے دکھائی دیے۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کسی اور مکان کے گیٹ پر ایسے ہینڈبل نظر نہیں آئے تھے۔

"تم جینئس ہو۔" اس نے خود کو مبارک باد دی۔ یہی مکان اس کی عارضی پناہ گاہ ہے۔ اس نے سوچا۔ آس پاس سناٹا تھا۔ پروجیکٹ واضح طور پر نیا تھا۔ ناتھن کے اندازے کے مطابق کم مکانات آباد تھے۔

اس نے اپنے منتخب کردہ مکان کا جائزہ لینا شروع کیا۔ مکان کا نمبر 4120 تھا۔ محض 420 بھی ہوتا تو ناتھن کو کیا فرق پڑتا۔ اس نے اچک کر گیراج کا جائزہ لیا تو اندر ایک ہنڈا اکارڈ کھڑی تھی پھر اس نے گھوم پھر کر نیم تاریک کھڑکیوں میں جھانکا۔

ناتھن بلز واپس اپنی کار کی جانب آ گیا۔ سب سے پہلا کام کار کو ٹھکانے لگانے کا تھا۔ سڑک کے بالائی سرے پر ایک چرچ کی موجودگی اس کے خانۂ یادداشت میں محفوظ تھی۔

نصف میل سے زیادہ ڈرائیو کر کے وہ چرچ تک پہنچ گیا۔

چرچ کی پارکنگ کے انتہائی کونے پر اس نے گاڑی لگا دی۔ مشرق کی سمت آسمان سرخ ہونے لگا تھا۔ ایک اور دن شروع ہونے والا تھا اور وہ اپنی مطلوبہ مسافت طے نہیں کر سکا تھا۔ آزادی میں شاید ابھی کچھ اور وقت باقی تھا۔

کار چھوڑنے سے قبل اس نے چابیاں ڈرائیونگ سائڈ پر سیٹ کے نیچے ڈال دیں اور دروازہ آہستگی سے بند کر کے حرکت میں آ گیا...

پینتالیس منٹ بعد وہ پھر "لٹل روک ڈیلپا" پر تھا۔ چھ بج رہے تھے۔ صبح دھندآلود تھی۔ درجہ حرارت 90 ڈگری کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ناتھن کے کپڑے پسینے سے بھیگ کر جسم سے چپک گئے تھے۔ گیلے بال پیشانی سے لپٹے ہوئے تھے۔

تعمیراتی کام مکمل نہیں ہوا تھا۔ جگہ جگہ کھدائی کے گڑھے اور مشینیں نظر آ رہی تھیں۔ تاہم بیشتر مکانات مکمل تھے۔

ناتھن جھاڑیوں سے نکل آیا۔ وہ مکان نمبر 4120 سے زیادہ دور نہیں تھا۔ یہ دلیری اور خود اعتمادی دکھانے کا وقت تھا۔ اس نے انگلیوں سے بالوں میں کنگھی کی۔ ممکن حد تک کپڑے صاف کیے۔ گہری سانس لے کر ڈر و خوف کو ایک طرف جھٹکا اور اطمینان سے چہل قدمی شروع کر دی۔ ناتھن کا رخ مکان نمبر 4120 کی جانب تھا اور اس کی چال معتدل تھی لیکن سینے میں دل کی دھڑکن میں اضطراب اور تیزی موجود تھی۔

☆☆☆

"تونی برسکو" نے کوئی سو دیں بار گھڑی دیکھی اور اپنی بیوی بیٹی کو کوئی غلط بات سنائی۔ وہ نہیں چاہتا تھا لیکن اسے بولنا پڑا۔ دیر ہو رہی تھی، گھڑی صبح کے چھ بجا چکی تھی۔

"میں جا رہا ہوں، دیر ہو جائے گی!" اس نے غصے کو دبانے کی کوشش کی۔

"ہاں، تم جا سکتے ہو... دیکھ نہیں رہے کہ میرے پاس ابھی کتنا کام ہے۔" بیٹی نے سرد مہری سے جواب دیا۔ اس کا اشارہ گھر کے بکھرے ہوئے سامان کی جانب تھا۔ وہ لوگ حال ہی میں اس نئی آبادی میں منتقل ہوئے تھے۔

تونی برسکو بھنا گیا اور بریف کیس اٹھا کر گیراج کی جانب چل دیا۔ گھر سے نکلنے کے بعد تھوڑی دیر میں ہی اس کی نگاہ بڑے پر پڑی۔ "وہ کون ہے؟"

بارہ تیرہ سال کا ایک لڑکا سڑک پار کر رہا تھا۔ اگرچہ درمیان میں کچھ فاصلہ تھا لیکن وہ اچانک ہی آمنے سامنے آ گئے تھے۔

نوڈی نے لڑکے کے چہرے میں خفیف شناسائی محسوس کی۔ وہ چھریرے بدن کا ایک خوش شکل لڑکا تھا۔ بال سنہری تھے۔ اس کی چال بظاہر عام سی تھی لیکن نوڈی نے ہلکی سی بے چینی محسوس کی۔ وہ اڑوس پڑوس کے بچوں میں سے نہیں تھا۔

جب ناتھن کی نظر کار پر پڑی تو اضطراری طور پر پہلا خیال جو ذہن میں چمکا، وہ بھاگ جانے کا تھا۔ اس نے بمشکل اعصاب پر قابو پایا اور سابقہ چال سے قدم بڑھاتا رہا۔ تاہم اس نے مکان نمبر 4120 کی جانب سے رخ پھیر لیا تھا۔

نوڈی کی شیوئی (شیورلیٹ) ناتھن کے قریب پہنچ کر خود سے آہستہ ہوئی۔ ناتھن نے خوش دلی سے مسکرا کر ہاتھ ہلایا۔ جواباً نوڈی کو بھی ہاتھ لہرانا پڑا۔ لڑکا نارمل تھا۔ نوڈی کوئی غیر معمولی بات نوٹ نہیں کر سکا۔ سوائے اس کے کہ ایک تھکا ماندہ لڑکا صبح ہی صبح گھر کی جانب رواں دواں تھا۔

نوڈی نے شیوئی کی رفتار بڑھائی۔ اس کے خیالات کا دھارا اپنے کام کی جانب مڑ گیا۔ نوڈی نے ایک بار بھی عقبی شیشے میں نہیں جھانکا۔

شیوئی کے غائب ہوتے ہی ناتھن نے رخ بدلا اور جنگل نما خطے میں گھس گیا۔ اس نے دوڑنے کی حماقت نہیں کی تھی۔ جھاڑ جھنکاڑ کی آڑ میں وہ ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

”تم نے حماقت کی۔“ اس نے خود سے کہا۔ ”تمہیں کھلی جگہ پر نہیں جانا چاہیے تھا۔ اگر وہ آدمی پہچان لیتا پھر؟“

اسے خود پر غصہ تھا۔ گزشتہ چوبیس گھنٹے میں وہ کئی غلطیاں کر چکا تھا اور صرف قسمت کے سہارے آگے بڑھ رہا تھا۔ اسے لگا کہ وہ دلدل میں پھنس گیا ہے۔ نکلنے کی جتنی کوشش کرتا ہے، مزید گہرائی میں چلا جاتا ہے۔ آگے کیا ہونے والا ہے۔ اس کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔

توانائی گھٹتی جا رہی تھی۔ اسے نیند کی ضرورت تھی۔ اس نے ہمت مجتمع کی۔ وہ ایک اور جرم کرنے جا رہا تھا۔

بالآخر اس نے 200 گز کا فاصلہ طے کیا اور دھوبی خانے کی کھڑکی کے راستے مکان نمبر 4120 میں داخل ہو گیا۔ چند منٹ بعد وہ رہائشی حصے کے ماسٹر بیڈروم میں گہری نیند سو رہا تھا۔

☆☆☆

تھامس پر قنوطیت طاری تھی۔ ویزنما عرف ”بلی“ سے ریڈیو پر بات کر کے اس نے فاش غلطی کی تھی۔ اسے سرے سے وہاں جانا ہی نہیں چاہیے تھے۔ مانگلی سے ملاقات میں چار گھنٹے باقی رہ گئے تھے اور تھامس کو یقین تھا کہ اس کے کیریئر کا ذلت آمیز اختتام سر پر ہے۔

فی الحال اس کی ڈیوٹی مارک بیلی کے مکان پر لگی ہوئی تھی۔ جہاں وہ کچھ فاصلے پر ایک عام سی کار میں موجود تھا۔ مارک کا فوٹو دیگر معلومات کے ساتھ ہیکر نے فراہم کیا تھا۔ مانگلی اور ہیکر اس وقت جے ڈی سینٹر گئے ہوئے تھے۔

پرانے ماڈل کی سرخ رنگ کی گاڑی سڑک پر نمودار ہوئی تو تھامس سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے ہاتھ میں موجود بے اور فوٹو پر نظر دوڑائی۔ پھر سرخ گاڑی کی جانب نگاہ کی جو مارک بیلی کی رہائش گاہ کی طرف جا رہی تھی۔

جونہی سرخ گاڑی گیراج میں داخل ہوئی، تھامس گاڑی سے اتر گیا۔ اس نے جوگنگ کے انداز میں سڑک پار کی۔ مارک، گاڑی سے اتر کر گھر کے داخلی دروازے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ تھامس نے اسے آلیا۔

”مسٹر مارک بیلی؟“

مارک چونکا لیکن رکنے کے بجائے دروازے کی جانب سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ تاہم تھامس اس کی متوازی طرف آن پہنچا۔

”تم ہی مارک بیلی ہو؟“ تھامس نے نرم انداز میں پوچھا۔

”ہاں، کیا مسئلہ ہے؟“ مارک رک گیا پھر تھامس کے لباس کو پہچان کر سٹپٹا گیا۔

”کہاں بھاگے جا رہے ہو؟“

”یہ گھر ہے میرا۔“

”جانتا ہوں۔“ مارک کے ردعمل نے تھامس کو شک میں مبتلا کر دیا۔ ”تم رات بھر کہاں تھے؟“

”میں اسپتال میں تھا۔“ مارک نے ہاتھ کی بینڈیج کو نمایاں کیا۔ ”گاڑی کے بریک ٹھیک کرتے ہوئے معمولی گڑبڑ ہو گئی تھی۔ جیک سلپ ہو گیا۔“

”تمہیں علم ہے کہ تمہارا بھتیجا ناتھن بیلی“ یوتھ جیل ”سے فرار ہو گیا ہے؟“

”ہاں، میرے علم میں ہے۔ تم کیا سمجھ رہے ہو کہ میں نے اس کو یہاں چھپا رکھا ہے؟“ مارک نے سوالیہ جواب دیا۔

”تمہارا خیال ہے کہ مجھے اس رخ پر سوچنا چاہیے؟“ تھامس نے بھی جواباً سوال کیا۔

”دیکھو آفیسر، وہ مجھ سے نفرت کرتا تھا۔“

”اور تم؟“ تھامس نے مارک کی بات کاٹ دی۔

”میں بھی۔ اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا۔ میری بھی جان

پھوٹ گئی تھی۔" مارک نے بے دھڑک کہا۔

"کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟"

"میرا خیال ہے، نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ وارنٹ کے بغیر نہیں۔" مارک نے صاف انکار کر دیا۔

تھامس کو اس غیر متوقع جواب پر حیرت ہوئی۔

"ٹھیک ہے۔" تھامس نے ہاتھ اٹھا کر پسپائی اختیار کی۔ مارک دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

"مسٹر مارک!" اچانک تھامس پلٹا۔

"اب کیا بات ہے؟" وہ کھلے دروازے میں کھڑا تھا۔

"گاڑی والا حادثہ کہاں پیش آیا تھا؟"

مارک کا رنگ بدلا۔ "گاڑی کے نیچے۔" مارک بڑبڑایا اور دروازہ بند کر دیا۔

"مارک تم واقعی قابلِ نفرت ہو۔" تھامس اسٹیئرنگ پر انگلیاں بجاتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ یہ بندہ اسے کسی رخ سے ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔ ناتھن کی بات پر بھڑک گیا تھا۔ نیز حادثے کے سوال پر بھی تندی دکھائی دے رہا تھا۔ تھامس کو یقین تھا کہ مارک کچھ نہ کچھ چھپا رہا ہے لیکن کیا؟ اسے کیا کرنا چاہیے۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ مائیکل کے ساتھ میٹنگ میں ابھی وقت تھا۔ تھامس نے کچھ سوچتے ہوئے کاؤنٹی اسپتال کا رخ کیا۔

اسپتال پہنچ کر اس نے ایمرجنسی ڈپارٹمنٹ کے بارے میں معلوم کیا۔ ٹراما ڈیسک پر اسسٹنٹ کو اس نے مارک کا فوٹو دکھایا اور ہاتھ کے زخم اور ٹریٹمنٹ کے بارے میں سوال جواب کیے۔ اسے مایوسی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ جلد ہی وہ ڈاکٹر نیڈ بیکر تک پہنچ گیا۔

ڈاکٹر کسی زخمی کھلاڑی کے ساتھ مصروف تھا۔ تاہم جلد ہی وہ تھامس کے ساتھ ایک خالی کمرے میں آ گیا۔

"ہاں بھئی بولو کیا معاملہ ہے؟"

"ڈاکٹر نیڈ! کل رات آپ نے مارک بیلی نام کے مریض کے ہاتھ کا ٹریٹمنٹ کیا تھا؟" تھامس نے سوال کیا۔

"کیا مسئلہ ہو گیا؟" ڈاکٹر نے استفسار کیا۔

"اس نے بتایا ہو گا کہ اس کا ہاتھ گاڑی کے نیچے آ گیا تھا۔"

"اس نے یہی بتایا تھا۔" ڈاکٹر نے تصدیق کی۔ پھر کچھ توقف کے ساتھ بولا۔ "لیکن آفیسر! میں تفصیل میں نہیں جا سکتا کیونکہ کچھ قانونی رکاوٹیں ہیں۔ تم سمجھ سکتے ہو۔"

"ڈاکٹر! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" تھامس کی آواز میں مایوسی اور پریشانی تھی۔ "لیکن میرا کیریئر داؤ پر لگ گیا ہے۔ بس میری اتنی سے مدد کر دیں۔ آپ کچھ نہ بتائیں، میں

اپنا خیال ظاہر کرتا ہوں۔ آپ صرف ہاں یا نہ میں سر ہلا دیں؟"

ڈاکٹر کی پیشانی پر پُرسوچ شکنیں نمودار ہو گئیں۔

"او کے۔"

تھامس نے رکی ہوئی سانس خارج کی۔ "میں یہ سمجھا ہوں کہ مارک ہاتھ کے بارے میں جھوٹ بول رہا ہے۔ جھوٹ کچھ چھپانے کے لیے بولا جاتا ہے۔ کچھ نہ کچھ اس نے غلط کیا ہے۔ جسے پوشیدہ رکھنے کے لیے اس نے گاڑی والا عذر پیش کر دیا۔ ڈاکٹر! کیا میرا خیال ٹھیک ہے؟" تھامس نے پُرامید نظروں سے ڈاکٹر نیڈ کو دیکھا۔

ڈاکٹر نے اثبات میں سر کو جنبش دی اور کھڑا ہو گیا۔

"تھینک یو، ڈاکٹر، آپ نے مجھے مریض کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ بہت بہت شکریہ۔" تھامس نے ہاتھ ملایا۔ وہ پُرجوش نظر آ رہا تھا۔ بالآخر اس نے کچھ نہ کچھ کارروائی ڈال ہی دی تھی۔ جو بظاہر معمولی لگ رہی تھی لیکن حوصلہ افزا تھی۔ اب وہ مائیکل کو فیس کرنے کے لیے بہتر پوزیشن میں تھا۔

☆☆☆

نکلسن فیملی کے شاندار گھر تک پہنچنے والا پہلا تفتیش کنندہ، مائیکل خود تھا۔ اس کی تیز نگاہ نے اس کا تعاقب کیا۔ اسے وہاں مقامی نیوز چینل کی سیٹلائٹ وین بھی دکھائی دی۔

فرنٹ ڈور پر مائیکل نے ایک شناسا چہرہ دیکھا۔ یہ وہی افسر تھا جو اسے ڈی سینٹر میں بھی ملا تھا۔

"گڈ آفٹرنون، آفیسر بورشو۔" مائیکل نے کہا۔

بورشو نے جواب دے کر مائیکل کے لیے راستہ بنایا۔ نکلسن فیملی کی بڑی گاڑی کال کے ذریعے وہاں ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ جس کی واحد وجہ یہ بھی کہ یہ خبر عام ہو گئی تھی کہ ناتھن نے وہاں قیام کیا تھا۔ نکلسن فیملی وہاں سے بہت دور ڈزنی ورلڈ گئے ہوئے تھے۔

"تم کیسے کہتے ہو کہ ناتھن یہاں تھا؟"

جواب میں پہلے بورشو نے مائیکل کو واش روم دکھایا جہاں ناتھن کے خون آلود کپڑے موجود تھے۔ پھر مائیکل کو بریف کیا کہ ناتھن کہاں سے بند خالی مکان میں داخل ہوا، غسل کیا اور کپڑے بدلے۔ ریفریجریٹر میں موجود خوردنی اشیا استعمال کیں۔ ٹی وی دیکھا۔ فون استعمال کیا اور نکلسن کی بی ایم ڈبلیو لے کر نکل گیا۔ جاتے جاتے وہ ایک رقعہ بھی چھوڑ گیا۔

مائیکل نے رقعہ بورشو سے لے کر دیکھا۔

"تاریخ کا سب سے شریف اور مہذب نقب

زن۔" بورشو نے تبصرہ کیا۔

مائیکل نے رقعہ پڑھ کر بورشو کو دے دیا۔ "نبیل کہاں ہے؟" بورشو نے کھلے ہوئے مرکزی دروازے سے بیرونی منظر کی جانب اشارہ کیا۔

مائیکل نے دیکھا کہ باہر ریڈیو اور ٹی وی کی گاڑیاں پہنچ چکی تھیں۔ صحافی بھی موجود تھے، اچھی خاصی پریس کانفرنس لگی ہوئی تھی۔ نبیل کے چار افراد تھے۔ میاں، بیوی اور دو بچے۔ کیمرے اور مائیک ہوا میں گردش کر رہے تھے۔

"خوب موقع ہاتھ آیا ہے شہرت حاصل کرنے کا۔" مائیکل نے گہری سانس لی۔

☆☆☆

نئی پناہ گاہ ماتھن کی گزشتہ قیام گاہ کے مقابلے میں بہت چھوٹی تھی۔ ماتھن وہاں گھسنے سے پہلے باہر سے پروجیکٹ دیکھ چکا تھا۔ تمام مکانات ایک ہی سائز کے تھے۔

ماتھن غسل کرنے کے بعد صوفے پر لیٹا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ دن چڑھ چکا تھا۔ گیارہ بجنے والے تھے۔ اس نے ٹی وی بند کیا اور ون یونٹ مکان کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اندرونی سیڑھیوں سے ہوتا ہوا وہ بالائی منزل پر آیا۔ کچھ دیر بعد وہ خواب گاہ میں داخل ہو رہا تھا۔ وہاں زیادہ فرنیچر نہیں تھا۔ ڈریسر کو کھنگالتے ہوئے اس نے تیسری دراز کھولی تو چونک اٹھا۔ وہاں نیلے اور سیاہ رنگ کا ایک وزنی ریوالور پڑا تھا۔ ساتھ میں گولیوں کا ایک ڈبا بھی تھا۔

ماتھن کو ٹی وی پروگرام کوپس (COPS) یاد آیا جو وہ بڑے شوق سے دیکھتا تھا۔ اس نے ریوالور اٹھا لیا۔ اس وقت وہ خود کو ایک پولیس والا سمجھ رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ سلنڈر میں چار گولیاں موجود ہیں۔ وہ کچھ دیر تک ٹی وی پروگرام کے مرکزی کرداروں کی طرح ایکٹنگ کرتا رہا۔ پھر اس نے ہتھیار پچھلی سمت پتلون میں اڑس لیا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک بار پھر گراؤنڈ فلور پر تھا۔ اس کا دماغ خالی تھا۔ معاً اس کی نگاہ ٹیلی فون پر رک گئی۔ کچھ سوچ کر ماتھن نے فون اٹھایا اور نمبر ملانے لگا۔

☆☆☆

زیزی کے سامعین کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ اہم بات یہ تھی کہ لوگ ماتھن کے بارے میں فکرمند تھے اور ہمدردانہ سوچ رکھتے تھے۔ اس وقت وہ گوئین نامی خاتون کی کال اٹینڈ کر رہی تھی۔ خاتون ماتھن کے تحفظ کے بارے میں اپنے خدشات کا اظہار کر رہی تھی۔

"ہائے، گوئین ایک منٹ رکو۔ تمہارے لیے سرپرائز ہے اور سننے والوں کے لیے بھی۔" زیزی کو اشارہ ملا تھا کہ لائن نمبر چودہ پر... ماتھن موجود ہے۔ شو کا حقیقی ستارہ وہی تھا۔

زیزی نے مخصوص بٹن دبایا اور بولی۔ "ماتھن! کیا تم لائن پر ہو؟"

"یس، میم۔" جواب آیا۔

"کیا تم نے مارننگ شو سنا تھا؟ تم سامعین کے لیے ایک اسٹار بن چکے ہو۔"

"نہیں، میں معذرت خواہ ہوں۔ میں نہیں سن سکا۔ میں سو رہا تھا۔"

"اوہ ڈیئر! مجھے حیرت نہیں ہوئی۔ اپنے کپڑے دھونے کے بعد تم یقیناً تھک گئے ہو گے۔" زیزی نے کہا۔

"وہاٹ؟" اس کا منہ کھل گیا۔ زیزی کو کیسے پتا چلا؟ وہ سوچ رہا تھا۔

"مطلب تمہیں پریس کانفرنس کا بھی علم نہیں ہوا؟" "کیسی پریس کانفرنس؟ وہ کیا بات کر رہی ہے؟" ماتھن کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ وہ چپ تھا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

"ماتھن...؟"

"یس، میم۔"

"شاید تمہیں نہیں معلوم کہ تمہارے اجنبی میزبان گھر واپس آ گئے ہیں۔ اور ان کی کچھ اشیا گھر میں موجود نہیں ہیں۔ جیسے ان کی بی ایم ڈبلیو کار... اور ان کو تمہارا چھوڑا ہوا رقعہ بھی مل گیا ہے۔" زیزی نے نرم اور محتاط انداز میں ماتھن کو بتایا۔ وہ جانتی تھی کہ ان گنت لوگ سن رہے ہیں۔ جن میں عوام کے ساتھ یقیناً کچھ خواص بھی شامل ہیں۔

ماتھن کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ گھر کے مالک اتنی جلدی واپس آ جائیں گے اور بات پھیل جائے گی۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ پولیس سے محض چند گھنٹے آگے ہے وہ لوگ بہت جلد سب سے پہلے بی ایم ڈبلیو تک پہنچیں گے پھر اسے پکڑیں گے۔ اچھی بات یہ تھی کہ لوگ مڈو بک میں چرچ نہیں جانتے ہیں اور اس نے چرچ کے احاطے میں جہاں گاڑی چھوڑی تھی وہ جگہ سڑک سے نظر نہیں آتی۔ اس نے گاڑی استعمال ضرور کی تھی، چرائی نہیں تھی، اس امر کو واضح کرنے کے لیے اس نے چابیاں چھوڑ دی تھیں۔ اسے چند گھنٹے اور چاہیے تھے۔ بہت سے سوال اس کے ذہن میں رینگ رہے تھے۔

"ماتھن! کہاں ہو؟" زیزی کی میٹھی آواز نے اسے خیالات کے حصار سے باہر نکال لیا۔

''میں، بیسم۔'' اس نے بات جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔

☆☆☆

پوائنٹر میکنزم کو صاف کرتے ہوئے اپنی قیام گاہ پر لائیو پریس کانفرنس دیکھ رہا تھا۔

میڈیا میں ہاتھن کی مقبولیت اور دلچسپی، پوائنٹر کے لیے تکلیف دہ تھی۔ بہرحال ڈور کا سرا اسے مل گیا تھا۔ اسے زیادہ سے زیادہ دو دن میں ہاتھن کی کہانی کا اینڈ کرنا تھا۔ بصورت دیگر سلیبرٹی کے ہاتھوں خود پوائنٹر کا ''دی اینڈ'' یقینی تھا۔

میڈیا کا جنونی پہیا جس برق رفتاری سے گھوم رہا تھا، لائیو شو میں، مذکورہ فیملی جو کچھ بتا رہی تھی۔ وہ سب کچھ ہاتھن کے امیج کو مثبت رنگ دے رہا تھا۔ فیملی کے بیان کے مطابق کپڑوں اور کار کے علاوہ کوئی چیز غائب نہیں ہوئی تھی۔ ہاتھن نے فریج سے تین عدد پیزا کھائے تھے۔ ان کا واش روم، وین اور ماسٹر بیڈ استعمال کیا تھا۔ کوئی یقین کرے یا نہ کرے۔ یہ لائیو شو تھا۔ وہ لوگ بتا رہے تھے کہ ہاتھن نے اپنے لباس کے علاوہ ان لوگوں کی جو چیز بھی تولیا اور کپڑوں سمیت استعمال کی تھی، وہ سب اس نے دھو کر رکھ دیے تھے۔ حتیٰ کہ استعمال شدہ بستر کو بھی اصل حالت میں کر کے گیا تھا۔

ٹی وی پر مسز نکلسن یعنی کینڈرا، ہاتھن کا چھوڑا ہوا رقعہ پڑھ رہی تھی۔

''ڈیئر مسٹر اینڈ مسز نکلسن اینڈ کڈز!

مجھے امید ہے کہ میں ٹھیک نام لکھ رہا ہوں، میں معذرت خواہ ہوں کہ مجھے غیر قانونی طریقے سے آپ کے گھر میں داخل ہونا پڑا۔ میں نے کوشش کی ہے کہ آپ لوگوں کو کوئی پریشانی نہ ہو اور نہ ہی کوئی نقصان ہو۔ میں نے کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے بھی ہٹا دیے ہیں۔ میں بڑا ہو کر آپ کا نقصان ضرور پورا کروں گا۔ آپ کا گھر بہت خوب صورت ہے اور میں نے اتنا بہترین ٹی وی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ پلیز، اپنے بیٹے کو بتا دیجیے کہ مجھے مجبوراً اس کے کچھ کپڑے لینے پڑے۔ میں شرمندہ ہوں اور شکر گزار بھی۔ میں نے آپ کے تولیے اور دیگر کپڑے دھو کر رکھ دیے ہیں۔

''کار کے بارے میں آپ فکر یا پریشانی محسوس نہ کریں۔ میں بہت احتیاط کروں گا اور جلد آپ کو بتا دوں گا کہ کار کہاں کھڑی ہے۔ مجھ سے کچھ غلط کام ہو گئے ہیں، لیکن یہ سب ویسا نہیں جیسا کہ پولیس سمجھ رہی ہے۔ آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ مجھے انتہائی پریشان کن صورت حال کا سامنا ہے۔

''مجھے امید ہے کہ آپ میری دیانت اور سچائی پر شک نہیں کریں گے۔ پلیز چند روز پولیس کو اطلاع نہیں کیجیے گا۔ میں تنہا ہوں اور چھوٹا ہوں، مجھے اپنا مسئلہ حل کرنے میں چند روز لگیں گے۔

آپ کا دوست

ہاتھن بیلی''

کینڈرا نے رقعہ پڑھ کر سر اٹھایا تو کیمرا کلوز اپ میں چلا گیا۔ اسکرین پر صرف کینڈرا کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ کیمرا دوبارہ دور ہونے لگا۔ ادھر سوالات کی بوچھاڑ نے کینڈرا کو اپنے حلقے میں لے لیا۔

وہ سب کو جواب دینے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ بالآخر مقامی اخبار کے ایک صحافی نے مشکل سوال کا تیر پھینکا اور یہ آخری تیر تھا۔

''ہاتھن جو رقعہ لکھ کر گیا ہے۔ اس میں، اس نے درخواست کی تھی کہ آپ لوگ چند روز پولیس کو بے خبر رکھیں۔ لیکن آپ نے اس کے برخلاف عمل کیا۔ کیسا محسوس ہوا؟''

کینڈرا کے چہرے پر سرخی کی لہر دوڑ گئی اور اس نے امدادی نظر ساتھ کھڑے شوہر پر ڈالی۔ لیکن نکلسن کیس میں اور کھویا ہوا تھا۔ وہ اپنے ہاتھ کے ناخن میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔

پوائنٹر نے چھ عدد راؤنڈ میکنزم میں منتقل کرتے ہوئے قہقہہ لگایا۔ ''اچھا سوال کیا ہے۔'' وہ شکار کرنے کے لیے تیار تھا۔

☆☆☆

مائیکل عجلت میں نکلسن فیملی کے گھر سے روانہ ہوا تھا۔

کار ریڈیو اس نے نیوز ٹاک 990 پر سیٹ کر دیا تھا۔

مائیکل کے دل کی گہرائی میں کہیں ایک آواز بھی جو کہہ رہی تھی کہ... ہاتھن کو نکل جانا چاہیے۔ اس کے شکوک و شبہات اس وقت مکمل طور پر دور ہو گئے تھے جب وہ اور ہیکر بے ڈی سینٹر میں ''سولی'' کا انٹرویو کر رہے تھے۔ سولی وہ لڑکا تھا، جس کا کمرا سینٹر میں ہاتھن کے کمرے سے ملحق تھا۔

''سولی'' کو مائیکل اور ہیکر نے بمشکل گفتگو پر آمادہ کیا تھا۔ لڑکا تو جیسے گونگا بن گیا تھا۔ وہ چندرہ سال کا، سیاہ رنگت کا حامل اور اپنی عمر سے دیکھنے میں بڑا معلوم ہوتا تھا۔

''دیکھو سولی۔'' مائیکل نے لڑکے کو سمجھایا۔ ''تم شاید یقین نہ کرو لیکن ہاتھن کے بہترین مفاد میں ہے کہ ہم اس تک

پہنچ جائیں۔ اگر ہم ایسا نہ کرسکے تو وہ مارا جائے گا۔"

"کیوں؟ آخر تم کیوں اس کو مارنا چاہتے ہو؟" لڑکا اچانک بول پڑا تھا۔

"نہیں، تم غلط سمجھ رہے ہو۔" مائیکل کی دھڑکن میں اضافہ ہوگیا۔ "پرکنس کا مسلح غول ناتھن کی بو سونگھتا پھر رہا ہے۔ ان کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی ہوسکتے ہیں۔" مائیکل نے ذرا توقف کیا پھر بولا۔ "مثلاً رکی ہیرس (مقتول) کے دوست احباب میں سے کوئی مشتعل ہو اور بدلے کے چکر میں ناتھن کو مار ڈالے... یا ناتھن بھاگتے بھاگتے پولیس کے ہاتھوں مارا جائے۔ اگر ہم پہلے اس تک پہنچ گئے تو اس کے بچنے کے بہتر امکانات ہیں۔"

"لیکن اگر میں خاموش رہوں تو ناتھن کے لیے زیادہ بہتر نہیں ہوگا؟" لڑکے نے گویا جرح کی۔

مائیکل لڑکے موبی کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ اتنا تو واضح ہوگیا تھا کہ لڑکا نہیں چاہتا کہ ناتھن کسی کے ہاتھ آئے۔ یعنی لڑکا بھی وہی چاہتا ہے، جو خود مائیکل کے دل میں تھا لیکن موبی کیوں یہ سوچ رکھتا ہے؟

"رکی کے بارے میں کیا خیال ہے؟" ہیکر نے سوال کیا۔ "ہم نے سنا ہے کہ وہ برا آدمی تھا؟"

لڑکے کی آنکھیں معاً جھک گئیں۔ لاتعلقی کی جگہ اس بار نفرت کے تاثرات عیاں تھے۔

"اس کو بہت پہلے مرجانا چاہیے تھا۔" لڑکا بے دھڑک بولا۔

"وہ کیوں؟" ہیکر نے پوچھا۔

"اگر تم نے سنا ہے کہ رکی برا آدمی تھا تو پھر یہ سوال کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" موبی نے جواب دیا۔

کمرے میں سناٹا تھا۔ مائیکل اور ہیکر اندر ہی اندر دنگ رہ گئے۔ سناٹے کا وقفہ طویل تر ہوگیا۔

"شکریہ موبی۔" ہیکر سست روی سے کرسی سے اٹھا۔ اس نے مائیکل کی آنکھ کا اشارہ دیکھ لیا تھا۔ "مجھے امید ہے کہ تمہارا آگے اچھا وقت گزرے گا۔" ہیکر یہ کہہ کر چل پڑا۔

دونوں دوست واپسی کے لیے تیار تھے۔ مائیکل کا ہاتھ دروازے کی ناب پر تھا کہ لڑکے کی آواز پر دونوں رک گئے۔

"کاپس (COPS)۔" وہ بولا۔ "رکی، ناتھن کے پیچھے تھا۔ وجہ مجھے نہیں معلوم۔ اچھا ہوا، ناتھن یہاں سے نکل گیا۔ ورنہ... وہ مارا جاتا۔"

"شکریہ موبی۔" مائیکل نے مڑ کر دیکھا۔ "مگر تم ایسا کس بنا پر کہہ رہے ہو؟"

"میں نے کچھ بھی نہیں کہا۔" لڑکا منہ پھیر کر لیٹ گیا۔ وہ مزید کچھ کہے گا، یہ توقع فضول تھی۔ جتنا وہ بول گیا تھا، وہ بہت تھا اور غیر معمولی بھی... مائیکل اور ہیکر وہاں سے نکل آئے۔

مائیکل تصور کی دنیا سے باہر آگیا۔ وہ ڈرائیو کرتے ہوئے بے چینی محسوس کررہا تھا۔ اسے پہلے تھامس سے ملاقات کرنی تھی۔ تھامس نے ڈیزی سے آن ائیر بات کر کے مائیکل کو بدمزہ کردیا تھا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔

مائیکل جان گیا تھا کہ وہ اکیلا نہیں ہے بلکہ موبی سمیت ان گنت لوگ ناتھن کے طرف دار تھے۔ جن میں خود اس کے بعد دو ہستیاں سرفہرست آچکی تھیں۔ ایک ڈیزی اور دوسرا JDCI کا لڑکا موبی۔

ڈیزی اپنے دل کی آواز کو زبان نہیں دے سکتی تھی۔ یہی حال مائیکل کا تھا۔ وہ اپنے فرض سے مجبور تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ اپنی بیوی اور ہیکر سے ہی ذاتی خیالات شیئر کرسکتا تھا۔

جذبات سے ہٹ کر کڑی کڑی جوڑ کر حقائق کی بنیاد پر اس نے جو تصویر بنائی تھی، اس تصویر کے متعدد گوشوں پر اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ ناتھن کسی رخ سے "مرڈرر" کے خانے میں فٹ نہیں ہورہا تھا۔ اسے "کلر" کہا جاسکتا تھا۔ کلنگ بھی ذاتی دفاع میں حادثاتی طور پر ہوئی۔ ناتھن کو عوام کے لیے خطرہ قرار دینے کے لیے پیٹرولی سرتوڑ کوشش کررہا تھا۔

وہ سیاسی مفاد حاصل کرنے کے لیے اپنی منفی کوششوں میں مصروف تھا۔ مائیکل اور ڈیزی بالواسطہ طور پر پیٹرولی کے عزائم میں رکاوٹ ڈال رہے تھے۔ ڈیزی کا اسپیشل انٹرویو ABC نیٹ ورک کے پروگرام "گڈ مارننگ امریکا"... واشنگٹن ڈی سی میں ٹی وی پر لائیو آن ائر کیا گیا تھا۔ لطف اور دلچسپی کی بات یہ تھی کہ اے بی سی نیٹ ورک والوں نے پیٹرولی (پبلک اٹارنی) کو بھی مدعو کر رکھا تھا۔

مائیکل تک انٹرویو کی جزئیات پہنچ چکی تھیں۔ انٹرویو میں ڈیزی اور پیٹرولی کا متضاد موقف کھل کر سامنے آیا تھا۔ انٹرویو جیک لنڈن نے کیا تھا جس کی شہرت ٹھیک ٹھاک تھی۔ جیک لنڈن کے برجستہ اور چبھتے ہوئے سوالات نے پیٹرولی کو بوکھلا رہا تھا۔ رہی سہی کسر ڈیزی نے پوری کردی۔

مائیکل کا ذہن بن چکا تھا۔ تاہم وہ ابھی تک مضبوط کلیہ حاصل نہیں کر پایا تھا۔ جس کی بنیاد پر وہ کھل کر اظہار کرسکے کہ "ناتھن کیس" کے پس پردہ درحقیقت کیا گیم کھیلا جارہا ہے اور اصل کھلاڑی کون ہے؟

اس کے ذہن میں دو افراد متواتر چبھ رہے تھے۔ وہ میں سے ایک زندہ تھا۔ یعنی ناتھن کا چچا مارک بیلی۔ دوسرا

شخص اس دنیا میں نہیں تھا۔ یعنی رکی ہیریں۔۔۔

تمام ڈرامے، قیاس آرائیاں، مسترادکتہ ہائے نظر اور چوہے بلی کے کھیل کی جھلکی اور آخری حقیقت یہ تھی کہ پولیس نے بہرحال ناتھن کو گرفت میں لیا تھا ہے۔

☆☆☆

ریوالور ملنے پر ناتھن خود کو نسبتاً محفوظ خیال کر رہا تھا۔ دوسری طرف وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اس کے جرائم کی فہرست طویل ہوتی جارہی تھی۔ ”لیکن میں سرحد پار کر کے کینیڈا پہنچ جاؤں گا تو نکسن فیملی کے کپڑوں کی طرح یہ ہتھیار بھی اصل مالک کو واپس کر دوں گا۔“ اس نے سوچا۔

لیکن وہ ریوالور کا کرے گا کیا؟ وہ خود سے سوال جواب کر رہا تھا۔ کسی نے مجھے مارنے کی کوشش کی تو میں یہ ہتھیار استعمال کروں گا۔ تو کیا میں مستند قاتل بن جاؤں گا؟ لیکن اگر واقعی ایسا ہو گیا تو وہ یقیناً اپنے ہمدرد کھو بیٹھے گا۔ ریڈیو والی میم کتنی شرمندہ ہوگی۔

ناتھن کا ذہن مفلوج ہونے لگا۔ اس نے پریشان ہو کر ریڈیو آن کر دیا۔ مختلف نیوز اسٹیشن چیک کیے۔ خبروں میں سب سے اوپر ”ناتھن اسٹوری“ ہی چل رہی تھی۔

اس نے ریڈیو بند کر کے ٹی وی آن کر دیا۔ وہ بظاہر خبریں سن رہا تھا۔ نگاہ اسکرین پر تھی لیکن ذہن بھٹک رہا تھا۔ اچانک ٹی وی نے اس کی توجہ کھینچ لیا۔

تصویری خبریں جو کہہ رہی تھیں، ناتھن کو سماعت کا دھوکا محسوس ہوا۔ اس نے ٹی وی بند کر کے پھر ریڈیو آن کیا۔ وہاں بھی ٹی وی جیسی خبر چل رہی تھی۔ JDC کے مفرور لڑکے ناتھن نے جس بی ایم ڈبلیو کار پر سفر کیا، اسے تلاش کر لیا گیا ہے۔

آگے سننے کی تاب نہ تھی۔ ناتھن نے ریڈیو بند کر دیا۔ یہ کیونکر ہو گیا؟ اتنی جلدی؟ ابھی تو اسے سو میل مزید مسافت طے کرنی تھی۔ اس خبر سے پہلے وہ اپنی موجودہ پناہ گاہ کے گیراج میں کھڑی ہنڈا اکارڈ استعمال کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔

لیکن پولیس پہلے ہی اس کے بہت قریب پہنچ چکی تھی۔ اتنی جلدی وہ کیسے پہنچ گئے؟ سڈا سے وہ کار سوار یاد آیا جو کل صبح ہی صبح سڑک پر ملا تھا۔ کیا وہ ناتھن کو پہچان گیا تھا؟ کیا اس نے پولیس کو اطلاع دی؟ ناتھن کو خود سے نفرت محسوس ہوئی۔ وہ احمق تھا۔ اس نے بار بار احمقانہ خطرات مول لیے۔

اب پولیس جلد یا بدیر مرڈر کیس میں اسے پکڑ لے گی۔ ساتھ میں دیگر جرائم بھی شامل کرے گی۔ یہ لوگ اسے مار دیں گے یا پھر وہ ساری زندگی جیل میں سڑے گا۔

یک لخت ناتھن پر ڈپریشن کا حملہ ہوا۔ تمام سعی لاحاصل رہی۔ اب تک قسمت اس کا ساتھ دیتی رہی تھی لیکن کب تک۔ مایوسی کا اندھیرا ناتھن کو نگل رہا تھا۔ اس نے دھندلی آنکھوں سے ریوالور کو دیکھا پھر اسے اٹھا لیا۔

آزادی کا ایک اور راستہ بھی تو ہے۔ آسان اور سہل۔ کوئی ٹینشن نہیں، کوئی بھاگ دوڑ نہیں۔ تصور میں اس نے باپ کو دیکھا۔ فرشتے بھی ان کے ساتھ تھے۔ وہاں وہ اپنی ماں سے بھی مل سکے گا۔ ناتھن کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ نے جنم لیا۔ اس نے دیکھا کہ اس کے ماں باپ بھی مسکرا رہے ہیں۔ وہ بادلوں سے نکل کر والدین کے پاس پہنچ گیا۔ اس کی آنکھ سے ایک آنسو پھسلا۔ ناتھن کو پتا ہی نہیں چلا۔ اس نے ریوالور اٹھایا اور بیرل میں جھانکا۔ چند سیکنڈ بعد ہتھیار کی نال اس نے کنپٹی پر رکھ دی۔ وہ آزاد ہونے والا تھا۔ یہ خیال اسے پہلے کیوں نہ آیا؟ ٹریگر پر انگلی کا دباؤ بڑھنے لگا۔ آزادی اور مسرت اس کی منتظر تھیں۔

ایک۔۔۔دو۔۔۔

☆☆☆

”گریگ یو بینگر“ کا سینہ فخر و انبساط سے پھولا ہوا تھا۔ بی ایم ڈبلیو کی دریافت کے باعث ریڈیو اور چینلز پر شام کی خبروں میں اس کا نام اور تصویر شامل تھے۔ اگر گریگ لڑکے تک بھی پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس کی ترقی پکی تھی۔

علاقے کا جائزہ لینے کے بعد گریگ نے فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے علاقے کے مکینوں کو کھنگالا جائے۔ اسے معلوم تھا کہ جلد ہی پولیس فورس اور میڈیا کی یلغار ہونے والی ہے۔ اس کی پرجوش خواہش تھی کہ سب سے پہلے ناتھن تک پہنچ جائے۔ وہاں تعمیراتی پروجیکٹ نصف سے زیادہ مکمل ہو چکا تھا۔

وہ مکان نمبر 4120 پر پہنچا تو اسے احساس ہوا کہ مکان غیر آباد نہیں ہے تاہم اس وقت خالی پڑا ہے۔ اس نے آگے بڑھنے سے پہلے دروازے کی چپلی درز سے اپنا کارڈ اور انفارمیشن شیٹ اندر کھسکا دی اور چلتے چلتے رسماً اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔

☆☆☆

ہیکر، مائیکل کی ہدایت کے بموجب JDC کے اسٹاف کے ساتھ مشغول تھا۔ سینٹر کے ریکارڈ کے مطابق رکی

تنہا تھا۔ غیر شادی شدہ تھا۔ ہینگر نے منیجر کی مدد سے رکی کا کمرا دیکھا۔ تاہم اسے کوئی اہم سراغ نہیں ملا۔

منیجر سے بات چیت کے دوران بالآخر اسے ایک نام ہاتھ آہی گیا۔ یہ نام منشی کا تھا جو رکی کی دوست تھی۔ وہ بروک فیلڈ گارڈن اپارٹمنٹ میں مقیم تھی۔

ہینگر بلاتاخیر عمارت کی پہلی منزل تک پہنچا۔ منشی کے اپارٹمنٹ کے دروازے پر اسے کسی ڈور بیل کا بٹن دکھائی نہیں دیا۔ کئی بار دستک دینے پر ایک لڑکی نے دروازہ کھولا۔ ہینگر نے اپنا شناختی کارڈ گلے میں لٹکایا ہوا تھا۔

وہ ایک خوش شکل سرخی مائل بالوں والی خوش لباس لڑکی تھی۔ ہینگر نے عمر کا اندازہ پچیس سال لگایا۔ لڑکی کے چہرے پر ایک گہری خراش تھی جو ناک کے بانسے سے ہوتی ہوئی بائیں آنکھ کے نیچے اختتام پذیر ہوگئی تھی۔ خراش تشدد کی واضح علامت تھی۔ لڑکی کی سوجی ہوئی لال آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ روتی رہی ہے۔

ہینگر کے دماغ میں گھنٹیاں بجنے لگیں۔ وہ کسی اہم ترین انکشاف کے نہایت قریب تھا۔ لڑکی کے بال پونی ٹیل کی شکل میں بندھے ہوئے تھے۔ ہینگر فوراً اپنے تاثرات چھپا گیا۔ تاہم لڑکی کی حیرت زدہ تھی۔

"تم یقیناً منشی ہو!" ہینگر نے استفسار کیا۔

لڑکی کی نگاہ، ہینگر کے چہرے سے پھسل کر اس کے بیج پر جم گئیں۔ غیر متوقع طور پر اس نے جواب دینے کے بجائے دروازہ وا کر کے ہینگر کے لیے اندرونی راہ ہموار کی۔ ہینگر پوری طرح چوکس تھا۔ اس نے شکریے کا لفظ ادا کیا اور اندر قدم رکھ دیا۔

منشی نشست گاہ میں صوفے پر ڈھیر ہوگئی۔ سائڈ ٹیبل پر بیئر کی بوتل کھلی پڑی تھی جو نصف کے قریب خالی ہو چکی تھی۔ ہینگر نے اندازہ لگایا کہ وہ اکیلی تھی۔ اس نے سوچا کہ اظہارِ ہمدردی کرنے ہوئے منشی کے چہرے سے آغاز کرے پھر اس نے ارادہ بدل دیا۔

"مجھے رکی کی موت پر افسوس ہے۔ ایسی تکلیف دہ صورتِ حال میں، مجھے مجھ دریافت کرنا ہے۔ میں معذرت خواہ ہوں۔ شاید مجھے اس وقت نہیں آنا چاہیے تھا؟" ہینگر نے نوٹ بک نکالنے سے احتراز کیا۔

"آفیسر، تکلفات کی ضرورت نہیں ہے۔" منشی نے بوتل اٹھالی۔

ہینگر نے سہولت محسوس کی۔ اسے لگا کہ منشی آزردگی کے ساتھ دباؤ کا شکار ہے اور بوتل اس کا غم غلط کرنے کے لیے ناکافی ثابت ہورہی تھی۔

"میں یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ رکی، جو ڈے کیئر سینٹر کے بچوں کے لیے کیوں ناپسندیدہ شخص بن گیا تھا؟" ہینگر نے احتیاط سے الفاظ کا چناؤ کیا۔ "تاہم میں سمجھتا ہوں کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ اس کا حق دار نہیں تھا۔"

ہینگر نے دیکھا کہ منشی کی آنکھیں ڈبڈبانے لگی تھیں۔ اس نے گہری سانس لے کر آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کی۔

"کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ ناحق مارا گیا؟" منشی نے براہ راست سوال کیا۔

"میرا خیال ہے کہ حقائق اتنے سادہ نہیں ہیں، جتنے ظاہر نظر آتے ہیں۔" ہینگر مزید محتاط ہوگیا۔ منشی کے سوال نے اسے احساس دلایا تھا کہ اس کا وقت ضائع نہیں ہوگا۔

"ہاں آفیسر، تم ٹھیک سوچ رہے ہو۔ لیکن میں خود کو بہت اکیلا اور... اور..." وہ اچانک چپ ہوگئی۔

ہینگر ناسمجھی رہا۔ اس کا اندھا تیر نشانے پر لگا تھا۔ لیکن منشی اچانک بولتے بولتے رک گئی۔ ہینگر نے غم کے ساتھ اس کی آنکھوں میں خوف کا سایہ دیکھا۔ اس کا ذہن دوبارہ لڑکی کے چہرے کی خراش کی جانب چلا گیا۔ ہینگر کے دماغ میں پھر گھنٹیاں بجنے لگیں۔

"کیا رکی نے کبھی ناتھن کا ذکر کیا تھا؟" ہینگر نے بالآخر تنہا سوال گھمایا۔ اس کی کوشش تھی کہ لڑکی کچھ نہ کچھ بولتی رہے۔ اندر ہی اندر اس کی رفتارِ نبض تیز ہوگئی تھی۔

"ناتھن..." منشی نے بوتل منہ سے لگائی۔ "میں خود سے سیکڑوں بار ناتھن سے متعلق سوال کرتی رہی ہوں... مجھے خوشی ہوتی اگر میں یہ کہہ سکتی کہ کسی بچے کی جان لینا رکی کے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ کاش میں یہ کہہ سکتی۔" منشی ہچکی لے کر خاموش ہوگئی۔

ہینگر نے سخت اضطراب محسوس کیا۔

"لیکن میں یہ نہیں کہہ سکتی۔" وہ پھر گویا ہوئی۔ "بچے اس کو پسند نہیں کرتے تھے۔ رکی کو اس بات سے نفرت تھی کہ "سینٹر" میں بچوں نے اسے وہ عزت نہیں دی جس کا وہ حق دار تھا۔ رکی نے بے وقوفی کی اور کھلونا بن گیا۔ اس نے دوسری غلطی کی کہ مجھے بھی کچھ نہیں بتایا۔" وہ ایک بار پھر گم صم ہوگئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے بوتل دبوچ لی۔ اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔

"رکی کیا کرنا چاہتا تھا؟" ہینگر نے بدن کے عضلات میں تناؤ کی کیفیت محسوس کی۔

''وہ مجھے کیوں چھوڑ کے جا رہا تھا؟'' الفا مشی نے سوال کیا۔ اس کے سوال میں غم و غصے کا عنصر موجود تھا۔

''میں سمجھا نہیں؟'' ہیکٹر نے خود کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کی۔ سنسنی کی لہر اس کے رگ و پے میں دوڑ رہی تھی۔

''وہ کسی طویل المدت منصوبے میں الجھا ہوا تھا۔ وہ کیا کر رہا تھا؟ میں نے سمجھنے میں دیر کر دی۔ بہت زیادہ تاخیر کر دی۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ کچھ بھی نہیں۔ وہ میرے رہبر سے یہاں سے اپنی چیزیں ہٹا رہا تھا۔ ایک ہفتے قبل اتفاقاً وہ ٹکٹ میرے ہاتھ لگ گیا جو اس نے چھپا کر رکھا ہوا تھا۔''

''کیسا ٹکٹ؟'' ہیکٹر کو لگا جیسے صوفے میں کیلیں نکل آئی ہیں۔

''ارجنٹائن کا یک طرفہ ٹکٹ۔'' وہ بولی۔

''کہاں ہے ٹکٹ؟'' ہیکٹر کا حلق خشک ہونے لگا۔ وہ شدید ہیجان محسوس کر رہا تھا۔

''دوسری چیزوں کے ساتھ ٹکٹ بھی غائب ہو گیا۔''

''اسے کب روانہ ہونا تھا؟''

مشی نے شانے اچکائے۔ ''وہ ایک اوپن ٹکٹ تھا۔ جس کی نقد ادائیگی نو سو ڈالرز کی گئی تھی۔ میرے تصور میں نہیں تھا کہ رکی کے پاس وہ رقم کہاں سے آئی؟ میں اتنی بے خبر تھی کہ اس کے پاسپورٹ تک سے لاعلم تھی۔''

ہیکٹر کے پیٹ میں اینٹھن شروع ہو گئی۔ اس کا دل کر رہا تھا کہ وہ اڑ کر مائیکل تک پہنچے۔ یہ کیا گھن چکر ہے؟ اور نتھن کا اس معاملے سے کیا تعلق؟ وہ دل ہی دل میں مائیکل کے تجزیے اور چھٹی حس پر داد و تحسین پیش کر رہا تھا۔

''کیا تمھیں ہماری مدد کی ضرورت ہے؟''

''نہیں۔'' وہ رونے لگی پھر اچانک کھڑی ہو گئی۔

ہیکٹر بھی کھڑا ہو گیا۔

''مس، آخری سوال۔ تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ رکی میرس کو کوئی بڑی رقم فراہم کر رہا تھا؟ میرا مطلب ہے کسی خاص کام کے لیے؟ جسے کرنے کے بعد وہ جنوبی امریکا (ارجنٹائن) چلا جاتا؟''

مشی نے زور زور سے نفی میں سر ہلایا اور کھڑکی کے پاس چلی گئی۔ وہ شیشے میں سے باہر دیکھ رہی تھی۔ ''مجھے کچھ نہیں پتا۔ لیکن وہ کچھ بھی کر رہا تھا وہ اتنا برا تھا کہ رکی ملک چھوڑ کر جا رہا تھا... اور... مجھے... مجھے بھی چھوڑ...''

مشی کے آخری الفاظ سرگوشی میں ڈھل گئے۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مزید بات کرنے سے انکار کر دیا۔

☆☆☆

''بیٹھ جاؤ۔'' مائیکل نے کہا۔

تھامس بیٹھ گیا۔ تاہم اس کی کمر بالکل سیدھی تھی۔ وہ تناؤ کا شکار تھا۔

مائیکل نے اپنی کرسی پر ٹیک لگا کر ٹانگیں پھیلا دیں۔ اس کے دونوں ہاتھ سینے پر بندھے تھے۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔

''تو تم ریڈیو اسٹار بن گئے ہو، آفیسر تھامس؟''

تھامس کی نگاہ، مائیکل کی آنکھوں سے بندھی ہوئی تھی۔ اس نے خود کو بدترین صورتِ حال کے لیے تیار کر لیا۔

''تمہارا کیریئر تمہارے لیے اہم ترین ہے؟ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟'' مائیکل نے تھامس کی پرسنل فائل کھولی۔

''یس سر۔'' تھامس کی آواز مضبوط تھی۔

''کس نے مشورہ دیا تھا، آن ائیر جانے کا؟'' مائیکل تھامس کے بجائے فائل دیکھ رہا تھا۔

''سارجنٹ ہیکٹر کے مطابق، اس واردات سے قبل تم گولڈ میڈل کے حصول کے لیے کوشاں تھے؟''

تھامس خاموش رہا۔

''تم نے اکیڈمی کے داخلی امتحان میں چیٹنگ کی تھی؟'' مائیکل نے تھامس پر ایک نظر ڈالی اور دوبارہ فائل میں کھو گیا۔

''نو سر۔''

''تمہارا خیال ہے کہ چیٹنگ ایک غلط حرکت ہے؟''

''یس سر۔''

''تو تم نے ریڈیو سے معلومات حاصل کرنے کے لیے غلط راستہ کیوں چنا؟ کیا تم آگے جانے کے لیے شارٹ کٹ کی تلاش میں تھے؟''

''نو سر۔'' تھامس نے اپنے ہونٹ چبائے۔

''وہاٹ... یس سر، نو سر...؟'' مائیکل برہم ہو گیا۔

''جناب آپ جو بھی ایکشن لینا چاہتے ہیں، میں سامنا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن میری گزارش ہے کہ پہلے آپ میری چند باتیں سن لیں۔'' تھامس نے پُرامید نظروں سے مائیکل کو دیکھا۔

''میں سن رہا ہوں۔'' مائیکل نے فائل بند کر دی۔

''میں مارک بیلی سے ملا تھا۔'' تھامس کا اعصابی تناؤ کم ہو گیا۔ ''وہ زخمی تھا اور...''

''تفصیل سے بتاؤ۔ 'الف' سے 'ے' تک۔''

مائیکل نے اس کی بات کاٹی اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''یس سر۔'' تھامس کی ٹینشن یک لخت معدوم ہو گئی۔

''میں اس کے گھر کی نگرانی کر رہا تھا۔'' تھامس نے تمام تر جذبات دبا رکھے تھے۔ مائیکل کا چہرہ بے تاثر تھا لیکن آنکھیں بول رہی تھیں۔

''تمہیں کیوں یقین ہے کہ وہ ہاتھ کے بارے میں جھوٹ بول رہا تھا؟'' مائیکل کی آواز میں نرمی تھی۔

تھامس سوچ میں پڑ گیا کہ ڈاکٹر ٹیلڈ سے ملاقات کے بارے میں بتائے یا نہ بتائے۔ تاہم مائیکل کی دلچسپی اور بدلے ہوئے تیور نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔

''میں اس کے معالج سے ملا تھا۔'' بالآخر وہ بولا۔ مائیکل کی پیشانی پر شکن نمودار ہو کر غائب ہو گئی۔ وہ خاموش رہا۔ تھامس نے ڈاکٹر سے ملاقات کا احوال جوں کا توں اگل دیا۔

اس کی کہانی اختتام پذیر ہوئی تو مائیکل کھڑا ہو گیا۔ وہ چند قدم چل کر تھامس کے قریب آیا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''تم جانتے ہو کہ تم کیا کر آئے ہو؟''

''نو سر۔'' تھامس بھی کھڑا ہو گیا۔

''آفیسر تھامس! تم نے حیرت انگیز کام کیا ہے۔ ریڈیو والی غلطی کو بھول جاؤ۔'' مائیکل کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''تمہارا اتنا ٹاسک اب...'' فون کی گھنٹی کے باعث اس کا فقرہ نامکمل رہ گیا۔ تھامس اپنے اندرونی جوش پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''وارن مائیکل اسپیکنگ۔'' مائیکل نے دوسری جانب سپیکر کی آواز سنی۔ وہ سنتا رہا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بدلتے چلے گئے۔

''کہاں سے بات کر رہے ہو؟'' مائیکل نے سپیکر کو ٹوکا۔ پھر اسپیکر کا جواب سن کر بولا۔ ''باقی بات بعد میں... فوراً یہاں پہنچو۔'' اس نے فون رکھ دیا اور تھامس کو دیکھا۔

''میں کیا کہہ رہا تھا؟'' مائیکل کی ذہنی رو کسی اور طرف بہہ چلی تھی۔

''سر! آپ نیا ٹاسک دے رہے تھے۔'' تھامس نے پُرجوش انداز کے ساتھ جواب دیا۔

''ہاں، نیا ٹاسک یہ ہے کہ تم مارک بیلی کے ہاتھ کے زخم کے پس پردہ حقیقت کا سراغ لگاؤ۔ تاہم محتاط رہنا۔ چاہو تو کسی ساتھی آفیسر کو بھی لے جاؤ۔ لیکن دونوں ساتھ رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے الگ رہنا۔ اگر تمہیں سراغ مل جائے تو آگے بڑھنے کی کوشش مت کرنا بلکہ فوراً مجھے مطلع کرنا۔''

''یس سر۔'' تھامس کا سینہ فخر سے چوڑا ہو گیا۔

صورت حال یکسر تبدیل ہو گئی تھی۔

''تمہارے پاس اس کام کے لیے کلیو ہے کہ ناتھن کے انکل نے ایک ہاتھ ناکارہ ہونے کے بعد پہلا کام جو کیا ہے، وہ ڈاکٹر تک رسائی ہے۔ لہٰذا ڈاکٹر سے ملاقات سے پہلے کے چند گھنٹوں پر فوکس رکھنا۔ ڈاکٹر سے دور دور رہنا ہی مارک بیلی کے گھر میں گھسنے کی کوشش کرنا۔ باقی لائن آف ایکشن بھی تمہاری صلاحیت پر منحصر ہے۔ آخری بات یہ کہ تم ایک کارنامہ انجام دینے کے نہایت قریب ہو۔'' مائیکل نے بات ختم کی۔

''تھینک یو سر۔'' تھامس کا چہرہ فرط جوش سے سرخ ہونے لگا۔ اسے لگا کہ کیریئر کا ٹرننگ پوائنٹ اس کے ہاتھ میں ہے۔

☆☆☆

اطلاعی گھنٹی کی آواز کسی خوف ناک دھماکے کی طرح تھی۔ ناتھن اپنی جگہ سے تقریباً گر ہی پڑا... پہلا خیال یہی آیا کہ ریوالور چل گیا ہے۔ اگلے ہی لمحے اسے احساس ہو گیا کہ دراصل باہر کوئی ہے اور آواز گھنٹی کی تھی۔

وہ فرش کے ساتھ چپک گیا۔ نظر بیرونی دروازے سے ملحق کھڑکی پر پڑی۔ پردے کی جھری پر اس کی نگاہ گئی۔ وہ کوئی پولیس والا ہی تھا جس کی بغل میں کاغذات کا پلندہ تھا۔

''وہ آ گئے ہیں۔'' ناتھن نے خود سے سرگوشی کی۔ اچانک اس نے محسوس کیا کہ پولیس مین کا رویہ عجیب سا ہے۔ وہ تنہا لگ رہا تھا اور ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

ناتھن فرش سے چپکا ہوا پردے کی جھری کو گھور رہا تھا۔ وہ جیسے منجمد ہو گیا تھا۔ چند ساعت بعد پولیس مین کی شبیہ کھڑکی کے سامنے سے غائب ہو گئی۔ ایک کاغذ دروازے کے زیریں رخنے سے اندر آیا۔ پھر اس نے قدموں کی آہٹ سنی۔ جو کہہ رہی تھی کہ پولیس مین واپس جا رہا ہے۔

کئی منٹ تک ناتھن زمیں بوس رہا۔ آہستہ آہستہ وہ حقیقی دنیا میں واپس آ گیا۔ گھٹنوں کے بل اٹھا اور واپس صوفے پر جا بیٹھا۔ بے اختیار اس کے چہرے پر مسکراہٹ نظر آئی۔ پولیس والا اس سے دس پندرہ فٹ دور رہ گئی تھی پھر بھی وہ اس تک نہیں پہنچ سکی۔ قسمت اب بھی ناتھن کے ہمرکاب تھی۔ امید کی کرن پھر روشن ہو گئی۔ اسے اپنے باپ کی بات یاد آئی۔ ''امید کسی انسان کے لیے ایک گرانقدر اثاثے کی حیثیت رکھتی ہے۔''

ناتھن نے ریوالور کو دیکھا۔ اسے سرشاری کا احساس ہوا۔ وہ کیا کرنے جا رہا تھا۔ زندگی کی دشواریوں سے نمٹنے کا یہ کوئی قابلِ تعریف حل نہیں تھا کہ خود کو ختم کرلیا جائے۔ اس نے ہتھیار قالین پر گرا دیا۔ دونوں ہتھیلیاں آنکھوں پر رکھ لیں۔ وہ رو رہا تھا۔

دراصل وہ اصل دشمن سے بے خبر تھا۔ مسلح ''پوائنٹر'' ساتھ مسلسل وہ حرکت پذیر تھا۔ ''پورشے'' کار میں وہ اڑا جا رہا تھا۔ اس نے جو روپ دھارا تھا، وہ پولیس افسر کا تھا۔

☆☆☆

''کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ ناتھن تھا؟'' گریگ نے زور دے کر پوچھا۔

''کیا مطلب؟ کتنا یقین چاہتے ہو؟ تم نے میرے گھر پر جو کاغذ بمع تصویر کے ساتھ چھوڑا تھا۔ وہ تصویر ناتھن کی تھی۔'' نوزی برسکو نے خفگی کا اظہار کیا۔ ''اس روز صبح ہی صبح جو شخص سڑک پر مجھے نظر آیا تھا وہ ناتھن ہی تھا۔''

''اس کا لباس کیسا تھا؟'' گریگ نے نوزی کی خفگی کو نظرانداز کیا۔

''اس نے جیکٹ اور اسپورٹس شرٹ پہنی ہوئی تھی۔''

''شرٹ پر کس ٹیم کا نشان تھا؟'' گریگ نے تشویش محسوس کی۔

''وہ ایک سرسری مڈبھیڑ تھی۔ مجھے نہیں پتا کہ کون سی ٹیم کی شرٹ تھی۔''

تاہم گریگ جانتا تھا۔ رپورٹس کے مطابق، نکلسن فیملی کے گھر سے ناتھن نے جو لباس لیا تھا اس میں ''شکاگو بل، ٹی شرٹ'' بھی شامل تھی۔

''کیا تم یاد کرسکتے ہو کہ وہ چرچ کی جانب سے آرہا تھا؟''

نوزی نے توقف کیا پھر بولا۔ ''اگر چھدرے جنگل سے تجارت کٹ مارا جائے تو وہ غالباً اسی جانب سے آرہا تھا۔''

گریگ نے نوزی کا شکریہ ادا کیا اور اس کے گھر سے نکل آیا۔ مکانات پر ناتھن کے بارے میں پرچے چھوڑنا مفید ثابت ہوا تھا۔ نوزی کی کال ملتے ہی وہ اپنے دیگر ساتھیوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا تھا۔

''دوستو... ہم ناتھن کے سر پر ہیں۔ یہاں موجود ہر مکان کو چیک کرو قبل اس کے کہ وہ یہاں سے نکل جائے۔'' گریگ نے ہدایات جاری کیں۔ اچانک اسے خیال آیا کہ وہ ایک اہم سوال کرنا تو بھول ہی گیا۔ اس نے پلٹ کر نوزی کے مکان کی گھنٹی بجانا چاہی۔ تاہم نوزی ابھی دروازے پر ہی موجود تھا۔ نوزی کی بیوی بھی عقب سے جھانک رہی تھی۔

''معاف کیجیے، مسٹر نوزی۔'' گریگ نے معذرت کی۔ ''کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ کا کوئی پڑوسی چھٹیوں پر گیا ہے؟''

''میں ہر ایک کو تو نہیں جانتا۔'' نوزی نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں یہاں سکونت اختیار کیے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔''

''کوئی بات نہیں۔'' گریگ جانے کے لیے مڑا۔

''ایک منٹ۔'' نوزی کی آواز پر وہ رک گیا۔ ''میرا خیال ہے کہ ''گریگی'' گھر سے دور ہے۔'' نوزی نے مکانات کی ایک جانب اشارہ کیا۔ گریگ کے نزدیک تمام مکانات ایک جیسے تھے۔

''کیا آپ کو گریگی کے مکان کا نمبر یاد ہے؟''

''4120۔''

''بہت شکریہ۔'' گریگ وہاں سے پلٹ گیا۔

وہ جلد ہی مکان نمبر 4120 پر پہنچ گیا۔ اسے یاد آیا کہ وہ اس مکان پر بھی آیا تھا اور مکین کو غیر موجود دیکھ کر آگے بڑھ گیا تھا۔ تاہم اس نے چلتے چلتے گھنٹی بجائی تھی۔

اس مرتبہ اس نے بغور جائزہ لیا۔ کھڑکیوں پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ اس نے مکان کا چکر کاٹا۔ عقبی دالان خالی تھا۔ تمام کھڑکیاں صحیح سلامت تھیں۔ گریگ نے لان میں قدموں کے نشان تلاش کرنے کی کوشش کی۔ تاہم ناکام رہا۔ پھر اسے تہ خانے کی ادھ کھلی کھڑکی کا خیال آیا۔ اگر وہ یہاں ہے تو پھر تہ خانے کی راہ سے اندر گیا ہوگا۔ کھڑکی میں اتنی گنجائش تھی کہ کوئی کم عمر لڑکا کوشش کرکے اندر جا سکتا تھا۔

دفعتاً گریگ کا دل زور سے دھڑکا۔ اسے اپنی حماقت پر غصہ آیا۔ وہ خالی خالی نظروں سے گیراج کو دیکھ رہا تھا۔ گیراج خالی تھا جبکہ پہلے وہ یہاں آیا تھا تو وہاں ایک ہنڈا کار موجود تھی۔ معاً اسے ہوش آگیا۔ وہ تیزی سے تہ خانے کی ادھ کھلی کھڑکی تک پہنچا۔ ہلاتے جلاتے پر کھڑکی مزید کھل گئی۔ وہ بمشکل پھنس پھنسا کر اندر گھس گیا۔ اس نے ٹارچ کی روشنی میں تہ خانے کا جائزہ لیا اور گراؤنڈ فلور پر پہنچ گیا۔ گریگ نے پھرتی سے فلور کو کھنگالا اور پہلی منزل پر آگیا۔

اس کے ایک ہاتھ میں ٹارچ اور دوسرے ہاتھ میں گن تھی۔ ٹارچ وہ گراؤنڈ فلور پر آف کرچکا تھا۔ بہرحال پہلی منزل پر اسے کچھ نہیں ملا۔ تاہم ایک تکیے پر اسے ناتھن کا رقعہ مل گیا۔ رقعے کے مندرجات تقریباً ویسے ہی تھے جو

نکلسن فیملی کے گھر سے ملنے والے رقعے پر درج کیے گئے تھے۔ سب سے نمایاں اور تشویش ناک بات یہ تھی کہ ناتھن کے پاس اب ایک آتشیں ہتھیار بھی تھا۔

کریگ دانت پیس کر رہ گیا۔ ناتھن پھر ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ کریگ نے اخبار بند کیے۔ سنبھالا اور واپس گراؤنڈ فلور کی طرف بھاگا۔ اس کا رخ تہ خانے کے بجائے سیدھا بیرونی دروازے کی جانب تھا۔

☆☆☆

پچھلے پانچ میل سے وہ کار متواتر ناتھن کی ہنڈا کی تعاقب میں تھی۔ ناتھن نے کئی بار رفتار بڑھا کر اسے پیچھے چھوڑنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ ناتھن نے ایک آدھ بار رفتار انتہائی کم کر کے عقبی کار کو آگے نکلنے کا موقع دیا۔ تاہم نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات... وہ کار مستقل ناتھن کی ہنڈا کے عقبی بمپر کے ساتھ لگی رہی۔ متعاقب کی تیز ہیڈ لائٹس، بیک ویو اور سائڈ مرر میں ناتھن کی آنکھوں کو خیرہ کرتی رہیں۔

وہ جو کوئی تھا، ناتھن کے پیچھے تھا۔ ناتھن کو کوئی شبہ نہیں رہا تھا۔ رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ ناتھن مرکزی سڑک کے بجائے ذیلی سڑکیں استعمال کر رہا تھا۔

وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے عقب میں موجود کار کے ساتھ کوئی دوسری گاڑی نہیں تھی۔ ناتھن یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ تعاقب کنندہ کون شخص ہے اور اس کے مقاصد کیا ہیں؟ ایک اقدام پر اسے اطمینان تھا کہ وہ ریوالور ساتھ لے آیا تھا۔ علاوہ ازیں اس نے نکلنے سے پیشتر ٹیپ کی مدد سے لائسنس پلیٹ کے دو ہندسے تبدیل کر دیے تھے۔ ایک...... کو چار بنا دیا تھا۔

☆☆☆

ڈپٹی شیرف ”اسنیڈمین“ کے اقدامات واضح تھے۔ بیک اپ کے بغیر وہ ملزم کو روکنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ آخری رپورٹ کے مطابق ناتھن مسلح تھا اور ہنڈا کار استعمال کر رہا تھا۔ ہنڈا کے پیچھے لگے ہوئے اسنیڈمین نے بارہ میل گزار دیے تھے۔

ہیڈ لائٹس کی روشنی میں اسنیڈمین دیکھ رہا تھا کہ ہنڈا کے ڈرائیور کا سر نشست کی پشت سے چند انچ ہی اوپر تھا۔ اسے کوئی شک نہیں تھا کہ وہ کوئی لڑکا ہے۔ لائسنس پلیٹ پر لڑکے نے جو تبدیلی کی تھی وہ پولیس کو جھانسا دینے کے لیے قطعی ناکافی تھی۔

اچانک اسنیڈمین کا ریڈیو بیدار ہوا۔

اسنیڈمین نے ڈیش بورڈ سے مائیک اٹھا کر بٹن دبایا۔ ”بیکر ففٹین 15 چارلی سیون۔“ اس نے عقبی شیشے میں جھانکا۔ جیری ہنٹ کی گاڑی ڈپٹی شیرف کے ساتھ آن ملی تھی۔ ”امکانات بلند تر ہیں۔ سامنے ہنڈا کار ہی ہماری مطلوبہ گاڑی ہے۔“ اسنیڈمین نے مائیک منہ سے لگایا۔

”روکنا ہے اسے؟“ جیری نے سوال کیا۔

”ابھی نہیں۔ کمانڈ سکس... 6 پہنچنے والی ہے۔“ اسنیڈمین نے جواب دیا۔ ”ان کو اس وقت مجلسی روڈ اور روٹ نمبر 168 پر ہونا چاہیے۔ جنکشن کے ساتھ۔“

”اوکے۔“

”کمانڈ 6، بیکر 15۔“ اسپیکر سے آواز آئی۔ ”ہم پہنچ گئے ہیں۔“ یہ سارجنٹ رانس تھا۔

”روڈ بلاک؟“

”یس، روڈ بلاک۔“

☆☆☆

ناتھن کا دل ڈوب سا گیا۔ اس نے عقب میں ہیڈ لائٹس کا دوسرا جوڑا دیکھا۔ فوراً ہی گاڑی کی چھت پر سرخ اور نیلی روشنی گردش کرنے لگی۔ اور یہ پولیس والے ہیں۔

”گھبراؤ مت۔“ ناتھن نے خود کو سمجھایا۔ وہ اس کا ذہن تیزی سے کوئی حل تلاش کر رہا تھا۔ انہوں نے ابھی تک اسے نہیں روکا تھا۔ لیکن بالیقین وہ جلد ہی کچھ کرنے والے تھے۔ ناتھن نے عالم سراسیمگی میں دائیں بائیں جھانکا۔ ایکسلریٹر پر پاؤں کا دباؤ از خود بڑھتا گیا۔ اس نے سائڈ مرر میں عقبی منظر دیکھا۔ اس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ عقب میں ہیڈ لائٹس کے مزید دو جوڑے شامل ہو گئے تھے گویا پولیس کی چار گاڑیاں اس کے پیچھے تھیں۔ ان کی چھت پر مخصوص روشنی گردش کر رہی تھی۔ پھر اچانک فضا میں سائرن کی کریہہ چیخ بلند ہونے لگی۔ ناتھن کا دل اس کے سینے میں پھڑ پھڑانے لگا۔

اس نے سامنے دیکھا تو سو گز کے فاصلے پر سڑک بلاک تھی۔ پولیس کارز کی چھتوں پر سرخ اور نیلی روشنیاں دائرے کی شکل میں آگے پیچھے دوڑ رہی تھیں۔

ناتھن گویا چوہے دان میں پھنس گیا تھا۔ کچھ سجھائی نہیں دے رہا تو اس نے فیصلہ کیا کہ بھاگتے رہو۔ ایکسلریٹر پر مزید دباؤ نے اسے فلور کے ساتھ لگا دیا تھا۔ گاڑی فراٹے بھر رہی تھی۔

اسنیڈمین کو اپنی بصارت پر شک ہوا۔ اس نے ناقابل یقین نظروں سے دیکھا۔ ہنڈا اس سے دور ہوتی

جا رہی تھی لیکن کہاں؟ سامنے راستہ بند تھا۔ دو پولیس گاڑیاں ترچھی بمپر ٹو بمپر کھڑی تھیں۔ دونوں بمپرز کے درمیان محض بارہ انچ کا فاصلہ تھا۔

”لڑکا پاگل ہو گیا ہے؟“ اسٹینڈ مین بڑبڑایا اور مائیک سنبھال کر چیخا۔ ”سارجنٹ وہ تمہارے اوپر چڑھائی کر رہا ہے۔“

ماتھن کو کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اس کے کان شائیں شائیں کر رہے تھے۔ ایک ہی خیال ذہن میں تھا کہ ناکا توڑ کر کسی بھی طرح نکل جانا ہے۔ آگے کیا ہوگا؟ اسے پتا نہیں تھا۔

درمیانی فاصلہ برق رفتاری سے کم ہو رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ کے ساتھ پیوست تھے۔ دائیں ٹانگ جیسے اکڑ گئی تھی۔ ٹانگ کے نیچے پیڈل فلور کے ساتھ چپک گیا تھا۔

ماتھن ناکے کے سر پر تھا۔ محض بارہ گز دور۔ نیا: کن تصادم میں صرف لمحاتی فاصلہ باقی تھا۔ دفعتاً اس نے گاڑی سائڈ واک پر چڑھا دی۔ زوردار دھچکے نے اسے سیٹ پر سے اچھال دیا۔ یوں لگا جیسے گاڑی الٹنے والی ہے۔ ذرا سسپنشن لائن کی کنکریٹ پر رگڑ نے خوفناک آواز پیدا کی۔ ایک اور جھٹکا لگا اور ہنڈا کا رشتہ زمین سے منقطع ہو گیا۔ گاڑی سائڈ واک سے ٹکرانے کے بعد ہوا میں تیر گئی تھی۔

ماتھن دیوانہ وار اسٹیئرنگ سے لڑ رہا تھا۔ دایاں پیڈل، گاڑی کے ہوا میں بلند ہونے سے پہلے ہی اس نے چھوڑ دیا تھا۔ پہلے گاڑی کا دایاں پہیا اوس میں بھیگی گھاس سے ٹکرایا۔ گاڑی مزید دائیں جانب جھکتے جھکتے رکی اور دائیں بائیں پہیے پر گری۔ بعدازاں یکے بعد دیگرے، عقبی دونوں پہیے زمین سے ٹکرائے۔ ماتھن نے بریک لگائے۔ گیلی گھاس پر گاڑی لٹو کی طرح گھومی۔ ماتھن کے بدن کا ہر مسام پسینا اگل رہا تھا۔ شدید افراتفری میں وہ بارہ گز کے فاصلے سے شاٹ گن نہیں دیکھ پایا تھا۔ اسے ہوش اس وقت آیا جب ناکے سے چلنے والی شاٹ گن کے دھماکے نے اسے نیم بہرا کر دیا۔

گھومتی، پھسلتی گاڑی میں گولی پسنجر سیٹ کی کھڑکی کا شیشہ توڑتی ہوئی، ونڈ اسکرین سے گزر گئی۔ گاڑی کے اندر اور بونٹ پر شیشوں کے ان گنت چھوٹے بڑے ٹکڑوں کی برسات ہوئی۔

ماتھن کے ذہن میں یہی خیال آیا کہ اسے مارنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ بھاگتے رہو۔

اس نے دھندلی آنکھوں سے جائزہ لیا۔ وہ ناکے سے آگے تھا لیکن سڑک فاصلے پر تھی۔ اس کی گاڑی الٹنے سے بچ گئی تھی اور حیرت انگیز طور پر انجن بھی کام کر رہا تھا۔ تاہم اس کی اپنی حالت غیر تھی۔

ماتھن نے گاڑی گیئر میں ڈالی اور دوبارہ سڑک کا رخ کیا۔ سڑک پر پہنچتے ہی اس نے رفتار بڑھانی شروع کی۔ ناکا پیچھے رہ گیا تھا۔ ایک اور دھماکا ہوا اور ونڈ شیلڈ کا بچا کچھا حصہ بھی غائب ہو گیا۔

ماتھن نے سر جھکا کر رفتار بڑھائی تو یہ خوفناک انکشاف ہوا کہ ہنڈا کی رفتار بڑھنے کے بجائے کم ہو رہی ہے۔ اس نے پیڈل کو دبایا لیکن انجن بند ہو چکا تھا۔

خوف و دہشت نے ماتھن کو جکڑ لیا۔

”اوہ، نو... مائی گاڈ، اوہ گاڈ ابھی نہیں۔“ تاہم بالآخر گاڑی سڑک کے عین درمیان رک گئی۔ ماتھن سکتے کی کیفیت سے دوچار تھا۔ اس کے دماغ نے پیدل بھاگنے کی ترغیب دی۔ یہ ایک بے معنی ترغیب تھی۔ وہ بے دست و پا ہو چکا تھا۔ اسٹینڈ مین اس کے سر پر پہنچ گیا تھا۔

”ہاتھ سامنے رکھو ورنہ کھوپڑی اڑا دوں گا۔“ وہ غرایا۔

ماتھن ساکت بیٹھا تھا۔ مسافت تمام ہو گئی تھی۔ یہ اس کی بھاگ دوڑ کا اختتام تھا۔ اس نے دھیرے دھیرے ہاتھ بلند کر دیے۔ دوڑتے قدموں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

”باہر نکلو۔“ کسی نے حکم دیا۔

”ماتھن۔“ کوئی چلایا۔ ”نشست پر گن موجود ہے۔“

دو ہاتھوں نے اسے گاڑی سے باہر گھسیٹ لیا۔ شیشے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے اس کے ہاتھ، چہروں اور پیٹ کو مجروح کر گئے۔ اس کی ناک سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ اسے ہتھکڑیاں پہنا کر پولیس کار میں منتقل کر دیا گیا۔

☆☆☆

پوائنٹر نے ٹاؤن شپ کی پولیس میں مکمل طور پر جانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ خود کو بریڈک کاؤنٹی کا افسر ظاہر کرے گا جس کی ذمے داری تھی کہ پنسلوانیا میں ”کیبس“ کی کارکردگی پر نظر رکھے۔

اس کی وردی اور شناخت اصل کے مطابق تھی۔ بیج پر اس کا نام ”جیری رابرٹسن“ لکھا تھا۔

اس وقت وہ جینگر ٹاؤن شپ کے ہوٹل میں موجود تھا۔ اس کی توجہ ٹی وی پر چلنے والی اسپیشل رپورٹ کی جانب تھی۔ ماتھن کی تصویر نے پوری اسکرین کو گھیرا ہوا تھا۔ عنوان تھا۔ ”پولیس کی تحویل میں۔“

اناؤنسر بتا رہی تھی۔ ملک کا مقبول ترین ”مفرور“ پولیس کی گرفت میں۔ نیوز کاسٹر کے مطابق، ناتھن کو ”پٹ نم“ کاؤنٹی، نیو یارک میں رکھا گیا تھا۔ پوائنٹر کا منہ بن گیا۔ وہ جانتا تھا کہ مذکورہ کاؤنٹی، نیو یارک کے انتہائی جنوبی حصے میں واقع تھی۔ اس کا مطلب ”ٹارگٹ“ تک پہنچنے کے لیے، پوائنٹر کو مزید چند گھنٹے درکار تھے۔

☆☆☆

سارجنٹ وانس نے ناتھن کی گرفتاری کی رپورٹ مکمل کی تو گھڑی ساڑھے چار بجنے کا اعلان کر رہی تھی یعنی صبح ابھی فاصلے پر تھی۔ اس نے رپورٹ لفافے میں منتقل کر کے شیرف مرفی کا پتا درج کیا۔

لابی کا دروازہ کھلنے کی آواز نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ اس وقت کسی کی آمد وہاں قطعی غیر متوقع تھی۔ وانس نے اجنبی پولیس اہلکار کو دیکھا اور اسے پہچاننے میں ناکام رہا۔

”گڈ مارننگ۔“ پوائنٹر نے مسکرانے کی کوشش کی۔

”رات کافی ہنگامہ رہا۔“ وہ بولا۔

وانس، فخریہ انداز میں مسکرایا۔ ”ہاں، کچھ ایسا ہی رہا مگر میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”میرا نام رابرٹسن ہے۔“ پوائنٹر نے سکون سے جھوٹ بولا۔ ”میرا تعلق برونکس کاؤنٹی پولیس ڈپارٹمنٹ سے ہے۔ میں یہاں ضروری کارروائی نمٹانے آیا ہوں تاکہ ناتھن کی واپسی کا بندوبست کیا جا سکے۔ میرا مطلب ہے، واپس ورجینیا اسٹیٹ۔“ اس نے لابی کا جائزہ لیا۔ ”کافی سناٹا ہے۔ لگتا ہے تم اکیلے ہو؟“

وانس نے شانے اچکائے۔ ”فی الحال تو میں اور ڈگ ہی یہاں موجود ہیں۔“ وہ میز پر کاغذات کی جانب متوجہ ہو گیا۔ تاہم جواب دیتے ہی اسے احساس ہو گیا تھا کہ اسے تنہائی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے تھا۔

وانس نے دوبارہ سر اٹھایا تو پوائنٹر گن نکال چکا تھا بلکہ گولی میز کے عقب میں موجود سارجنٹ وانس کی جانب اپنا سفر شروع کر چکی تھی۔

☆☆☆

ناتھن غنودگی کے عالم میں تھا۔ جب اس نے مشکوک آواز سنی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ ایک عجیب سی آواز تھی۔ جیسے کسی نے برتن میں پھنسا ہوا کارک جھٹکے سے کھولا ہو۔ اس کے فوراً بعد فرنیچر کے گرنے کی آواز سنائی دی اور پھر مہیب سناٹا۔

ناتھن کے کان کھڑے ہو گئے۔ معاً کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔ فوراً ہی وہی آواز دوبارہ آئی جس نے ناتھن کو چوکنا کر دیا تھا۔

ناتھن کے دماغ میں گھنٹیاں بجنے لگیں۔ اس کی چھٹی حس شدید خطرے کا اعلان کر رہی تھی۔ اسے فی وی کا مبر بز ”کاپس“ یاد آئی۔ اس نے آواز پہچان لی تھی۔ کسی نے سائلنسر لگے ہتھیار سے دو فائر کیے تھے۔ ناتھن کا لہو رگوں میں منجمد ہو گیا۔ اس کا بھیانک خواب ابھی جاری تھا۔

کسی کے قدموں کی آواز کوٹھری کی جانب آ رہی تھی جو کوئی بھی تھا، مسلح تھا اور ناتھن کو ٹھکانے لگانے آ رہا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے کسی پولیس والے کو بھی مارنے سے دریغ نہیں کیا تھا۔

”نا… نا… ناتھن۔“ قدموں کی آہٹ کے ساتھ اجنبی آواز نے اس کا نام گنگنایا۔

کوئی نامعلوم عنصر تھا، اس گنگناہٹ میں جس نے ناتھن کا خون خشک کر دیا۔

”ناتھن… بے… بی… بی… بی…“ وہی گنگناہٹ پھر کسی کا قہقہہ سنائی دیا۔ ”اب کہاں بھاگو گے؟“ قدموں کی آہٹ قریب آ گئی تھی۔

کوئی شک نہیں تھا کہ وہ ناتھن کی جان لینے آ رہا تھا۔ کوئی بے رحم قاتل۔ جو شکار کی بے بسی پر لطف اندوز بھی ہو رہا تھا۔ یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا کہ وہ کون ہے؟

ناتھن بند کمرے میں پھنسی ہوئی بلی کی طرح ہراساں تھا۔ وہ بوکھلایا ہوا کمرے میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ ٹوٹا پھوٹا پلنگ اسے قاتل سے کہیں بچا سکتا تھا۔ کچھ نہیں سوجھا تو وہ دروازے کی اوٹ میں ہو گیا۔ دفعتاً اس کی نگاہ پلنگ کے ڈگمگاتے ہوئے پائے کی جانب گئی۔ اس نے لپک کر پائے کو دبوچ لیا اور تھوڑی سی جدوجہد کے بعد بوسیدہ پلنگ کی ایک ٹانگ اس کے ہاتھ میں تھی۔ اسی وقت سیل کے دروازے میں موجود قفل میں چابی گھومنے کی آواز آئی۔ کمرے میں نیم تاریکی تھی۔

ناتھن پھرتی سے دوبارہ دروازے کے ساتھ دیوار سے چپک گیا۔ دروازہ کھلتے ہی اسے خود بخود دروازے کی آڑ مل جاتی۔ اس کا دل حلق میں دھڑک رہا تھا۔

وہ جونہی دیوار کے ساتھ لگا، دروازہ کھل گیا۔ ناتھن نے دونوں ہاتھوں سے پلنگ کا پایہ تھاما ہوا تھا۔ پہلے ہتھیار بدست بازو اندر آیا۔ ناتھن نے تم سے جسم و جان کی تمام تر قوت جمع کر کے وار کیا۔ گن قاتل کے ہاتھ سے نکل کر زمین پر گری۔

پوائنٹر کے حلق سے دبی سی کراہ خارج ہوئی۔ وہ

مختصر قید خانے میں در آیا۔ ناتھن کی آنکھوں میں حیرت ہی حیرت تھی۔ وہ ناقابلِ یقین نظروں سے اپنے سامنے ایک پولیس مین کو دیکھ رہا تھا۔

"کون ہو تم؟" ناتھن نے پوائنٹر کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پوائنٹر جواب دینے کے بجائے گن اٹھانے کے لیے جھکا۔ ناتھن کے پاس سوال جواب کرنے کا وقت نہیں تھا۔ اس کے بدن کا ریشہ ریشہ تن گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے پاس انتہائی قلیل وقفہ ہے۔ پوائنٹر کی حرکات میں بلا کی تیزی تھی۔ وہ گن اٹھا کر سیدھا ہو رہا تھا۔ ناتھن نے دونوں ٹانگیں پھیلا کر، ہاتھوں میں موجود لکڑی کا بھرپور وار پوائنٹر کے سر پر کیا۔ اس مرتبہ وہ مکمل بے ہوش ہو گیا۔

ناتھن کو حیرت ہوئی کہ سر پر چوٹ کھانے کے باوجود نامعلوم پولیس مین یا قاتل کے حلق سے کوئی آواز نہیں نکلی تھی۔ نہ اس نے گن ہاتھ سے جانے دی تھی۔ وہ لوٹ لگا کر ناتھن سے دور ہو گیا۔

ناتھن کو لگا کہ جے ڈی سینٹر کا خوفناک منظر دہرایا جا رہا ہے۔ آخر یہ لوگ میری جان کے دشمن کیوں ہو گئے ہیں؟ اور یہ ایک دوسرے کو کیوں مار رہے ہیں؟

بھاگو... ایک بار پھر بھاگو... اس کے ذہن نے نعرہ لگایا۔

پوائنٹر کے سنبھلنے سے پہلے وہ قید خانے سے باہر ہو گیا۔ دہشت اس کی رفتار کم کرنے میں ناکام رہی تھی۔ اس کا ریوالور، ظاہر ہے کہ پولیس نے اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ تاہم ڈیوک کے جوتے اب بھی اس کے پیروں میں تھے۔ آناً فاناً وہ نیم تاریکی میں پولیس اسٹیشن سے نکل گیا۔

بھاگو... بھاگو... وہ پوری قوت سے اندھادھند دوڑ رہا تھا۔

☆☆☆

سارج... اوہ نو... مائی گاڈ!" شٹ کا فقرہ ادھورا رہ گیا۔ اس نے فی الفور پستول نکالا اور سارجنٹ ڈانس کی لہولہان لاش سے صرفِ نظر کرتے ہوئے، ہال وے سے گزر کر کوریڈور کا رخ کیا۔

اس کے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ وہ پوری طرح چوکس تھا۔

دوسری جانب پوائنٹر کو شٹ کی موجودگی کا احساس ہو گیا۔ وہ ناتھن کے سیل سے نکل کر کوریڈور کی دیوار کے ساتھ منہ لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ کراہ رہا تھا۔

شٹ نے گن دونوں ہاتھوں میں لے کر فائرنگ پوزیشن اختیار کی ہوئی تھی۔ وہ قدم بہ قدم آگے جا رہا تھا۔ کوٹھری میں جھانک کر اس نے ناتھن کی غیر موجودگی کا تعین کیا۔ پھر زمین پر بیٹھے ساتھی اہلکار کی جانب متوجہ ہوا جس کا سر سینے پر جھکا ہوا تھا۔

شٹ کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ اگلے لمحے کیا ہونے والا ہے۔ جیسے ہی اس نے گن واپس ہولسٹر میں منتقل کی۔ پوائنٹر اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ شٹ کا منہ کھلا رہ گیا۔ پوائنٹر کی چلائی ہوئی گولی نے اس کا کام تمام کر دیا تھا۔

پوائنٹر کو سیلنجر کا خیال آیا۔ دو عدد قانون کے رکھوالے مارے جا چکے تھے۔ یہ امر سیلنجر کو برہم کرنے کے لیے کافی تھا۔ کیونکہ ایسی صورت حال میں تفتیش کا دائرہ نہ صرف وسیع ہو جاتا بلکہ اس میں شدت اور سرگرمی کا شامل ہونا لازمی امر تھا۔ تاہم پوائنٹر کے پاس اس کے سوا چارہ بھی کوئی نہیں تھا۔

اس کے شیطانی دماغ میں نئے منصوبے کے خدوخال نمایاں ہونے لگے۔ ناتھن کو پہلے ہی "کاپ کلر" تصور کیا جا رہا تھا۔ پولیس اسٹیشن کی صورت حال بھی عکاسی کر رہی تھی کہ ناتھن ایک بار پھر قتل کر کے بھاگ نکلا۔

"ناتھن، تم بہت گندے بچے ہو۔" پوائنٹر نے داخلی ڈیسک کی جانب چلتے ہوئے سرگوشی کی۔ "اب تمہاری بکواس کوئی نہیں تسلیم کرے گا۔ شاید تمہیں اس کا موقع ہی نہ ملے۔"

سارجنٹ ڈانس کی لاش سے بچتے ہوئے وہ ڈیسک پر پہنچا۔ جہاں سیکیورٹی کیمرے نصب تھے۔ اس کی نظر گھڑی پر پڑی۔ پانچ بج رہے تھے۔ تیزی سے کام ختم کر کے اس نے باہر کا رخ کیا۔

گن اور دونوں ٹیپس اس کی جیب میں تھیں۔

☆☆☆

بیدار ہونے اور فون اٹھانے سے قبل، چھ بار گھنٹی شور مچا چکی تھی۔

"دِس از مائیکل۔" اس نے خوابیدہ آواز میں کہا۔

"ہائے مائیکل، میں جیگر بات کر رہا ہوں۔"

"ہاں، کہو... کیا افتاد آن پڑی ہے؟" مائیکل نے بیٹھتے ہوئے، سائیڈ ٹیبل کا لیمپ روشن کر دیا۔

جیگر نے مختصر الفاظ میں ناتھن نیگل کی گرفتاری کی کہانی بیان کی۔ اور انکشاف کیا کہ اس مرتبہ وہ شیرف کے دو ماتحتوں کو گولی مار کے فرار ہو گیا۔

"دونوں زندہ ہیں یا...؟" مائیکل کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ وہ پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔

"زندہ...؟ ان دونوں کو سانس لینے کا موقع بھی نہیں

ملا۔ ہیکر نے بتایا۔

"کیا بکواس ہے؟"

"مائیکل، حقیقت بتا رہا ہوں۔ دونوں نے موقع پر ہی دم توڑ دیا۔"

"اس کے پاس ہتھیار کہاں سے آیا؟"

"اس نے ایک گن چھین کر دونوں کو گولی ماردی۔"

"ورنہ یہ کوئی کمانڈو نہیں ہے۔"

"یقین تو مجھے بھی نہیں آیا دوست لیکن واردات کچھ ایسی ہی ہے۔" ہیکر نے جواب دیا۔ مائیکل خاموشی کے سمندر میں ڈوب گیا۔

"کیا ہم دونوں دشمن کے ہاتھوں بے وقوف بنتے رہے؟"

"معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔"

نہیں یہ ممکن نہیں ہے۔ مائیکل نے بددلی کے ساتھ سوچا۔ "ٹھیک ہے۔ میں نیویارک کے لیے نکل رہا ہوں۔ ہم دیکھیں گے کہ دشمن کی گرفتاری کے سلسلے میں کیا کر سکتے ہیں۔ تم یہاں سب کو اطلاع کردو۔ جو وہاں پہنچنا چاہے پہنچ سکتا ہے اور تم تھامس سے ملتے ہوئے آنا۔"

"او کے باس۔"

☆☆☆

"نہیں۔" زیزی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ خبر سن رہی تھی۔ اسے لگا جیسے اس کا دل کسی نے مٹھی میں لے لیا ہے۔ خبروں کے الفاظ کسی پگھلی ہوئی دھات کی طرح اس کے کانوں میں اتر رہے تھے۔

نہ سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ قید کی حالت میں، کوئی بچہ تربیت یافتہ پولیس سے گن چھین کر انہی کو مار ڈالے...

عورتوں کی مخصوص حس، اس کا تجربہ... احساسات اب بھی مختلف تھے۔ لیکن ٹی وی پر جو کچھ دکھایا جا رہا تھا، اسے تبدیل کرنا کسی کے بس میں نہیں تھا۔

زیزی کو پتا ہی نہیں چلا۔ کب اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ کچھ دیر بعد اس نے خود کو سنبھالا اور ڈزموراکو فون ملایا جس نے پہلی گھنٹی پر ہی فون اٹھالیا۔ غالباً وہ زیزی کے فون کی توقع کر رہا تھا اور جانتا تھا کہ وہ کیوں فون کرے گی۔ لہٰذا اس نے زیزی کی آواز سنتے ہی، دھیرے سے مختصر جواب دیا۔

"ہاں، مجھے بھی ابھی معلوم ہوا ہے۔"

☆☆☆

پولیس اسٹیشن سے فرار ہونے کے ایک گھنٹے بعد ماتھن کی سماعت سے سائرن کی آوازیں ٹکرانا شروع ہوگئیں۔ وہ ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ کی سیڑھیوں کے نیچے چھپا ہوا تھا۔

معاً اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اسے چھپنے کے لیے رکنا نہیں چاہیے تھا۔ پولیس اسٹیشن سے بھاگتے وقت اس کی نگاہ میز پر پڑی تھی، وہ پولیس والا یقیناً مر چکا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں تھا۔ ماتھن کو سائلنسر لگے ہتھیار کی فائرنگ بھی یاد آئی۔ اس وقت افراتفری میں اضطراری طور پر اس نے ردعمل ظاہر کیا تھا اور جان بچا کر نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

اب اس کے حواس واپس آرہے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس کی کوٹھری میں گھسنے والا اسے ختم کرنا چاہتا تھا لیکن کیوں؟ وہ پولیس والا تھا تو اس نے اپنے ساتھی کو کیوں مارا؟ ماتھن کو اس کی گنگناہٹ یاد آئی۔

"ٹا... ٹا... ماتھن... اب کہاں بھاگو گے؟"

نہیں وہ پولیس والا نہیں تھا۔ سوچ سوچ کے ماتھن کا دماغ دکھنے لگا۔ بس اتنا ہی سمجھ آیا کہ وہ جو کوئی بھی تھا اسے مارنے آیا تھا۔ دوم ڈیسک والے پولیس مین کو بھی اسی نے مارا تھا۔ سوم، اس کی وردی پولیس کی تھی۔ تاہم وہ پولیس والا نہیں تھا۔

ماتھن کے لیے صورت حال پہلے سے زیادہ خطرناک تھی۔ ایک پولیس والا مر چکا تھا۔ اگر جعلی پولیس والا نکل گیا تو سب یہی سمجھیں گے کہ ماتھن نے ایک اور قتل کر دیا ہے اور پولیس اس کے خون کی پیاسی ہو چکی ہوگی جبکہ جعلی پولیس والا بھی اس کی جان کا دشمن تھا۔

اسے یہاں چھپنے کے بجائے، ایک گھنٹے کی مہلت میں زیادہ سے زیادہ دور نکل جانا چاہیے تھا۔ اب تک پولیس نے علاقہ گھیر لیا ہوگا۔ یعنی وہ پولیس کے گھیرے میں پھنسا ہوا تھا۔ اس کا خیال پھر جعلی پولیس مین کی جانب چلا گیا۔ کیا وہ جے زی سینٹر میں مرنے والے دکی ہیرس کا کوئی رشتے دار تھا؟ ماتھن کی عقل اس گتھی کو سلجھانے میں ناکام تھی۔ ماتھن نے دھیان ہٹا کر اپنے اگلے قدم کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آیا سوائے اس کے کہ کسی نہ کسی طرح آگے بڑھتا رہے۔

ماتھن کے ذہن میں ایک ہی بات تھی کہ تھانے سے زیادہ سے زیادہ دور چلا جائے۔ یہ شہری علاقہ نہیں تھا۔ تنگ گلیاں، چھوٹے مکانات اور دکانیں، اپارٹمنٹ والی عمارتیں زیادہ تھیں۔ کئی منزلہ عمارتیں...

وہ ایک عمارت کے اجاڑ احاطے میں تھا۔ جب افق پر

نارنجی سرخی نے جھلک دکھانا شروع کی۔ وہ پھر سوچ میں پڑ گیا۔

اس کے بائیں جانب ایک دروازہ تھا جس کے پیچھے سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔ سیڑھیوں کے ایک طرف دیوار اور دوسری طرف گرل بنی ہوئی تھی۔ تہ خانہ، اس نے سوچا۔ یہ مکان کا نہیں بلکہ کئی منزلہ اپارٹمنٹ بلڈنگ کا تہ خانہ تھا۔ گرل اور دروازے کی حالت سے عیاں تھا کہ تہ خانہ عام طور پر زیر استعمال نہیں ہے۔ وہاں چوہے، اندھیرا، کاکروچ وغیرہ ہوں گے۔ ناتھن نے دروازے پر ہاتھ رکھا، وہ کھلا ہوا تھا۔

☆☆☆

چیڑرلی کو واشنگٹن پوسٹ کے رپورٹر کے ذریعے سب سے پہلے خبر ملی تھی۔ وہ اس وقت اسٹیٹ پولیس کے ہیلی کاپٹر میں سفر کر رہا تھا۔ اچانک تبدیل شدہ صورت حال چیڑرلی کے حق میں استوار ہو گئی تھی۔ چیڑرلی نے اپنی مسرت کو چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ کئی روز سے وہ خود کو ایک اذیت تصور کر رہا تھا۔ وہ بھی محض ایک بچے کی وجہ سے۔ لیکن اب میڈیا کو چیڑرلی کی دانش اور تجربے پر انگلی اٹھانے کا موقع نہیں ملے گا بلکہ کوئی بھی اس کے آڑے نہیں آسکے گا۔ نئی صورت حال نے اس کی پوزیشن مستحکم کر دی تھی۔ وہ خود کو ایک دانشور اور فلسفی کے روپ میں دیکھ رہا تھا۔ اب اس کی تھیوری کو چیلنج کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

☆☆☆

سائی بازل نے ناب پر ہاتھ رکھا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ وہ، مسٹر سلیٹر کے آفس میں تھا۔ وہ سلیٹر کی ڈیسک کے قریب خاموشی سے ایستادہ ہو گیا۔ دونوں کو معلوم تھا کہ کیا بات ہونے جا رہی ہے۔ سلیٹر کے لیے یہ ایک مشکل گھڑی تھی لیکن سائی کے لیے نہیں... وہ تو عرصے سے اس کام کا منتظر تھا۔

سلیٹر اپنا ذاتی قانون نافذ کرنے کے لیے پچیس سال سے سائی پر انحصار کرتا آیا تھا۔ دونوں کی عمروں میں دس سال کا فرق تھا۔ تمام برسوں کے دوران غیر قانونی کاروبار چلتا رہا۔ سلیٹر کے لیے کام کرنے والے آئے بھی اور گئے بھی۔ جانے کا ہمیشہ ایک ہی راستہ ہوتا تھا۔ تاہم سائی کی وفاداری اور پوزیشن ہمیشہ مستحکم رہی تھی۔

دونوں کو یقین تھا کہ پوائنٹر ہمیشہ کی طرح اپنا کام خوش اسلوبی سے نمٹالے گا لیکن ایسا نہیں ہو سکا تھا۔ خود سلیٹر کے لیے یہ ایک حیرت انگیز حقیقت تھی۔ پوائنٹر ایک بچے کو قابو کرنے میں ناکام رہا تھا۔ یہ چیز پوائنٹر کے سابقہ ریکارڈ کے برخلاف تھی۔ اس کے ریکارڈ کی وجہ سے ہی سلیٹر نے پوائنٹر کو دوسرا موقع دیا تھا جبکہ دوسرا موقع فراہم کرنے کا وہ قائل نہیں تھا۔ پوائنٹر اس کا ایک قیمتی مہرہ تھا۔

سلیٹر کو جو چیز سب سے بڑھتا نظر آ رہی تھی وہ، پوائنٹر کے ہاتھوں دو پولیس والوں کی ہلاکت تھی۔ یہ ہلاکتیں سلیٹر کے غیر قانونی کاروبار کے لیے نئے خطرات کھڑی کر سکتی تھیں۔

"کیا تم سمجھ رہے ہو کہ آج کی ملاقات کا کیا مقصد ہے؟" سلیٹر نے سائی کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"بالکل جناب۔" سائی نے نشست سنبھالتے ہوئے جواب دیا۔ "ہمیں اب پوائنٹر کو دور کرنا ہوگا۔"

سلیٹر نے اثبات میں سر ہلایا۔ "مطلب، اسے کمد ور کر دیا جائے؟"

"نہیں جناب... پولیس ہلاکتوں کے پیچھے ناتھن نہیں بلکہ کسی اور کا ہاتھ ہے۔ جیسے ہی یہ بات کھلے گی، ہمارے لیے نئی مشکلات کھڑی ہو جائیں گی۔" سائی نے کہا۔

"پھر؟"

"ہمیں، پوائنٹر کی قربانی دینی پڑے گی۔" سائی نے جواب دیا۔

"تمہاری رقم ہے، کیا ہم رقم کو بھول جائیں؟"

سائی نے رک کر جواب دیا۔ "رقم کو بھولنا ہی بہتر ہے۔ اتنا معمولی کام تھا۔ جو کہ شروع سے خراب ہی ہوتا جا رہا ہے اور مزید خراب ہوتا نظر آ رہا ہے۔ بہتر ہے کہ ہم پہلی فرصت میں فل اسٹاپ لگا کر عارضی طور پر سرگرمیاں معطل کر دیں۔ بڑے نقصان سے بچنے کے لیے چھوٹا نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔"

سلیٹر ناخوش تھا۔ پیشانی پر شکنیں تھیں۔

"ناتھن کو کڈنیپ کرنے کا منصوبہ بھی پوائنٹر ہی لایا تھا۔" سائی نے مزید کہا۔

"ہونہہ۔" سلیٹر نے ہنکارا بھرا۔ "یہ کڑوا گھونٹ پینا پڑے گا۔ میں نے پوائنٹر کو بات کرنے کے لیے بلایا ہے۔"

"یس سر۔" سائی کھڑا ہو گیا۔

☆☆☆

الیگزینڈر، اینکس کے نام سے مشہور تھا۔ اس کی عمر دس سال تھی، وہ اپنی فیملی میں سب سے چھوٹا تھا بلکہ اس بلڈنگ میں بھی سب سے کم عمر تھا۔ برنی اس کا وفادار ساتھی جو چھ مہینے پہلے اسے ایک گلی میں ملا تھا۔ جب سے دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہو گئے تھے۔

ان کے اڑوس پڑوس میں رنگا فساد اور فائرنگ عام

تھی۔ کم از کم دو مرتبہ الیکس فسادوں کی زد میں آکر زخمی ہوا تھا۔ برنی کا ساتھ ملنے پر الیکس خود کو زیادہ محفوظ خیال کرتا تھا۔

وہ ان لڑکوں میں سے تھا، جو اسکول کا ناغہ نہیں کرتے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ الیکس کو پڑھائی سے دلچسپی تھی۔ اسکول میں اے سی کی ٹھنڈک تھی۔ اچھا کھانا ملتا تھا۔ دوستوں کے ساتھ کھیل کود کے مواقع تھے۔

اسکول سے ہٹ کر اس کا زیادہ وقت تہ خانے میں گزرتا تھا۔ برنی بھی ساتھ ہوتا تھا۔

اس روز بھی دونوں ساتھ تھے۔ برنی سیڑھیاں اترتے اترتے رک گیا۔ پلٹ کر الیکس کو دیکھا۔ الیکس اس کے پیچھے تھا۔ برنی ایک بار پھر رک گیا۔ اس مرتبہ اس کے حلق سے خوفناک غراہٹ بلند ہوئی۔ الیکس چونکا۔ معاً اس نے کسی چیز کے گرنے کی آواز سنی۔

”کون ہے، وہاں کون ہے۔ باہر آؤ، ورنہ میرا کتا تمہیں پھاڑ ڈالے گا۔“ الیکس نے دھمکی دی۔

خاموشی، سکوت، صرف برنی کی دھیمی غراہٹ سنائی دے رہی تھی۔ الیکس اور برنی آہستہ آہستہ تہ خانے کے گندے فرش تک پہنچ گئے۔

چند ڈبے گرے اور ان کے عقب سے ایک سفید فام لڑکے کا چہرہ نمودار ہوا۔ ناتھن پہچاننے میں الیکس نے پانچ سیکنڈ لیے۔

”تم ناتھن ہو؟“

ناتھن اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

”یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”پولیس مجھے ڈھونڈ رہی ہے۔“ ناتھن نے کہا۔

الیکس کچھ دیر تک بغور ناتھن کے خوف زدہ چہرے کو دیکھتا رہا پھر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر برنی کا غصہ ٹھنڈا کرنے لگا۔

”تم نے مجھے کیسے پہچانا؟“ ناتھن نے سوال کیا۔

”تمہیں کون نہیں جانتا، اتنی عمر میں تم نے ٹھیک ٹھاک شہرت کمائی ہے۔“ الیکس بولا۔ ”پولیس والوں کو مار کر تم نے بڑی غلطی کی ہے۔ وہ تمہیں چھوڑیں گے نہیں۔“

”میں نے کسی کو نہیں مارا۔“ ناتھن نے کہا۔ ”ایک پولیس والے نے دوسرے پولیس والے کو مارا۔ اس کے بعد مجھے مارنے کی کوشش کی۔“

”اچھا۔ تو پھر دوسرے پولیس والے کو کس نے مارا؟“

ناتھن کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ”دوسرا پولیس والا؟ کیا مطلب؟ وہاں تو اور کوئی نہیں تھا؟“

ایلکس نے ناتھن کو تفصیل بتائی۔ ناتھن کا منہ کھلا رہ گیا۔

"تو وہ لوگ ان دونوں کے قتل کا ذمے دار مجھے ٹھہرا رہے ہیں؟"

ایلکس نے اثبات میں سر ہلایا۔ کتا خاموش ہو گیا تھا۔ وہ دروازوں کی کافی دیر تک خاموش رہے۔

"اب تم کیا کرو گے؟" بالآخر ایلکس نے سوال کیا۔

"مجھے نہیں پتا۔" ناتھن نے ناامیدی سے کہا۔ "اور تم کیا کرو گے؟" اس نے ایلکس سے پوچھا۔

"اگر تمہارا اشارہ پولیس کی طرف ہے تو پولیس کو اطلاع دینے کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔" ایلکس نے جواب دیا۔

ناتھن نے سوچا کہ اب کیا بات کرے پھر وہ بولا۔

"کیا میں یہاں ایک دن کے لیے چھپ سکتا ہوں؟"

ایلکس نے بلاتوقف اتنی آسانی سے جواب دیا جیسے وہ پہلے سے اس سوال کی توقع کر رہا ہو۔ "کیوں نہیں، ضرور۔"

"تم پولیس کو کیوں نہیں بتاؤ گے؟" ناتھن نے مشکور نظروں سے سوال کیا۔

"میں اتنا چھوٹا بھی نہیں رہا۔ زندگی کی تلخیوں نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا ہے۔" ایلکس نے فلسفہ بھگارا۔ "میں نہیں سمجھتا کہ تم جیسا نازک لڑکا تنہا اور قید میں ہوتے ہوئے دو پولیس آفیسرز کو مار سکتا ہے۔" ایلکس نے برنی کے بالوں بھری گردن سہلائی۔

ناتھن نے ٹھنڈی سانس بھری اور خاموش رہا۔

"تم بھوکے ہو؟" ناتھن نے سر ہلایا۔

"میں کچھ کرتا ہوں۔" ایلکس نے کہا۔ "یہاں میں نے چند کمبل اور ایک چھوٹا ٹی وی رکھا ہوا ہے۔ پہلے میں تمہارے لیے کچھ کھانے کے لیے لاتا ہوں۔ میں اوپر کی منزل پر رہتا ہوں۔"

"کیا وقت ہوا ہے؟" ناتھن نے پوچھا۔

"میں یہاں آیا تو اس وقت ساڑھے نو بج رہے تھے، کیوں؟"

"مجھے دس بجے ایک فون کرنا ہے۔" ناتھن نے درخواست کی۔

"میں کوشش کروں گا۔" ایلکس نے وعدہ کیا۔ "میں برنی کو چھوڑ رہا ہوں۔ اس سے باتیں کرو۔ یہ تمہارا خیال رکھے گا۔ کوئی آئے تو چھپ جانا، برنی کسی کو نیچے نہیں آنے دے گا۔"

ایلکس چند منٹ برنی سے باتیں کرنے کے بعد رخصت ہونے لگا۔ ناتھن کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔

"میاں ہوشیار، سب ٹھیک ہو جائے گا۔" ایلکس نے ناتھن کا شانہ تھپتھپایا۔ "میں فون لا کر یہاں پلگ ان کر دوں گا۔ ماں باپ گھر پر نہیں ہیں۔"

☆☆☆

جب مائیکل کاؤنٹی کے شیرف آفس پہنچا تو وہاں میڈیا سرکس کا سماں تھا۔ ہال میں پہلی ملاقات ہی چیزرولی سے ہو گئی۔ مائیکل اس سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے کترا کر نکلنا چاہا لیکن چیزرولی کی نظر پڑ گئی۔

"لیفٹیننٹ مائیکل۔" چیزرولی نے بھرپور اعتماد سے پکارا۔ اس کی آواز میں تحکم کا تاثر موجود تھا۔

مائیکل نے گہری سانس لے کر چیزرولی کی جانب... پیش قدمی کی۔

"یہ سراغ رساں، لیفٹیننٹ وارڈن مائیکل ہیں۔"

چیزرولی نے دوسرے افسران سے مائیکل کا تعارف کرایا۔ "ناتھن کو پکڑنے کے سلسلے میں یہ آپ لوگوں کی مدد کرنے آئے ہیں۔"

"کیا ہم اسے گرین سگنل سمجھیں کہ ضرورت پڑنے پر لڑکے کو ختم کر دینا ہے؟" ایک ڈپٹی نے سوال کیا۔ "میرا مطلب ہے کہ وہ بچہ اور میں اپنا بقیہ کیریئر کورٹ روم میں قانونی لڑائی لڑتے نہیں گزار سکتا۔"

وہاں موجود مختصر ہجوم کی بھنبھناہٹ تیز ہو گئی۔

چیزرولی تیار تھا۔ "میں شروع سے کہتا آ رہا ہوں کہ وہ بچہ نہیں ہے۔ اسے بالغ سمجھو۔ وہ ایک وحشی قاتل ہے جس نے دو خاندانوں کو برباد کر دیا ہے۔ تمہارے سوال کا جواب یہ ہے کہ اسے گرین لائٹ سمجھو۔ ضرورت پڑنے پر تم لوگ اسے بلا دریغ گولی مار سکتے ہو۔"

مائیکل، چیزرولی کی خود غرضی اور شقاوت پر بدمزہ ہو گیا۔

"اب جاؤ اور اسے گرفتار کرو۔" چیزرولی نے طمطراق سے کہا۔

"مسٹر چیزرولی تم بچے کے لیے ڈیتھ وارنٹ ایشو کر رہے ہو۔ تم کورٹ آفیسر ہو۔ تم یہ اختیار نہیں رکھتے کہ ناتھن کو ختم کرنے کا حکم نامہ جاری کرو۔" مائیکل نے شیرف مرفی کی جانب دیکھا۔

چیزرولی برہم دکھائی دیا۔ "ہمیں یہ کام ختم کرنا ہے، وہ خطرہ بنتا جا رہا ہے۔ اگر وہ مارا جاتا ہے تو اس کا ذمے دار بھی وہ خود ہے۔ مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔"

مائیکل جانتا تھا کہ چیزرولی سے بحث کرنا بے معنی ہے۔ حالات نے جو رخ اختیار کیا تھا، وہ چیزرولی کے

موقف کے لیے کارآمد تھا۔ چنانچہ اس نے شیرف مرفی کی جانب توجہ مبذول کی۔

"شیرف۔" وہ بولا۔ "یوں لگتا ہے کہ تمہارے آدمی ایک بارہ سالہ بچے کو ختم کرنے جا رہے ہیں۔"

"دیکھو مائیکل۔" شیرف نے صبر کا مظاہرہ کیا۔ "میرے آدمیوں کو پتا ہے کہ کیا کرنا ہے۔ وہ زندہ ہاتھ آ گیا تو ٹھیک ہے اگر خطرہ بنا تو مجبوراً ہمیں اسے مارنا پڑے گا۔"

"یہ اتنا سادہ نہیں ہے۔ اگر تمہارے آدمیوں کو پتا ہے کہ کیا کرنا ہے تو اس وقت انہوں نے کیا کیا؟ جب ناتھن تنہا قید میں تھا۔ نہ وہ اسے قید میں رکھ سکے بلکہ خود ہی مارے گئے۔ ابھی یہ بھی نہیں پتا کہ درحقیقت ہوا کیا تھا۔"

"ہاں، یہ اتنا ہی سادہ ہے" شیرف کو غصہ آ گیا۔ "مجھے بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ کیا ہوا اور مجھے ڈپارٹمنٹ کیسے چلانا ہے۔ میرے دو ڈپٹی مارے گئے ہیں۔ یہ اب میرا کیس بن گیا ہے۔ یہ بولا را بنڈز رکھو اور مجھے اپنا کام کرنے دو۔" شیرف نے قلم مائیکل کے سپرد کی۔

چیبرز بھی شیرف کے پیچھے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

نہ چاہتے ہوئے بھی پوائنٹر نے سلیٹر کو فون کرنا تھا۔ وہ پُرجوش بہت ممن تھا۔ پیشہ ورانہ اس کے پیشے کا تقاضا تھا کہ وہ اپنی غلطیوں کو تسلیم کرے۔

سالی نے فون اٹھایا اور سلیٹر کو دے دیا۔ "کیا خبر وں میں سب سچ چل رہا ہے؟ کیا ناتھن پھر تمہارے ہاتھ سے نکل گیا؟ پولیس اہلکار کو کس نے مارا؟" سلیٹر نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

"میں معذرت خواہ ہوں، مسٹر سلیٹر۔" پوائنٹر نے وضاحت کرنا چاہی۔ اسے حیرت ہوئی کہ اس کی آواز میں کمزوری تھی۔

"لیکن ایسا نہیں ہوا جیسا..."

"وضاحت بند رکھو۔" سلیٹر نے حکم دیا۔ "میں مزید کوئی وضاحت سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ کیا تم نہیں سمجھ رہے کہ تم نے سارے منصوبے پر پانی پھیر دیا۔ میری پوزیشن خراب کر دی۔"

"ایسا نہیں ہے، جیسا آپ سوچ رہے ہیں۔"

"بکواس بند کرو۔" سلیٹر مشتعل ہو گیا۔ "تم کیا سوچتے ہو، مجھے پروا نہیں ہے۔ مجھے رزلٹ سے مطلب ہے اور تم نے میرا سر جھکا دیا ہے۔ اب غور سے سنو۔ لڑکے کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ واپس آ جاؤ۔ کچھ بات کرنی ہے تم سے۔"

پوائنٹر کا تنفس غیر متوازن ہو گیا۔ "مارک بیلی کا کیا ہو گا؟ کیا میں اسے..."

"مارک کو ہم سنبھال لیں گے۔ پانچ بجے میں تمہیں اپنے آفس میں دیکھنا چاہتا ہوں، سمجھ گئے؟"

"یس سر۔" پوائنٹر نے ریسیور سے فون رکھ دیا۔ وہ اپنے لرزتے ہاتھوں کو گھور رہا تھا۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس نے مٹھیاں بند کر کے کھولیں۔

پوائنٹر جانتا تھا کہ اب وہ ایک "مردہ آدمی" ہے۔ اگر وہ واپس نہیں جاتا ہے تو وہ اس کے پیچھے آ جائیں گے۔

☆☆☆

مائیکل نے شیرف آفس میں ہی ایک کمرا اپنے لیے منتخب کر لیا۔ اس نے کوئی چھٹی مرتبہ شیرف کی دی ہوئی تصاویر کا جائزہ لیا۔ ناتھن نے ایسی ڈرائنگ شوٹنگ کیونکر اور کہاں سیکھی؟ یہ ممکن نہیں ہے۔ نہ ہی تصاویر میں اسے فائرنگ کرتے دکھایا گیا تھا۔

وہ صرف فرار ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا اور سخت ہراساں تھا۔ آثار و شواہد بظاہر ناقابلِ تردید تھے۔ تاہم مائیکل کا دماغ قائل نہیں ہو پا رہا تھا۔ مائیکل نے پیڈ پر لکھنا شروع کی۔ ناتھن کے پاس گن کہاں سے آئی؟ ناتھن نے اپنی دوسری پناہ گاہ مقتول مرد کی ٹرک سے ریوالور حاصل کیا تھا۔ وہ ریوالور پولیس کے قبضے میں تھا۔ پھر دوسری گن اس نے کہاں چھپائی ہوئی تھی؟ جبکہ حوالات میں ڈالنے سے قبل اس کی اچھی طرح تلاشی لی گئی تھی۔ نہیں، دوسری گن اس کے پاس نہیں تھی۔ مائیکل نے آخری سطر کے نیچے لکیر کھینچ دی۔

وشنٹ ناتھن کے سیل کے قریب ہلاک ہوا۔ ظاہر ہے کہ پہلے وہ مارا گیا۔ لیکن ناتھن نے پولیس آفیسر سے گن کیسے چھین لی؟ ناممکن! حوالات کے سامنے والے حصے میں ڈیسک پر وائس موجود تھا۔ اگر ناتھن وشنٹ کو مار کر بھاگا تو وہ وائس کے سامنے سے گزرا ہو گا۔ دوسرے وائس نے دھماکے کی آواز پہلے ہی سن لی ہو گی۔ نہایت اہم سوال تھا۔ کہ وائس نے کوئی ردِعمل ظاہر کیوں نہیں کیا۔ وہ اپنی کرسی میں ہی موجود تھا اور اسے وہیں گولی ماری گئی۔ دو گولیاں کیوں ماری گئیں؟ ایک بالکل قریب سے اور دوسری قدرے فاصلے سے؟ جبکہ تصاویر میں ناتھن غیر مسلح تھا اور سیدھا باہر کی جانب بھاگا جا رہا تھا۔

اگر سیل کی جانب سے فائرنگ کی آواز سنائی دیتی ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وائس اپنی نشست پر آرام کرتا رہا... اور ایک بچے کے ہاتھوں اطمینان سے گولیاں کھا کر راہی

ملک عدم ہو جائے۔ تونل شٹ . . .

مائیکل نے شیرف کے ایک آدمی کو ساتھ لیا اور واچ ڈوبک پر آ گیا۔ ''او کے۔'' وہ ڈیسک کے پیچھے چلا گیا۔ ''تم والس کی جگہ یہاں بیٹھے ہو۔'' مائیکل نے پولیس اہلکار سے کہا۔ وہ سر ہلا کر رہ گیا۔ ''تمہیں ناتھن کے سیل کی جانب سے فائر کی آواز آئی ہے۔ تم کیا کرو گے؟''

''ظاہر ہے میں جائزے کے لیے اٹھ کر جاؤں گا۔''

''تمہاری گن ہولسٹر میں ہوگی؟''

''ظاہر ہے نہیں۔ میرے ہاتھ میں ہونی چاہیے۔''

مائیکل نے سر ہلایا۔ ''تو پھر والس اپنی جگہ سے کیوں نہیں ہلا اور اس کا ریوالور اس کے ہولسٹر میں کیوں تھا؟''

پولیس اہلکار نے بے بسی سے شانے اچکائے۔

مائیکل کی پیشانی پر شکنوں کا جال نمایاں ہو گیا۔

''والس کو پہلی گولی بہت قریب سے ماری گئی جو کوئی تھا، وہ والس کا جاننے والا تھا یا پھر پولیس والا تھا۔ والس کو ہلنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ اہم ترین بات یہ ہے کہ پہلے والس کو مارا گیا تھا۔'' مائیکل کی آواز سے الجھن جھلک رہا تھا۔

''سادہ سی منطق ہے۔''

پولیس اہلکار ہونق دکھائی دے رہا تھا۔

''شمٹ صبح ہی صبح کسی کام سے یا اتفاقاً وہاں آیا اور والس کی حالت دیکھ کر ریوالور ہاتھ میں لے کر اندر کی جانب بڑھا۔'' مائیکل اس طرح تجزیہ پیش کر رہا تھا جیسے اس کی آنکھوں کے سامنے فلم چل رہی ہو۔ ''شمٹ بعد میں مارا گیا ہے . . . سمجھ رہے ہو؟''

''کچھ کچھ . . .'' پولیس والے نے کہا۔

کچھ وقت کے لیے کمرے میں سکوت طاری رہا۔ فضا ویرا ابھی تک مائیکل کے ہاتھ میں تھیں۔

''شمٹ کا ریوالور کہاں تھا؟'' اچانک مائیکل نے سوال کیا۔

''ہولسٹر میں۔''

''وہ مارا۔'' مائیکل کی آواز بلند ہو گئی۔ اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ وہ لوگ اب تک ناتھن کے فرار کو، شواہد کی روشنی میں، غلط زاویے سے دیکھ رہے تھے۔ جس کی سب سے بڑی وجہ یہ بھی کہ انہوں نے ناتھن کو قاتل فرض کیا ہوا تھا۔ اس لیے دو پولیس والوں کے قتل کی تفتیش ہی نہیں ہوئی۔ مائیکل کو یقین تھا کہ شمٹ کے بدن سے جو گولی برآمد ہوگی وہ شمٹ کے ریوالور کی نہیں ہو سکتی۔

جو کوئی بھی تھا؟ اس کا ٹارگٹ پولیس والے نہیں تھے۔ وہ اصل قاتل کے ''ٹارگٹ'' کے راستے میں آ گئے اور ٹارگٹ تھا . . . ناتھن . . .

یعنی ناتھن اس وقت پہلے سے زیادہ خوفناک صورت حال سے دوچار تھا۔ مائیکل اچھل پڑا۔ ''دوست فوراً میری شیرف سے بات کراؤ۔''

☆☆☆

ہیکٹر کے ہاتھ سے فون گرتے گرتے بچا۔ مائیکل کی پیش کردہ ''ہٹ مین'' کی تھیوری ایسی ہی چونکا دینے والی تھی۔

''ہیکٹر، ذرا سوچو . . . بچہ یتیم ہے، اس کا باپ خاصی دولت چھوڑ گیا ہے۔ واحد چچا ہے، وہ بھی قلاش۔ خاص نے مارک بیلی (چچا) کی رپورٹ بھی مشکوک دی ہے۔ اگر کسی نے ناتھن کو راستے سے ہٹانے کا معاہدہ کیا ہے تو پورا معاملہ حل ہو جاتا ہے۔ ناتھن قاتل نہیں ہے بلکہ وہ صرف اپنا دفاع کر رہا ہے۔''

''میرے دوست! عزت مآب۔'' ہیکٹر نے کہا۔ ''کیا تم شک کا فائدہ دے دے کر بہت دور نہیں نکل گئے؟'' ہیکٹر نے احتیاط سے اعتراض کیا۔

''جزوی میں سمجھتا ہوں۔'' مائیکل نے جواب دیا۔ ''یاد کرو، جے ڈی سینٹر کا وڈیو سیکیورٹی سسٹم مکمل خراب نہیں تھا۔ ہمیں صرف وہی ٹیپ ملی تھی جو قاتل یا قاتل کے سرپرست ہمیں دکھانا چاہتے تھے۔ یہاں بھی ایسا ہی ہے۔ نگرانی کے کیمروں سے کئی ٹیپس غائب ہیں۔ جے ڈی سینٹر کے لڑکے کا اور مقتول رکی ہیرس کی گرل فرینڈ کا انٹرویو یاد کرو . . . ارجنٹائن کا یک طرفہ ہوائی جہاز کا ٹکٹ کس نے رکی ہیرس کو دلوایا؟'' مائیکل کی آواز پرجوش ہوتی جا رہی تھی۔

''اگر یہ سب ایسا ہی ہے تو کس نے کس سے معاہدہ کیا ہے اور کون لنڈنگ کر رہا ہے؟''

''کنٹریکٹ تو مارک بیلی نے دیا ہے۔ پھر بھی تم خاص سے رابطہ کرو۔ میں اس کی ڈیوٹی لگا آیا تھا۔ ہاں یہ نہیں پتا کہ مارک نے کنٹریکٹ کس کے ساتھ کیا ہے؟ سرپرست بینک میں رکی ہیرس کا اکاؤنٹ کھنگالو۔''

''او کے باس۔''

☆☆☆

ناتھن ایک گھنٹے سے کوشش کر رہا تھا۔ بالآخر اس کی کوشش بار آور ثابت ہوئی۔ اسے ایک شناسا آواز سنائی دی۔

''ہائے، یہ میں ہوں۔'' ناتھن نے کہا۔ ''مجھے مم سے بات کرنی ہے۔''

ڈسوزا نے آواز فوراً ہی پہچان لی تھی۔ ''ناتھن ذرا رکو،

کالرز کا رویہ کافی خراب ہو چکا ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں۔" ناتھن نے آہستہ سے کہا۔

زیزی نے تیزی سے پروگرام میں تبدیلی کرنے ہوئے ناتھن کی موجودگی کا اعلان کیا۔

"ناتھن بیٹی! تم لائن پہ ہو؟" زیزی کی رفتار نبض بڑھ چکی تھی۔

"میں نے کسی پولیس والے کو نہیں مارا۔" ناتھن کی آواز بھرا گئی۔

"مجھے خوشی ہوئی یہ سن کر۔" ناتھن کو احساس ہوا زیزی کی آواز میں پہلے جیسا یقین نہیں رہا تھا۔

"میم، آپ دوسروں کی طرح کیوں نہیں سوچتی ہیں؟" ناتھن رونے لگا۔

"زیزی، کیونکہ مجھے تم پر یقین ہے۔" زیزی نے بمشکل اپنی آواز کو نارمل رکھا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ "تم رو دوست، مجھے بتاؤ وہاں کیا ہوا تھا؟"

"یس... یں... یس... میم..." ناتھن نے خود کو سنبھالا اور ساری کہانی سنا دی۔

"وہ پولیس والا کون تھا؟" زیزی نے سوال کیا۔

"میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ پولیس والا نہیں تھا۔ مجھے نہیں پتا کہ کتنے لوگ مجھے مارنا چاہتے ہیں؟ اور کیوں؟ میں کیسے اتنے لوگوں سے بچ پاؤں گا۔ وہ سب بڑے ہیں اور خطرناک ہیں۔ ناممکن ہے... میم! آپ کا شکریہ... شاید میں آپ سے دوبارہ بات کرنے کے لیے زندہ نہ بچوں۔ میں تھک گیا ہوں۔ میں ڈر گیا ہوں۔" وہ پھر رونے لگا۔

زیزی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

"کیا تم مایوس ہو؟" زیزی نے بہ وقت تمام اپنی آواز پر قابو کیا۔

"جی... جی... نہیں۔" ناتھن نے روتے ہوئے کہا۔ "میم! میں سب لوگوں سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں، بولو... سب سن رہے ہیں۔"

"یہ لوگ مجھے کیوں مارنا چاہتے ہیں؟ کیوں؟ میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے؟ مجھے بچانے والا کوئی بھی نہیں ہے۔ کوئی میری بات پر یقین نہیں کرتا۔"

"میں یقین کرتی ہوں... تمہیں بچانے والا آسمانوں میں ہے۔ تمہیں اس پر یقین کرنا چاہیے۔"

"میں آپ سے ملنا چاہتا تھا لیکن شاید نہ مل پاؤں۔ آپ بہت اچھی ہیں۔ دنیا میں شاید بہت کم لوگ اچھے ہیں۔"

"مجھے یقین ہے کہ ایک دن میں تم سے ضرور ملوں گی۔"

لائن پر دوسری جانب سسکیوں کی آواز آتی رہی پھر لائن مردہ ہو گئی۔

زیزی کو پتا ہی نہیں چلا کہ اس کے رخساروں پر شفاف موتی رینگ رہے تھے۔

☆☆☆

نحاس کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ جناب ہانگل نے براہ راست میرا ذکر کیا تھا؟" نحاس نے ہانگل کے لیے احترام کے گہرے جذبات محسوس کیے۔ "جناب ہانگل نے مجھے مفروض کر رہا ہے۔ میں نے کبھی بھی اتنی اہمیت محسوس نہیں کی۔ میری ذیوٹی زیادہ تر ٹریکنگ کے لیے لگا دی جاتی تھی... زیزی سے بات کر کے تو میں بالکل ہی مایوس ہو گیا تھا۔ کوئی اور دفتر ہوتا تو میری چھٹی ہو چکی ہوتی۔"

"تم نے اچھا کام کیا ہے۔" ہیگر نے حوصلہ افزا انداز میں نحاس کا شانہ تھپتھپایا۔ "فوری طور پہ اس وقت ہانگل کے مطابق، ہمارا فوری مشن یہ ہے کہ پتا چلایا جائے کہ ناتھن کو ختم کرنے کا کنٹریکٹ کس کے پاس ہے؟ اسی نے رکی ہیرس کو ناتھن کے نشانے پر مامور کیا تھا۔"

"ہم جان گئے ہیں کہ بینک ریکارڈ کے مطابق رکی ہیرس کے کھاتے میں بیس ہزار ڈالرز جمع کیے گئے تھے۔ یہ وقوعے سے تین ہفتے قبل کی بات ہے جس رات رکی ہیرس مارا گیا اسی روز وہ رقم اکاؤنٹ سے نکالی گئی تھی۔"

"رکی ہیرس کی ناکامی کے بعد یہ کام "ہٹ مین" کو سونپا گیا جس کے نام سے ہم نا واقف ہیں۔ سوائے اس کے کہ وہ ایک پیشہ ور قاتل ہے۔ ناتھن کو مارنے کے چکر میں دو پولیس والے اس کے ہاتھوں مارے گئے۔ یہ بات طے ہو گئی ہے کہ ناتھن "ٹارگٹ" ہے۔"

"ایک منٹ، ایک منٹ۔" نحاس اچانک بول پڑا۔

"کیا ہوا؟"

جواب دینے کے بجائے نحاس نے بروک اسپتال کا نمبر ملایا۔ کچھ دیر میں اس کا رابطہ ڈاکٹر شبر سے ہو گیا۔ نحاس نے ڈاکٹر کو اپنی گزشتہ ملاقات کے بارے میں یاد دلایا۔ ذرا توقف کے بعد ڈاکٹر کو یاد آ گیا۔

"ڈاکٹر! آخری بار تکلیف دے رہا ہوں... ہماری بات کوئی نہیں سن رہا۔ محض ایک سوال کروں گا، آپ ہاں یا ناں میں جواب دے دیجیے۔" نحاس نے درخواست کی۔

"یہ ایک معصوم بچے کی زندگی کا سوال ہے۔"

ڈاکٹر نے اطراف کا جائزہ لیا پھر فون کی جانب متوجہ ہوا۔ "اوکے۔" وہ بولا۔

تھامس نے گہری سانس لی۔ "ڈاکٹر مجھے یقین ہے کہ مارک بیلی کی انگلیاں کسی نے زبردستی توڑی تھیں؟"

"ایسا ہی تھا۔ غالباً کوئی پیشہ ور آدمی تھا۔" ڈاکٹر نے ایک لمبے وقفے کے بعد کہا۔

"تھینکس، ڈاکٹر۔" تھامس نے شکر گزاری سے کہا۔

ڈاکٹر نے رابطہ منقطع کر دیا۔

ہیکٹر بوریت محسوس کرنے لگا۔ "یہ کیا معاملہ ہے؟"

"آؤ میرے ساتھ۔" تھامس نے باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔

"تمہارا خیال ہے کہ تمام فساد مارک بیلی نے برپا کیا ہے؟"

"نہیں، لیکن میں شرط لگاتا ہوں کہ وہ اصل مجرم کو جانتا ہے۔" تھامس نے جواب دیا۔

☆☆☆

پوائنٹر کو معلوم تھا کہ اگر وہ سلیٹر کے پاس جاتا ہے یا نہیں جاتا، دونوں صورتوں میں اس کا مارا جانا یقینی ہے۔ گینگ میں پہلے ہی کئی کردار اسے راستے سے ہٹانے کے مواقع کی تاک میں رہتے تھے۔

موت کا کاروبار اس کا پیشہ تھا۔ پچھلے کئی برسوں میں متعدد بار اس نے اپنی موت کے بارے میں تصور کیا تھا۔ کیونکہ اس کام میں یہ ایک ناگزیر امر ہے... بس ہاتھ کا فرق ہوتا ہے۔ پوائنٹر کے خیال میں اس کا فیصلہ کن وقت آ گیا تھا۔

اس نے بڑے مشکل "ٹارگٹ" نہایت کامیابی سے "ہٹ" کیے تھے اور اسے دکھ اس بات کا تھا کہ ایک بچے نے اس کی شہرت اور پوزیشن کو خاک میں ملا دیا تھا۔ اسے اب کسی چیز سے غرض نہیں تھی۔ ناتھن اور اس کا معاملہ اب ذاتی صورت اختیار کر چکا تھا۔ خود اس کا جو بھی حشر ہو وہ اس لڑکے کو بہت بری موت سے ہمکنار کرے گا۔ سلیٹر کے پاس واپس جانے کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔

پوائنٹر، جانتا تھا کہ پولیس ناتھن کو قاتل سمجھ رہی ہے اور پولیس نے علاقے کو گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ ناتھن، پولیس اور پوائنٹر دونوں سے زیادہ دور نہیں تھا۔

پوائنٹر نے سوچ لیا تھا کہ اسے پولیس سے پہلے ناتھن تک پہنچنا ہے۔

☆☆☆

"میں صاف گوئی سے کام لوں گا۔" شیرف مرفی نے مائیکل کا تجزیہ سننے کے بعد زبان کھولی۔ "تم چاہتے ہو کہ میں تمام واضح شواہد کی موجودگی کو نظرانداز کر کے تمہاری "ہٹ مین" کی تھیوری پر کام کروں؟"

پیٹر ولی اور شیرف، مائیکل کے سامنے بیٹھے تھے۔ قبل اس کے مائیکل کچھ بولتا، پیٹر ولی نے مداخلت کی۔

"مائیکل، مجھے تمہارے بارے میں فکر ہونے لگی ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ گزشتہ برس تمہارا بیٹا بچھڑ گیا تھا اور تم نے اسے بہت مشکل سے برداشت کیا۔ تاہم اس کے اثرات اب تک تمہارے اوپر ہیں۔ اس کیس میں مذکورہ حادثہ تمہاری سوچ کو متاثر کر رہا ہے۔ میں مشورہ دیتا ہوں کہ تم رضاکارانہ طور پر پیچھے ہٹ جاؤ۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہیں ہٹانے کے لیے مجھے چیف سے بات کرنی پڑے۔"

پیٹر ولی کے الفاظ، مائیکل کے سینے میں ہتھوڑے کی طرح لگے۔ اسے شروع سے خطرہ تھا کہ پیٹر ولی یہ کارڈ کب استعمال کرتا ہے۔ مائیکل نے جب بیلی بار بے ڈی سینٹر کی فلم میں ناتھن کو دیکھا تھا تو اسے اپنا بیٹا برائن یاد آ گیا تھا۔ اس کے دل نے کہا تھا کہ ناتھن قاتل نہیں ہے۔ ناتھن کے لیے نرم گوشہ رکھنے کے باوجود اس نے کبھی اپنی پیشہ ورانہ ذمے داریوں کے ساتھ سمجھوتا نہیں کیا تھا درحقیقت ناتھن کی وجہ سے پیٹر ولی کی انتخابی مہم متاثر ہوئی تھی۔ اب اس کے لیے بہترین موقع تھا کہ وہ اپنی مہم دوبارہ نئے سرے سے استوار کرے۔ جبکہ مائیکل کی نئی تھیوری میں اسے واضح خطرہ نظر آ رہا تھا۔

"کیا خیال ہے؟ مائیکل؟" پیٹر ولی نے دباؤ بڑھایا۔

مائیکل شائستگی سے مسکرایا۔ "مسٹر پیٹر ولی، میرا مشورہ ہے کہ آپ میرے بجائے بذاتِ خود اس معاملے سے الگ ہونے کے بارے میں غور کریں۔" پیٹر ولی کا چہرہ خون کے دباؤ سے سرخ ہو گیا۔

"تم ایک قاتل کو بچانا چاہتے ہو؟" وہ غصے سے بولا۔

"میں اصل قاتل کو پکڑنا چاہتا ہوں اور اپنی ذمے داریوں سے بخوبی آگاہ ہوں۔"

مائیکل اس بات سے آگاہ تھا کہ چیف شیرووڈ، پیٹر ولی کو مائیکل سے زیادہ ناپسند کرتا ہے اور پیٹر ولی نے مائیکل کو دباؤ میں لینے کے لیے محض ایک کھوکھلی دھمکی دی تھی۔

اس موقع پر شیرف مرفی نے دخل اندازی کی۔

"مائیکل، میرا خیال ہے کہ یہ میٹنگ ختم ہو گئی ہے۔"

''نہیں ایسا نہیں ہے۔'' مائیکل نے جارحانہ انداز اختیار کیا۔ ''آپ کو چند سوالات کے جوابات جلد از جلد تلاش کرنے ہیں۔ ابھی میں استفسار کر رہا ہوں۔ بعد ازاں میڈیا خود معلوم کرے گا اور اس وقت آپ کے لیے بہت دیر ہو چکی ہوگی۔''

شیرف کا منہ لٹک گیا۔

''پہلا سوال: مقتولین کو جس ہتھیار سے ختم کیا گیا وہ کہاں ہے؟ مقتولین کے بدن میں جو گولیاں ہیں کیا وہ سروس ریوالور کی ہیں؟ تیسرا سوال: شمٹ پہلے قتل ہوا ہے تو پھر وائس نے تاھن کے خلاف مزاحمت کیوں نہیں کی؟ اگر تاھن ہی قاتل ہے تو تصاویر میں اس کے دونوں ہاتھ خالی کیوں ہیں... چوتھا سوال: واچ ڈیسک کے اوپر لگے کیمروں سے تین تصاویر کیوں غائب ہیں؟ مسٹر شیرف! آپ تفتیش سے زیادہ تاھن کو ''مارنے'' میں دلچسپی رکھتے ہیں۔'' مائیکل کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

''آخری بات مسٹر شیرف۔'' مائیکل نے بھرپور حملہ کیا۔ ''اگر تاھن پولیس کے بجائے کسی اور کے ہاتھوں مارا جاتا ہے تو آپ سوچ سکتے ہیں کہ آپ اور آپ کا آفس کہاں ہوگا؟ گڈ لک ود یور انویسٹی گیشن... گڈ مارننگ۔'' مائیکل کھڑا ہو گیا۔

شیرف ناک آؤٹ ہو چکا تھا۔ کمرے کی فضا میں سکوت اور تناؤ تھا۔ قبل اس کے کسی جانب سے گفتگو کا آغاز ہوتا، معاً فون کی گھنٹی بجی۔

شیرف نے فون اٹینڈ کیا اور بیڑولی کے حوالے کر دیا۔ بیڑولی کچھ دیر سنتا رہا پھر جیسے پھٹ پڑا۔ ''کیا بکواس کر رہی ہو تم؟ میں یہ نہیں کر سکتا۔''

مائیکل کے کان کھڑے ہو گئے۔ بیڑولی یقیناً کسی خاتون سے مخاطب تھا۔ وہ مضطرب اور الجھا ہوا نظر آ رہا تھا۔

وہ کئی منٹ تک دوسری جانب سے بات سنتا رہا پھر بولا۔ ''دیکھو، استھنی! میں دوسری بار یہ نہیں کر سکتا۔ جج مجھے جیل میں سزا دے گا۔ کیا اسے نمبر نہیں ملا؟''

مائیکل اچھل پڑا۔ استھنی، بیڑولی کی اسسٹنٹ کا نام تھا۔ اس کے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ سمجھ گیا کہ کوئی شخص تاھن کا نمبر ٹریس کر رہا ہے۔ نمبر جج کی مداخلت یا ڈیزی کے ریڈیو اسٹیشن سے ہی مل سکتا تھا۔ جو بظاہر ممکن نہیں تھا۔ نمبر کے پیچھے ''قاتل'' کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا...

دفعتاً مائیکل نے بیڑولی کے ہاتھ سے فون جھپٹ لیا۔ ''استھنی میں مائیکل بول رہا ہوں۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ کوئی تاھن کا وہ نمبر ٹریس کر رہا ہے... جس نمبر سے تاھن نے آخری بار ڈیزی کو فون کیا تھا۔ وہ کون ہے؟ کیا اسے نمبر مل گیا ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم، وہ کون ہے؟''

''کیا اسے نمبر مل گیا ہے؟'' مائیکل چلایا۔

''وہ... ہاں... ہاں... لیکن۔''

''کتنی دیر ہوئی ہے استھنی... کتنی دیر؟؟'' مائیکل باقاعدہ چیخ رہا تھا۔ بیڑولی اور شیرف سکتے کی کیفیت میں تھے۔

''تقریباً... شاید... بیس منٹ۔'' استھنی کی آواز میں ہراس تھا۔

''نمبر کیا ہے؟''

''وہ بیل...''

''پلیز نمبر بتاؤ وہ نمبر قاتل کے پاس ہے جس کی ہمیں تلاش ہے اور وہ تاھن کو قتل کرنے والا ہے... استھنی... مجھے نمبر چاہیے۔ وقت نہیں ہے۔'' مائیکل نے بمشکل آواز کو نرم کیا۔ ''وہ ''ہٹ مین'' ہے۔''

ذرا ہچکچاہٹ کے بعد استھنی نے نمبر بتا دیا۔ نمبر میں سات اعداد تھے۔ جوں ہی مائیکل نے ساتواں عدد سنا اس نے فون رکھ دیا۔ اس کے اعصاب تن گئے تھے... وہ کون تھا؟ نمبر اس نے کیسے لیا؟ کیا ریڈیو اسٹیشن سے؟

مائیکل سیل فون نکالتا ہوا باہر نکل گیا۔

☆☆☆

ہیکر نے پہلی چیز جو نوٹ کی، وہ مارک بیلی کے پرانے مکان کے پردے تھے۔ ''شاید وہ گھر پر نہیں ہے۔'' ہیکر نے تھامس سے کہا۔ دونوں یہاں آنے سے پیشتر ڈکی ہیرس کے اکاؤنٹ کی معلومات مائیکل کو دے چکے تھے۔ جسے سننے کے بعد مائیکل نے تھامس پر سے اندر جانے کی پابندی ہٹا دی تھی... نئی ہدایت کے مطابق دونوں کو اختیار تھا کہ ضرورت پڑنے پر مارک بیلی کے گھر میں داخل ہو جائیں۔ ڈکی ہیرس کے اکاؤنٹ کی معلومات کے بعد مائیکل نے ہر احتیاط اور رسک کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ اس کے نزدیک یہ فیصلہ کن گھڑی تھی اور تیز ایکشن کا وقت تھا۔ لہٰذا اس نے بیڑولی اور شیرف کی دھلائی کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کیا۔

''پچھلے گیراج میں گاڑی کھڑی ہے۔'' تھامس نے جواب دیا۔ ''اس کی گاڑی تو کھڑی ہے۔''

ہیکر نے اطراف کا جائزہ لیا۔ گن ہولسٹر سے نکال کر کوٹ کے نیچے کر لی۔ تھامس چونک اٹھا۔ تھامس نے

سائڈ میں کھڑے ہو کر دستک دی۔

"مارک!" ہیکر چلایا۔ "دروازہ کھولو۔"

کوئی ردِعمل نہیں ہوا۔ ہیکر نے گن نکال لی اور تھامس کو اشارہ کیا۔ تھامس نے دروازے کی دوسری سائڈ سے ہاتھ بڑھا کر دروازے کی ناب کو گھمایا لیکن وہ لاک تھا۔ تھامس نے نفی میں سر ہلا کر ہاتھ ہٹا لیا۔

ہیکر نے اگلے ہی لمحے فائر کر کے لاک اڑا دیا۔ تھامس نے لات مار کر دروازہ کھول دیا۔ کوئی ردِعمل نہیں... دونوں نے انتظار کیا۔ پھر ہیکر نے تھامس کو بائیں جانب اشارہ دیا۔ دونوں مکمل الرٹ حالت میں اندر پہنچے۔ تھامس بائیں رخ پر گیا اور ہیکر دائیں۔

"مارک!" ہیکر پھر چلایا مگر خاموشی طاری رہی۔

"میں اوپر جا رہا ہوں، تم گراؤنڈ فلور دیکھو۔" ہیکر نے کہا۔

ابھی ہیکر اندرونی زینے کے سہارے اوپر پہنچا ہی تھا کہ اسے تھامس کی آواز سنائی دی۔ وہ الٹے قدموں واپس ہوا۔ تھامس لیونگ روم (ڈرائنگ روم) میں تھا۔ ایک کرسی کے ساتھ مارک بیلی بندھا ہوا تھا۔ اس کا منہ کھلا تھا اور دونوں ہاتھ اطراف میں لٹک رہے تھے۔

"ختم۔" تھامس نے ہیکر کی سوالیہ نگاہوں کو جواب دیا۔

"یہیں رکو۔" ہیکر نے کہا۔ پھر اس نے محتاط انداز میں پورے مکان کی تلاشی لی۔ مکان خالی تھا۔ ہیکر واپس لیونگ روم میں آ گیا۔

"اسٹیشن فون کردو۔" ہیکر نے مارک بیلی کا جائزہ لیا، پھر مختصر لیونگ روم میں نظر دوڑائی۔ صوفے کے قریب تین دن کے اخبارات موجود تھے۔ اخبار میں ناتھن والی اسٹوری کا صفحہ سامنے تھا۔

میز پر قانونی کاغذات کا مختصر ڈھیر تھا۔ کاغذات فولڈر میں تھے۔ فولڈر پر سونے الفاظ میں لکھا تھا۔

"دی لاسٹ ول اینڈ ٹیسٹامنٹ آف ولیم اسٹیو بیلی۔"

اسٹیو، مارک کا بھائی اور ناتھن کا مرحوم باپ تھا۔ کاغذات اس کی وصیت سے متعلق تھے۔

ہیکر نے سرسری مطالعہ شروع کیا... وصیت کے صفحے پر اس کی نگاہ جم گئی۔ دوسرے پیراگراف کا اس نے بغور مطالعہ کیا۔ اور سر پیٹ کر رہ گیا۔ "کیا ہوا؟" تھامس نے سوال پھینکا۔

"ہم احمق تھے۔ مانگل شروع سے ٹھیک جا رہا تھا۔"

"ہاں، مارک کے قتل کے بعد تو یقیناً کیس کا رنگ بالکل بدل گیا ہے۔" تھامس نے تبصرہ کیا۔

"ہاں۔" ہیکر نے اتفاق کیا۔ "تاہم ہر جرم کا محرک بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔"

"کیا ہم محرک سے دور ہیں؟"

"یہ رہا محرک۔" ہیکر نے وصیت کا صفحہ نمبر 14 تھامس کے آگے کر دیا۔

☆☆☆

ڈیزی حیران تھی کہ رویہ یک لخت کال کرنے والوں کا رویہ کیسے بدل گیا۔ حالانکہ وہ صبح ناتھن سے بات کر کے سخت پریشان اور رنجیدہ تھی لیکن اب اکثریت ناتھن کے حق میں تھی۔ ناتھن کے صبح کے بیان کی تفصیل نے کئی نازک سوال اٹھا دیے تھے۔ آخر میں ڈیزی نے روتے ہوئے جو سوالات پوچھے تھے، ان سوالات نے سامعین کے دل کے تاروں کو چھیڑ دیا تھا۔ اگر کوئی جوان آدمی یہ بات کرتا تو اس کا کوئی جذباتی اثر نہ ہوتا... یہ بات کسی کے حلق سے نہیں اتر رہی تھی کہ ایک کم سن لڑکا کیسے تین جوان آدمیوں کو مار سکتا ہے؟ جبکہ ان میں دو کا تعلق تربیت یافتہ پولیس آفیسرز سے تھا اور لڑکا قید میں تھا۔ وہ چھوٹا بچہ تھا، کوئی کمانڈو نہیں تھا۔

ڈیزی اس وقت ناتھن سے بات کرتے ہوئے یکے بعد دیگرے مختلف نظریات قائم کر رہی تھی اور سامعین سے بھی سن رہی تھی۔

دفعتاً آپریٹر کی آواز آئی۔ "معاف کیجیے، کالرز (Callers) سے الگ یہ ایک ایمرجنسی فون ہے۔ جناب بات کریں۔"

ڈیزی نے حیرت کے احساس کے ساتھ ایک بٹن دبایا اور ایمرجنسی کال پروگرام کی گفتگو میں شامل ہو گئی۔

"ناتھن، میں بریڈ برک کاؤنٹی پولیس ڈیپارٹمنٹ کا لیفٹیننٹ مانگل بات کر رہا ہوں۔"

"ایک منٹ جناب..." ڈیزی کی آواز میں احتجاج تھا۔

"پلیز ڈیزی مجھے بات مکمل کرنے دو۔ وقت کم ہے۔ ورنہ بعد میں ہم سب پچھتا رہے ہوں گے۔ ناتھن اس وقت شدید خطرے میں ہے۔" مانگل کی آواز میں شائستگی اور سچائی کے ساتھ التجا کا عنصر تھا۔ ڈیزی نے حسبِ صلاحیت محسوس کر لیا کہ مانگل سچ بول رہا ہے۔

"ٹھیک ہے مسٹر مانگل... بولو۔"

"شکریہ۔ ناتھن تم جہاں بھی ہو وہاں سے فوراً نکل جاؤ۔ تمہارا فون نمبر ٹریس ہو گیا ہے اور جعلی پولیس آفیسر کے پاس ہے جس نے پہلے ہی دو پولیس افسران ہلاک کر دیے

ہیں۔ تم بچ گئے تھے۔ اب وہ تم تک پہنچنے والا ہے۔'' ناٹیگل کی آواز میں بے چینی تھی۔

ادھر ناتھن کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ ڈیزی کے چہرے کا رنگ بھی بدل گیا۔

''تمہیں کیسے پتا چلا؟'' ناتھن نے گویا ڈیزی کا سوال چھین لیا۔

''بیٹا ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔ انہیں بعد کے لیے رکھو۔ جلدی کرو، وہاں سے بھاگ جاؤ۔ اصل بات تک پہنچنے میں مجھے پہلے ہی کافی دیر ہو گئی ہے۔''

''میں کیسے یقین کروں کہ یہ کوئی چال نہیں ہے؟''

''فی الوقت تمہیں یقین دلانے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں ہے، بیٹا تمہیں مجھ پر بھروسا کرنا ہوگا۔ بھاگ جاؤ۔ پلیز بھاگ جاؤ۔''

''کہاں جاؤں؟'' ناتھن کے پیٹ میں بل پڑنے لگے۔

''ڈیزی مجھے ایک منٹ کے لیے ڈیڈ ائر (DEAD AIR) پر کردو۔ پلیز۔'' ناٹیگل نے کہا۔

سامعین اب تک خاموشی سے یہ سنسنی خیز بات چیت سن رہے تھے جس میں ایک منٹ کا وقفہ آنے والا تھا۔

ڈیزی، ناٹیگل کا اصل مدعا سمجھ گئی، اس نے پھرتی سے ہدایات جاری کیں۔ اس کا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ ریڈیو اسٹیشن کے کارکن اب چیخ رہے تھے کہ ناتھن کیس کا ڈراپ سین ہونے والا ہے۔

''آفیسر! تمہارا وقت شروع ہو گیا ہے۔ تم اب ''آف ائر'' ہو۔ ناتھن کے علاوہ صرف میں تمہاری آواز سن سکتی ہوں۔'' ڈیزی نے ناٹیگل کو اطلاع دی۔

ناتھن سب سن رہا تھا۔ اسے لگا کہ اچانک اس کی دنیا بہت مختصر رہ گئی ہے۔ صرف وہ اور ناٹیگل نامی پولیس آفیسر۔

ڈیزی کی کلیئرنس ملتے ہی ناٹیگل نے ناتھن سے بات شروع کر دی۔ اس کی نگاہ گھڑی پر تھی۔ وہ مختصر گفتگو کر رہا تھا۔ جس کے مطابق ناتھن کو پتا چلا کہ اس کے قتل کا منصوبہ کسی اور نے بنایا تھا اور پولیس کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ تیس سیکنڈ ختم ہونے تک ناتھن کو مزید معلوم ہوا کہ پولیس سرگرمی سے اسے تلاش کر رہی ہے اور اسی کو پولیس کا قاتل سمجھ رہی ہے۔ اگر اس نے مزاحمت کی تو پولیس اسے ختم کر دے گی۔ تیسری اطلاع یہ تھی کہ کرہ ارض پر صرف ناٹیگل اسے بچانے کی کوشش کر رہا ہے اور وہ ناتھن کو بے قصور تسلیم کرتا ہے۔ میدان میں ناتھن اب تنہا نہیں ہے۔ مزید یہ کہ اس کا آخری چانس یہ ہے کہ وہ ناٹیگل پر بھروسا کرتا ہے۔ ناتھن کی بچت کا سامان اسی میں ہے کہ وہ خود کو ناٹیگل کے حوالے کر دے۔

چالیس سیکنڈ ہونے والے تھے۔'' ناتھن نے... ٹاؤن اسکوائر کے سنگی تخروطی مینار تک پہنچنا ہے۔ جو لیوس اینڈ کلارک میموریل کے نام سے مشہور ہے۔'' میں براؤن سوٹ اور نیلی شرٹ میں ہوں گا۔ تم مجھے پہچان لو گے۔'' ناٹیگل نے بتایا۔

ناتھن نے فون رکھ کر الیکس کو دیکھا۔

''تمہیں بھروسا ہے اس پر؟'' الیکس نے سوال کیا۔

ناتھن نے چند لمحے سوچا پھر بولا۔ ''ہیں۔''

☆☆☆

الیکس نے ناتھن کو لیوس اینڈ کلارک میموریل ٹاور کی لوکیشن سمجھائی۔ ناتھن نے جوتوں کے تسمے درست کیے اور تیار ہو گیا۔

برفی ڈی کتا الیکس کے ساتھ کھڑا تھا۔ ناتھن ذرا سی دیر مسکرایا پھر الیکس کے گلے لگ گیا۔

''شکریہ دوست۔'' وہ بولا۔

الیکس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایکس مین کا پلاسٹک کا چھوٹا سا مجسمہ نکال کر ناتھن کو دے دیا۔

''اسے رکھ لو۔ یہ میرے لیے خوش قسمتی کی علامت رہا ہے۔''

ناتھن نے تشکر آمیز نظروں سے الیکس کو دیکھا اور ایکس مین کو سامنے والی جیب میں رکھ لیا اور ہاتھ ہلا کر سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔ اسی وقت پولیس کارز کے سائرن کی مدھم آواز آنی شروع ہوئی۔

''نکل جاؤ، وہ ابھی دور ہیں۔'' الیکس چلایا۔

ناتھن نے دوڑ لگائی۔ وہ تہ خانے سے نکل کر ابھی کچھ دور ہی گیا تھا کہ اسے وہی مخصوص آواز سنائی دی جو اس نے پولیس اسٹیشن میں سنی تھی۔ اس کا دل رک سا گیا۔ ''ہائے، ناتھن۔'' پوائنٹر کی آواز آئی۔

اس کی چلائی ہوئی گولی نے بھاگتے ہوئے ناتھن کی قریبی دیوار کو ادھیڑ دیا تھا۔ ناتھن گھٹنوں کے بل گرا۔ عقب میں قاتل کے قدموں کی دھمک تھی۔ وہ لوٹ لگا کر اٹھا اور اندھا دھند بھاگا۔ عالم وحشت میں وہ غلط سمت میں دوڑا تھا۔ عمارت کے احاطے سے نکلنے کا دروازہ مخالف سمت میں تھا۔ ناتھن کا دل بیٹھ گیا۔ سائلنسر لگے ہتھیار سے دوسرا فائر ہوا۔ عین اسی وقت ناتھن خستہ پاؤں سے الجھ کر گرا۔ وہ پھر بچ گیا۔ تاہم موت اس کے سر پر تھی۔ رفتہ رفتہ اسے پاؤں میں درد کا احساس ہوا۔

عقب میں ہڑبونگ کی آوازیں بلند ہوگئیں۔ برفی کی مسلسل غراہٹ سنائی دی۔ ناتھن نے پلٹ کر دیکھا۔ الیکس نے برفی کو پوانٹر کی جانب دھکیل رہا تھا۔ اس اچانک افتاد نے پوانٹر کو زمین بوس کر دیا اور ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ کتا اس کے اوپر سوار تھا اور گردن پر منہ ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"مار دے، برفی... مار دے۔" الیکس چلا رہا تھا۔

پوانٹر اس وقت بھی پولیس کے لباس میں تھا۔

ناتھن کے لیے سنہری موقع تھا وہ اٹھ کر صحیح سمت میں بھاگا اور جان توڑ کر دوڑ رہا تھا۔ اسے خبر تھی اور مائیکل نے بھی بتا رکھا تھا کہ پیشہ ور قاتل اس کے پیچھے ہے۔ لہٰذا اس کے پاس مہلت کم تھی۔ الیکس اور برفی زیادہ دیر پوانٹر جیسے خونی کو روک نہیں سکتے تھے۔

ناتھن تیر کی طرح عمارت سے نکل گیا۔

پولیس سائرن کی آوازیں زیادہ واضح سنائی دے رہی تھیں۔ الیکس کے سمجھائے ہوئے نقشے کے مطابق ناتھن کا رخ ٹاؤن اسکوائر کی جانب تھا۔ وہ اس وقت سڑک پر تھا۔ جب اس نے ایک بار پھر عقب میں مخصوص قدموں کی دھمک سنی۔ ساتھ ہی ایک پولیس کار سڑک پر نمودار ہوئی۔

پوانٹر نے رفتار کم کرلی۔ سائلنسر، [illegible] سے الگ کر کے جیب میں ڈالا اور گن ہولسٹر کے سپرد کر کے، عام سی رفتار میں چلنا شروع کر دیا۔

کار کا سائرن اس کے فاصلے کی نشاندہی کر رہا تھا۔ ناتھن اس کے نمودار ہونے سے پیشتر ہی سڑک پار کر کے ایک اسکول میں گھس چکا تھا۔

پولیس کار پوانٹر کے قریب سے گزری تو اس نے بے پروائی سے ہاتھ ہلایا اور سڑک کی دوسری جانب اسکول کا رخ کیا۔

☆☆☆

شیرف مرفی کے اسپیشل اسکواڈ میں پولیس کی تیرہ عدد گاڑیاں تھیں جو ناتھن کو تحویل میں لینے کے لیے رہبت اپارٹمنٹ کی طرف جارہی تھیں۔

ڈیری کے پروگرام میں مائیکل کی کال نے پورے ملک میں سنسنی پھیلادی تھی۔ سخت ہیجانی کیفیت تھی۔ اپنی نوعیت کا عجیب اور پُراسرار کیس اپنے انجام کی طرف بڑھ رہا تھا۔ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی تھی۔ میڈیا جائے وقوعہ پر ٹوٹ پڑا تھا۔

مائیکل نے ایک منٹ تک ناتھن سے آف ائر بات کی تھی۔ اس لیے میڈیا، پولیس، دوست اور دشمن سب بے خبر تھے کہ ناتھن کہاں ہے؟

اسپیشل اسکواڈ کار بی اسٹینڈ میں آخر میں پہنچا تھا۔ وہ نیم کالڈنگ اسٹاپ پر تھا۔

سات آدمی ہتھیار بدست نہایت سرعت سے پچھلی منزل پر پہنچے جو زون نمبر سے چابک کرتا تھا۔ وہ اس عمارت کا اپارٹمنٹ نمبر 612 تھا۔

پہلے آدمی نے لات مار کر دروازہ کھولا اور جھکی ہوئی حالت میں بائیں جانب سے اندر گھسا۔ دوسرے نے سیدھی حالت میں دائیں جانب سے یلغار کی۔ تین تک گنتی کرنے کے بعد بقیہ افراد بھی اندر گھس گئے۔ ہتھیار ان کے شانوں پر تیار حالت میں تھے۔

"کوئی حرکت نہیں۔"

لیونگ روم میں سیاہی مائل رنگت کا بچہ صوفے پر نیم دراز تھا۔

"ہیلو آفیسرز۔" وہ اطمینان سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

وہ سب ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔

"ناتھن کہاں ہے؟" کسی نے سوال کیا۔

"بھاگ گیا۔"

"کہاں گیا ہے؟"

"پولیس کو مارنے۔" الیکس نے جواب دیا اور سکون سے بولا۔ "تم سب احمق ہو۔ ناتھن بے قصور ہے۔ قاتل پولیس کی وردی میں ہے۔ وہ ناتھن کو مارنے آیا تھا۔ میرے کتے نے ناتھن کو بچالیا لیکن اس کمینے نے میرے کتے کو ختم کر دیا۔ کتے کی لاش احاطے میں پڑی ہے۔ قاتل نے جو گولیاں چلائی تھیں، ان کے نشانات تم لوگوں کو احاطے میں مل جائیں گے۔ قاتل کی جعلی وردی کی دائیں آستین پھٹ گئی ہے۔ اس نے تمہارے آدمیوں کو مارا تھا۔ اب جاؤ اور ناتھن کو بچاؤ۔ وہ ٹاؤن اسکوائر کی طرف گیا ہے۔"

☆☆☆

ناتھن کی ساری جان ٹانگوں میں سمٹ آئی تھی۔ اسے علم تھا کہ قاتل پیچھے ہے جو پولیس کار کی وجہ سے دھیما پڑ گیا تھا لیکن یہ مہلت مختصر تھی۔ وہ قاتل کو پہچان گیا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے پولیس اسٹیشن میں ناتھن پر حملہ کیا تھا اور دو پولیس والوں کی جان لی تھی۔ اس درندے کی گرفت میں آنے کا مطلب فوری موت کے سوا کچھ نہیں تھا۔

ناتھن نے اسکول کی اندرونی عمارت کا چکر کاٹا اور عقبی سمت میں نکل گیا۔ دیوار کی بلندی دیکھ کر اس پر دہشت

اور مایوسی کا حملہ ہوا۔ اس نے عالم وحشت میں ادھر ادھر دیکھا۔ اس کی نگاہ دیوار کے ساتھ موجود درخت پر پڑی۔ وہ لپک کر بندر کی طرح درخت پر چڑھتا چلا گیا۔

دھماکا ہوا اور گولی اس کی کمر کے قریب شاخ سے ٹکرائی۔ اگلے لمحے وہ دیوار کی دوسری جانب لٹکا ہوا تھا۔ تاہم ایک ثانیے کے لیے اسے حیرت ہوئی کہ سائلنسر کی موجودگی میں دھماکا کیوں ہوا؟ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ دیوار سے نیچے کود گیا۔

حالات بدل گئے تھے۔ اب وہ گرفتاری سے بچنے کے لیے نہیں بھاگ رہا تھا بلکہ جان بچانے کے لیے بھاگ رہا تھا۔ پولیس اور ہٹ مین دونوں سے... اس کی واحد امید مائیکل نامی آفیسر تھا۔

کچھ دیر بعد وہ مرکزی سڑک پر تھا۔ وہ گاہے گاہے عقب میں بھی دیکھ رہا تھا۔ اسے احساس تھا کہ بلڈنگ کے احاطے میں اسے پہلو میں گولی لگی ہے۔ تاہم وہ حیران تھا کہ وہ اب تک بھاگ کیسے رہا ہے۔

یہاں سڑک پر قدرے رش تھا۔ وہ گاڑیوں اور لوگوں سے بچتا بچاتا، جھکائیاں دیتا ہوا راستے بدل بدل کر نکلا جارہا تھا۔ دوڑ کر اس کے پہلو میں ٹیس اٹھی۔ ایک جگہ موقع پاکر وہ پارکڈ گاڑی کے پیچھے چھپ گیا۔

دائیں بغل کے نیچے ٹی شرٹ خون آلود ہورہی تھی۔ اس نے شرٹ اوپر کرکے زخم کا جائزہ لیا۔ بغل سے کچھ نیچے کئی انچ لمبا اور انگلی کی موٹائی کے برابر بدنما نشان تھا۔ وہ احاطے میں ٹھوکر کھاکر گرنے کی وجہ سے بال بال بچا تھا۔

ناتھن نے شرٹ نیچے کی اور کھڑا ہوگیا۔ ٹی شرٹ کی حالت بہت بری تھی۔

"دیکھو تم ناتھن ہو... رک جاؤ۔" ناتھن کے پیچھے ایک ریسٹورنٹ تھا۔ دروازے میں ایک آدمی کھڑا چلا رہا تھا۔ "اسے پکڑو وہ پولیس کا قاتل ہے۔ روکو اسے۔"

ناتھن نے مڑ کر نہیں دیکھا اور بھاگ نکلا۔ لیکن وہ آواز پوائنٹر کے کانوں تک پہنچ گئی جو زیادہ دور نہیں تھا۔ جلد ہی اس نے چیخ پکار کرتے آدمی کو دیکھ لیا۔ پوائنٹر اس کے ہاتھ کے اشارے کی جانب لپکا۔

☆☆☆

اس وقت کمانڈ بس میں شیرف مرفی "اسٹاپ بیرون" کا پیغام وصول کررہا تھا۔ "اسٹاپ بیرون" ڈپٹی اسٹیڈمین کا کوڈ نیم تھا۔ اسٹیڈمین نے ویلیسٹا اپارٹمنٹ سے جو رپورٹ دی، اسے سن کر شیرف مرفی دنگ رہ گیا۔

اس نے کمانڈ بس میں لگا نقشہ دیکھا اور تیزی سے نئی ہدایات جاری کرنا شروع کردیں۔ پولیس آپریشن یک دم تبدیل ہو چکا تھا۔ ویلیسٹا اپارٹمنٹ سے جو اطلاعات موصول ہوئی تھیں، اس کے مطابق علاقے میں موجود ہر ایک پولیس اہلکار تک "ہٹ مین" کا حلیہ بسرعت پہنچ گیا۔

میڈیا کے گھاگ شکاری اپنے اپنے اندرونی ذرائع سے پل پل کی خبریں کور کررہے تھے۔ ایک ہنگامہ برپا تھا۔ ڈیزی نے ایک عدد ٹی وی اسٹوڈیو میں منگوالیا تھا۔

اس کی نظریں ٹی وی پر جمی تھیں۔ وہ اپنے کیریئر کی اہم اور موثر ترین کوریج پیش کررہی تھی۔ اس کیس سے اس کی جذباتی وابستگی تھی۔

مارک بیلی کے قتل کی خبر ایک سماعت شکن دھماکے کی طرح تھی۔ منظرنامہ سارا کیس کروٹیں بدلتا ہوا اس مقام پر پہنچ گیا تھا جہاں وہ ہر منٹ ایک نیا رنگ بدل رہا تھا۔ ٹی وی پر مردہ برنی (کتے) کی تصویر دکھائی جارہی تھی۔

ناتھن کی ہر بات سچ ثابت ہوئی تھی۔ مائیکل کا ذکر بھی وقفے وقفے سے ہو رہا تھا۔ ڈیزی کھل کر اظہار خیال کررہی تھی۔ تاہم اس کی دھڑکنیں قابو سے باہر تھیں۔ کیونکہ تمام لوگوں کے ساتھ وہ بھی جانتی تھی کہ ناتھن کے سر سے موت ابھی ٹلی نہیں ہے۔

عوام ناتھن کے بجائے پولیس کے خلاف ہوگئی تھی۔ تاہم مائیکل کا رول سامنے آنے کے بعد یہ مخالفت قدرے کم ہوگئی۔ بعدازاں انٹیل اسکواڈ کے ڈپٹی اسٹیڈمین کی رپورٹ لیک ہونے پر مخالفت کی شدت میں مزید کمی آگئی تھی۔

ناتھن، مائیکل اور پوائنٹر جنون تیزی سے رنگ بدلتے ڈرامے کی جزئیات سے بے خبر تھے۔

سلیٹر نے احتیاطاً اپنا ٹھکانا تبدیل کرلیا تھا اور فوری طور پر ساتھی کے ہمراہ ایک اور قاتل روانہ کررہا تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے، پوائنٹر کو ٹھکانے لگا دے۔ حالانکہ اسے خدشہ تھا کہ دونوں ہٹ مین بروقت پوائنٹر تک نہیں پہنچ پائیں گے... اگر پوائنٹر زندہ پولیس کے ہاتھ آگیا تو سلیٹر کو شدید نقصان اٹھانا پڑے گا۔

وہ اس وقت کو کوس رہا تھا جب مارک بیلی کے حوالے سے پوائنٹر منصوبہ لے کر آیا تھا اور سلیٹر نے حامی بھرلی تھی۔

ایک طرف پیٹرول اپنے بال نوچ رہا تھا۔

دوسری طرف میکر سیل فون پر مائیکل سے رابطے کی ناکام کوششیں کررہا تھا۔

☆☆☆

سڑک پر دوڑ پڑا تھا۔ تاہم پوائنٹر، ماتھن کو دیکھ چکا تھا۔ اس کے نظر میں آنے ہی پوائنٹر ہجوم کی لہروں میں تارپیڈو کی طرح حرکت پذیر ہوا۔ اس کی آنکھیں شدتِ اشتعال سے انگارہ ہو رہی تھیں۔ تاہنگ دار چھوکرے نے پوائنٹر جیسے سفاک بہت مَین کو برباد کر ڈالا تھا۔ پوائنٹر دوڑتے بغیر بڑی صفائی اور سرعت سے راستہ بنا رہا تھا۔

دونوں کے درمیان فاصلہ محض پچاس گز رہ گیا تھا۔ ماتھن بے خبر تھا کہ اسے دیکھ لیا گیا ہے اور قاتل دم بدم قریب تر ہوتا جا رہا ہے۔

درمیان میں افراد کی موجودگی نے پوائنٹر کو گولی چلانے سے باز رکھا ہوا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ گرفتاری کا ڈھونگ رچا کر ماتھن کو تحویل میں لے لیا جائے پھر تنہائی میں اس کی درگت بنا کر قتل کیا جائے۔

لڑکا بھی کم پھرتیلا نہیں تھا۔ پوائنٹر نے اندازہ لگایا کہ اب بھی ماتھن کو جا پکڑنے کے لیے اسے کم از کم تین منٹ درکار ہیں۔ تاہم وہ اس بات سے لاعلم تھا کہ واقعات کے تیزی سے بدلتے ہوئے سلسلے میں ایک اور غیر متوقع موڑ آنے والا ہے۔

☆☆☆

ماتھن کو بحر ذلی ستی مینا نظر آنے لگا تھا۔ روشن امید اور توانائی کے ساتھ منزل کی جانب بڑھ رہا تھا۔ پیچھے ریسٹورنٹ کے دروازے پر جس نے بھی نعرے بازی کی تھی، اس نے ماتھن کے اعصاب کشیدہ کر دیے تھے۔ اگر اس وقت قاتل زیادہ دور نہیں تھا تو یقیناً اس نے وہ چیخ پکار سن لی ہوگی۔

ماتھن کا دل چاہا کہ عقب کا جائزہ لے۔ یہ خیال آتے ہی کسی نے اسے پیچھے سے بری طرح جکڑ لیا۔ اس کے دونوں ہاتھ بھی جکڑ بندی میں آ گئے تھے۔

"مسٹر ماتھن، کھیل ختم ہو گیا۔" قاتل کی سرگوشی اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"چھوڑ دو مجھے۔" ماتھن چلایا۔ وہ مضبوط گرفت میں کیچوے کی طرح کلبلا رہا تھا۔ ساتھ ہی لاتیں چلا رہا تھا۔ پوائنٹر نے بآسانی اسے اوپر اٹھا لیا۔ ماتھن نے اندازے سے اپنا سر پیچھے پھینکا۔ جو پوائنٹر کی ناک سے ٹکرایا۔ اس کے حلق سے ایک دردناک کراہ برآمد ہوئی۔ اس کی گرفت ڈھیلی پڑی اور کیلا ہوا ماتھن پھسل کر سڑک پر آ گیا۔ وہ چاروں ہاتھ پیروں کے بل بھاگنے کی پوزیشن میں تھا۔

"حرکت مت کرنا۔" پوائنٹر کی پُرغضب غراہٹ سنائی دی۔

ماتھن نے دیکھا کہ وہ گن نکال چکا ہے جس کا رخ اس کے سینے کی جانب تھا۔ اتنے قریب سے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

عوام بھی متوجہ ہو چکی تھی۔

"اسے پکڑو، یہ ماتھن ہے۔ پولیس کا قاتل۔"

☆☆☆

مائیکل، ٹاؤن اسکوائر پہنچ چکا تھا۔ اس سے پہلے ڈپٹی اسٹینڈ نے ستی مینا کی کھڑکی میں پوزیشن سنبھال لی تھی۔

مائیکل یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ ٹاؤن اسکوائر میں بے حد ہجوم تھا۔ لوگوں کے علاوہ وہاں کاؤنٹی کی درجنوں پولیس گاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ میڈیا بھی کثیر تعداد میں موجود تھا۔ مائیکل سوچ رہا تھا کہ ٹاؤن اسکوائر سے متعلق جو باتیں اس نے ماتھن سے کی تھیں، وہ آن ائیر نہیں گئی تھیں۔ پھر یہ کیا تماشا ہے؟

☆☆☆

"میں بے قصور ہوں، پولیس کو اس آدمی نے مارا تھا۔" ماتھن چلایا۔

پوائنٹر کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "نیچے لیٹ جاؤ لڑکے۔" اس نے خطرناک انداز میں گن کو جنبش دی۔

ماتھن لوگوں کی قطار کے پیچھے نکل جانا چاہتا تھا۔ "میں نے کچھ نہیں کیا۔" وہ پھر چیخا۔ "یہ پولیس والا نہیں ہے، مجھے اس سے بچاؤ۔" اس نے امدادی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ تاہم کسی نے تعاون کے لیے حرکت نہیں کی۔ "میری بات کا یقین کرو۔" وہ پھر بولا۔ "اس نے گولی چلا کر مجھے زخمی کیا۔ یہ دیکھو۔" ماتھن نے خون آلود شرٹ کی جانب اشارہ کیا۔

بزنس سوٹ میں ملبوس ایک دراز قامت چھریرے بدن کا فرد بالآخر آگے بڑھا۔ اجنبی دونوں سے محض دو گز کے فاصلے پر تھا۔ اس کے بالوں میں سفیدی جھلک رہی تھی اور نفاست سے تراشی ہوئی چھوٹی سی داڑھی بھی سفید بالوں سے پُر تھی۔ ماتھن نے اس کی آنکھوں میں ہمدردی کی جھلک دیکھی۔

"میرا نام البرٹ ہے۔" وہ بولا۔ "میں وکیل ہوں۔ آفیسر میں تمہاری درد پہنچانے میں ناکام رہا ہوں۔ تم کہاں سے آئے ہو؟"

پوائنٹر کے ضبط کے بندھن ٹوٹنے لگے۔ وہ ایک قدم آگے بڑھ کر بولا۔ "میرا تعلق بریڈک کاؤنٹی پولیس سے ہے۔ یہ نوجوان کئی قتل کر چکا ہے۔"

”بات یہ ہے مسٹر۔“ وکیل نے سنجیدگی سے کہا۔ ”یہ بریڈک کا ڈنی نہیں ہے۔ جہاں تم وہیں رہو۔ جو کچھ کرنا ہے، یہاں کی پولیس نے کرنا ہے۔۔۔“

ناتھن کے لیے اس سے بہتر موقع ملنا ناممکن تھا۔ وہ حتی الامکان پھرتی سے لوگوں کے پیچھے غائب ہو گیا۔ پوائنٹر دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں۔ اس نے بے دھڑک گولی داغ دی۔ گولی ایک خاتون کی ٹانگ میں لگی۔

پوائنٹر غصے سے تقریباً پاگل ہو چکا تھا۔ وہ وکیل کی طرف مڑا اور بے محابا فائر کیا۔ گولی بوڑھے وکیل کے پیٹ میں لگی اور وہ پیٹ پکڑ کر آگے کی جانب جھکتا چلا گیا۔ ناتھن کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔ وہ پھر ہجوم کی جانب گھوما۔ پبلک ہراساں انداز میں ادھر ادھر بھاگنے لگی۔

اسی اثنا میں ناتھن پچاس گز دور نکل چکا تھا۔ پوائنٹر گالیاں دیتا ہوا اپنے شکار کی جانب لپکا۔

جو بے تکی کی دوڑ پھر شروع ہو گئی۔

☆☆☆

مائیکل پہلے دھماکے کو بیک فائر سمجھا۔ فوراً ہی گولی کے دوسرے دھماکے نے اس کی غلط فہمی دور کر دی۔ اس نے تازہ جائے واردات کا رخ کیا۔ ڈپٹی اسٹیڈمین وہاں سے فاصلے پر تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس کی ٹیلی اسکوپ نے سب سے پہلے مائیکل کا احاطہ کیا۔ جو وردی میں نہیں تھا۔ دوسری بار ٹیلی اسکوپ نے خستہ حال ناتھن کو ٹاؤن اسکوائر سے قریب ہوتے دیکھا۔ اسٹیڈمین کے دل نے ایک بیٹ مس کر دی۔ اس نے تیزی سے ٹیلی اسکوپ رائفل کے زاویے بدلے اور اجنبی پولیس آفیسر کو فوکس کر لیا۔ جس کی ایک آستین پھٹی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں مہلک ہتھیار تھا اور وہ ناتھن سے قریب ہوتا جا رہا تھا۔

فیصلہ کن لمحہ آن پہنچا تھا۔ اس نے تیزی سے پوزیشن بدل کر رائفل سیدھی کی۔

☆☆☆

مائیکل کی نظر بیک وقت ناتھن اور پوائنٹر پر پڑی تھی۔ بڑی نازک صورت حال تھی۔ ناتھن کا حال برا تھا۔ اس کی قمیص خون آلود تھی۔ مسلح پوائنٹر کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ مائیکل نے صاف محسوس کیا کہ ناتھن کے قدموں میں جان نہیں رہی ہے۔ یا تو وہ گر جائے گا یا بے رحم قاتل کی گرفت میں پھنس جائے گا۔ مائیکل گن ہاتھ میں لیے سرعت سے راستہ بنا رہا تھا۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ بروقت ناتھن تک نہیں پہنچ سکے گا۔

☆☆☆

میڈیا نے مذکورہ کاؤنٹی میں بشتر وحائل جھونک دیے تھے۔ ڈیزی نے پہلی بار اپنے پروگرام میں ٹی وی کا سہارا لیا تھا۔ ایکشن نیوز والوں نے ہیلی کاپٹر بھی بھیجا ہوا تھا۔ کاپٹر کے کیمرا مین کے پاس بڑے سائز کا ٹیلی فوٹو لینس تھا۔ ایکشن نیوز کی وجہ سے، ٹی وی سے لگے ناظرین ہولناک ڈرامے کا سنسنی خیز کلائمکس براہ راست دیکھ رہے تھے۔

وکی ہیرس کے بعد مناویہ زین، مقبول کیس لاشوں سے پُر ہوتا جا رہا تھا۔ وکی ہیرس کے بعد، دو پولیس والے، پھر مارک بیلی۔۔۔ پھر برنی (کتا)، پھر بوڑھا وکیل (جس کی بابت کنفرم نہیں ہوا تھی) ایک خاتون زخمی تھی۔

آخری لاش ناتھن کی گرنی تھی یا پوائنٹر کی؟ پوائنٹر کو تو بہرحال مرنا ہی تھا۔ وہ خود بھی اس بات سے آگاہ تھا۔

ڈیزی پلکیں جھپکنا بھول گئی تھی۔ اسے خیال آیا کہ کاش وہ یہ سب نہ دیکھتی۔ مسلح قاتل لڑکھڑاتے ناتھن کے سر پر تھا۔

پوائنٹر نے اپنا بازو ناتھن کے گلے میں ڈال دیا۔ مائیکل اب بھی تیس فٹ کے فاصلے پر تھا۔ اس نے دیکھا کہ ناتھن نڈھال ہے۔ اس کی آنکھوں میں وحشت نے پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔

مائیکل فاصلہ مزید کم ہوتے ہوئے چلایا۔ ”مسٹر! ہتھیار پھینک دو۔“ مائیکل نے اسے آفیسر کہہ کر مخاطب نہیں کیا تھا۔

پوائنٹر کو جھٹکا لگا۔ اس نے ناتھن کو ایک بار پھر زمین سے اٹھا کر اپنے سامنے کر لیا اور گھوما۔ ”پیچھے ہٹ جاؤ، ورنہ میں اس فٹے کا سر کچل دوں گا۔“ پوائنٹر کا میگنم، ناتھن کی کنپٹی سے لگا تھا۔

”میں کہیں نہیں جا رہا۔ بچے کو چھوڑ دو گے تو زندہ رہو گے۔ کوئی غلط حرکت کی تو مارے جاؤ گے۔ ہر طرف پولیس ہے۔“ مائیکل نے دونوں ہاتھوں سے گن کو تھاما ہوا تھا۔ نشانہ پوائنٹر کی کھوپڑی تھی۔ اس کی ٹانگیں شوٹنگ اسٹائل میں پھیلی ہوئی تھیں۔

لیکن وہ خوب جانتا تھا کہ وہ ناتھن کو ہٹ کیے بغیر پوائنٹر کو نشانہ نہیں بنا سکتا۔ یہ کام کوئی دوسرا بھی نہیں کر سکتا تھا۔ پوائنٹر کے لیے سودے بازی کے لیے آخری پتا ناتھن تھا جو صورت حال ورسٹینس تھی، اس نے پوائنٹر کے بچنے کے امکانات بالکل ہی معدوم کر دیے تھے اور وہ بخوبی اس بات سے آگاہ تھا۔ لہٰذا اسے ناتھن کو ختم کرنا ہی تھا۔

☆☆☆

کمانڈر ریٹا میں شیرف نے ہتھیلی پر مکا مارا۔ پھر مائیکروفون پر "اسنائپر ون" سے بات کرنے لگا۔

فاصلہ سو گز کے قریب تھا۔ رائفل کی سائٹ میں لڑکا اور قاتل بہت قریب تھے۔ مزید یہ کہ ٹارگٹ ساکن نہیں تھا۔

"شیرف... میرا ٹارگٹ کون ہے؟ بچہ یا...؟"

شیرف نے سکوت اختیار کیا، پھر بولا۔ "پولیس مین۔"

☆☆☆

ناتھن کو سانس لینے میں مشکل ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ پیر بے جان سے ہو گئے تھے۔ اس نے دھندلی آنکھوں سے سامنے والے گن مین کو دیکھا۔ جو براؤن سوٹ اور نیلی شرٹ میں ملبوس تھا۔ اس کی آنکھوں میں نرمی کے ساتھ اداسی بھی تھی۔ وہ بے حد خوب صورت تھا۔ ناتھن کو خیال آیا۔ اسے یاد آیا کہ بے ڈی سینٹر سے بھاگنے کے بعد اس نے جس گھر میں پناہ لی تھی، وہاں لی ورئی پر اس نے مائیکل کو دیکھا تھا۔ کیا مائیکل اسے بچا لے گا؟

☆☆☆

"اسنائپر ون، ٹو کمانڈ، شاٹ ملتے ہی میں فائر کروں گا۔ اجازت چاہیے۔" اسنیڈ مین نے نشانہ باندھا۔

"اجازت ہے۔"

اسنیڈ مین مسکرایا۔ اس کا وقت آن پہنچا تھا۔ آج اس کا بہترین شاٹ ایک مشکل ترین نشانہ تھا۔ وہ جس رینج سے نشانہ لینے جا رہا تھا، وہاں ہوا کے دباؤ میں معمولی رد و بدل کے باعث المیہ بھی جنم لے سکتا تھا۔ اسنیڈ مین نے انگوٹھے سے سیفٹی کو ہٹایا۔ گہری گہری سانسیں لے کر خود کو پرسکون کیا۔ تمام تر توجہ مرکوز کر کے ٹیلی اسکوپ کی کراس لائن کو دیکھا۔ اس کی ایک آنکھ بند ہو گئی۔ اب وہ سکون سے مناسب موقع کا منتظر تھا۔ پوائنٹر کے سر کا معمولی حصہ نظر آ رہا تھا۔

پھر وہ موقع آ گیا۔ پوائنٹر نے مائیکل کے عقب میں ناور کو دیکھا۔ اگرچہ اتنی دور سے اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اس کا چہرہ ذرا دیر کے لیے واضح ہو گیا۔

پولیس فورس اور میڈیا کا ہجوم تھا۔ لگ رہا تھا کہ کسی فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہے۔

اسنیڈ مین اسنائپر ون تیار حالت میں تھا۔ موقع ملتے ہی اس نے سانس روک لی اور پوائنٹر کی دائیں ابرو کا نشانہ باندھ کر انگلی کا دباؤ بڑھا دیا۔ وہ ایک پرفیکٹ شاٹ تھا۔

پوائنٹر کی پیشانی سے خون کا فوارہ چھوٹا۔ وہ زمین پر گرنے سے قبل ہلاک ہو چکا تھا۔

ناتھن کے بدن کو بھی جھٹکا لگا اور وہ زمین پر جا گرا۔ اسے کچھ خبر نہ تھی کہ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ بس یہ احساس تھا کہ وہ ابھی تک زندہ ہے اور قاتل مارا جا چکا ہے۔ معاً اس نے دیکھا کہ اچانک پولیس کی قطار اس کی جانب بڑھ رہی ہے۔

"نہیں، اب نہیں۔" اس کا ذہن چیخا اور اس نے پوائنٹر کا مکینم اٹھا لیا۔ مکینم دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر وہ چلایا۔ "رک جاؤ، دور رہو مجھ سے۔"

پولیس کی قطار تھم گئی۔

مائیکل دونوں کے درمیان آ گیا۔ "ناتھن! میں مائیکل ہوں۔" وہ بولا۔

"یس سر۔"

"ہم نے فون پر بات کی تھی۔ ہم دوست ہیں۔"

"یس سر۔"

"معاملہ ختم ہو گیا ہے۔ تمہاری زندگی کا نیا دور شروع ہونے جا رہا ہے۔ کیا تمہیں مجھ پر یقین ہے؟"

"یس سر۔"

"تو پھر گن پھینک دو۔ سب کچھ بدل گیا ہے۔"

مائیکل کی آواز میں نرمی اور پیار تھا۔ وہ دھیرے دھیرے ناتھن کی سمت بڑھ رہا تھا۔ اچانک گن اس نے واپس جگہ پر رکھ دی گیا۔

ناتھن کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ اس نے مائیکل کی دوستانہ آنکھوں میں دیکھا اور مکینم نیچے گرا دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ سائڈ واک پر بیٹھ گیا۔ مائیکل آہستہ روی سے چلتا ہوا اس کے برابر جا کر بیٹھ گیا۔

ناتھن رو رہا تھا۔ مائیکل نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ خود اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ اسے لگا کہ وہ ناتھن نہیں بلکہ اپنے مرحوم بیٹے براؤن کے ساتھ بیٹھا ہے۔ اس نے کسی باپ ہی کی طرح محبت سے ناتھن کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔

"میرے بچے سب ٹھیک ہو گیا ہے۔" مائیکل نے سرگوشی کی۔ "اب تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔"

ٹی وی پر ان گنت لوگ یہ جذباتی منظر دیکھ رہے تھے۔

☆☆☆

ڈیزی کے ہونٹ سختی سے بھنچے ہوئے تھے۔ اس کا میک اپ خراب ہو چکا تھا۔ نظر اسکرین پر جمی تھی۔ ڈیڈ بائی آنکھوں کے ساتھ لبوں پر مسکراہٹ بھی۔

"میں تم سے ضرور ملوں گی۔" وہ بڑبڑائی۔

◆●◆

خارِ راہ

محمد عثمان آزاد

اپنی پسند کے لوگ ملنا مشکل اور من چاہا باس ملنا تو شاید ناممکنات میں سے ہے... ان دونوں کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا... دونوں جی جان سے باس کو خوش کرنے کی کوشش کرتے لیکن شاباشی ان سے دور ہی رہتی... ڈانٹ... ذلت... حقارت ان کا مقدر بن چکی تھی... لیکن ایک دن صبر کا پیمانہ چھلکا تو پھر باس کے طوطے اڑ گئے...

ایک بڑے مقصد کے لیے کی جانے والی چھوٹی سی قانون شکنی کا پرلطف احوال

لگ بھگ ایک سال ہونے والا تھا۔ اب وہ یہ جان چکے تھے کہ کانفرنس روم میں جانے کا مطلب ہے چند منٹ اور ذلت سے بھرے ڈھیروں نوکرے۔ وہ دونوں کئی مہینوں سے اس تکلیف دہ صورتِ حال کا سامنا کر رہے تھے۔ ہفتے میں کم و بیش دو تین بار ایمٹرون انٹرپرائزڈ پرائیوٹ لمیٹڈ کے قائم مقام سربراہ ویجڈ لوری کے سامنے حاضری اور جھکے سروں کے ساتھ طعن و تشنیع برداشت کرنا ان کا معمول بن چکا تھا۔ ہیکس اور ملٹن اس فرم کے پرانے

ملازم تھے لیکن برسوں کی ملازمت میں بھی بار انہیں اپنے محسن دل دکھتے پڑ رہے تھے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید وہ ورزوں ہی اپنا استعفیٰ رچرڈ کے منہ پر مار کر نکل جاتے لیکن ان کی ایک مجبوری ایسا کرنے سے روک رہی تھی۔ امریکی معیشت شدید مندی سے تو نکل چکی تھی لیکن کساد بازاری کے اثرات اب بھی برقرار تھے۔ کمپنیاں اور کاروبار سخت حالات سے نکلنے کے باوجود غیر مستحکم تھے۔ ایسے میں ملازمت چھوڑنے کا مطلب جمع پونجی کا صفایا اور نئی ملازمت کے لیے طویل انتظار کے سوا کچھ نہ تھا۔ ملٹن اور ہیکس خوش حال زندگی بسر کر رہے تھے لیکن وہ غیر معینہ مدت کی بے روزگاری اختیار کرنے کے قطعی متحمل نہ تھے۔ اسی لیے وقت کی نزاکت نے انہیں مفاہمت کے در پہ لا کھڑا کیا تھا۔

وہ پیر تھا۔ نئے ہفتے میں کام کا پہلا دن۔ حسب سابق اس دن کا آغاز بھی گزشتہ ایک برس کے دوران گزرے دنوں سے کچھ مختلف نہ تھا۔ رچرڈ نے ایک بار پھر دفتر پہنچتے ہی دونوں کو کانفرنس روم میں طلب کر لیا تھا۔ برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے لیکن اس کے حضور پیشی سے پہلے تک دونوں کو قطعی اندازہ نہ تھا کہ اب شاید پیمانہ چھلکنے کے قریب ہے۔ ہمیشہ کی طرح وہ میٹنگ بھی چند منٹوں پر محیط رہی تھی لیکن ہیکس اور ملٹن کے لیے وہ لمحات جیسے اپنے مقام پہ ساکت ہو چکے تھے۔ آخر ہیکس کے دل میں یہ بات آہی گئی کہ بس بھئی بس! اب بہت ہو چکا۔

''تم لوگوں کے ساتھ ہی مسئلہ ہے۔'' رچرڈ نے اس میٹنگ کی ابتدا بھی حسب عادت تلخ لہجے میں نفرت بھرے کلمات سے کی۔ ''سے ہی کہا تمہارے پاس، ایکس کلائنٹس... کیا تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ صرف ان ایجنسی کلائنٹس کی بنیاد پر یہ کمپنی چل سکتی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے دونوں کے چہرے پر سوالیہ نگاہ ڈالی۔

ملٹن کو توقع تھی کہ ہیکس کے لیے رچرڈ کا سوال اہمیت کا حامل نہیں ہوگا لیکن وہ ایسا نہیں سوچ رہا تھا۔ ''مسٹر رچرڈ...'' ہیکس نے کچھ توقف کے بعد زبان کھولی۔ ''گزشتہ بائیس سال سے یہ کمپنی چل رہی ہے اور ہمارے ہیکشن کے پاس بھی کلائنٹس ہیں، کبھی دو چار زیادہ تو کبھی ایک دو کم مگر ایجنسی سے کم کبھی نہیں ہوئے۔''

''واہ واہ... کیا نکتہ اٹھایا ہے۔'' رچرڈ نے طنزیہ انداز میں تالی بجائی۔ ''یہ نہایت تسلی بخش بات ہے۔'' وہ کانفرنس میز کے آخری سرے پر بیٹھا تھا۔ اس نے سفید شرٹ اور گرے سوٹ کے ساتھ سرخ ٹائی باندھی ہوئی تھی۔ انتہر

ٹون اسٹر پرائزز میں وہ ٹائی باندھنے والا واحد شخص تھا، باقی شاید اسے رکھ رکھاؤ کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے تھے۔ ان کے نزدیک سجنے سنورنے سے زیادہ اہمیت کام کی تھی مگر شاید رچرڈ... اس کے نزدیک آسائش و آرائش اور قیمتی لباس زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ وہ بلا کا فضول خرچ اور عیش و آرام کا دلدادہ تھا۔ یہ وہ شخص تھا جو بال کٹوانے پر دس ڈالر سے زیادہ اڑا رہا تھا۔ اسے ٹینس کھیلنے کا بھی بہت شوق تھا۔ دفتر ہو یا باہر وہ اپنا شوق پورا کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ جب وہ کسی سے ناراض ہوتا تو پھر ٹینس کی گیند اس کے ملازم کی ناک یا سر کا نشانہ لے لیتی تھی۔ اس کے بعد وہ مصنوعی لہجے میں کہتا سوری، وہ جسے سن کر سامنے والا خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا تھا۔ ہیکس اور ملٹن بھی کئی بار اس کی بال کا ہدف بن چکے تھے۔ ہیکس نے تو بچنے کا راستہ نکال لیا تھا۔ وہ جھکائی دیتا اور بال جا کر کسی اور شے سے ٹکراتی۔ رچرڈ بھی یہ بھانپ چکا تھا۔ اب اکثر اس کا ہدف بے چارہ ملٹن ہی بنتا تھا۔ ان میں ہیکس کی طرح پھرتی نہ تھی کہ اپنا بچاؤ کر سکتا۔ رچرڈ جان بوجھ کر اسے ہی اپنی بال کا نشانہ بناتا لیکن اسے چڑانے کے لیے سوری کہنے کے بجائے صرف ایک جملہ کہتا۔ ''تم ٹھیک سے بچ نہیں سکتے، کیوں بال کے سامنے آجاتے ہو۔'' یہ سن کر ملٹن کے تن بدن میں آگ لگ جاتی مگر وہ اپنی اس عادت سے مجبور تھا۔ کچھ کیوں نہ ہو جائے، دماغ ٹھنڈا رکھنا اس کی زندگی کا پہلا اصول تھا۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی برداشت کا پیمانہ چھلک جانے کی۔ کانفرنس روم میں میٹنگ جاری تھی۔ ابتدائی لعن طعن کا مرحلہ گزر جانے کے بعد کمرے میں چند لمحوں تک سکوت طاری رہا، آخر ایک بار پھر رچرڈ کی پاٹ دار آواز گونجی۔ ''جانتے ہو اصل مسئلہ کیا ہے، وہ تم خود ہو ہیکس... دراصل تمہاری پیشہ ورانہ تربیت میں ہی کمی رہ گئی ہے۔ تم بڑے ہی نہیں ہو سکے اب تک۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے دائیں ہاتھ پہ بیٹھے ملٹن کی طرف گردن گھمائی۔ ''تو تم میری بات سے متفق نہیں ہو۔'' اس نے ملٹن کو گھورتے ہوئے سوالیہ لہجے میں کہا۔

یہ سن کر ملٹن کسمسایا ضرور لیکن کوئی جواب نہیں دیا۔

''میں نے تم سے ایک سوال پوچھا ہے۔'' رچرڈ نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ اس کی کاٹ دار نگاہیں بدستور ملٹن کے چہرے پہ گڑی تھیں۔

''ہیکس اس شہر کا سب سے بہترین ڈیزائنر ہے۔''

ملٹن سمجھ گیا تھا کہ جواب دیے بنا جان چھوٹنے والی نہیں اسی لیے اس نے اعتماد سے نہیں بلکہ ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا بکواس ہے... !'' یہ سن کر رچرڈ نے زور سے میز پر ہاتھ مارا اور چھت کو گھورنے لگا۔ اس کا ہلتا ہوا سر اس کے اندر کی اضطرابی کیفیت کو ظاہر کر رہا تھا۔ کچھ دیر تک وہ یونہی خاموش رہا اور پھر ایک جھٹکے سے ملٹن کی جانب گردن گھمائی۔ ''اب اگر میں تم سے یہ کہوں کہ آج ڈیزائن کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی ہے تو پھر تم کیا کہو گے؟''

ملٹن ایک بار پھر کسمسایا۔ اس نے کن انکھیوں سے ہیکس کی جانب دیکھا۔ وہ شرمندگی سے سر جھکائے بیٹھا تھا۔

جب ملٹن بدستور خاموش رہا تو جواب کا مزید انتظار کرنے کے بجائے رچرڈ نے خود ہی بولنا شروع کر دیا۔ ''اصل ہدف ترقی حاصل کرنا ہے، ڈیزائن تو کوئی بھی بنا سکتا ہے لیکن ہدف حاصل کرنا اور ترقی کی سیڑھی چڑھنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوا اور انہیں گھورنے لگا۔

ہیکس اس کی کاٹ دار نگاہوں کی تاب نہ لا سکا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ ملٹن نے مداخلت کی۔ ''سر! ہم ترقی کریں گے، مجھے یقین ہے۔'' اس کا لہجہ مؤدبانہ تھا۔

''کیا... !'' رچرڈ نے اسے کھا جانے والی نگاہوں سے گھورا۔ ''خوب کہا تم نے۔'' وہ طنزیہ ہنسی ہنسا۔ ''ہم ترقی کریں گے لیکن کب... ہم تو اب ختم ہونے جا رہے ہیں، سب تباہ ہو رہا ہے۔ ہم برباد ہونے لگے ہیں اور تم کہتے ہو کہ ترقی کریں گے... واہ واہ، کیا کہنا۔'' وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا۔ ملٹن کھسیانا ہو رہا تھا۔ ''تم دونوں...'' اس نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''اگلی سہ ماہی ختم ہونے تک مجھے مستقل بنیادوں پر مزید پانچ نئے کلائنٹس چاہئیں مکمل پیکج کے ساتھ۔ ڈیزائن، تعمیر اور پھر مستقل بنیادوں پر باقاعدہ دیکھ بھال کے ٹھیکے سمیت۔''

ہیکس یہ سن کر کرسی پر پیچھے کی طرف کھسکا اور پشت سے سر ٹکایا۔ اس کی بھویں تن رہی تھیں۔

''آئندہ سے میں براہِ راست تم دونوں کے کام کی نگرانی کروں گا اور جب پراجیکٹ کے دورے پر جاؤں گا اس وقت بھی تم دونوں میرے ساتھ جاؤ گے۔'' اس نے ہیکس کی طرف دیکھا۔ ''سمجھے... میرا مطلب ہے کہ اب ڈیزائن میرے سامنے ہی تیار ہو گا۔'' اتنا کہہ کر رچرڈ ملٹن کی طرف مڑا۔ ''کنسٹرکشن اور مینٹی نینس بھی میری نگرانی میں ہو گی۔''

ہیکس کے بعد ناپسندیدہ بات میں سر ہلانے کی باری ملٹن کی تھی لیکن وہ خاموش نہ رہا۔ ''اگر اس سہ ماہی کے دوران مستقل بنیادوں پر پانچ نئے کلائنٹس حاصل کر لیے تو اس کا مطلب یہ بھی ہو گا کہ ہمیں نیا عملہ بھرتی کرنا پڑے گا۔ اگر کام بڑا ہوا تو موجودہ عملہ اس کے لیے ناکافی ہو سکتا ہے۔''

''کیا کہا تم نے...'' یہ سنتے ہی رچرڈ نے تیزی سے گردن گھمائی اور اسے گھورا۔ لگتا تھا کہ جو سنا وہ اس پر یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔ ''کلائنٹس ابھی آئے نہیں کہ تم نے اخراجات کی گردان شروع کر دی۔'' ''کیا تمہارا دماغ خراب ہے۔ یہاں پہلے ہی خرچے کم نہیں اور اوپر سے تم نے نئے خرچوں کی بات شروع کر دی۔'' لمحہ بھر توقف کے بعد پھر کہنا شروع کیا۔ ''سب سے پہلے کلائنٹس آنے دو۔ اس کے بعد موجودہ عملے سے کام چلاؤ۔ آگے چل کر دیکھیں گے کہ کیا کرنا ہے۔ فی الحال مجھے کلائنٹس چاہئیں اور کچھ نہیں۔ میں مزید ایک پھوٹی کوڑی خرچ کرنے کو تیار نہیں۔'' وہ غصے میں بھرا لگ رہا تھا۔

''اب میں اس سے زیادہ اور کتنا کام کر سکتا ہوں۔ جو کام ہے، اسے نمٹانے کے لیے پہلے ہی پچاس فیصد اوور ٹائم کر رہا ہوں۔'' ملٹن نے منمناتی آواز میں احتجاج کیا۔

''مجھے بتانے کی ضرورت نہیں۔ اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم کتنا کام کرتے ہو۔'' اوور ٹائم کا سنتے ہی رچرڈ بھڑک گیا۔ ''اپنی کارکردگی بنانے کی کوشش نہ کرو بلکہ کمپنی کو جو نقصان ہو رہا ہے، اسے بچانے اور اسے آگے بڑھانے کا سوچو۔''

''بہتر ہے۔'' ملٹن نے بے دلی سے کہا۔

''زیادہ بہتر ہے کہ یہاں بیٹھنے کے بجائے اٹھو اور جا کر اپنا کام کرو۔''

رچرڈ کی بات سنتے ہی ہیکس نے فوراً اپنی کرسی چھوڑ دی۔ اس کے پیچھے پیچھے ملٹن بھی کانفرنس روم سے باہر نکل آیا۔ ہیکس چھوٹے سے ہال سے گزرتے ہوئے اپنے کیبن میں پہنچا۔ اس کے پیچھے پیچھے ملٹن بھی داخل ہوا اور آتے ہی دروازہ بند کر دیا۔

ہیکس اپنی کرسی پر ڈھیر ہو چکا تھا۔ اس کے چہرے پر مایوسی اور ندامت کے آثار نمایاں تھے۔ ''تم ٹھیک تو ہو نا؟'' ملٹن نے اس کے سامنے دھری کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

ہبکس نے گہری سانس لی اور بھاری لہجے میں کہا۔ ”وہ اب آخری قدم اٹھانے جا رہا ہے۔“

”تم نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا؟“ وہ کافی دیر خاموش رہا تو ہبکس نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

ملٹن نے کرسی کی پشت سے سر ٹکا یا اور لمحہ بھر ہبکس کا چہرہ تکتا رہا، پھر گہری سانس بھر کر کہا۔ ”مسٹر ایمفرٹون بیمار ہیں اور بورڈ میں بیٹھ کر رچرڈ تمام حرکتیں اپنے سسرالیوں کو دکھانے کے لیے کر رہا ہے۔“ اس کی آواز پنچی تھی۔

”تمہاری بات ٹھیک ہے۔“ ہبکس نے کہا۔ ”ڈاکٹروں نے ان سے کہا ہے کہ وہ خود کو کاروباری جھمیلوں میں الجھانے سے پرہیز کریں ورنہ ان کے سسر کی بگڑتی صحت مزید تیزی سے خراب ہو سکتی ہے۔ اب اگر مسٹر ایمفرٹون نے رچرڈ کی لگامیں نہ کھینچیں تو سب کچھ بھی کر گزرے گا۔“

”ٹھیک کہتے ہو۔“ ملٹن نے ہنکارا بھرا۔ ”صرف یہی کاروبار نہیں بلکہ اس کے انکل نے اپنی محنت سے جو کچھ بنایا ہے، یہ اس سب کو برباد کر کے رکھ دے گا۔ لگتا ہے کہ اس کی نظریں ایمفرٹون انٹرپرائزز کے ہر کاروبار پر ہیں۔“

رچرڈ لوری، مسٹر ایمفرٹون کا بھتیجا ہی نہیں، ان کی اکلوتی بیٹی کا شوہر بھی تھا۔ ایمفرٹون نے بڑی محنت سے ایک ایک اینٹ لگا کر اپنے کاروبار کی عمارت کھڑی کی تھی۔ کم و بیش کبار در مارفیل جب انہیں دل کا دورہ پڑا تو ڈاکٹروں نے سختی سے انہیں کاروباری جھمیلوں سے دور رہنے کو کہا تھا مگر یہ کوئی دکان تو تھی نہیں کہ شٹر گرایا اور معاملہ ٹھپ۔ یہ تو ایمفرٹون انٹرپرائزز تھی۔ مسٹر ایمفرٹون نے بھی طرح طرح کے کاروبار میں ہاتھ ڈال رکھا تھا۔ سب کچھ یکدم ختم نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی لیے کاروبار کی دیکھ بھال کے لیے انہوں نے اپنے بھتیجے اور داماد رچرڈ لوری کا سہارا لیا۔ شاید وہ خود بھی دل سے اس بات کا خواہش مند تھا۔ اس نے بھی خوشی خوشی ذمے داری قبول کی۔ بظاہر کارکردگی دکھانے کے چکر میں اس نے ماتحت عملے کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔ اپنے انکل کی نسبت وہ خاصا خرانٹ اور بدتمیز واقع ہوا تھا۔ سب اس سے تنگ تھے سوائے اس نئے اسٹاف کے جنہیں اس نے خود بھرتی کیا تھا۔ ان میں بھی زیادہ تر اسٹاف اکاؤنٹس کا تھا۔

ایمفرٹون انٹرپرائزز کے کئی کاروبار تھے لیکن سب سے جانا پہچانا کام لینڈ اسکیپنگ سروسز تھا۔ ہبکس اور ملٹن اسی شعبے سے وابستہ تھے۔

آخر لعن طعن کانفرنس میں رچرڈ نے ملٹن اور ہبکس کو کارگزاری دکھانے کے لیے ایک ہفتے کی ڈیڈ لائن دی تھی۔ جس کے بعد ایک بار پھر وہ تینوں ایک دوسرے کے سامنے کانفرنس روم میں موجود تھے۔ ماحول گزشتہ میٹنگز سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔ ہبکس اور ملٹن نے باری باری اپنی کارکردگی رپورٹ اور نئے کلائنٹس حاصل کرنے کے لیے کی جانے والی کوششوں پر بریفنگ دی۔ رچرڈ بے دلی سے ان کی بات سنتا رہا اور جب وہ خاموش ہوئے تو رچرڈ کے ایک جملے نے ہی ان کی محنت پر پانی پھیر دیا۔ اس نے برا سا منہ بناتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔ ”یہ سب کچھ بکواس ہے۔“ اس نے میز پر ہاتھ مار کر ان کی فائلیں نیچے پھینکیں۔ ”تم دونوں بکواس کو کارکردگی سمجھتے ہو۔“

یہ سنتے ہی ان کے منہ اتر گئے۔ ہبکس اندر ہی اندر غصے سے کھول اٹھا۔ اس نے خود پر قابو پانے کے لیے شدت سے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ اس کے جبڑے بھنچ گئے تھے البتہ ملٹن کے چہرے پر ندامت چھائی ہوئی تھی۔ وہ مرا مرا سا لگ رہا تھا۔ ”یہ ممایا پا کا مال ہے اور میں اسے یوں برباد نہیں ہونے دوں گا۔“ وہ زور سے چلایا۔

”مگر......“ ملٹن نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

”تمہارے ان آٹھ نئے آرڈیلاز کی کوئی قیمت نہیں۔“ رچرڈ نے اسے کہنے کا موقع دیے بغیر اپنی بات شروع کر دی۔ اس کا لہجہ تلخ تھا۔ ”تم جنہیں اچیو کہہ رہے ہو، در اصل وہ یہ آٹھ ممکنہ کلائنٹس ہیں جو اس وقت کسی اور فرم کی خدمات سے استفادہ کر رہے ہیں۔ چلو...... اگر ان میں سے تین چار کو توڑنے میں تم کامیاب ہو بھی جاتے ہو تو پھر......“ اس نے بات ادھوری چھوڑ کر دونوں کے ستے ہوئے چہروں پر باری باری نظر ڈالی۔ ”کیا ہوگا پھر......“ ہنکارا بھر کر اس نے ایک بار پھر جلی کٹی سنانا شروع کی۔ ”اس سے آمدنی میں صرف پانچ چھ فیصد اضافہ ہوگا جو کسی فرم کے استحکام اور ترقی میں کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتی۔ رہے بھی اب تک صرف یہ ایک آئیڈیا ہے، ضروری نہیں کہ وہی کچھ ہو جو سوچ کر تم نے یہ رپورٹ لکھی ہے۔“ اس نے نخوت سے دائیں جانب نظریں گھمائیں۔ ”یہ سب کچھ نہیں چاہیے، مجھے ٹھوس کارکردگی درکار ہے۔“

کمرے میں چند لمحوں تک سکوت طاری رہا۔ رچرڈ کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ دم بخود بیٹھے تھے۔ آخر رچرڈ کی ریوالونگ چیئر کی چرچراہٹ سے

سکوت ٹوٹا۔ اس نے ہینڈ بیگ سے ایک بڑے سائز کا لفافہ نکالا۔ ”ہفتہ بھر میں نے بہت کام کیا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے لفافہ کھولا اور ایک کاغذ نکال کر ان دونوں کے سامنے لہراتے ہوئے بولا۔ ”آنے والے چند مہینوں میں ہمارے بہت سے ٹھیکوں کی میعاد ختم ہو رہی ہے اور توقع نہیں کہ ان کی تجدید ہو سکے۔ ادارے اور عمارتیں جنگلی کھمبوں کی طرح نہیں اگتے کہ بس ذرا بارش ہو اور زمین ان سے بھر جائے۔“ اس نے دونوں پر قہر آلود نظر ڈالی۔ ”آئندہ چند ماہ میں ایک اسپتال، دو کالج، کاؤنٹی آفس کی دیکھ بھال اور مرمت کا ٹھیکا ختم ہونے جا رہا ہے... سمجھے۔“

”ایک بونٹیک بھی اس میں شامل ہے۔“ طلمن نے جلدی سے لقمہ دیا۔

”اوہ...“ رچرڈ کا لہجہ طنزیہ تھا۔ ”تم تو بہت معلومات رکھتے ہو۔“

”سوری سر!“ طلمن گڑبڑا گیا۔

”تم سب تالاب کے شکاری ہو۔ تم کانٹے میں چھوٹی مچھلی دیکھ کر خوش ہو جاتے ہو لیکن یہ مجھے نہیں چاہیے۔ میں شارک پکڑنا چاہتا ہوں۔“ رچرڈ نے کٹ کھنے لہجے میں کہا۔ پھر بجھا ہوا سگار دوبارہ سلگانے کے لیے توقف کیا اور بھرپور کش لے کر دھواں طلمن کی طرف چھوڑ دیا۔ ”اور تم مسٹر کارگزاری...“ اس نے طنزیہ انداز میں اسے مخاطب کیا۔

”یس سر!“ طلمن نے فوراً خادمانہ انداز میں کہا مگر اس کا لہجہ مرا مرا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ اب پھر ڈانٹ پھٹکار کی توپوں کا رخ اس کی طرف ہونے والا ہے۔

”خود کو ٹھیک کرو۔ میں تمہاری کارکردگی سے مطمئن نہیں ہوں۔ تمہیں جتنا کچھ ڈلیور کرنا چاہیے، وہ نہیں کر پا رہے ہو۔“

”او سر!“ طلمن منمنایا۔ ”میں تو اپنی پوری کوشش کر رہا ہوں۔ اب تو میں نے گزشتہ ہفتے سے اوور ٹائم کرنے کے باوجود اس کا معاوضہ بھی لینا بند کر دیا ہے۔“

”تو میں کیا کروں۔“ رچرڈ نے جھلا کر جواب دیا۔ ”کون سا فائدہ ہو رہا ہے تمہارے اوور ٹائم کا۔ اور اگر تم نے اوور ٹائم کے پیسے لینا بند کر دیے ہیں تو کیا اس کے لیے پریس ریلیز جاری کر دوں۔“ اس نے لمحہ بھر توقف کیا اور پھر منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ ”سمجھ میں نہیں آتا کہ انکل نے تم میں کیا خوبی دیکھ کر بھرتی کیا تھا۔ دو ٹکے کی قابلیت نہیں ہے۔“

”لیکن سر... آج تک مجھ سے کسی کو کوئی شکایت نہیں ہوئی، چاہیں تو میرا ریکارڈ چیک کر سکتے ہیں۔“ طلمن نے دفاع کی بھرپور کوشش کی۔ وہ رچرڈ کے تبصرے سے سبکی محسوس کر رہا تھا۔

”کچھ دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ میں سب کچھ بہت اچھی طرح جان چکا ہوں۔“ اس نے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔ یہ سن کر طلمن خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا مگر زبان سے کچھ نہ بولا۔ رچرڈ نے ان دونوں پر گہری نظر ڈالی۔ ”تم دونوں نے ایک بار پھر مجھے بہت مایوس کیا ہے۔“ اس نے ہیلکس کی طرف انگلی اٹھائی۔ ”تمہارے پاس ایک ہفتہ اور ہے۔ سوچو اور نئے بزنس لاؤ، نئے آئیڈیاز لاؤ۔ وہ اسپتال ہو یا کالج، مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بس آئیڈیا جاندار ہونا چاہیے اور ہاں بڑا بھی۔ مجھے چھوٹے کام نہیں کرنے۔ اس طرح تبدیلی نہیں آنے والی۔ میں اس کمپنی کو فرش سے اٹھا کر عرش پر لے جانا چاہتا ہوں اور آئیڈیے پر کام کرتے ہوئے یہ بات تمہارے ذہن میں رہنی چاہیے۔“ اس کا لہجہ مزید تخت اور تلخ ہو چکا تھا۔

کمرے میں خاموشی تھی۔ رچرڈ نے سگار کا ایک اور گہرا کش لیا۔ ایک بار پھر طلمن کی آنکھوں کے سامنے دھوئیں کے مرغولے تیر رہے تھے۔ اچانک اس نے کرسی گھمائی اور آگے جھک کر طلمن کے چہرے کو لمحہ بھر بغور دیکھا اور پھر شہادت کی انگلی کو پستول کی نال کی طرح اس کی طرف کیا۔ ”جو کچھ ابھی میں نے کہا وہ تمہارے لیے بھی تھا۔ اچھی طرح ذہن میں بٹھا لو ورنہ...“ اس نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑی اور کرسی کی پشت سے سر ٹکا لیا۔ ”اگلے ہفتے بھی یہی حال رہا تو پھر تم دونوں میں سے کسی ایک کو جانا ہوگا۔ وہ کون ہو سکتا ہے، مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔“

یہ سن کر طلمن کا چہرہ اتر گیا۔ ”لیکن سر...“ اس نے ڈرتے ڈرتے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر لمحہ بھر کچھ سوچنے کے بعد کہا۔ ”اوکے... جیسا آپ نے کہا، میں ویسا ہی کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

”کچھ اور کہنا ہے...“ رچرڈ نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا اور کوئی جواب نہ پا کر چلایا۔ ”تو پھر یہاں سے دفع ہو جاؤ۔“

دونوں کانفرنس روم سے باہر نکل آئے۔ ہیلکس دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اب وہ یہاں مزید کام نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن کوئی فیصلہ کرنے سے قبل وہ طلمن سے بات کرنا چاہتا تھا۔ دفتری ماحول سے دور کسی اور جگہ جہاں وہ کھل کر بات کر سکیں۔

دفتر سے فراغت کے بعد دونوں اپنی اپنی کار میں

قریب واقع ہیمبرگر ریستوران پہنچے۔ وہاں وہ آرام سے بات کر سکتے تھے۔ وہ کھڑکی کے ساتھ والی میز پر بیٹھے تھے۔ ریستوران بھی تقریباً خالی تھا۔ ویسے بھی یہ وقت نہ لنچ کا تھا، نہ ہی ڈنر کا۔ ہینکس کو بھی اسی طرح کا ماحول درکار تھا۔ دونوں کچھ دیر خاموشی سے باہر کا نظارہ کرتے رہے۔ رچرڈ کی باتوں کی وجہ سے ملٹن بہت پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ اسے نوکری جاتی ہوئی نظر آرہی تھی۔

"مجھے لگتا ہے کہ وہ ہمیں نکالنے پر تلا بیٹھا ہے۔" آخر ہینکس نے خاموشی توڑ دی۔

اس سے پہلے کہ ملٹن کچھ کہتا، ویٹرس آرڈر لے آئی۔

"شکریہ..." اس نے افسردہ مسکراہٹ کے ساتھ ویٹرس کی طرف دیکھا۔

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔" ہینکس نے پلیٹ اپنی طرف سرکائی۔ وہ جان بوجھ کر اس کے چہرے کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ رچرڈ جس طرح اسے ذلیل کر رہا ہے، وہ رویہ خود ملٹن کے لیے بھی ناقابلِ برداشت ہو چکا تھا۔

"مجھے رچرڈ نے نہیں، مسٹر ایمبرٹون نے ملازمت پر رکھا تھا اور وہ میرے کام سے خوش بھی تھے۔"

اسی دوران موسیقی بجنے لگی۔ چھت کے کونوں میں لگے بڑے بڑے اسپیکر سے گونجنے والی موسیقی بہت تیز تھی۔ بھاری مردانہ آواز میں کوئی مردِ محبوب کے وصال کا لطف اور ہجر کا صدمہ بیان کر رہا تھا۔ ہینکس دھیمے لہجے میں گفتگو کرتا تھا مگر پُرشور موسیقی کے سبب اس کی آواز بھی اونچی ہوگئی تاکہ وہ اس کی بات سن سکے لیکن وہ جو کچھ ملٹن سے کہنا چاہتا تھا، اس کے لیے اونچی آواز میں بولنا خطرناک تھا۔ اس نے ملٹن کے چہرے کی طرف دیکھا۔ "ایمبرٹون قناعت پسند بندہ ہے لیکن رچرڈ لالچی اور حریص ہے۔ ایسا شخص اپنے فائدے کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے، کسی حد تک بھی جا سکتا ہے۔"

ملٹن بے دلی سے پلیٹ میں رکھے ہیمبرگر کو تک رہا تھا۔ وہ لمحہ بھر یونہی بیٹھا رہا پھر دل گرفتہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ہم نے اس کے سامنے ٹھوس منصوبہ پیش کیا تھا۔ بڑے بڑے ٹھیکوں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے کام بھی کیے جائیں، کمپنی کی آمدنی میں رفتہ رفتہ بڑا اضافہ ہو سکتا ہے لیکن اسے تو سرکاری ٹھیکے چاہئیں اور وہ بھی بڑے بڑے۔ بڑے بڑے ترقیاتی منصوبوں کے شروع ہونے کے کوئی آثار نہیں ہیں، جہاں ہمیں زمین ہموار کرنے کے بڑے ٹھیکے مل سکیں۔ مجھے تو کچھ نہیں آتا وہ کیا سوچ کر یہ بات کر رہا ہے؟"

"ہو سکتا ہے، اسے کہیں سے، اپنے ذرائع سے کچھ بھنک مل گئی ہو۔" ملٹن نے دبے دبے لہجے میں جواب دیا۔

"شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" ہینکس نے سر ہلایا۔ "یہ بے بڑا کمینہ۔ ایسے لوگ جو چاہتے ہیں وہ حاصل کر لیتے ہیں، خواہ اس کے لیے کچھ غلط ہی نہ کرنا پڑے۔" وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا پھر بولا۔ "مگر ایک بات طے ہے، وہ جو کرانا چاہتا ہے ہم دونوں اس کے لیے نہیں کر سکتے۔ مسٹر ایمبرٹون کی حالت اس قابل نہیں کہ وہ یہ دیکھ سکیں کہ ان کا چہیتا داماد، ان کے خاندانی کاروبار کو کس طرح تباہ و برباد کرنے پر تلا بیٹھا ہے..."

"شاید اپنے ذاتی مفاد کی خاطر۔" ملٹن نے بات کاٹتے ہوئے لقمہ دیا۔

ہینکس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"صورتِ حال ایسی ہے کہ ہم کچھ کر بھی نہیں سکتے۔" ملٹن نے بے بسی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

دن کے آغاز پر کام کی شروعات ہی رچرڈ کے ہاتھوں ڈانٹ پھٹکار سے ہوئی تھی۔ جس کے بعد وہ دونوں نہ تو کوئی دفتری کام ڈھنگ سے کر سکے تھے اور نہ ہی لنچ۔ اسی لیے شام کے پہلے پہر وہ دونوں بھرپور توجہ کے ساتھ کھانے سے انصاف کر رہے تھے۔ تیز موسیقی ریستوران کے کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھی۔ اس وقت ملٹن یہ بھی بھول چکا تھا کہ ہینکس آخر تنہائی میں اس سے کیوں ملنا چاہتا تھا۔

"کچھ اور چاہیے۔" کچھ دیر بعد ویٹرس نے ان کے قریب آکر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ضرور..." ہینکس نے کہا۔

"کیا...؟"

"موسیقی ذرا دھیمی کر دیں۔" ملٹن نے کہا۔

"اوہ..." وہ ایک بار پھر مسکرائی اور دونوں پر گہری نظر ڈالی۔ وہ دونوں ادھیڑ عمر تھے۔ سمجھ گئی کہ انہیں نوجوانوں کے پسندیدہ گلوکاروں کی گلا پھاڑ آواز پسند نہیں مگر منہ سے کچھ نہ بولی۔ "صرف ایک منٹ..." یہ کہہ کر وہ لہراتے ہوئے چل دی۔

"تم لوگوں کے بارے میں کس حد تک جانتے ہو۔" ہینکس نے ہیمبرگر ختم کر کے کولڈ ڈرنک پیتے ہوئے خاموشی توڑی۔ کھانے کے دوران وہ دونوں ہی چپ رہے تھے۔

"شاید کچھ خاص نہیں۔" اس نے بے دلی سے جواب

دیا۔ لگتا تھا کہ وہ اب تک رچرڈ کے ہاتھوں ہونے والی تذلیل کو دل سے لگائے بیٹھا تھا۔

ہیکس نے لمحہ بھر کو اسے دیکھا اور پھر بہت عجیب سوال کیا۔ ”کبھی تم جیل میں قید رہے ہو؟“

”کیا بکواس ہے۔“ اس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر چلا گیا۔

”اگر لوگوں کو سمجھنا ہے تو پھر کچھ عرصہ جیل میں ضرور گزارنا چاہیے۔“ ہیکس کا لہجہ گمبھیر تھا۔ ”اس سے انسانوں کو پرکھنے کا ہنر آ جاتا ہے۔“

”ہر شخص ہمیشہ باور کیے جانے کے قابل نہیں ہوتا۔“ ملٹن نے نوالہ چباتے ہوئے کہا۔

”میں یہ نہیں کہہ رہا کہ تمہیں ہر شخص کو ذاتی طور پر سمجھنا چاہیے بلکہ اس کی کوشش کرنی چاہیے لیکن جن لوگوں کے ساتھ ہم ہوتے ہیں، کام کرتے ہیں، اپنا وقت گزارتے ہیں، انہیں تو سمجھنا چاہیے۔“ ہیکس کا لہجہ کسی ایسے دانشور کی طرح تھا جو سامنے بیٹھے طالب علم کو زندگی کے اسرار و رموز سکھانے کی کوشش کر رہا ہو۔

ملٹن نے ہیکس کی طرف دیکھا مگر وہ سر اٹھائے چھت کو گھورے جا رہا تھا۔ ”ہمیں اپنے کام سے غرض ہونی چاہیے، لوگوں کو سمجھنے کا اس سے کیا تعلق اور پھر اس کے لیے جیل جانا...“

”چیزوں کو ہونے دو۔“ ہیکس نے اس کی طرف دیکھے بنا فلسفیانہ انداز میں جواب دیا۔ ”پانی کو بہنے دو لیکن اگر وہ تمہارے گھر میں داخل ہونے لگے تو پھر اس کا رخ موڑنا ضروری ہے۔“

ملٹن نے سنی ان سنی کرتے ہوئے ایک اور لقمہ لیا۔ برگر اس کی توقع سے زیادہ لذیذ تھا۔ ویسے بھی ہیکس جس انداز سے گفتگو کر رہا تھا وہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

ریٹری کو کی گئی ہدایت کام آئی۔ پرشور موسیقی کے بجائے اب ڈائننگ ہال میں دھیمے سُر گونج رہے تھے۔ پیٹ میں رزق گیا تو ملٹن کی بھی جان میں جان آئی۔ اب اس کا دماغ بھی کچھ کام کرنے لگا تھا۔ اسے موسیقی بھی اچھی لگنے لگی تھی۔ اس نے کھانا ختم کیا اور آہستہ آہستہ کولڈ ڈرنک کے گھونٹ بھرنے لگا۔

”یہ بتاؤ تم مجھ سے اکیلے میں کیا کہنے والے تھے۔“ ملٹن نے کہا۔

”ہمیں رچرڈ کو مزہ چکھانا ہے۔“ ہیکس نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

”کیا...“ یہ سن کر وہ چونک گیا۔

”وہی جو تم نے سنا۔“

”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“

”بس اتنا کہ اب رچرڈ میرے اور تمہارے لیے ناقابلِ برداشت نہیں بلکہ ہماری روزی روٹی کے لیے خطرہ بن چکا ہے اور ہمیں اسے تباہی پھیلانے سے پہلے روک دینا چاہیے۔“

”تم کھل کر بات کیوں نہیں کرتے۔“ ملٹن نے جھنجلا کر کہا۔

”اس سے پہلے کہ وہ ہمیں ملازمت سے فارغ کرے، کیوں نا ہم اسے فارغ کرا دیں۔“ ہیکس نے سرگوشی کی۔

”مجھے تمہارے ارادے خطرناک لگ رہے ہیں۔“ ملٹن کے لہجے سے تشویش جھلک رہی تھی۔

”مجھے تمہارا ساتھ چاہیے۔ ایک کرائے کا قاتل ڈھونڈنا ہے، تم مدد کرو۔ پیسا میں دوں گا، تلاش تم کرو گے۔“ ہیکس کے لبوں پر شیطانی مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔

”تو تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں اس کام میں بہت ماہر ہوں۔ ایک فون کال کروں گا اور بندوبست ہو جائے گا۔“

”سمجھنے کی کوشش کرو۔“ ہیکس نے الفاظ چباتے ہوئے کہا۔ ”رچرڈ تمہیں پہلی فرصت میں نکال باہر کرنا چاہتا ہے۔ اسے صرف ایک جواز چاہیے اور تمہارے بعد...“ یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر توقف کیا۔ ”پھر میری باری ہو گی۔ لیکن کہاں میں اور کہاں یہ رچرڈ...“

”اسے بھول جاؤ۔“ ملٹن نے تیزی سے کہا۔

”کیوں... کیا ڈر رہے ہو کہ کہیں تمہارا فون ٹیپ نہ کیا جا رہا ہو۔“ ہیکس کا لہجہ تمسخرانہ تھا۔

یہ سن کر ملٹن لمحہ بھر کے لیے ششدر رہ گیا اور اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہنے لگا۔ ”تم نے ٹھیک کہا دوست... میرا فون ٹیپ ہو رہا ہے۔ ایک غلط فون کال مجھے جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل سکتی ہے۔“

”اور یہ کام رچرڈ کروا رہا ہے۔“

ملٹن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”کمینہ...“ ہیکس نے دانت کچکچا کر کہا۔ ”میں رقم دینے کو تیار ہوں، چاہے کتنی ہی کیوں نہ ہو، بس تم اپنا بندہ ڈھونڈ لو۔“

”میں نے کہا، جو کچھ ہو چکا، اسے بھول جاؤ۔“ یہ کہہ کر ملٹن نے ریٹری کو اشارے سے بل لانے کے لیے کہا۔

”مگر.....“

ہیکس نے کچھ کہنا چاہا لیکن ملٹن نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ ”تم بہت سنگین بات سوچ رہے ہو۔ بہتر ہے اپنے اس خیال کو ذہن سے کھرچ ڈالو۔“

”مجھے تم سے اس جواب کی توقع ہرگز نہ تھی۔“ ہیکس کے لہجے سے مایوسی عیاں تھی۔

”اس بات کو اب ختم سمجھو۔ سمجھ لو کہ میرے اور تمہارے درمیان یہ بات کبھی ہوئی ہی نہیں۔“ اس کا لہجہ حتمی تھا۔

”اوکے.....“ ہیکس نے ہنکارا بھرا اور پھر معنی خیز مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا۔ ”سمجھ لیتا ہوں کہ ہمارے درمیان اس موضوع پر کبھی بات ہوئی ہی نہیں تھی۔“

ملٹن کو اس طرح کی مسکراہٹ بھی پسند نہ تھی۔ اس نے گردن گھمائی۔ اسی دوران ویٹرس بل لے کر آ گئی۔ اس نے پرس کھولا ہی تھا کہ ہیکس نے بل دینے کی پیشکش کی مگر اسے یہ پسند نہ تھا۔ اس نے جلدی سے بیس ڈالر کا نوٹ بل بک میں رکھ کر ویٹرس کو تھما دیا۔

”تو یہ بات واقعی ختم سمجھوں؟“ ویٹرس کے آگے بڑھتے ہی ہیکس نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں..... “ ملٹن کا لہجہ حتمی تھا۔ ”میں ایسا کچھ بھی نہیں چاہتا۔ اگر رچرڈ کے ساتھ کچھ ہوا تو میں فوراً پولیس کے پاس پہنچوں گا اور سب کچھ انہیں بتا دوں گا۔“ اس نے ہیکس کو گھورتے ہوئے دھمکی بھرے لہجے میں کہا۔

ہیکس نے گہری سانس لی۔ اس کے لبوں پر طاری مسکراہٹ معنی خیز نہیں بلکہ شیطانی انداز اختیار کر چکی تھی۔

”تم کیا سمجھتے ہو، اس دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس کا ذمے دار رچرڈ ہی ہے۔“ ملٹن نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور خود ہی بلند آواز قہقہہ لگایا۔ ”ہر جگہ اسی طرح کے لوگ ملتے ہیں، انہی میں کبھی کبھار دو چار اچھے مل جاتے ہیں ورنہ یہ دنیا رچرڈ جیسوں سے بھری ہوئی ہے۔ کتنوں کو مارو گے.....“

ہیکس سوچ میں پڑ گیا اور چند لمحے بعد اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”جو کچھ میں نے کہا، وہ تمہارے ساتھ پیش آنے والے حالات کے پس منظر میں تھا لیکن تم تو اسے بچانے کے چکر میں ہو جو تمہاری پیٹھ اور پیٹ پر لات مارنے پر تُلا بیٹھا ہے..... سمجھے!“ اس کا لہجہ سوالیہ تھا۔

”چلو.....“ ملٹن جواب دینے کے بجائے اٹھ کھڑا ہوا۔

کچھ دیر بعد دونوں پارکنگ میں کھڑی گاڑیوں کی طرف جا رہے تھے۔ یہاں سے انہیں اپنے اپنے گھر جانا تھا۔

ملٹن خاموش طبع، نرم خو اور جلد پریشان ہو جانے والا چھوٹے دل کا آدمی تھا لیکن اس کی سوچ بلند اور ارادے مضبوط تھے۔ ہیکس کے ساتھ ہونے والی گفتگو اسے مسلسل پریشان کیے جا رہی تھی۔

پریشانی انسان کو غلطیوں کی طرف لے جاتی ہے اور پھر ایسے میں وہ کوئی نہ کوئی غلطی کر بیٹھتا ہے کہ اس کا خمیازہ بھگتنے کے باوجود ماضی کے رہ ماہ و سال انسان کا کبھی پیچھا نہیں چھوڑتے۔ ہر وقت انسان ماضی کے اس آسیب کے خوف میں زندہ رہتا ہے۔ ملٹن کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ اس کی ماں شدید بیمار تھی اور اس کی صحت یابی کے لیے آپریشن کی ضرورت تھی۔ اس کے لیے انشورنس سے ملنے والی رقم سے کچھ زیادہ کی ضرورت تھی۔ اس وقت وہ ایک نیمن انجینئر تھا۔ بھری پُری دنیا میں ایسا کوئی نہ تھا جو بے روزگار لڑکے پر بھروسا کرتے ہوئے مطلوبہ رقم اس کے ہاتھ میں تھما دیتا۔ ہر آنے والے دن کے ساتھ ماں کی حالت مزید خراب اور اس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر پریشانی کے عالم میں ملٹن بھی ایک غلطی کر بیٹھا۔ نتیجہ یہ کہ رقم تو ملی لیکن ماں اور رقم دونوں کو اسپتال تک پہنچانے سے پہلے پولیس اس تک پہنچ گئی اور پھر وہ پانچ سال کے لیے بلند و بالا دیواروں سے گھری الوہے کی مضبوط سلاخوں والی ایک الگ دنیا میں پہنچ گیا، جہاں اس جیسے سیکڑوں لوگ اپنی اپنی غلطیوں کی سزائیں بھگتنے کے لیے موجود تھے۔ کچھ غلطیوں سے سبق سیکھ کر توبہ کرتے تو کچھ 'تجربہ کاروں' کی شاگردی اختیار کر کے اپنا 'فن' نکھارنے میں مصروف تھے۔ پانچ طویل برسوں کے بعد لوٹ مار کی سزا بھگت کر وہ جیل سے باہر آیا تو اس کی دنیا ہی بدل چکی۔ گرفتاری کے وقت اس کی ماں گھر کے اندر تھی لیکن جب وہ لوٹا تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

دنیا میں صرف چند ایسے تھے جو اس کے داغ دار ماضی سے واقف تھے۔ خود ملٹن بھی کم و بیش اپنے ماضی کو بھلا چکا تھا لیکن جس بات کے لیے ہیکس اسے ریسٹورانٹ میں لے کر آیا تھا، اسے سنتے ہی اس کی روح کانپ اٹھی تھی۔ وہ رچرڈ کے ہاتھوں اپنی آئے روز کی تذلیل سے بھڑک چکا تھا۔ ہیکس چاہتا تھا کہ ملٹن اس کا ساتھ دے۔ رچرڈ کے ہاتھوں آئے دن بے عزت ہونا، دونوں کی قدر مشترک تھی اور اسی ناتے وہ اپنے منصوبے میں اسے شراکت دار بنانا چاہتا تھا۔ ہیکس کا منصوبہ تھا کہ کچھ اس طرح رچرڈ کا کام تمام کرا دیا جائے کہ ان کی طرف کسی کو ہلکا سا شائبہ تک نہ ہو۔ اگرچہ اس نے ہیکس کو نہ صرف ایسا کرنے سے روکا بلکہ

اسے دھمکی بھی دے ڈالی تھی کہ ایسا کچھ ہوا تو وہ پولیس کے پاس جائے گا لیکن اسے یقین تھا کہ جس انداز سے ہیکس سوچ رہا ہے، وہ ایسا کچھ کرنے کی کوشش ضرور کرے گا۔

وہ دل ہی دل میں ڈر رہا تھا۔ رچرڈ لاکھ برا سہی لیکن وہ اس حد تک جانے کی کبھی سوچ بھی نہیں سکتا لیکن ہیکس...

ریستوران سے نکلنے کے بعد وہ بدستور یہی سوچ رہا تھا۔ وہ یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا وہ کیا کچھ کر سکتا ہے لیکن کسی حتمی نتیجے تک پہنچنے میں ناکام رہا تھا۔

کسی پیشہ ور قاتل کے لیے رچرڈ جیسے معمولی آدمی کو ٹھکانے لگانا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ وہ حفاظتوں کے بنا آتا جاتا تھا۔ اس کے معمولات کسی سے ڈھکے چھپے نہ تھے۔ اسے ٹھکانے لگانے کے بعد سے حادثے کا رخ دے کر قاتل بچ سکتے تھے مگر اس کے غلط رویے کے باوجود ملٹن اس پر متفق نہ تھا کہ اسے مار دیا جائے۔

ہیکس چاہتا تو خود بھی یہ کام کر گزر سکتا تھا مگر اس کی ایک مجبوری تھی۔ وہ کسی کرائے کے قاتل کو جانتا نہ تھا اور خود یہ کام کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ ملٹن کو یقین تھا کہ اس کے عزائم پختہ ہیں اور اس کے انکار کے بعد ضروری نہیں کہ وہ ارادہ بدل دے۔ وہ اپنی بے عزتی کا حساب رچرڈ کی جان لے کر چکتا کرنے کی ٹھان چکا تھا۔ جبکہ وہ رچرڈ کے ہاتھوں تمام تر ذلت کے باوجود صرف ایک نوکری یا بے عزتی کا بدلہ لینے کی خاطر اس حد تک جانے کی کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے جیل دیکھی تھی اور رچرڈ کے اصل چہرے کو بھی دیکھ چکا تھا مگر اپنی فطری نرمی کے ہاتھوں مجبور تھا۔ کسی کی جان لینے میں مدد کرنا تو دور کنار وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اسے ہیکس پر حیرت ہو رہی تھی کہ اس کی تو نوکری بھی ابھی تک داؤ پر نہیں لگی تو پھر وہ کیوں اس قدر بھڑکا ہوا ہے۔

ریستوران میں ہیکس سے ملاقات کے بعد ملٹن پریشانی میں گھر چکا تھا۔ اسے یہ بات بھی پریشان کیے جا رہی تھی کہ اگر ہیکس نے کوئی قدم نہ اٹھایا تو پھر شاید اگلے ہفتے اسے اپنی برسوں پرانی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔

وقت کم تھا اور اس کی ملازمت ہو یا رچرڈ پر ممکنہ جان لیوا حملہ، دونوں صورتوں میں فوری فیصلہ کرنا اہم تھا لیکن ملٹن جلد بازی میں کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ وہ ہیکس یا اس کے کرائے کے قاتل کو اہداف تک پہنچنے سے پہلے روکنا چاہتا تھا۔ آخر ملٹن نے بہت غور و فکر کے بعد کچھ کرنے کی ٹھانی۔ وہ ہیکس کو روک سکتا تھا اور اپنی ملازمت بھی بچا سکتا تھا۔ ہیکس نے درست کہا تھا جیل انسان کو پرکھنا سکھاتی ہے۔

سیاسی محاورے

☆ دکھتی رگ چھیڑنا...... کسی ترمیم پر بات کرنا۔

☆ وکی دواؤ کرنا...... ملازمت میں توسیع دینا۔

☆ بغلیں بجانا...... من پسند وزارت کا حلف اٹھانا۔

☆ من و سلویٰ اڑانا...... فائیو اسٹار ہوٹل میں کھانا کھانا۔

☆ منہ شکر سے بھر دینا...... شوگر مل کا پرمٹ دینا۔

☆ شیر و شکر ہونا...... ایک پارٹی سے مفادات حاصل کر کے دوسری پارٹی میں جانا۔ جس کے جیتنے کے امکان ہوں۔

ناظم علی کوہ چانی، دواجل

جیل میں گزرا وقت اور رچرڈ کی حرکتیں اس کڑے وقت میں ان دونوں کے ہی نہیں خود مسز اینفرٹون کے بھی کام آنے والی تھیں۔

ملٹن نے اس رات اپنے منصوبے کو حتمی شکل دی اور پھر دوسرے دن پروگرام کے مطابق فرضی نام پر جاری پری پیڈ سم اور موبائل فون خریدا۔ اگرچہ ایسا کرنا مشکل ہے لیکن وہ شکاگو کے ایک سیاہ نام سے آگاہ تھا۔ چور مارکیٹ پر راج کرنے والا ٹائی جیل کے زمانے کا واقف تھا۔ اس کی مدد سے ہی وہ فون اور سم خریدنے میں کامیاب ہوا۔ موبائل فون سم کو دو روز پہلے مر جانے والے انکل ہیر اللہ کے نام پر ایکٹیویٹ کیا گیا تھا۔ اب اسے یقین ہو چکا تھا کہ وہ کچھ کرنے کے قابل ہو چکا ہے۔

☆☆☆

ہیمبرگر ریستوران میں ملٹن اور ہیکس کے درمیان ہونے والی ملاقات کو ایک ماہ گزر چکا تھا۔ اس دوران بہت کچھ بدل چکا تھا۔ مسٹر اینفرٹون اپنی نشست پر براجمان تھے۔ یہ وہ کرسی تھی جس پر کبھی رچرڈ بیٹھ رہا تھا مگر وہ ماضی کی بات ہے، اینفرٹون ایک بار پھر دفتر جوائن کر چکے تھے۔ دونوں کی ملازمتیں برقرار تھیں اور رچرڈ بدعنوانی کے الزام میں جیل کی دیواروں کے پیچھے پہنچ چکا تھا۔

وہ خوشگوار اور چمکیلی صبح تھی۔ شیشے کے دروازوں سے چھن کر سورج کی کرنیں کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔ ایک ماہ کے پہلے مقابلے میں دفتر بھی بہت بدل چکا تھا۔ اب نہ تو دیواروں پر کارکردگی اور قابلیت کے سرٹیفکیٹ آویزاں

تھے اور نہ ہی چیف انجز یکٹو کی نشست کے پیچھے ریک پر شیلڈز اور ٹرافیاں سجی تھیں۔ رچرڈز کے مقابلے میں ان کے انکل مسٹر ایفرزن کو سادگی پسند تھی۔ اگرچہ دل کا دورہ اور اوپن ہارٹ سرجری کے بعد ان کی صحت کافی گر گئی تھی۔ گالوں کی سرخی غائب ہو چکی تھی۔ چہرے پر کمزوری کے آثار نمایاں تھے لیکن ان کی ہمت اور لہجے کی سچائی پہلے کی طرح اب بھی جوان تھی جو بڑی سی آبنوسی میز کے سامنے دھری کرسیوں پر ملٹن اور ہیکس بیٹھے تھے۔ ایفرزون کے سامنے کاروبار کی فائلوں اور دستاویزات کا چھوٹا سا ڈھیر رکھا تھا۔ کئی ماہ کے بعد آج سے ایک بار پھر وہ اپنا کاروبار خود اپنے ہاتھوں سنبھالنے جا رہے تھے۔

''میں نے ان کا تفصیلی مطالعہ کر لیا ہے۔'' ایفرزون نے دایاں ہاتھ کاغذات کے ڈھیر پر رکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں، میں جان چکا ہوں کہ رچرڈز کی وجہ سے کاروبار کو بہت نقصان پہنچا ہے۔''

ملٹن اور ہیکس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خاموشی سے ان کی طرف دیکھے جا رہے تھے۔ انہیں کچھ کہنے کی نہیں صرف سننے کی ضرورت تھی۔

''تم کیا کہتے ہو؟'' ایفرزون نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ان کی طرف دیکھا۔

ہیکس نے پہلو بدلا اور کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگا۔ ''میرا خیال ہے کہ جو آپ کہہ رہے ہیں، وہ زیادہ درست ہے۔''

''اور تم...'' انہوں نے ملٹن کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔

''مسٹر رچرڈز جلد باز تھے، انہیں کاروبار میں جارحانہ حکمت عملی پر زیادہ یقین تھا۔'' ملٹن نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ میرا ذاتی خیال ہے، ہو سکتا ہے کہ ایسا کچھ نہ ہو، یہ میں بھی سمجھ سکتا ہوں۔''

''بات صاف ظاہر ہے۔'' ایفرزون نے لیپ ٹاپ پر نظر ڈالی۔ ''سالانہ بیس فیصد تنزلی اور آمدنی میں پندرہ فیصد کمی۔ اس کے بعد سمجھنے کے لیے کچھ رہ نہیں جاتا کہ کہیں گھپلا ہو رہا تھا۔'' لمحہ بھر توقف کے بعد وہ بولے۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ رچرڈز کی پالیسی جارحانہ تھی اور میں نے ہی اسے ایسا کرنے کو کہا تھا مگر...'' لمحہ بھر خاموش رہنے کے بعد انہوں نے دوبارہ بات شروع کی۔ ''بیمار نہ ہوتا تو اس سے ضرور باز پرس کرتا کہ بورڈ نے اس سے جو وعدے لیے تھے، کس طرح وہ ان سے تجاوز کر سکتا تھا۔'' یہ کہہ کر انہوں نے گہری سانس لی اور کرسی کی پشت سے سر ٹکا دیا۔

ملٹن نے پہلو بدلا لیکن کہا کچھ نہیں۔ وہ ایفرزون کا تہ دل سے مشکور تھا۔ انہی کی وجہ سے اس کی نوکری بچی تھی۔ وہ ان کی خاطر کچھ بھی کر سکتا تھا سوائے اس فون کال پر کوئی بات کرنے کے جس کی وجہ سے رچرڈز کو جیل جانا پڑا۔

''میرے خیال میں ہمیں اب چلنا چاہیے۔'' یہ کہتے ہوئے ہیکس کھڑا ہوا تو ملٹن بھی اٹھ گیا۔

''ہاں ٹھیک ہے...'' یہ کہتے ہوئے ایفرزون سیدھے ہوئے اور دونوں کہنیاں میز پر ٹکا کر ان کی طرف دیکھا۔ ''یہ درست ہے کہ جو کچھ ہوا، میں اس سے خوش نہیں لیکن شاید...'' انہوں نے دونوں کی طرف باری باری دیکھا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ شاید وہ کچھ خاص کام کرنا چاہتا تھا۔'' ایفرزون کا اشارہ رچرڈز کی طرف تھا۔ ''خیر چھوڑو ان باتوں کو، جو ہونا تھا سو ہو چکا۔ اچھی بات یہ ہے کہ فرم کو کوئی خطرہ نہیں اور نہ ہی کسی کی ملازمت کو۔''

یہ سنتے ہی ملٹن کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

''ہم چلیں...'' ہیکس نے جانے کی اجازت طلب کی۔ ملٹن بھی اس کے برابر کھڑا تھا۔

''ہاں ٹھیک ہے لیکن ملٹن...'' ایفرزون نے کہا۔ ''تم ذرا ایک منٹ رکنا۔''

''تو پھر میں چلتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے ہیکس دروازے کی طرف بڑھا۔

ملٹن اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا۔ ہیکس کے کمرے سے نکلتے ہی ایفرزون نے انگلی سے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے بیٹھنے کا کہا۔

''میں یہ جاننے کے لیے بے تاب ہوں کہ جو کچھ ہوا، تم اس پر کیا رائے رکھتے ہو؟''

ملٹن کا دل زور سے دھڑکا۔ اس نے فوری طور پر خود پر قابو پایا اور اپنی آواز میں ٹھہراؤ پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ''تفتیش کاروں نے مجھ سے اس حوالے سے بات کی تھی...''

''اوہ...'' ایفرزون نے مصنوعی حیرت سے کہا۔ ''لیکن ایسا تو بظاہر نظر آتا ہے۔'' یہ کہہ کر لمحہ بھر توقف کیا اور پھر اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''کیا اتفاق ہے۔''

''اتفاق، کیسا اتفاق...'' ملٹن گڑبڑا گیا تھا۔

''شاید میں غلط کہہ رہا ہوں، یہ اتفاق نہیں...'' اتنا کہہ کر وہ لمحہ بھر کچھ سوچتے رہے پھر کہنے لگے۔ ''میرا خیال ہے اس کے لیے 'طے شدہ' کا لفظ زیادہ بہتر ہے۔''

''سر! میں کچھ سمجھ نہیں سکا۔''

''یقیناً تم کچھ نہیں سکے ہو۔'' ایمبرٹون نے ہنکارا بھر کر کہا۔ ''اس نے تمام کو اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ ذہین نظر آئیں۔ کیوں... ایک فون کال کا توجہ حاصل کر لینا اتفاق کی بات نہیں ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس کا لہجہ سوالیہ تھا۔ ''وہ ایک عمدہ ترکیب تھی۔'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوئے اور غور سے ملٹن کو دیکھتے ہوئے بولے۔ ''ویسے اب اس بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر۔'' ملٹن نے کچھ سوچنے کے بعد کہنا شروع کیا۔ ''یہ تفتیش کاروں کو راہ سے بھٹکانے کے لیے ایک چال بھی ہو سکتی تھی لیکن سچ تو پھر سچ ہے، جس نے بھی یہ کام کیا شاید وہ ہماری کمپنی کا ہمدرد ہی تھا۔''

''یہ تو یقینی بات ہے جس نے بھی گمنام رہ کر فون پر پولیس کو ساری صورتِ حال بتائی اور چرچ میں سروس کے دوران ثبوت سرافرساں تک پہنچائے، وہ یقیناً میرا اچھا ہمدرد ہے۔'' ایمبرٹون نے نرم لہجے میں کہا۔

ملٹن مسکرا دیا۔

''تمہاری مسکراہٹ بتاتی ہے کہ میں ٹھیک سمجھا ہوں۔''

''جہاں تک پولیس کا تعلق ہے تو شاید کوئی بھی یہ نہ جان سکے کہ ان کے علم میں یہ سب کچھ کیسے آیا۔'' ملٹن کے لہجے سے اعتماد جھلک رہا تھا۔ ''ضروری نہیں کہ پولیس ہر بات سے ہمیں آگاہ رکھے۔''

ایمبرٹون نے ہنکارا بھرا اور سر ہلاتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''کوئی شخص، شاید کوئی شخص... مجھے یقین ہے کہ اتوار کو چرچ سروس میں تم تو کسی سے ملے نہیں تھے۔''

ملٹن کا دل ایک بار پھر زور سے دھڑکا۔ ''میں کئی ہفتوں سے چرچ گیا ہی نہیں۔'' اس نے اپنی گردن بچانے کے لیے جھوٹ بولا۔

''خیر چھوڑو اس بات کو۔'' مسٹر ایمبرٹون نے کہا۔ ''یہ تو سب جانتے ہیں کہ ہماری فرم کے قائم مقام چیف انجینئر بگلو نے قواعد و ضوابط کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی تھی لیکن یہ تو تم بھی جانتے ہو گے کہ پولیس کو اس افسر سے متعلق علم ہی نہیں جو خاموش رہنے کے لیے کمیشن لے رہا تھا۔'' وہ لمحہ بھر کے لیے رکے۔ ''کوئی کمیشن لے یا پھر قواعد و ضوابط کو توڑے مگر ایسے کچھ لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں جنہیں خلافِ قانون کوئی کام پسند نہیں۔ ایسے اچھے لوگ ہمیشہ پولیس کی مدد کرتے ہیں، چاہے اس کے لیے انہیں خود کیوں نہ تھوڑی سی قانون شکنی کرنی پڑے مگر ایک بڑے نیک مقصد کے لیے وہ چھوٹی سی غیر قانونی حرکت کر گزرتے ہیں۔ ایسے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں، چاہے وہ ایک کمپنی ہو یا کاؤنٹی یا پھر ریاست۔''

''یہ بات تو حیرت انگیز ہے۔'' ملٹن نے اپنے اندر کے ہیجان پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''حیرت انگیز...'' ایمبرٹون نے دہرایا۔ ''ہاں، یہ لفظ بالکل ٹھیک ہے۔ میں اس لفظ کو استعمال کرنا چاہتا ہوں مگر سوچتا ہوں...'' وہ بات مکمل کیے بغیر خاموش ہو گئے اور چند لمحے تک سر نیہوڑائے کچھ سوچتے رہے۔ ''میرا خیال ہے کہ جو کچھ ہوا، اگر اس صورتِ حال کو بیان کرنا چاہوں تو میں 'منقطع رابطے' کا لفظ استعمال کروں گا، یعنی میری دفتر سے غیر حاضری یا معاملات سے مکمل لاتعلقی ورنہ جو کچھ ہوا وہ ایسا ہرگز نہ ہوتا۔''

ملٹن خاموش بیٹھا تھا لیکن اس کے دل و دماغ میں طوفان اٹھ رہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں بوڑھے مالک کو یہ پتا تو نہیں چل گیا کہ رچرڈ کی گرفتاری کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا۔ اگرچہ مسٹر ایمبرٹون کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ جو ہوا، وہ اپنی جگہ درست تھا لیکن پھر بھی... گمنام فون کال کے باعث جسے جیل جانا پڑا، وہ ان کا بھتیجا ہی نہیں داماد بھی تھا۔ اسے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ ملازمت جاتی ہے یا ترقی ملتی ہے۔ اس کے نزدیک دونوں کے چانس ففٹی ففٹی تھے۔ وہ کسی بھی صورت کو خفی قرار نہیں دے سکتا تھا۔ کمرے میں مکمل خاموشی طاری تھی۔

''کل رچرڈ کے مقدمے کا فیصلہ ہونے والا ہے۔'' کافی دیر خاموش رہنے کے بعد آخر ایمبرٹون نے لب کھولے۔ ''یہ میرا خاندانی کاروبار ہے۔ اس نے غیر قانونی راستے اختیار کر کے ترقی کی سیڑھی پر چڑھنا چاہا۔ اس نے مناسب راستہ اختیار نہیں کیا۔ میرے کاروبار کے ساتھ جو ہوا، اسے سدھارا جا سکتا ہے لیکن اس کے ساتھ جو ہونے والا ہے...'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔

''سر! جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔'' ملٹن نے خاموشی توڑی۔

''ٹھیک کہتے ہو۔'' ایمبرٹون نے اسے دیکھا۔ ''رچرڈ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کاروبار کی ترقی ایک طرف، وہ تو کمپنی سے بھی فراڈ کرتا رہا۔ پندرہ فیصد ماہانہ آمدنی اس کی جیب میں جا رہی تھی۔ جس نے بھی پولیس کو یہ سارا معاملہ بتایا، میں اس گمنام فون کال والے کا شکر گزار ہوں۔'' انہوں نے معنی خیز نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

ملٹن ان نگاہوں کی تاب نہ لا سکا اور گردن موڑ کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ کمرے میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ چند لمحوں کے بعد ملٹن نے پہلو بدلا۔ کرسی کی چرچراہٹ سے ایفرٹون اس کی طرف متوجہ ہوئے اور نرم لہجے میں کہنے لگے۔ ”میری ایک سال کی غیر موجودگی میں بھی تمہاری کارکردگی عمدہ رہی ہے۔ اس لیے میرے پاس تمہیں دینے کے لیے کچھ ہے۔“

”کیا...!“ ملٹن نے حیرت سے کہا۔

”ایماندار لوگوں کو عزت سے آرام دہ زندگی بسر کرنے کا حق ہے۔ کمپنی کے لیے تمہاری خدمات کے جواب میں ترقی، ذاتی گاڑی اور ڈرائنگ روم اپارٹمنٹ کے ساتھ نئے گھر کی چابی پیش کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر ایفرٹون نے دراز کھولی اور ایک بڑا سا لفافہ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ ”ہر ماہ بینک کے ہوم لون کی قسط کا نصف کمپنی ادا کرے گی۔“

”بہت بہت شکریہ...“ ملٹن کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔

”اور ہاں...“ ایفرٹون نے لفافہ اسے تھماتے ہوئے کہا۔ ”رچرڈز نے تمہارے جس عملے کو ملازمت سے نکال دیا تھا، ان سے رابطہ کر کے دوبارہ ملازمت کی پیشکش کرو۔“

”فوراً کرتا ہوں۔“

”اور ایک بات یاد رکھو...“ یہاں رچرڈز نے جتنا عملہ رکھا تھا، اسے فارغ کرنے کی تیاری کرو، خاص کر اکاؤنٹس والوں کو۔“

”لیکن سر! یہ میرا اختیار نہیں۔“

”مگر اب ہے، تم اپنی ترقی کا خط تو پڑھو۔“

”مگر...“

”اب تم کمپنی کے ڈپٹی چیف ایگزیکٹو ہو۔ اور جو کہہ رہا ہوں، وہ تمہارے اختیار میں آ چکا۔“

”واقعی...!“ یہ سن کر ملٹن کا منہ حیرت کے مارے کھلے کا کھلا رہ گیا۔

ایفرٹون نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

”تو پھر مجھے اس بات کی اجازت ہوگی کہ ڈپٹی ڈائریکٹر ہیکس کو چیف ڈائریکٹر کے عہدے پر ترقی دے سکوں۔“

”یہ سوچنا اور کرنا تمہارا کام ہے۔“

”ٹھیک ہے... تو پھر میں چلوں۔“

ایفرٹون نے سر ہلا کر اسے جانے کی اجازت دے دی۔

کمرے سے نکلتے ہی وہ سیدھا ہیکس کے کیبن میں پہنچا۔ اسے چیف ڈائریکٹر کے عہدے پر ترقی کی نوید سنائی اور اپنے کیبن میں آ کر کرسی پر ڈھے گیا۔ ”یہ سب تو میں نے کبھی سوچا تک نہ تھا۔“ وہ بڑبڑایا۔ اس کا ذہن تیزی سے گزرے واقعات سوچ رہا تھا۔

مسٹر ایفرٹون ایک سال سے کچھ زیادہ عرصہ دفتر سے غیر حاضر رہے تھے۔ اس دوران رچرڈز نے جو گل کھلائے وہ ان سب سے آگاہ تھا۔ وہ اکاؤنٹس میں گھپلے اور کاؤنٹی افسران کو رشوت دے کر ٹھیکے لینے تک، رچرڈز کے تمام اعمال سے واقف تھا۔ ویسے بھی وہ رچرڈز کو بہت عرصے سے جانتا تھا۔ لڑکپن میں قید کے دوران رچرڈز بھی جیل میں تھا۔ اسے فرم کے بینک اکاؤنٹ میں گھپلے پر چار سال قید کی سزا ہوئی تھی۔ وہ اسے پہچان چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ رچرڈز اسے سخت ناپسند کرتا تھا۔

”ہیکس نے ٹھیک کہا تھا، جیل انسان کو پہچاننا سکھاتی ہے۔“ کرسی پر نیم دراز ملٹن بڑبڑایا۔ ”رچرڈز کو تو میں جیل میں اس وقت ہی پہچان گیا تھا جب وہ میرے حصے کی سگریٹ چرا کر پی جاتا تھا۔ لیکن ہیکس جس طرح اس کا پتا صاف کرنا چاہتا تھا، وہ طریقہ غلط تھا۔“ یہ کہہ کر وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور اپنے کیبن کو دیکھنے لگا۔ وہ اسے تھوڑا سا سجانا چاہتا تھا۔ اب وہ کمپنی کا نائب سربراہ تھا۔ دفتر کو بھی اس کے شایانِ شان ہونا چاہیے تھا، سادہ مگر پُروقار۔“

اسی دوران کمرے کا دروازہ کھلا اور ہیکس اندر داخل ہوا۔ ”ترقی مبارک ہو... پورے دفتر میں خبر پھیل چکی لیکن تم...“

”کیا...!“ ملٹن نے حیرانی سے کہا۔

”مسٹر ایفرٹون نے ای میل بھیجی ہے سارے عملے کو۔“

”اوہ...“ ملٹن اٹھ کر ہیکس کے قریب آیا۔ ”گھی سیدھی انگلی سے بھی نکلتا ہے، بس ذرا عقل اور صبر چاہیے۔“

”کیا...“ ہیکس نے حیرت سے کہا۔

”راستہ صاف کرنے کے کئی طریقے ہوتے ہیں اور یہ بات ناہموار زمینیں ہموار کرنے والے مجھ جیسے ماہرینِ تعمیرات زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔“

یہ سن کر ہیکس کسی سوچ میں پڑ گیا اور پھر اس نے بڑے غور سے ملٹن کی طرف دیکھا۔ ”رچرڈز کے خلاف پولیس کو کی گئی گمنام فون کال، وہ سارے ثبوت...“ اس کے لہجے سے بے یقینی ٹپک رہی تھی۔

ملٹن نے کچھ کہنے کے بجائے زوردار قہقہہ لگا دیا۔

●◆●

کائنات کی وسعت اور مستقبل میں جذباتی کا انجام

دماغ کی بھول بھلیوں میں انسانی فکر راستہ پالے تو پھر گردشِ افلاک کی حدوں میں بسنے والے ستاروں اور سیاروں پر کمند، پیرابنِ خاک کے لیے بڑی بات نہیں رہتی... سائنسی ماحول میں بھی انسان کے ازلی جذبات کی عملی کارفرمائی...

خلائی فرار

صوفیہ شکیل
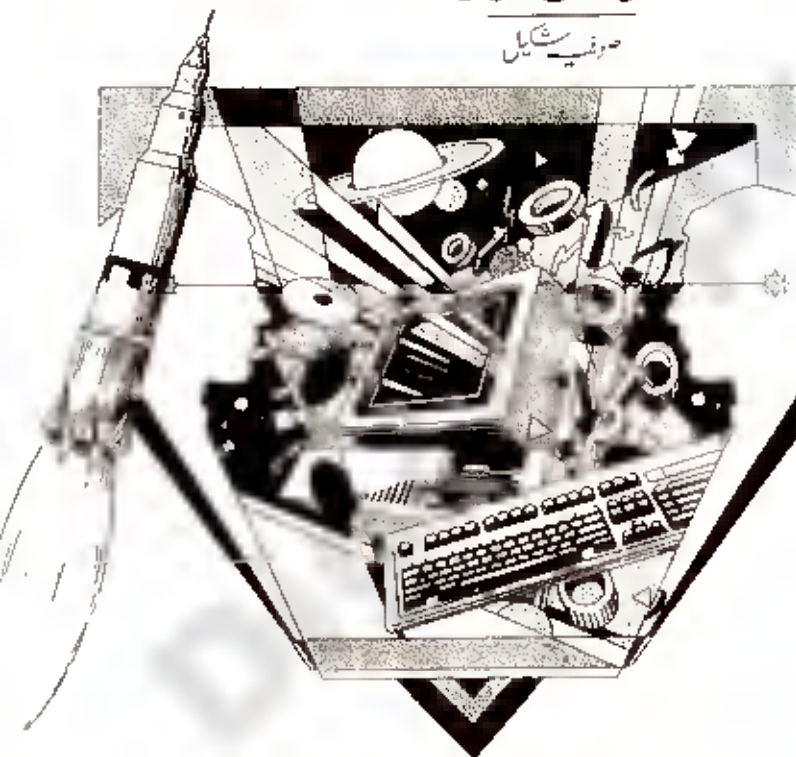
آرتھر ہر لمحے ہوشیار اور چوکنا تھا کیونکہ یہ ان دونوں کے لیے زندگی اور موت کا معاملہ تھا۔ اس نے ریسیور پر وہ پیغام بہت واضح طور پر سنا۔ وہ الفاظ گولیوں کی طرح اس کی سماعت میں اترتے چلے گئے۔

”آرتھر... تم کہکشاں کے کسی بھی حصے میں اب بچ نہیں سکتے... صرف دو گھنٹے میں تمہارے جہاز کا مدار کاٹ دیا جائے گا... تم نے ذرا سی بھی مزاحمت کی تو تمہیں ہم تمہارے جہاز سمیت خلا سے بھی باہر اندھیری وسعتوں

…. میں پھینک رہی کے جہاں صرف موت تمہاری منتظر ہوگی۔"

"وہ گھٹنے دو۔" آرتھر اپنا اپرجنس بند کر کے زیرِ لب بڑبڑایا۔ اس کے پاس اپنے بچاؤ کے لیے کوئی ہتھیار نہ تھا نہ اسے زمین والوں سے لڑنے کی ضرورت تھی۔ وہ گھنٹے سے کم وقت میں وہ اپنے خلائی مدار سے نکل کر کئی نوری سال دور… اتنی دور چلا جاتا کہ وہ کبھی بھی اس تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ فرار ہوتے ہوئے وہ اپنے ساتھ کریلیم کی کافی مقدار لے آیا تھا جو کائنات میں پائے جانے والے ہر روبوٹ کے لیے ناگزیر دماغی خوراک تھی۔ اس کے بغیر روبوٹ لوہے، پلاسٹک اور تاروں کا ایک مجہول ڈھانچا بن کر رہ جاتے تھے۔ کہکشاں میں جہاں بھی آبادی تھی، کریلیم کے خریدار موجود تھے۔ وہ جس سیارے میں بھی پہنچتا، وہاں بے تاب خریداروں سے اسے کریلیم کے عوض منہ مانگی رقم مل سکتی تھی۔

منصوبہ بوڑھے برین کے دماغ کی پیداوار تھا۔ اس نے مسلسل تیس سال کی تحقیق اور تجربات کے بعد آخری تیاری کی تھی۔ ایک مفلوک الحال غلام کی زندگی اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گئی تھی۔ فرار کے لیے اسے ایک قابلِ اعتماد اور نڈر ساتھی کی ضرورت تھی اور وہ اس بارے میں اکثر سوچ بچار کرتا رہتا تھا۔

"اصل مسئلہ یہاں سے فرار کا ہے۔" آخر کار ایک روز اس نے تخلیے میں آرتھر سے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ "اس کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ تم ایک خلائی جہاز کو زمین سے اڑا کر اوپر لے جا سکتے ہو، میں نہیں!"

"خلا میں جانے سے کچھ نہیں ہوگا۔" آرتھر نے ساری بات سننے کے بعد کہا۔ "انہیں ہم کو تلاش کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی اور ہم مارے جائیں گے۔"

"خلا ہماری منزل نہیں ہے۔" بوڑھے برین نے سنجیدگی سے اسے سمجھایا۔ "ہم خلا سے چھلانگ لگا کر کششِ ثقل سے نکل جائیں… کئی نوری سال آگے چلے جائیں تو وہ ہمیں کبھی تلاش نہیں کر سکیں گے۔"

"کششِ ثقل سے نکلنا اتنا آسان نہیں ہوگا مسٹر برین!" وہ بولا۔ "اس ہولناک چھلانگ کی تیاری میں آدھا دن لگ جائے گا… وہ ہمیں اتنی مہلت نہیں دیں گے۔ اس سے پہلے ہمارا سراغ لگا لیں گے۔"

"نہیں آرتھر، نہیں۔" برین نے اس کا ہاتھ تھام کر دھیمی مگر گرم جوش آواز میں کہا۔ "کہکشاں بہت بڑی ہے۔ تم نے تاریخ ضرور پڑھی ہوگی۔ کہکشاں بھی یوں سمجھو کہ زمین جیسی ہے… وہاں ہر طرف آبادی تھی مگر سب گروہ اور قبیلے ایک دوسرے سے بے خبر، اپنی دنیا میں مگن رہتے تھے۔ کسی کو دوسرے کی خبر نہیں تھی… ان کے رابطے دھیرے دھیرے ہوتے پھر بڑھتے گئے۔ بس یہی حال کہکشاں کا ہے۔ زمین کے ظالم حاکموں کو اپنے آس پاس کے چند سیاروں کا علم ہے اور بس… اس سے آگے اور دائیں بائیں کیا ہے، اس سے وہ بالکل بے خبر ہیں۔" وہ آرتھر کے قریب ہو گیا۔ اس کی پُرجوش آواز سرگوشی میں تبدیل ہو گئی۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "مگر میں نے اپنی زندگی کے تیس سال اس کہکشاں کے کھوج میں گزارے ہیں جس میں ان گنت شمسی نظام گردش کر رہے ہیں۔ اس کھوج میں، میں نے اپنی دوربین کے ذریعے ہزاروں نوری سال کی مسافتیں طے کی ہیں… پر اس سیارے کا سراغ لگایا ہے جس پر انسان زندہ رہ سکتا ہے اور یہ سب میں نے اپنے کمپیوٹر کی یادداشت میں محفوظ کر رکھا ہے۔

"ان نقشوں اور معلومات میں ہر روشن ستارے اور اس کے سیاروں کی سو فیصد درست نشان دہی کی گئی ہے۔ جب تم کششِ ثقل سے نکلنے کے لیے اپنے جہاز سے خلائی چھلانگ لگاؤ گے تو پتا نہیں کہ تم چند نوری سال دور ہی نکل سکو یا سیکڑوں نوری سال دور نکل جاؤ۔ میں نے سب کچھ کمپیوٹر کی میموری میں محفوظ کیا ہوا ہے۔ تم بلکہ ہم جہاں بھی پہنچیں گے، ہمارا کمپیوٹر محفوظ معلومات کی روشنی میں صرف دو منٹ میں اپنے گرد و پیش کا ماحول پہچان کر ہمارے خلائی جہاز کا رخ خودکار طریقے سے کسی ایسے قریب ترین سیارے کی طرف موڑ دے گا جہاں زندگی کا وجود ہوگا۔"

"سننے کی بات اور ہے لیکن یہ سب بہت مشکل لگتا ہے۔" آرتھر نے اعتراض کیا تھا۔

"میں نے دن رات کی عرق ریزی سے اسے بہت آسان اور خودکار کر دیا ہے۔" برین نے پورے اعتماد سے کہا۔ "مگر میں اکیلا یہ کام نہیں کر سکتا۔ اسی لیے میں تمہارے پاس آیا ہوں۔ میں بوڑھا ہوں۔ فارمولے بتاتے ہیں کہ میں زیادہ سے زیادہ دس برس زندہ رہوں گا۔ تمہاری عمر کے ابھی ستر سال باقی ہیں۔ میں کروڑوں کی رقم اور آزاد زندگی کا مزہ صرف دس سال لے سکوں گا۔ اس کے بعد سب کچھ تمہارا ہوگا۔ تم عیش کرو گے۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ خلائی چھلانگ کے نتیجے میں ہم

کسی کھولتے ہوئے سیارے کے لاوے میں جا گریں۔“

آرتھر نے اعتراض کیا۔

”ہونے کو تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ چھلانگ زیادہ لمبی نہ ہو۔۔۔ ہم صرف اتنی دور جا سکیں جہاں زمین کے فرعون ہمیں ڈھونڈ رہے ہوں اور میرا کمپیوٹر علاقہ پہچان کر ہمارے جہاز کا رخ زمین کی طرف موڑ دے جہاں سسکتی ہوئی غلامانہ زندگی وجود رکھتی ہے۔“ برین نے اسے سمجھایا۔

”ہونے کو کچھ بھی ہو سکتا ہے لیکن میں پھر کہہ رہا ہوں کہ میری تیس سال کی عرق ریزی مجھے دھوکا نہیں دے سکتی۔ یوں سمجھ لو کہ ایسے منفی خطرات کا امکان سو کھرب میں ایک سے بھی کم ہے۔۔۔ یہ صرف تمہاری نہیں، میری بھی زندگی اور موت کا سوال ہے۔“

”اگر فارمولا غلط ہوا۔۔۔ کسی وجہ سے تم دس سال سے پہلے مر گئے؟“

برین نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہم جہاں سے نکلیں گے اور جسے پہلے زمین کہا جاتا تھا، وہاں فارمولے کبھی کبھی غلط بھی ہو جاتے ہیں۔ تم جوان ہو، ہر جھٹکا سہہ لو گے۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ خلائی چھلانگ کا زبردست جھٹکا میری زندگی کا چراغ گل کر دے۔۔۔ میرے بچے! میں بھی امکانات سے غافل نہیں رہا۔ میں نے سب کچھ کمپیوٹر کی میموری میں محفوظ کر دیا ہے۔ خلائی چھلانگ تک مجھے اور تمہیں محنت کرنا ہوگی۔۔۔ اس سے آگے کمپیوٹر کسی ہدایت اور رہنمائی کے بغیر خود فیصلے کرے گا اور وہ درست ہوں گے۔۔۔ میری اور تمہاری مداخلت کے بغیر۔۔۔ میں جھٹکا برداشت نہ کر سکا اور مر گیا تب بھی تم محفوظ اور بچے ہو گے!“

☆☆☆

آرتھر نے وہ ساری باتیں ذہن نشین کر لیں۔ اسی کے بعد وہ اس مجرمانہ خلائی مشن میں شرکت کے لیے تیار ہوا۔ اس کے لیے کریلیم چرانا مشکل نہیں تھا۔ ادپر والے اس پر حد سے زیادہ اعتبار کرتے تھے۔ کریلیم کا تھیلا دیکھ کر برین کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا مگر اس کی یہ خوشی بہت عارضی ثابت ہوئی۔ آرتھر کے دوسرے ہاتھ میں ایک چھوٹی مگر تیز چھری وہی ہوئی تھی جو اس نے پوری سفاکی سے برین کے دل میں اتار دی۔ وہ آخری ہچکی بھی نہ لے سکا اور کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح وہیں ڈھیر ہو گیا۔ آرتھر نے اپنی تیز چھری سے فارمولے کے دس برسوں کو وہیں ختم کر دیا تھا۔

آرتھر بے پروا تھا۔ اب اسے خلا کی بسیط پہنائیوں میں گم ہو جانا تھا۔ اس نے وہ چھری برین کے مردہ جسم میں چھوڑی اور وہاں سے نکل گیا۔

اب وہ خلا میں تھا۔ اپنی پرستائی دینے والی دھمکی اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اب پولیس اور اس جیسے محکموں کی درجنوں خلائی گاڑیاں اس کے پیچھے لگی ہوں گی۔ اس کے اعصاب پر تناؤ کی کیفیت طاری ہونے لگی۔

وہ خلائی چھلانگ کے لیے تیار تھا۔ اس کے اعصاب چٹخ رہے تھے۔

اچانک اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے اندر سے سب کچھ باہر ابل رہا ہے، وجود ہوا ہو گیا۔ بصارت ماؤف ہو گئی۔ زبان اکڑ کر حلق میں اتر گئی۔ آنکھوں کے ڈھیلے باہر آتے ہوئے محسوس ہوئے۔ سماعت میں بس ایک ہولناک اور ماورائے روائی گونج تیر رہی تھی۔

پھر سب کچھ اعتدال پر آ گیا۔ اس نے اپنی پلکیں

دیر آید۔۔۔!

میکسیکو سٹی کا ایک روانی جوڑا جلد بازی میں کوئی فیصلہ کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ ان دونوں کا خیال تھا کہ ہر کام بہت غور و خوض کے بعد کرنا چاہیے۔

لہٰذا وہ دونوں منگنی کے بعد 62 برس تک شادی کے سوال پر غور کرتے رہے تھے اور آخر جب وہ ایک دوسرے سے مطمئن ہو گئے تو انہوں نے شادی کر لی۔ شادی کے وقت ان کی عمر 82 برس تھی۔

انتظار

نرس: ”یہ ایمرجنسی میں آپریشن کس کا ہو رہا ہے؟“

وارڈ بوائے: ”ایک غریب آدمی کا۔۔۔ جو گالف کورس سے گزرتے ہوئے جمائی لے رہا تھا۔ سیٹھ صاحب نے ہٹ لگائی اور بال سیدھی اس کے پیٹ میں چلی گئی۔“

نرس: ”وہ صاحب جو باہر بے چینی سے ٹہل رہے ہیں وہ شاید ان کے رشتے دار ہیں۔“

وارڈ بوائے: ”نہیں میم صاحب! یہ تو وہی سیٹھ ہیں، انتظار کر رہے ہیں کہ آپریشن مکمل ہو اور وہ اپنی بال لے کر کھیل مکمل کر سکیں۔“

جھپکائیں اور بے ساختہ مسکرا دیا۔ خلائی چھلانگ لگائی گئی تھی اور وہ زندہ تھا۔ زمین، برین کی لاش اور پولیس وغیرہ کی خلائی گاڑیوں کو وہ پیچھے... بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ اسے خود معلوم نہیں تھا کہ وہ اندھیروں میں ڈوب کر کہکشاں کے کس حصے میں نکل آیا ہے۔

وہ پُرسکون انداز میں ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کا خلائی جہاز دھیرے دھیرے گھومتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

کمپیوٹر اسکرین پر گرد و پیش میں پھیلے ہوئے بے شمار ستاروں اور سیاروں کے جھرمٹ بن اور بگڑ رہے تھے۔ چند منٹ یوں ہی گزر گئے پھر اسکرین پر ایک بڑا سا روشن، آگ اگلتا اور دھوئیں کے بادلوں میں گھرا ہوا ستارہ نمودار ہوا اور وہیں ٹھہر گیا۔

کمپیوٹر سے کلک کلک کی تیز آوازیں آرہی تھیں۔ ننھی ننھی روشنیاں جل بجھ رہی تھیں... منٹ کے بعد گھنٹا اور پھر کئی گھنٹے گزر گئے، یہی ہوتا رہا۔ کمپیوٹر نے اس روشن گولے کو اپنا حوالہ بنالیا تھا اور اس کے ذریعے گرد و پیش میں پھیلی ہوئی کہکشاں کو شناخت کرنے کی ناکام کوشش کررہا تھا۔

آرتھر بے چین ہوگیا۔ برین نے اپنی کاوشوں میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، کسی ستارے کو نظرانداز نہیں کیا تھا۔ سب کچھ جیسا تھا، اس نے ویسا ہی بنایا تھا... پھر کیا ہورہا تھا؟

یقیناً ستارے پیدا ہونے اور فنا ہونے رہتے ہیں۔ کائنات کی بے پایاں وسعتوں میں قدرت کے پُراسرار کھیل کھربوں سال سے جاری ہیں مگر یہ تبدیلیاں رفتہ رفتہ رونما ہوتی ہیں۔ ان کھربوں سالوں میں ایک لمحہ... کوئی ایک لمحہ ایسا ضرور ہوتا ہے جو تاریک ستاروں کے ہونے اور نہ ہونے کے درمیان حائل ہوتا ہے۔

آرتھر کے پیٹ میں گرہیں پڑنے لگیں۔ جو کچھ اس کی سمجھ میں آرہا تھا اگر وہ درست تھا تو وہ انتہائی بھیانک صورتِ حال سے دوچار ہوچکا تھا۔

وہ خود بھی ایسٹ روان تھا۔ اس نے تیزی سے اپنے ٹیلی اسکوپ کو روشن گولے کی طرف مرکوز کیا۔ اس وقت سنسنی خیز گھبراہٹ نے اسے بری طرح جکڑا ہوا تھا۔ آتشیں گولا اس کے ٹیلی اسکوپ کی گرفت میں آگیا۔ اس کے وسط میں جہنمی الاؤ بھڑک رہے تھے جنہیں بپھری ہوئی گیسوں کے بگولوں نے گھیرا ہوا تھا۔

وہ ایک نووا تھا!

گمنام کائناتی اندھیروں سے آسمان میں ابھرنے والا وہ سپر اسٹار ہونے اور نہ ہونے والے ایک لمحے کو عبور کرکے شاید چند روز یا چند مہینوں پہلے... برین کا کام ختم ہونے کے بعد نمودار ہوا تھا۔ وہ پہلے سے موجود ہوتا تو برین کبھی اسے نظرانداز نہ کرتا... کمپیوٹر بھٹک رہا تھا، اس کی کھٹ کھٹ کی آوازیں آرتھر کے اعصاب پر ہتھوڑے برسا رہی تھیں۔ کمپیوٹر نے اس نووا کو اپنا حوالہ یا ریفرنس بنالیا تھا اور اس کے گرد و پیش میں کسی ایسے سیارے کی تلاش میں سرگرداں تھا جہاں حیات پائی جاتی ہو مگر وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ برین نے تیس سال کی شب و روز کی محنت میں خالقِ کائنات کے تخلیقی عمل کو یکسر نظرانداز کردیا تھا۔ وہ بھول گیا تھا کہ اس کے ایک اشارے سے یکا یک سب کچھ وجود میں آتا ہے اور پھر ایسے ہی کسی اور اشارے سے سب کچھ فنا بھی ہوسکتا ہے۔

”بھول جاؤ... اس جہنمی ستارے کو بھول جاؤ... کچھ اور دیکھو!“ آرتھر گلا پھاڑ کر پوری قوت سے چلایا۔

اس کی آواز خلائی جہاز کے کیبن میں گونج کر رہ گئی۔ وہ بے بسی کے عالم میں ایک خودکار مشین پر چیخ رہا تھا جو برین کے دیے ہوئے پروگرام کے مطابق اپنا کام کررہی تھی... انسان کی کسی فریاد کو سنے بغیر!

کمپیوٹر کی بے سود کوششیں جاری تھیں۔ جب تک بیٹری ساتھ دیتی وہ کام کرتا رہتا اور پھر خاموش ہوجاتا۔ آرتھر جانتا تھا کہ اس کی بیٹری بہت طاقتور تھی۔ اس کے بے جان ہونے سے پہلے ہی جہاز میں موجود آکسیجن ختم ہوجاتی... آکسیجن جو اس کے زندہ رہنے کے لیے ضروری تھی!

وہ بے بسی، بے چارگی اور دہشت کے عالم میں ایک کرسی پر ڈھے گیا۔ ابھی نووا اپنی جگہ پر موجود تھا۔ کچھ ہی دیر میں اس کا جہاز دھیرے دھیرے اس کے گرد اپنا مدار قائم کرلیتا... وہ اس کے حصار میں قید ہوچکا تھا۔ موت کے طویل اور دہشت ناک انتظار کے ساتھ اس کا کاؤنٹ ڈاؤن شروع ہوچکا تھا۔

اس انتظار کی طوالت کو ختم کرنے کا ایک ہی آسان راستہ تھا جو اس نے خود بند کرلیا تھا۔

کاش! اس نے اپنا تیز چھری برین کی لاش میں چھوڑنے کے بجائے اپنے ساتھ رکھی ہوتی!

بھیانک، پُرہول اور بے کراں کائناتی سناٹے میں وہ بالکل تنہا تھا اور بہت دھیرے دھیرے آنے والی اپنی موت کا منتظر!

(ماخوذ)

☆☆☆

وہ پرنسپل کے سامنے بیساکھی کے سہارے تن کر کھڑا ہوا تھا۔

پرنسپل اسے بہت حیرت اور دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے ایک گہری ہنکاری بھرتے ہوئے کہا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مسٹر حامد نے آپ کو کیسے بھیج دیا۔“

”کیوں جناب؟“ فیاض نے پوچھا۔

”میرا مطلب ہے مسٹر فیاض کہ ہمارے اسکول میں جو ویکنسی ہے وہ پی ٹی ماسٹر کی ہے، یعنی فزیکل ٹریننگ... اور

جذبات... احساسات اور انا کے خول میں جکڑی حقیقت سے قریب تر کہانی...

خواہشات کا تسلسل کبھی رکتا نہیں... ہمیشہ آگے کی طرف بڑھتا رہتا ہے... ایک ایسے ہی شخص کی خواہشوں کا احوال... اس نے جو سوچا، وہ خود پا نہ سکا... پھر اس نے اپنی آنے والی نسل کے لیے خواب بننے شروع کر دیے... لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تمناؤں... امیدوں کے چراغ ٹمٹمانے لگتے ہیں... روشن رکھنے کی سعی کے باوجود وہ گل ہو جاتے ہیں...

خواب زدہ

منظر امام

آپ... معاف کیجیے گا، یہ آپ کیسے کر سکتے ہیں؟"

"سر! میں لڑکوں کو انسٹرکشن تو دے سکتا ہوں نا۔" فیاض نے کہا۔ "ان کو چیک کر سکتا ہوں۔ ان کی ٹائمنگ درست کر سکتا ہوں۔ انہیں ایکسرسائز کے طریقے سمجھا سکتا ہوں۔ کیونکہ اس فیلڈ میں میرا بہت وسیع تجربہ ہے۔ میں نے برسوں ایکسرسائز کی ہے۔ شاید آپ کو یہ معلوم نہ ہو کہ میں پاکستان کا جونیئر چیمپین رہا ہوں۔ میری ٹریننگ اولمپک کے لیے ہو رہی تھی کہ بدقسمتی سے میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور میری ایک ٹانگ کاٹ دی گئی لیکن برسوں کا تجربہ تو میرے پاس ہے نا۔"

"اور...!" پرنسپل اب سنبھل کر دلچسپی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"میں سمجھ رہا ہوں سر کہ آپ مجھے دیکھ کر مایوس ہوئے ہوں گے۔" فیاض کہہ رہا تھا۔ "کیونکہ آپ کے تصور میں کوئی ایسا شخص ہوگا جو باڈی بلڈر ٹائپ کا ہو اور جو ہر لمحے آپ کو اپنی فٹنس کا احساس دلا سکتا ہو۔ آپ ٹرائل کے طور پر مجھے دو چار روز تک کلاسز دے کر دیکھیں۔ میں بچوں میں اگر اسپورٹس کی لگن نہ پیدا کر سکوں تو پھر مجھے جواب دے دیجیے گا۔"

پرنسپل کو اس کے لہجے کا اعتماد بہت اچھا لگ رہا تھا۔ بیساکھی کے سہارے کھڑے ہوئے اس آدمی کے چہرے کی چمک بتا رہی تھی کہ وہ ایک باہمت شخص ہے۔

"ٹھیک ہے مسٹر فیاض۔" پرنسپل نے ہار مان لی تھی۔ "میں آپ کو دو چار روز نہیں پورا ایک ہفتہ دیتا ہوں۔ آپ خود کو پرو کر کے دکھائیں۔"

"تھینک یو سر۔" فیاض کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔

اس کی عمر پچیس چھبیس کے لگ بھگ تھی۔ اس نے بہت دشوار زندگی ایک خواب کے سہارے گزاری تھی۔ اس کا یہ خواب دوڑ میں ورلڈ چیمپین بننے کا تھا۔

اس کے دوڑنے کی ابتدا بچپن ہی میں ہو گئی تھی۔ محلے کے دوستوں میں سب سے زیادہ تیز رفتار تھا۔ وہ جہاں رہا کرتا، وہاں ایک بڑا سا ٹیلا تھا۔ ٹیلے کے ساتھ ایک سڑک ان کے گھر کے سامنے سے ہوتی ہوئی بازار کی طرف جاتی تھی۔

ہر صبح ترکاریوں سے بھری ہوئی ایک گاڑی شہر کی منڈی سے آیا کرتی۔ فیاض ہر صبح اس ٹیلے پر چڑھ کر آتی ہوئی سوزوکی کو دیکھا کرتا۔ وہ سوزوکی دور سے دکھائی دے جاتی۔

فیاض دوڑ شروع ہونے کے انداز میں دونوں ہاتھ آگے نکال کر گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتا۔ پھر جیسے ہی سوزوکی نیچے کے قریب آتی، وہ اس کے ساتھ دوڑنے لگتا تھا۔

سوزوکی کا ڈرائیور اور اس پر بیٹھے ہوئے مزدور بھی بہت اچھی طرح اسے پہچان گئے تھے۔ وہ اس کی حوصلہ افزائی کرتے رہتے اور فیاض اپنی رفتار تیز کرتا جاتا۔

اپنے اسکول میں بھی وہ دوڑ کا چیمپین تھا۔ اسی زمانے سے اسے ورلڈ کلاس رنرز کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا شوق ہو گیا تھا۔

اولمپک ریکارڈ کیا ہے۔ ورلڈ ریکارڈز کیا ہے۔ ان کی ٹریننگ کیا ہوتی ہے؟ کس ملک کے کس رنر نے کب اور کہاں گولڈ میڈل حاصل کیا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس کے جنون کو دیکھ کر اس کے جاننے والے اس کا مذاق اڑایا کرتے۔ "یار! کن چکروں میں پڑ گئے ہو۔ کیا فائدہ ہوگا اس کا؟"

"تم لوگ دیکھ لینا۔ میں اس میں کمال کر کے دکھاؤں گا۔" وہ کہا کرتا۔

اس کا ساتھ دینے والا اس کا باپ تھا جو خود بھی اپنے زمانے میں چھوٹا موٹا اتھلیٹ رہ چکا تھا۔ اس نے یہ بھانپ لیا تھا کہ فیاض میں ورلڈ کلاس رنر بننے کی صلاحیت ہے لیکن اسے مناسب ٹریننگ کی ضرورت ہے۔ اس نے فیاض کو شہر کے ایک اسکول میں داخلہ دلا دیا جہاں فزیکل ٹریننگ کی سہولیات موجود تھیں۔ فیاض نے اسی سال انٹر اسکول چیمپین شپ جیت لی۔

پھر وہ صوبے کا چیمپین بن گیا۔ پھر پاکستان کا چیمپین بنا۔ اس نے اب تک کا سب سے بہترین ریکارڈ بنا لیا تھا۔ اب اس کی نگاہیں اولمپک پر تھیں۔

کھیلوں کی ایسوسی ایشن بھی اس کا ساتھ دینے کو تیار ہو چکی تھی کہ اچانک ایک بھیانک حادثے نے اس کے سارے خواب تباہ کر دیے۔

اس کی ایک ٹانگ کاٹ دی گئی۔ وہ بیساکھی پر آ گیا اور اس کے خواب اس سے دور بہت دور ہوتے چلے گئے۔

لیکن اس کا جذبہ برقرار رہا۔ وہ نہ سہی کوئی اور سہی۔ کسی نہ کسی کو تو اس ملک سے ورلڈ چیمپین بننا تھا۔

کوئی تو ایسا ہو جسے دیکھ کر وہ فخر سے کہہ سکے کہ دیکھو... یہ ہے ورلڈ چیمپین... اور یہ ہمارے ملک کا ہے۔

اب اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ نوجوان نسل کو ذہن کرے۔ انہیں ایسے طریقے بتائے کہ وہ زندگی کی ہر دوڑ میں کامیاب ہوسکیں۔ چیمپئن بن سکیں۔

☆☆☆

عالیہ کو اپنے باپ کی کچھ باتیں پسند نہیں تھیں۔

اس کا باپ ایک وقیانوسی قسم کا انسان تھا۔ اس نے اپنے آپ کو فرسودہ رسم و رواج میں لپیٹ رکھا تھا اور وہ یہ سمجھتا تھا کہ جو کچھ وہ کہتا ہے بس وہی ٹھیک ہے۔

اس کے اردگرد اس کے معتقد مستقل رہا کرتے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کی معلومات اصغر حسین سے بھی بہت کم تھیں۔ وہ سب اصغر حسین کو سائیں بابا کہا کرتے تھے۔

اصغر حسین نے اپنا گیٹ اپ بھی کچھ ایسا بنا رکھا تھا۔ لانبی داڑھی، لانبی زلفیں، پگڑی اور آنکھوں میں کاجل۔ ایک ہاتھ میں تسبیح ضرور ہوا کرتی۔

اس نے عالیہ کی تعلیم کے سلسلے میں بہت رکاوٹیں ڈالی تھیں۔ عالیہ کے میٹرک کرنے کے بعد اس نے ہنگامہ مچا رکھا تھا۔ ''نہیں، بس بہت ہو چکی تعلیم۔ میٹرک کر چکی ہے اس لیے آگے پڑھانا فضول ہے۔''

اس وقت عالیہ کی ماں زینب نے اسٹینڈ لے لیا تھا۔

''ایسا کیوں کہہ رہے ہیں آپ۔ زمانہ کہاں سے کہاں جا چکا ہے اور آپ کو لڑکی کی تعلیم اچھی نہیں لگ رہی۔''

''میں پوچھتا ہوں، زیادہ تعلیم پا کر یہ کرے گی کیا؟''

''تعلیم تو ذہن کو روشن کرنے کے لیے ہوتی ہے۔'' زینب کہا کرتی۔ ''ایک عورت کی تعلیم پورے گھر کی تعلیم ہوا کرتی ہے۔ آپ کو یاد ہے عالیہ کو ابتدائی تعلیم کس نے دی تھی۔ خود میں نے، کیونکہ میں پڑھی لکھی ہوں۔ ورنہ وہ میٹرک بھی نہیں کر پاتی۔''

زینب کی ضد کے سامنے اصغر حسین نے ہار مان لی تھی۔ ''ٹھیک ہے، بھیج دو اس کو۔ لیکن یاد رہے یہ اس کالج میں جائے گی جہاں صرف لڑکیاں ہوں گی۔''

''ہاں، ہاں۔'' زینب نے اطمینان کی سانس لی۔ ''اس کا خیال تو خود مجھے بھی ہے۔ اس شہر میں کئی گرلز کالجز ہیں۔ کسی ایک میں داخلہ ہو جائے گا۔ اس نے میٹرک میں نمبرز بھی تو بہت اچھے لیے ہیں۔''

اس طرح عالیہ کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔

اس رات اصغر حسین نے اپنی بیٹھک میں اپنے پاس آنے والوں کو بتایا۔ ''میں پچھلے ایک مہینے سے بہت پریشان تھا لیکن آج پریشانی ختم ہوئی ہے۔''

''خدا خیر کرے سرکار، کس بات کی پریشانی تھی؟'' کسی نے پوچھا۔

''ارے بھائی، پچھلے ایک مہینے سے میں ایک ہی خواب دیکھ رہا تھا۔'' اصغر حسین نے بتایا۔ ''وہ خواب یہ تھا کہ میں ایک جگہ ٹھوکر کھا کر گر پڑا ہوں۔ بہت ہی ویران سا علاقہ ہے۔ دور دور تک کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ اچانک کچھ بلائیں زمین سے نکل کر میری طرف بڑھنے لگی ہیں۔''

حاضرین ہمہ تن گوش ہو کر اس کا یہ خواب سن رہے تھے۔

''پھر کیا ہوا سرکار؟'' کسی اور نے پوچھا۔

''بھائی! میں نے کچھ پڑھ کر ان کی طرف پھونکنا شروع کر دیا لیکن ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بلائیں آگے بڑھتی چلی گئیں۔ پھر اچانک کہیں سے میری صاحبزادی عالیہ وہاں آگئی اس نے کہا۔ بابا! میرا ہاتھ تھام لیں۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور اس نے مجھے ساتھ لے کر پرواز کرنا شروع کر دی۔ اوپر بہت اوپر۔ جیسے کوئی جہاز اوپر جا رہا ہو۔ وہ بلائیں زمین پر ہی رہ گئیں۔''

''واہ، واہ، سبحان اللہ سرکار!'' حاضرین جھومنے لگے۔

''پھر وہ مجھے ساتھ لے کر نیچے اترنے لگی۔ ہم زمین پر آگئے۔ سامنے ایک عمارت تھی۔ اس عمارت کا گیٹ لوہے کا تھا اور اس پر پھولوں کے ڈیزائن بنے ہوئے تھے۔ وہ ڈیزائن میرے ذہن میں محفوظ رہ گئے۔ میری بیٹی مجھے لے کر اس عمارت میں داخل ہوگئی اور مجھے ایسا لگا جیسے سکون مل گیا ہو۔''

''واہ، واہ سرکار! یہ تو بہت مبارک خواب ہے۔''

''اب آگے سنو۔'' اصغر حسین نے کہا۔ ''اس خواب نے مجھے پریشان کر کے رکھ دیا تھا لیکن خدا کا شکر ہے کہ کل جب میں اپنی بیٹی کو داخلہ دلانے کے لیے کالج گیا تو سب معاملات سامنے آگئے۔ اس خواب کی تعبیر سامنے آگئی۔ میں نے جس کالج میں اپنی بیٹی کو داخل کرایا اس کا لوہے کا گیٹ بالکل ویسا ہی ہے جیسا میں نے اپنے خواب میں دیکھا تھا۔''

''یہ تو بہت زبردست بات ہوگئی سرکار!''

''ہاں، اور مجھے پتا چل گیا۔ قدرت نے اشارہ دے دیا کہ میری بیٹی کالج میں تعلیم حاصل کر کے عالم

اسلام کی خدمت کرنے والی ہے۔'' اصغر حسین نے کہا۔
''یوں سمجھ لو کہ میں نے جو خواب دیکھا تھا اس میں اسلام کی علامت خود میں تھا جو کمزور ہو کر ٹھوکر کھا کر گر پڑا تھا اور وہ بلائیں کفر کی تھیں۔ الحاد کی تھیں جو میری طرف چلی آ رہی تھیں۔ پھر میری بیٹی مجھے وہاں سے اٹھا کر اس درس گاہ میں لے آئی جہاں اسے آگے چل کر تعلیم حاصل کرنی ہے۔''

حاضرین واہ واہ اور سبحان اللہ کہنے لگے۔

اصغر حسین کو یہ کہانی گھڑنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی تھی کہ چند مہینے پہلے وہ لڑکیوں کی تعلیم کے خلاف اپنے معتقدین کے سامنے ایک لیکچر دے چکا تھا۔

لوگ اس پر اعتراض بھی کر سکتے تھے اس لیے اس نے ایک من گھڑت خواب سنا دیا اور سامنے بیٹھے لوگوں کو عقیدت میں سرشار دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک اطمینان بھری مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ یہ ایک مشکل مرحلہ تھا جو بہت آسانی سے طے ہو گیا تھا۔

☆☆☆

بہت سے بچے اسکول گراؤنڈ میں موجود تھے۔ انہوں نے جب اپنے نئے پی ٹی سر کو بیساکھی پر آتے دیکھا تو وہ مسکرا دیے۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو بہت ہمدردی کی نگاہوں سے اپنے ٹیچر کو دیکھ رہے تھے۔

فیاض کے لیے ایک کرسی رکھ دی گئی تھی۔ اس نے کرسی پر بیٹھ کر بچوں سے کہا۔ ''بچو! تم سب میرے سامنے آ کر بیٹھ جاؤ۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

وہ سب گراؤنڈ میں فیاض کے سامنے بیٹھ گئے۔

''دیکھو بچو! میں جانتا ہوں کہ تم سب میرا مذاق اڑا رہے ہو کہ ایک ٹانگ سے معذور انسان کس طرح کھیلوں میں تمہاری تربیت کر سکتا ہے لیکن شاید تم لوگوں کو یہ نہیں معلوم کہ اس لنگڑے انسان کے پاس بہت تجربہ ہے۔ میں دوڑ میں پاکستان چیمپئن رہ چکا ہوں اور اولمپک کے لیے ٹریننگ کر رہا تھا کہ میرے ساتھ یہ حادثہ پیش آ گیا۔ میری ایک ٹانگ کاٹ دی گئی۔ میں بیساکھی پر آ گیا اور آج اس حال میں تمہارے سامنے موجود ہوں۔''

لڑکے اب بالکل خاموش ہو کر اس کی باتیں سن رہے تھے۔ یہ اس کی پہلی کامیابی تھی۔ فیاض کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''میرے بچو! میرے اپنے خواب تو ادھورے رہ گئے لیکن خوابوں کا یہ سفر ختم نہیں ہوا۔ میں اپنے ملک کے کسی نوجوان کو ورلڈ چیمپئن دیکھنا چاہتا ہوں اور تم جانتے ہو کہ وہ نوجوان کون ہے؟''

''نہیں سر، ہم نہیں جانتے۔ آپ بتائیں۔''

''وہ نوجوان تم ہو... تم ہو۔'' اس نے اشارے سے کہا۔ ''تم میں سے کوئی ایک ہے۔ میں نے ایک نظر میں تم لوگوں میں آگے بڑھنے کا جذبہ دیکھ لیا ہے۔ تمہارے چہرے بتا رہے ہیں کہ تم کوئی عام بچے نہیں ہو بلکہ بہت آگے جانے والے ہو۔ تمہارے چہرے اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ تم میں سے کوئی ورلڈ چیمپئن اور کوئی اولمپک چیمپئن ہے۔ کیا تمہارے اندر ایسی خواہش نہیں ہے۔''

''ہے سر۔'' سب لڑکوں نے ایک ساتھ کہا۔

''شاباش، یاد رکھو جہاں خواہش ہوتی ہے وہاں راستے بھی نکل آتے ہیں۔'' فیاض نے کہا۔ ''اب تم لوگ میرا ساتھ دو گے تو سب کچھ ممکن ہے۔ میں تمہیں بہت آگے لے کر جاؤں گا۔''

''آپ بتائیں سر، ہمیں کیا کرنا ہوگا؟'' ایک لڑکے نے پوچھا۔

''دیکھو، میں تمہارے ساتھ بھاگ دوڑ نہیں کر سکتا لیکن تمہیں ٹپس دے سکتا ہوں۔ ہدایات دے سکتا ہوں۔ تم ان کے مطابق عمل کرتے جاؤ۔ پھر دیکھو، کیا ہوتا ہے۔''

''ٹھیک ہے سر، آپ بتائیں۔''

''شاباش، آج پہلا دن ہے۔ میں آج تمہیں وارم اپ ہونے کی چند ٹیکنیکس بتاؤں گا۔ اب تم سب دو لائن بنا کر کھڑے ہو جاؤ۔''

فیاض نے انہیں ہدایت دینی شروع کر دی۔ وہ انہیں بتا رہا تھا کہ دوڑتے وقت کن باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ہاتھوں کی موومنٹ کیا ہوتی ہے۔ باڈی لینگویج کیا ہونی چاہیے۔

کچھ فاصلے پر کھڑے پرنسپل نے اپنے ایک ٹیچر سے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ میں نے اس شخص کو پی ٹی ٹیچر رکھ کر غلطی نہیں کی ہے۔''

☆☆☆

کئی مہینوں کے بعد ایک دن فیاض کو ایک لڑکی دکھائی دے گئی۔

اس کی زندگی میں اس قسم کے دل نشین حادثے کبھی نہیں ہوئے تھے۔ زندگی نے اتنی فرصت ہی نہیں دی تھی۔

جب وہ تندرست تھا تب وہ اپنے مسائل اور اپنی تیاریوں میں مصروف رہا تھا اور اب تو وہ بیساکھی پر تھا۔ معاشرے میں اس کی حیثیت ہی کیا تھی، ایک ایسا معذور شخص جو ایک اسکول میں پی ٹی ٹیچر تھا۔ بس اس کے علاوہ کیا تھا اس کے پاس۔"

لیکن اس قسم کے جذبے ایسی باتوں کی پروا نہیں کیا کرتے۔ وہ ایک دم کسی تیز رفتار اور پھر تیلے چیتے کی طرح حملہ آور ہو کر انسان کو بے بس کر کے رکھ دیتے ہیں۔

وہ بھی اس کو دیکھ کر بے بس ہو گیا تھا۔ اس کی نگاہیں اس سیدھی سادی لڑکی پر مرکوز ہو کر رہ گئی تھیں جو اپنی دو سہیلیوں کے ساتھ بک شاپ میں کوئی کتاب خریدنے آئی تھی۔

فیاض بھی ورلڈ کلاس کھلاڑیوں پر کوئی کتاب دیکھنے وہاں آیا تھا۔ اس لڑکی نے اپنے چہرے پر فیاض کی نگاہوں کی تمازت محسوس کر لی تھی۔ اس نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔

فیاض کو احساس ہوا کہ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ وہ بھی کتابیں دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ لڑکی چوری چوری اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔

فیاض کو اپنی پسند کی کتابیں دکھائی دے گئیں۔ اس نے ریک سے کتابیں اٹھائیں اور بیساکھی کے سہارے چلتا ہوا کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔

"بے چارہ!" لڑکی نے اپنی ایک سہیلی کو متوجہ کیا۔ "دیکھو تو سہی، کتنا اچھا آدمی ہے لیکن بیساکھی پر چل رہا ہے۔"

"میں جانتی ہوں اس کو۔" اس کی سہیلی نے بتایا۔

"تم کیسے جانتی ہو؟"

"میرا چھوٹا بھائی جس اسکول میں پڑھتا ہے یہ اسی اسکول میں پی ٹی ٹیچر ہے۔" سہیلی نے بتایا۔ "پچھلے دنوں بھائی کے اسکول میں سالانہ فنکشن تھا۔ میں بھی گئی تھی۔ وہیں دیکھا تھا اس کو۔"

"اوہ...!" لڑکی نے ایک گہری سانس لی۔ "لیکن یہ بے چارہ تو... میرا مطلب ہے یہ بچوں کو پی ٹی کیسے کراتا ہے؟"

"یہی تو کمال ہے۔ بچوں کو زبانی ٹریننگ دیتا ہے اور ان کے سکھائے ہوئے بچوں نے ابھی انٹر اسکول چیمپئن شپ جیتی ہے۔"

"پھر تو بہت زبردست بندہ ہوا۔"

"تمہیں اس میں کیا دلچسپی ہو گئی؟" سہیلی نے پوچھا۔

"یونہی۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔"

فیاض اپنی پسند کی کتاب لے کر دکان سے باہر جا چکا تھا۔ لڑکی نے بھی اس کی طرف سے دھیان ہٹا لیا۔ وہ اپنی کتابیں تلاش کرنے لگی۔

لیکن یہ کوئی اتفاق نہیں تھا بلکہ یہ قدرت کی طرف سے تھا۔ وہ اسی طرح دلوں کے ملنے کا اہتمام کرتی ہے۔ راستہ نکالتی ہے۔ مواقع فراہم کرتی ہے۔ کوئی واقعہ کوئی حادثہ اچانک نہیں ہوتا۔ بلکہ برسوں کی پلاننگ کے بعد رونما ہوتا ہے۔

یہ قدرت کی پلاننگ تھی کہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے آ گئے تھے۔ بظاہر یہ سب اتفاق تھا لیکن اس اتفاق کے پیچھے اور بھی بہت کچھ تھا۔

وہ ایک بار پھر ایک دوسرے سے ملے۔ لیکن یہ کوئی باضابطہ ملاقات نہیں تھی۔ وہ لڑکی اپنی اسی سہیلی کے ساتھ اسکول آئی تھی جہاں فیاض پی ٹی ماسٹر تھا۔

یہاں اسکول کے کوریڈور میں دونوں پھر ایک دوسرے کے سامنے آ گئے تھے۔ اس بار اس لڑکی نے خود ہی آگے بڑھ کر اس سے بات کی تھی۔ "معاف کیجیے گا، میں اس طرح آپ کو روک کر آپ سے بات کرنے لگی۔"

"نہیں، نہیں، کوئی بات نہیں ہے۔" فیاض نے کہا۔ "کیا آپ کو کچھ پوچھنا ہے؟"

"میں نے سنا ہے آپ دوڑ میں پاکستان کے چیمپئن رہ چکے ہیں؟" لڑکی نے پوچھا۔

"ہاں، لیکن اب سب کچھ خواب و خیال ہو کر رہ گیا ہے۔" فیاض نے کہا۔ "اب تو میں اپنے آپ کو اس بیساکھی کے سہارے گھسیٹ رہا ہوں۔"

"یہ حادثہ کیسے ہوا تھا۔"

"حادثوں کا کوئی جواز یا کوئی منطقی وجہ نہیں ہوتی، بس وہ ہو جاتے ہیں۔ ان کا دورانیہ اگرچہ چند لمحوں کا ہوتا ہے لیکن ان کے اثرات مہینوں اور برسوں تک پھیلے ہوتے ہیں۔"

لڑکی کی آنکھوں میں اس کے لیے ہمدردی اور دلچسپی کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے۔

"آپ بہت اچھی باتیں کرتے ہیں۔" لڑکی نے کہا۔

"ہاں، اب تو صرف باتیں رہ گئی ہیں، ورنہ تم کرن

ہو؟" فیاض نے پوچھا۔ "میں شاید دوسری بار دیکھ رہا ہوں۔"

"ہاں، ایک بار میں نے بک شاپ میں آپ کو دیکھا تھا۔" لڑکی نے بتایا۔ "میں اپنی سہیلی کے ساتھ کتابیں خریدنے گئی تھی اور اسی کے ساتھ آج اس اسکول میں آئی ہوں، اس کے بھائی کا کوئی مسئلہ ہے۔"

"نام کیا ہے تمہارا؟" فیاض نے پوچھا۔ "معاف کرنا، میں نام صرف اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ مجھے یاد رہے کہ کس لڑکی نے مجھ سے ہمدردی میں باتیں کی تھیں۔"

"عالیہ۔" لڑکی نے اپنا نام بتایا۔ "میں سیکنڈ ایئر کی اسٹوڈنٹ ہوں۔"

"ٹھیک ہے عالیہ۔" فیاض مسکرا دیا۔ "میرا نام تو جانتی ہی ہو اور یہ بھی معلوم ہے کہ میں کہاں ہوتا ہوں، اسی اسکول میں۔"

☆☆☆

عالیہ کی پرورش جس ماحول میں ہوئی تھی وہاں اس قسم کی باتیں نہیں ہوا کرتی تھیں۔ اس کا باپ تو لڑکیوں کی تعلیم کے خلاف تھا۔ وہ یہ کیسے برداشت کرسکتا تھا کہ اس کی بیٹی کسی شخص سے دوستی کرلے۔ اس سے راہ و رسم بڑھائے۔

لیکن یہ جانے کیوں وہ اس پی ٹی ٹیچر کے سامنے پگھل کر رہ گئی تھی۔

اس نے خود کو ٹٹولنے کی کوشش کی۔ کیا تھا یہ جذبہ ہمدردی۔ لیکن اس نے تو اس سے بھی برے حالات میں بہت سوں کو دیکھا تھا پھر ان کے لیے ایسا جذبہ کیوں نہیں جاگا تھا۔

یہ شاید جذبۂ ہمدردی سے بڑھ کر کچھ اور تھا۔ اس رات اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ ایک بار اسکول جاکر اس شخص سے پھر ملے گی۔

لیکن دوسری صبح اس کے لیے ایک کڑے امتحان کی طرح اس کے سامنے آگئی۔ اس کے باپ نے اسے اپنے پاس بلاکر بتایا۔ "بیٹی! میں نے تیرا رشتہ طے کردیا ہے۔"

"رشتہ؟" عالیہ بھونچکی رہ گئی تھی۔ "میرا... میرا رشتہ۔"

"ہاں، وہ میرا معتقد ہے، نواز علی۔ تو بھی اسے جانتی ہوگی۔ بہت بڑا ٹھیکیدار ہے۔"

"ہاں جانتی ہوں میں۔" عالیہ دھیرے سے بولی۔ "لیکن ابا! مجھے ابھی شادی نہیں کرنی۔ مجھے تعلیم مکمل کرلینے دیں۔"

یہ پہلا موقع تھا کہ عالیہ نے باپ کے کسی فیصلے پر اختلاف کیا تھا۔

"بس ہوچکی تعلیم۔" اصغر حسین غرایا۔ "تو نے انٹر کیا ہے۔ اتنا بہت ہے اور نواز علی جیسا رشتہ باربار نہیں آتا۔"

"بابا! میں اچھی طرح جانتی ہوں آپ کے نواز علی کو۔" عالیہ نے کہا۔ "آپ خود جانتے ہیں کہ وہ کیسا آدمی ہے۔ کئی بار پکڑا بھی گیا ہے۔ آپ ایسے شخص سے میری شادی کرنا چاہتے ہیں؟"

عالیہ اس وقت کھل کر بول رہی تھی۔ نہ جانے کیسا جذبہ تھا جس نے اس میں اتنی ہمت پیدا کردی تھی۔

"بس بہت ہوگئی۔" اصغر حسین نے کہا۔ "میں نے اس سے ہاں کہہ دی ہے اور اگلے ہفتے تک تیرا نکاح کروا دوں گا۔"

عالیہ جزبز ہوکر رہ گئی۔ اصغر حسین اپنا فیصلہ سنا کر جا چکا تھا۔ لیکن عالیہ کے بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ اسے کسی قیمت پر نواز علی جیسے آدمی سے شادی نہیں کرنی تھی۔ چاہے کچھ بھی ہوجائے۔

باپ کے جانے کے بعد اس نے اپنی ماں سے بات کی۔

"ہاں بیٹا تمہارے باپ نے یہ فیصلہ کرلیا ہے۔"

"لیکن آپ کو تو خود نواز علی پسند نہیں ہے۔" عالیہ نے کہا۔

"ہاں وہ آدمی اس قابل نہیں ہے لیکن تو اپنے باپ کی ضد کو تو جانتی ہے۔"

"اماں! اگر میں کوئی قدم اٹھاؤں تو کیا آپ میرا ساتھ دیں گی؟" عالیہ نے پوچھا۔

"کیسا قدم؟" ماں کچھ پریشان ہوگئی تھی۔

"فکر نہ کریں۔ کوئی ایسی بات نہیں ہوگی جس سے عزت پر حرف آئے۔ جو ہوگا جائز ہی ہوگا۔ ابا بہت اللہ والے بنتے ہیں۔ کیا ان کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ اولاد کو بھی اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ اس کے ساتھ زبردستی نہیں کی جاسکتی۔"

"لیکن اب ان کو کون سمجھائے۔" ماں بے بسی سے بولی۔

"آپ صرف یہ وعدہ کریں کہ آپ میرا ساتھ دیں گی۔" عالیہ نے کہا۔

"چل ٹھیک ہے۔ جہاں تک میرے بس میں ہوگا میں ساتھ دوں گی۔"

☆☆☆

فیاض اپنے سامنے عالیہ کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس لڑکی سے کل ہی تو باتیں ہوئی تھیں اور آج پھر وہ اس کے اسکول میں اس سے ملنے آگئی تھی لیکن کیوں؟ اس نے اندازہ لگایا کہ وہ بہت پریشان سی دکھائی دے رہی ہے۔

''ارے عالیہ تم! خیریت تو ہے؟''

''خیریت نہیں ہے۔'' عالیہ دھیرے سے بولی۔ ''مجھے آپ سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔''

''تو پھر میرے ساتھ میری کلاس میں آجاؤ۔'' فیاض نے کہا۔ ''وہاں سکون سے بات ہوسکے گی۔ ویسے تم بہت پریشان دکھائی دے رہی ہو۔''

''جی ہاں، پریشان ہی ہوں۔ اسی لیے آپ کے پاس آئی ہوں۔''

دونوں کلاس روم میں آکر بیٹھ گئے۔ ''ہاں، اب بتاؤ کیا بات ہے؟''

''پہلے آپ میرے بارے میں یہ بتائیں کہ کیا میں آپ کو بُرے کردار کی لڑکی لگتی ہوں؟'' عالیہ نے پوچھا۔

''نہیں، ہرگز نہیں۔''

''تو بس، اسی سے اندازہ لگالیں کہ کوئی لڑکی جب اس قسم کی بات کرنے آئی ہے تو اس کے ساتھ کتنی ذہنی پریشانی ہوگی۔ وہ اپنے ماحول اور اپنے گھر سے کتنی تنگ ہوگی کہ وہ ایسی کوئی بات کرنے ایک ایسے شخص کے پاس پہنچ گئی جس سے صرف ایک دفعہ کی ملاقات ہے۔''

''ہاں، میں تمہاری ذہنی کیفیت کو سمجھ رہا ہوں لیکن تم جب تک مجھے سب کچھ نہیں بتاؤ گی، میں کیا مشورہ دے سکوں گا۔''

''فیاض صاحب! میرے ابا ایک نام نہاد قسم کے پیر ہیں۔'' عالیہ نے بتایا۔ ''انہیں اسلام اور شریعت وغیرہ کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ وہ صرف الٹی سیدھی کہانیاں اور روایات جانتے ہیں۔ اپنے جاہل مریدوں کے سامنے وہی دہراتے رہتے ہیں اور وہ واہ واہ کرتے رہتے ہیں۔''

''میں سمجھ رہا ہوں کہ تمہارے گھر کا ماحول کیا ہوگا۔''

''وہ لڑکیوں کی تعلیم کے بھی سخت خلاف ہیں۔ میرا ہی دل جانتا ہے کہ میں کس طرح ہنگامہ کرکے اپنی تعلیم کو جاری رکھے ہوئے ہوں۔ اگر ان کا بس چلے تو وہ مجھے چہار دیواری میں قید کردیں۔''

''ہاں، ایسے لوگ ایسے ہی مزاج کے ہوتے ہیں۔''

احتجاج

مخالف پارٹیوں کے دو سیاست داں زور و شور سے بحث میں مصروف تھے۔ دونوں نے پہلے ایک دوسرے کو دلائل سے قائل کرنے کی ناکام کوشش کی پھر الزامات پر اتر آئے۔ ایک سیاست داں نے کہا۔ ''مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ تم کس کے اشارے پر ناچتے ہو۔''

دوسرے نے مشتعل ہوکر کہا۔

''احمق آدمی! سیاسی بحث میں میری بیوی کو کیوں گھسیٹتے ہو؟''

بس اور رکشا

ایک لڑکے نے لڑکی کو چھیڑتے ہوئے کہا۔ ''بس اور لڑکی ایک جیسی ہوتی ہے۔ ایک جاتی ہے تو دوسری چلی آتی ہے۔''

لڑکی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''رکشا اور لڑکے ایک سے ہوتے ہیں۔ ایک کو بلاؤ تو چار چلے آتے ہیں۔''

کاشف عبید کا وش، بہٹہ سوٹو ی بٹ گرام

فیاض نے کہا۔ ''لیکن نئی بات کیا ہوئی؟''

''نئی بات یہ ہوئی کہ وہ اب زبردستی میری شادی اپنے ایک مرید سے کروا رہے ہیں جو ان ہی کی طرح جاہل لیکن اول درجے کا بدمعاش انسان ہے۔''

''اوہ، یہ تو زیادتی ہے تمہارے ساتھ۔''

''بہت زیادہ اور میں یہ شادی کسی حالت میں نہیں کروں گی۔'' عالیہ نے کہا۔

''تو پھر تم نے کیا سوچا ہے؟''

''وہی سوچ کر تو آپ کے پاس آئی ہوں۔''

''کیا مطلب؟''

''ہاں، بات میں جواب دیں۔ کیا آپ مجھ سے شادی کرسکتے ہیں؟'' عالیہ نے پوچھا۔

''کیا مطلب؟'' فیاض بھونچکا رہ گیا۔

''وہی جو آپ نے سنا ہے۔'' عالیہ نے کہا۔ ''کسی لڑکی نے شاید براہ راست کبھی ایسی بات نہیں کی ہوگی لیکن اس سے آپ میری مجبوری اور پریشانی کا اندازہ لگاسکتے ہیں۔''

''لیکن عالیہ! یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ تم مجھے دیکھ رہی ہو، میں بیساکھی کے سہارے چلنے والا شخص ہوں۔ میرے پاس

تو کچھ بھی نہیں ہے۔ صرف خواہشیں اور خواب ہیں۔ اور زندگی ایسے نہیں گزاری جا سکتی۔ ایک معمولی سا پی ٹی ٹیچر تمہیں سوائے پریشانیوں اور محرومیوں کے اور کیا دے سکتا ہے؟"

"یہ ٹھیک ہے لیکن اگر کوئی ساتھ رہنے والا ہو تو یہ مایوسیاں اور محرومیاں بہت ہلکی ہو جاتی ہیں۔" عالیہ نے کہا۔

"میرے خدا! تو تم نے پورا فیصلہ کر لیا ہے؟" فیاض نے اپنا سر تھام لیا تھا۔

"ہاں، پورا فیصلہ۔" عالیہ نے کہا۔ "میرے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔"

"لیکن یہ سب کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ابا کی ضد نے مجھے راستے سمجھا دیے ہیں۔" عالیہ نے کہا۔ "بشرطیکہ آپ اسٹینڈ لے لیں۔ آپ نے اگر قبول کر لیا تو پھر راستے نکل آئیں گے۔"

"لڑکی تم نے مجھے امتحان میں ڈال دیا ہے۔" فیاض نے ایک گہری سانس لی۔ "ذرا خود سوچو، ہمارے درمیان بہت فرق ہے۔ سب سے پہلا فرق عمر کا ہے۔ میں تم سے بہت بڑا ہوں۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"دوسری بات یہ ہے کہ میں ایک غریب آدمی ہوں۔ بیساکھی کے سہارے چلتا ہوں۔ معمولی سی جاب ہے میری۔"

"یہ سب کچھ میرے ذہن میں ہے فیاض صاحب۔" عالیہ نے کہا۔ "لیکن باپ کی دی ہوئی موت سے تو بہتر ہے کہ میں خودکشی کر لوں۔"

☆☆☆

اصغر حسین اپنے مریدوں کو بتا رہا تھا۔ "تو پھر یہ ہوا کہ اچانک سیاہ بادلوں نے مجھے گھیر لیا۔" اپنا خواب سناتے ہوئے اس کے چہرے کے نقوش بدلنے لگے تھے۔ وہ بہت جلال کی کیفیت میں تھا۔ اسے اپنے مریدوں کے سامنے جواز پیش کرنا تھا کہ اس کی بیٹی نے عدالت میں جا کر اس کی مرضی کے خلاف ایک ایسے شخص سے شادی کیوں کر لی تھی جو بیساکھی کے سہارے چلا کرتا اور جو ایک اسکول میں پی ٹی ٹیچر تھا۔ اس نے اپنے مریدوں کے سامنے اپنے ایک ایسے خواب کی کہانی شروع کر دی جس میں اسی قسم کی بات کی گئی تھی کہ وہ کسی ویرانے میں چلا جا رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ وہ کالے بادلوں کے درمیان گھر گیا ہے۔

اس سے کچھ فاصلے پر اس کی بیٹی ایک شخص کا ہاتھ تھامے ہوئے کھڑی ہے۔ وہ غصے اور رنج کی حالت میں ان دونوں کی طرف بڑھتا ہے کہ اچانک بادلوں سے بجلیاں نکلنے لگتی ہیں اور اس کے چاروں طرف بارش کے قطروں کی طرح گرنے لگتی ہیں۔ وہ بے حد خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ اسی خوف کے عالم میں اس کی بیٹی اس کی طرف پھولوں کا ایک ہار اچھالتی ہے اور اشارہ کرتی ہے کہ وہ ہار اس آدمی کے گلے میں ڈال دوں۔

میں ایسا ہی کرتا ہوں اور جیسے ہی وہ ہار اس آدمی کے گلے میں ڈالتا ہوں بجلیاں گرنی بند ہو جاتی ہیں۔ وہ کالے بادل سمٹ کر غائب ہو جاتے ہیں۔"

اس کے مرید بہت حیرت اور عقیدت سے اس کا یہ خواب سن رہے تھے۔

"کچھ اندازہ ہوا کہ اس خواب کا مطلب کیا ہے؟"

"نہیں سرکار۔"

"یہ قدرت کی طرف سے مجھے خبردار کیا گیا ہے کہ میں اپنی بیٹی کی اس شادی کو قبول کر لوں، کیونکہ یہی مشیت الٰہی ہے۔"

پورا کمرا سبحان اللہ سے گونج اٹھا تھا۔ اصغر حسین کو اس بات کا اطمینان ہو گیا تھا کہ اس کے جاہل عقیدت مندوں نے اس کے جواز کو تسلیم کر لیا ہے۔

عالیہ نے خود فون کے ذریعے باپ کو شادی کی اطلاع دی تھی۔ اس روز پیر کو اسے کالج سے واپسی میں بہت دیر ہو گئی تھی۔ ایسا ہوتا نہیں تھا لیکن اس روز پیر کو ایسا ہی ہوا تھا۔

عالیہ کی آواز سنتے ہی اس نے گرجنا شروع کر دیا۔ "کہاں رہ گئی ہے تو، کیا تجھے یاد نہیں ہے کہ آج گھر میں مہمان آنے والے ہیں؟"

"یاد ہے بابا۔ اسی لیے یہ خبر دے رہی ہوں کہ میں نے شادی کر لی ہے۔"

"کیا؟" اصغر حسین کو اتنے زور کا جھٹکا لگا کہ ریسیور اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس نے دوبارہ ریسیور اٹھا لیا۔ "کیا بکواس ہے۔ کیا کہہ رہی ہے تو؟"

"ہاں بابا، میں نے فیاض سے عدالت میں جا کر شادی کر لی ہے۔" عالیہ نے بتایا۔

"تو پاگل ہو گئی ہے۔ میں کہتا ہوں گھر واپس آ جا۔" اصغر حسین دہاڑ رہا تھا۔

اصغر حسین کی آواز سن کر اس کی بیوی بھی دوسرے کمرے سے آ گئی تھی۔ "کیا ہو گیا۔ کس پر چیخ رہے ہیں؟"

"اس بدبخت پر، جو ہماری اولاد ہے۔ منع کر رہا تھا

کہ اس کو میٹرک سے آگے تعلیم نہ دلا کر آخر اس نے گل کھلا ہی دیا۔"

"کیا کر دیا ہے اس نے؟"

"شادی۔۔۔!" اصغر حسین چلّایا۔ "اس نے کورٹ میں جا کر شادی کر لی ہے۔"

"اوہ۔۔۔!" اس کی بیوی ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔

عالیہ کا یہ قدم اس کے علم میں تھا۔ عالیہ صبح ماں کی دعائیں لے کر گھر سے نکلی تھی۔ اصغر حسین نے ضد پکڑ لی تھی کہ وہ عالیہ کی شادی اپنے اسی عقیدت مند سے کرے گا جسے عالیہ نے انکار کر دیا تھا۔ عالیہ کے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ فیاض سے کورٹ میں جا کر شادی کر لے۔

اس کی ماں حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہ گئی تھی۔ عالیہ تو ایک خاموش لڑکی تھی۔ اس نے کبھی سر اٹھا کر بات بھی نہیں کی تھی لیکن اس کی محبت نے اس میں کیا جوش اور جذبہ پیدا کر دیا تھا۔

"عالیہ ایک بات بتاؤ، تمہارا یہ فیصلہ جذباتی تو نہیں ہے؟" ماں نے پوچھا۔

"نہیں اماں، میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا ہے۔" عالیہ نے بتایا۔ "حالانکہ خود فیاض بھی مجھے سمجھا چکے ہیں۔"

"تب تو میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں بیٹا۔" ماں نے کہا۔ "میں تمہارے باپ کو کسی طرح سنبھال لوں گی۔"

اصغر حسین کے عقیدت مندوں سے یہ بات چھپی نہیں رہی تھی۔ انہوں نے چہ مگوئیاں شروع کر دی تھیں۔ ان کو مطمئن کرنے کے لیے اصغر حسین ہر دوسرے تیسرے دن اپنا کوئی خواب سنا دیتا۔ وہ یہ ظاہر کرتا کہ وہ خدا کے اس فیصلے پر بہت خوش اور مطمئن ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے اندر آگ سی لگی رہتی تھی۔

ایک دن اس کی بیوی نے اس سے کہا۔ "آپ کو معلوم ہے میرے ساتھ کیا ہوا؟"

"کیا ہوا تمہارے ساتھ؟"

"میں ایک ویران اور اجاڑ راستے سے گزر رہی تھی کہ اچانک کچھ بھیڑیوں نے مجھ پر حملہ کر دیا۔"

"کیا بکواس کر رہی ہو؟ تم کس راستے سے گزر رہی تھیں اور یہ بھیڑیے کہاں سے آ گئے؟"

"سنئے تو سہی۔" اس نے کہا۔ "قریب تھا کہ بھیڑیے مجھے چیر پھاڑ دیں کہ اچانک ایک طرف سے عالیہ اور اس کا شوہر آ گئے۔ اس کا شوہر پیسا کی پر نہیں چل رہا تھا بلکہ پیسا کی اس کے ہاتھ میں بھی کسی تلوار کی طرح۔ اس نے ذرا سی دیر میں بھیڑیوں کو کاٹ کر رکھ دیا۔ اس طرح میری جان بچ گئی۔"

"یہ تم کیسی حماقت کی باتیں کر رہی ہو؟"

"یہ میرا خواب تھا۔" اس کی بیوی نے کہا۔ "جس طرح آپ خواب دیکھا کرتے ہیں اسی طرح اب میں بھی دیکھنے لگی ہوں۔ کیا خواب دیکھنے کا حق صرف آپ کو ہے؟ میں بھی تو خواب دیکھ سکتی ہوں نا۔"

اصغر حسین جز بز ہو کر رہ گیا۔

☆☆☆

دونوں ایک پُرسکون اور آسودہ زندگی گزار رہے تھے۔

جیسے جاڑوں کی خنکی میں دھوپ کا خوش گوار لمس ہو۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں تھیں، چھوٹی چھوٹی راحتیں۔ عالیہ نے ایک پرائمری اسکول میں جاب کر لی تھی۔ فیاض بدستور اپنے اسکول میں پی ٹی ٹیچر کے فرائض انجام دے رہا تھا۔

عالیہ پُرسکون تھی کہ اس نے فیاض کو اپنا جیون ساتھی بنا کر غلطی نہیں کی ہے۔ فیاض نے اسے بے پناہ خوشیاں دی تھیں۔

وہ اپنی بساط سے بڑھ کر عالیہ کے دامن میں خوشیاں بھر رہا کرتا۔ اس کی ذرا ذرا سی تکلیف سے بے چین ہو کر رہ جاتا۔

عالیہ کے باپ اصغر حسین نے بھی عالیہ کو تقریباً معاف کر دیا تھا لیکن شرط یہ تھی کہ وہ اور اس کا شوہر ان کے گھر نہیں آئیں گے۔ عالیہ کی ماں کبھی کبھی ان سے ملنے عالیہ کے گھر چلی جاتی۔

سارے معاملات تقریباً ٹھیک ہو گئے تھے۔ زندگی اچھی ڈگر پر آ گئی تھی لیکن فیاض کے لیے ابھی بھی ایک چیز کی کمی تھی۔

اور وہ تھی ورلڈ چیمپین کی ٹرافی۔

وہ عالیہ سے کہا کرتا۔ "دیکھو جب ہمارا بیٹا ہو گا تو میں اسے ٹریننگ دوں گا۔ تم دیکھنا وہ دوڑ میں پہلا پاکستانی ہو گا جو اولمپک چیمپین بن جائے گا۔ یہ میرا خواب ہے۔"

"اور اگر بیٹی ہوئی تو؟"

"کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ بھی وہی چیمپین ہو سکتی ہے۔ ہمارے ملک کی کتنی ایسی لڑکیاں ہیں جنہوں نے

ورلڈکپ میں حصہ لیا ہے۔"

"میں یہ دیکھتی ہوں کہ آپ اس خواب کی تعبیر حاصل کرنے کے لیے ہر وقت بے چین رہتے ہیں۔"

"ہاں عالیہ، میرے دو ہی خواب تھے۔ ایک عالمی چیمپئن بننا اور دوسرا انہیں حاصل کرنا۔ خدا نے ایک خواب تو پورا کر دیا۔ اب دوسرا خواب بھی پورا ہو جائے گا۔ میں نہ سہی میرا بیٹا سہی۔ لوگ فخر سے کہا کریں گے۔ یہ دیکھو یہ عالمی چیمپئن کا باپ جا رہا ہے۔"

ایسے موقع پر عالیہ مسکرا کر رہ جاتی۔ وہ دعائیں مانگا کرتی کہ خدا اس کے شوہر کے خوابوں کو پورا کر دے۔

اور جب شادی کے ایک سال بعد اس نے اپنے وجود میں کسی تبدیلی کو محسوس کیا تو سب سے پہلے فیاض کو اس کی خبر دی تھی۔

فیاض یہ سن کر نہال ہو گیا۔ "دیکھا خدا نے میری سن لی۔ اب میرے خوابوں کے سچا ہونے کا وقت آ گیا ہے۔"

"لیکن یہ سب کیسے ہوگا؟" عالیہ کچھ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں گھر میں اکیلی ہوں۔ آس پاس کوئی جاننے والا بھی نہیں ہے اور مجھے کسی قسم کا تجربہ بھی نہیں ہے۔"

"عالیہ! میں تمہاری پرابلم سمجھ رہا ہوں لیکن تم بتاؤ کیا ہو سکتا ہے۔"

"میری ماں کو یہ خبر دے دیں۔" عالیہ نے کہا۔ "ویسے تو وہ بھی ہمارے ساتھ ہی ہیں۔ اس خبر کو سن کر کتنی خوش ہوں گی۔ ممکن ہے ان کے ذہن میں اس مشکل کا کوئی حل بھی ہو۔"

"ضرور بتاؤ۔ اس میں سوچنے والی تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔" فیاض جلدی سے بولا۔ "تمہارے والدین ہی ہیں کوئی غیر نہیں ہیں۔"

جب عالیہ نے اپنی ماں کو یہ خبر سنائی تو وہ خوشی سے نہال ہو گئی۔

☆☆☆

اصغر حسین کی بیوی رات کے کھانے کے بعد اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے بیوی کے تاثرات سے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔

"کچھ کہنا ہے کیا؟" اصغر حسین نے پوچھا۔

"ہاں، خوشی کی خبر ہے۔" اس کی بیوی نے کہا۔ "آپ نانا بننے والے ہیں۔"

اصغر حسین نے گھور کر دیکھا۔ "کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"آپ سمجھے نہیں۔ ہماری عالیہ ماں بننے والی ہے۔"

"تو پھر؟"

"پھر یہ کہ یہ اس کی پہلی اولاد ہے اور ہمارے یہاں یہ دستور ہے کہ بیٹی کی پہلی اولاد اس کے میکے میں ہوتی ہے۔"

"میں نے اس کو معاف کر دیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کو سر پر لا کر بٹھا لوں۔" اصغر حسین نے کہا۔ "وہ جہاں ہے وہیں رہے۔"

"دیکھیں، یہ کوئی اچھی بات نہیں ہوئی۔ لاٹھی مارنے سے پانی جدا نہیں ہوتا۔ پھر وہ ہماری اکلوتی اولاد ہے اور اس نے کوئی غلط فیصلہ بھی نہیں کیا تھا۔ وہ کم بخت آپ کا سر نواز علی قتل کے جرم میں جیل کاٹ رہا ہے۔ خود سوچیں اگر آپ عالیہ کی شادی اس سے کر دیتے تو میری بچی کا اس وقت کیا ہوتا؟"

"اور وہ اس ٹی ٹی ماسٹر کے ساتھ کون سے عیش کر رہی ہے؟"

"عیش کرے یا نہ کرے لیکن دونوں بہت خوش ہیں۔" اس کی بیوی نے کہا۔ "آپ کبھی ان کے گھر تو جا کر دیکھیں۔ چھوٹا سا گھر ہے لیکن سکون ہی سکون ہے۔ اطمینان کی زندگی گزر رہی ہے دونوں کی۔"

"اچھا اچھا، لے آنا اس کو۔ لیکن ایک شرط ہوگی۔"

"وہ شرط بھی بتا دیں۔"

"اس کا شوہر یہاں نہیں آیا کرے گا۔" اصغر حسین نے کہا۔

اس کی بیوی نے اطمینان کی سانس لی۔ اصغر حسین کم سے کم یہاں تک تو مان گیا تھا۔

☆☆☆

گھر سے چلتے ہوئے عالیہ بہت اداس ہو رہی تھی۔

"عالیہ! ایک بار پھر سوچ لو۔" فیاض نے کہا۔ "تمہارا یہ فیصلہ غلط تو نہیں ہے؟"

"فیاض! اگر یہ فیصلہ غلط ہو تو بھی ہم کیا کر سکتے ہیں۔ ہمارا تو کوئی بھی نہیں ہے۔ کم از کم اتنا تو ہوا ہے کہ ابا اتنے دنوں تک گھر میں رکھنے کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔"

"لیکن تمہارے ابا نے مجھ پر جو پابندی لگائی ہے، اس کا کیا ہوگا؟"

"اس کی فکر نہ کریں۔ خدا کا شکر ادا کریں کہ ابا اس حد تک مان گئے۔" عالیہ نے کہا۔ "کچھ دنوں کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"لیکن میں تمہارے بغیر کیسے رہ سکوں گا۔ تمہاری تو عادت پڑ گئی ہے۔"

"بس دو تین مہینوں کی تو بات ہے۔" عالیہ نے کہا۔ "پھر ہم انشاء اللہ اپنی ننھی بانٹتے کو لے کر آجائیں گے۔"

"اور آنے ہی میں اس کی تربیت شروع کر دوں گا۔"

عالیہ ہنس پڑی۔ "اگر آپ کا بس چلے تو دوسرے ہی سال اس بے چارے کو ریس کے میدان میں لے آئیں اور ہاں، آپ ذرا اپنا خیال رکھیے گا۔ ناشتا گھر میں بنا لیجیے گا، ہوٹل میں بھی الٹا سیدھا کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کوشش کروں گی کہ ابا اس حد تک مان جائیں کہ آپ رات کا کھانا وہیں آ کر کھا لیا کریں۔"

"نہیں، یہ مت کرنا۔ میں کوئی انتظام کر لوں گا اور تم اپنا خیال رکھنا۔ ڈاکٹر سے چیک اپ کراتی رہنا۔ جو دوا بھی دی جائیں وہ ضرور استعمال کرنا۔"

عالیہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی، یہ اس بیوی کی مسکراہٹ تھی جو شوہر کے دل میں اپنے لیے پیار دیکھ کر نہال ہو گئی تھی۔

☆☆☆

باقی سب ٹھیک تھا، لیکن اصغر حسین نے عالیہ کو اس بات کی اجازت نہیں دی تھی کہ وہ اسپتال جا کر اپنا چیک اپ کرائے۔

"نہیں، یہ ہمارے خاندان میں کبھی نہیں ہوا۔ اور تم رکھو لو کہ ہمارے یہاں بھی اولادیں ہوتی ہیں۔"

"دیکھیں وہ زمانہ کچھ اور تھا اور آج بہت سے مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں۔" اس کی بیوی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "جیسے بچے کے لیے پولیو کے قطرے ضروری ہیں۔"

"نہیں، یہ بھی تو ہونے نہیں دوں گا۔" اصغر حسین نے کہا۔ "پہلے یہ سب کہاں ہوتا تھا۔ بتاؤ ہمارے یہاں کون لنگڑا ہے۔ کون بیساکھی پر چلتا ہے؟"

"لیکن شاہ صاحب آج کل تو یہ بہت ضروری ہے۔" اس کی بیوی نے کہا۔ وہ اصغر کو شاہ صاحب کہا کرتی تھی۔

"کوئی ضروری نہیں ہے۔" اصغر حسین نے کہا۔ "تمہیں کیا معلوم کہ پولیو کے قطرے پلانا حرام ہے۔ اس میں نہ جانے کیا کیا ملا دیتے ہیں۔ میں یہ تو گوارا کر لوں گا کہ ہمارے یہاں جو اولاد آئے وہ معذور ہو لیکن ناجائز اور حرام برداشت نہیں کر سکتا۔ میں اپنے ایمان کو کمزور نہیں کروں گا۔"

"خدا جانے آپ کے ذہن میں یہ بات کہاں سے آ گئی ہے۔"

"بس، اب اور کیا چاہتی ہو تم؟ میں نے اپنی اولاد کی یہ بات برداشت کر لی کہ اس نے میری اجازت کے بغیر شادی کر لی۔ پھر یہ برداشت کیا کہ اسے اولاد کی پیدائش کے لیے اپنا گھر رہنے دیا۔ اب تم یہ چاہتی ہو کہ میں اس حد تک اپنے آپ کو مار دوں کہ اس بچے کو وہ قطرے پلوانے کی اجازت دے دوں جو میرے نزدیک جائز نہیں ہے؟"

"خدا جانے کیا ہو گیا ہے آپ کو۔"

"پریشان مت ہو، تم دیکھ لینا، اس بچے کو کچھ بھی نہیں ہو گا۔"

☆☆☆

لیکن اس بچے کو بہت کچھ ہو گیا تھا۔

کئی برس بیت چکے تھے۔ اسکول وہی تھا۔ پی ٹی کا استاد وہی تھا فیاض لیکن اس کی ہدایات پر عمل کرنے والے بچے کوئی اور تھے۔

فیاض چیخ چیخ کر انہیں ہدایات دے رہا تھا۔ "شاباش، دوڑتے رہو۔ ادھر اُدھر نہیں دیکھنے، اس سے دھیان بٹ جاتا ہے۔ سامنے اپنے ٹارگٹ پر نگاہ رکھنی ہے۔ شاباش! جنید تم کیوں سست پڑ رہے ہو، شاباش اسپیڈ بڑھاؤ۔"

ماضی بن کر اس کی آواز پورے میدان میں گونج رہی تھی۔ وہ جن بچوں کو تربیت دے رہا تھا، انہی میں سے شاید کوئی آگے چل کر ورلڈ چیمپین بننے والا تھا۔ شاید اولمپک چیمپین بننے والا تھا۔

اچانک کسی نے پیچھے سے آ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "بابا۔"

فیاض نے مڑ کر دیکھا، اس کا اپنا بیٹا خرم بیساکھی کے سہارے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ ایک پولیو زدہ معذور بچہ تھا۔

"کیا بات ہے بیٹے؟ بھوک لگی ہے؟"

"نہیں بابا، کیا میں بھی اس طرح دوڑ سکوں گا بابا؟" بچے نے پوچھا۔

فیاض کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے بچے کو سینے سے لگا لیا۔ سامنے میدان میں اس کے زیرِ تربیت بچے دوڑتے جا رہے تھے، دوڑتے جا رہے تھے اور وہ اپنے معذور بچے کو اپنے سینے سے لگائے روئے جا رہا تھا۔

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن سے بھرپور

[illegible] دلچسپ سلسلہ...

بدترین اندیشے حقیقت کا روپ دھار لیں تو دل و دماغ ہی نہیں جسم بھی ماؤف ہونے لگتا ہے۔ میں اور اول خیر کم و بیش ایسی کیفیات سے دوچار تھے مگر یہ سب چند ثانیے کے لیے ہی ہوا تھا اور پھر یکلخت میرے خالی ہاتھ میں سیگار دو تھرکنے لگا۔ ایسے میں اول خیر کی سرسراتی آواز ابھری۔

''نہیں نکالے... مقابلہ نہیں... فرار... آؤ جلدی...'' یہ کہہ کر وہ پلٹا۔ میں اس کے عقب میں تھا۔ میرا خیال تھا، وہ تہ خانے کا رخ کرے گا اور وہاں بنی خفیہ سرنگ کے ذریعے نکلنے کی کوشش کرے گا مگر مجھے اس کی نیت کی بابت بھی یاد تھی کہ خفیہ سرنگ ہماری زندہ قبر بھی بن سکتی ہے کیونکہ نفر یا ایک کھو سپر لیمی اس سرنگ کا اختتام جس جگہ کھو... میں ہوتا تھا، کیا خبر وہاں گزرنے وقت نے مٹی بھاڑ کر اسے بند کر دیا ہو۔ میری طرح وقت سے پہلے اسے بھی کچھ باتوں کا اندازہ ہو چکا تھا کہ اب وہ خفیہ تہ خانہ... تخلی نہ رہا ہوگا۔

اول خیر نے چھت کا رخ کیا تو میں نے سکون کی سانس لی۔ ہم تا پختہ زینے طے کرتے ہوئے کھلی چھت پر آگئے۔ تاہم میں ابھی تک اس کی حکمت عملی سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ آخر کس راستے سے فرار ہونے کا ارادہ رکھتا ہے؟ یہ عمارت اس کی دیکھی بھالی تھی، اس لیے میں سردست اسے کوئی مشورہ دینے سے قاصر تھا۔ چھت پر بھی کاٹھ کباڑ اور ٹوٹے ہوئے آہنی تاروں اور جالیوں کے پنجرے بکھرے ہوئے تھے۔ ان میں قبذ کی ادھ کھلی بوریاں بھی تھیں اور دیگر الم غلم بھی تھا۔

معاً گاڑیوں کی آوازیں قریب آگئیں۔ جب تک مسلح دشمن عمارت میں داخل ہونے یا اسے گھیرے میں لینے کی کوشش کرتے، عمارت کی عقبی سمت کی پانچ فٹ اونچی منڈیر سے اول خیر نے نیچے چھلانگ لگا دی۔ آؤ، بکھانے تہ ذ میں نے بھی جست بھری۔ جہاں میں اول خیر کے بعد کودا تھا، وہ بھی کسی برآمدے کی نیچی چھت تھی۔

اسی وقت میری تنگی ہوئی سماعتوں سے خوفناک برسٹ کا سنسنی خیز تکرایا اور ساتھ ہی کربیہ چیخیں بھی سنائی دیں۔

''گئے وہ دونوں۔'' اول خیر نے ہانپتی آواز میں ان دونوں بدنصیب ساتھیوں کے انجام سے آگاہ کیا جو دشمنوں کی سنگ دلانہ بربریت کا شکار ہو چکے تھے۔

اول خیر نے نیچے جھانکا۔ بلندی بارہ تیرہ فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ سامنے مختصر میدان اور پھر زرد رو جھاڑیوں کے اختتامی سلسلے کے بعد کیکر کا جنگل سا نظر آتا تھا۔ وہ ابھی نیچے اترنے یا چھلانگ لگانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''نہیں اول خیر! اس طرح ہم دشمنوں کے لیے نرم چارا ثابت ہو سکتے ہیں۔ اب مقابلے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔''

ابھی میرے منہ سے فقط اتنے ہی الفاظ برآمد ہوئے تھے کہ ایک آواز پر ہم ٹھٹکے۔ ایک چوڑے ٹائروں والی بغیر ہڈ کی جیپ گولی کی رفتار سے عمارت کی شمالی دیوار کی آڑ سے نمودار ہوئی۔ شام کے ملگجے جھٹ پٹے میں مسلح جیپ سواروں کو شاید ہمارے ہیولے دکھائی دے گئے تھے کیونکہ اگلے ہی لمحے میں نے جیپ سے شعلے برستے دیکھے مگر ان سے پہلے ہی ہم غیر ارادی طور پر برآمدے کی طرف سے نکلی ہوئی اس مختصر عمارت کی ''چھتی'' پر لیٹ چکے تھے۔ چھتی کی صرف ایک یا ڈیڑھ فٹ کی اونچی منڈیر پر گولیوں کی خوفناک بوچھاڑ نے دیوار ادھیڑ دی اور ان گنت سنگ ریزے چیخ کر برچھیوں کی طرح ہمارے چہروں سے ٹکرائے۔ میرا دل سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا۔

اول خیر چھتی کے فرش پر پیٹ کے بل لیٹے لیٹے رینگ کر پلٹا اور ایک بڑے سے چوکور روشن دان کے قریب پہنچ کر ہاتھ کے ایک ہی دھکے سے اس کا چوبی تختہ توڑا اور پھر اندر غائب ہو گیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی اور پہلے اپنی دونوں ٹانگیں اندر داخل کر کے روشن دان کے خالی چوکھٹے کو پکڑ کر نیچے کود گیا۔

ایک بار پھر ہم دونوں عمارت کے اندر تھے اور کچھ پتا نہیں تھا کہ آنے والے سنگین لمحات میں یہ عمارت ہمارے لیے جو بے دال ثابت ہونے والی تھی یا پھر مقبرہ...

''کاکا! دشمن پندرہ بیس کی تعداد میں ہو سکتے ہیں۔'' اول خیر نے کہا

''اول خیر! ہمارے حوصلوں کے آگے ان کی تعداد کچھ نہیں... ان سب کو پولیس کی طرف سے گرین سگنل اور سرپرستی حاصل ہو چکی ہے... اب مرنا ہے یا مارنا ہے۔'' میں نے حتمی انداز میں کہا۔

''او خیر... پھر کیا پروا ہے۔'' وہ اپنے مخصوص بے پروایانہ لہجے میں بولا۔ دفعتاً ہمیں کمرے کے بغلی دروازے کی سمت دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ کچھ دشمن اس کمرے کی تلاش میں لپکے آرہے تھے۔ اول خیر نے اپنا پستول ہاتھ میں پکڑ لیا تھا اور سیگار دو میرے ہاتھ میں تھا۔ اسلحے کے نام پر ہمارے پاس فقط یہی دو ہتھیار تھے اور کچھ

فاضل راؤنڈز قمیص کے نیچے بندھی بیلٹ میں چسپاں تھے۔

ایک دھماکے سے دروازہ کھلا مگر تب تک ہم دونوں دائیں بائیں ہو کے کاٹھ کباڑ کی آڑ میں ہو چکے تھے۔ میری آتش اگلتی نظروں نے دروازے پر چار مسلح دشمنوں کو دیکھا جو طاقت کے زعم میں وراتے وار اندر داخل ہو چکے تھے اور دوسرے ہی لمحے ان پر بیک وقت دو سمتوں سے شعلے برساتی گولیاں لپکیں۔ دھماکوں سے کمرے کی محدود فضا تھرا گئی۔ چار میں سے دو تو فوراً کر گرے، باقی دو میں سے ایک زخمی ہو کے وقاع میں پلٹا جبکہ چوتھے کو شاید اپنے تینوں بدنصیب ساتھیوں کی ڈھال میسر آگئی تھی اور وہ دھماکوں کی آواز ابھرتے ہی کسی جنگلی بلی کی طرح لپک کر چوکھٹ کی آڑ میں ہو گیا۔ میں سب سے پہلے دشمنوں کے جدید ہتھیاروں پر قبضہ کرنا چاہتا تھا مگر بچ جانے والے ایک ساتھی نے میری اس سلسلے میں پیش قدمی کو روک دیا۔ زخمی ہو کر پلٹنے والے نمبر دو دشمن کو... اول خیر کے پستول کی گولی نے چاٹ لیا۔ گولی اس کی کمر پر لگی... اور اذیت ناک چیخ بہت واضح سنائی دی۔

میرے اور اول خیر کے درمیان کمرے کے سائز برابر ہی فاصلہ تھا البتہ ہم دونوں کا رخ آمنے سامنے تھا۔ میں نے اپنے ایک ہاتھ کے مخصوص اشارے سے اول خیر کو... دروازے کی چوکھٹ... کے پیچھے چھپے دشمن پر نظر رکھنے کو کہا اور خود پھرتی مگر محتاط روی سے دشمنوں کی دو لاشوں کی طرف بڑھنے لگا۔ میرا فاصلہ صرف چند فٹ رہ گیا تھا کہ دفعتاً اول خیر نے... بڑی عجیب اور جی دارانہ حرکت کر ڈالی۔ وہ کمرے کے دروازے کے رخ کے دائیں جانب گرا پھر لڑھکنیاں کھاتے ہوئے جیسے ہی اپنے گرنے کی جگہ تبدیل کی اس طرف چوتھے دشمن نے برسٹ مارا۔ کمرے کا فرش اس جگہ سے ادھڑ کر رہ گیا۔ میں اول خیر کی مستعد مگر خطرناک چالاکی پر بے اختیار دل ہی دل میں مسکرا اٹھا کیونکہ اگلے ہی لمحے فائر کرنے کے جوش میں آنے والے اس دشمن کی لرزہ خیز چیخ سنائی دی تھی۔ وہ اول خیر کی چالاکی اور گولی، دونوں کی زد میں آگیا تھا۔

وقت کی خطرناک نزاکت اور پیش قدمی کی اہم ضرورت کو شاید میری طرح اول خیر نے بھی محسوس کر لیا تھا یہی سبب تھا کہ وہ اپنی جان پر کھیل گیا تھا۔ میدان "صاف" ہوتے ہی میں ایک ہی جست میں دشمنوں کی لاش کے قریب پہنچا اور اسلحے کے نام پر جو بھی کچھ ملا وہ اپنے قبضے میں کر لیا۔

"کاکے...! باہر نکل... اس طرف سے۔" اے کے سینتالیس اسالٹ رائفل ہاتھ میں آتے ہی نہ صرف میرا بلکہ اس کا جوش اور حوصلہ بھی سوا ہو گیا۔

ابھی ہم نے کمرے کا دروازہ عبور کیا ہی تھا کہ درمیانے سائز کے ہال کمرے کی ایک کھلی کھڑکی سے ہم پر اندھے برسٹ نے آتشیں قہقہہ اگلا۔ زد پر اول خیر تھا مگر اس کی بیدار مغزی اور مستعدی نے شاید پہلے ہی خطرے کی بو پالی تھی، اس نے پہلے ہی پھرتی سے وہ جگہ چھوڑ دی تھی مگر بہر حال وہ جوابی فائرنگ کی پوزیشن میں نہ تھا اور جب تک اس پوزیشن پر آتا، اس پر دوسرا برسٹ بھی فائر کر دیا جاتا جبکہ مقابلتاً میں اس اندھے برسٹ کی جوابی کارروائی کی پوزیشن میں تھا۔ اے کے اسالٹ سینتالیس میرے ہاتھوں میں کھلونے کی طرح دبی ہوئی تھی، فوراً اس کا رخ کھڑکی کی طرف کر کے میں نے جوابی برسٹ آتشیں قہقہے کی صورت اگلا۔ اس اثنا میں اول خیر کو سنبھلنے کا موقع ملا اور اس نے مجھے دروازے کی طرف اشارہ کیا اور خود بھی دائیں جانب کے کاریڈور والے ایک دروازے کی طرف سرکا۔ مگر میں نے کھڑکی کی سمت محتاط پیش قدمی کی تو وہاں مجھے تین مسلح افراد دکھائی دے گئے جن میں سے دو کا رخ میرے محتاط اندازے کے مطابق اس طرف ہونا چاہیے تھا جہاں ہال کمرے کا دوسرا دروازہ تھا اس سمت پر ایک دوسرا کمرا تھا کھڑکی کے قریب میری جھلک دیکھتے ہی نمبر تین حملہ آور نے ذرا فاصلے سے ہی برسٹ مارا... یہ بھی ایک طرح سے اندھا فائر تھا کیونکہ میں اس کے نشانے پر نہ تھا، تاہم میں اس کی چالاکی بھانپ گیا۔ وہ اپنے دونوں مذکورہ ساتھیوں کو کمرے کے دروازے سے اندر داخل ہونے کا موقع دینا چاہتا تھا۔ اس کی چالاکی سمجھتے ہی میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، یک دم کھڑکی کے سامنے آکر اس پر اندھا دھند فائرنگ کر دی۔ اس کے قدم اکھڑ گئے اور وہ بوکھلا کر ایک طرف دوڑا مگر کھڑکی کے راستے میری برستی... گولیوں نے اسے جا لیا۔ وہ کربناک چیخ کے ساتھ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اندرونی کھڑکی پر آہنی گرلیں نہیں تھیں، میں اچھل کر کھڑکی پار کر گیا اور دوسری طرف کے گوشے کے فرش پر گرتے ہی میں نے ان دونوں مسلح حملہ آوروں کو دیکھا جو بری طرح بدکے ہوئے اس دروازے کے باہر موجود تھے جیسے فیصلہ نہ کر پا رہے ہوں کہ دروازے پر گولیاں برسائی جائیں یا پھر موت اگلتی کھڑکی کی طرف پیش قدمی

کی جائے۔ میں فرش پر لیٹا تھا اور وہ بھونچکا… صورتوں کے ساتھ کھڑے تھے۔ میرے جراتی جملے نے ان کی عقل خبط کر ڈالی تھی۔ وہ جب تک میری جانب متوجہ ہوتے، میں نے اپنی گن کا رخ ان کی جانب کرتے ہی لبلبی دبا دی۔ خودکار رشافنور رائفل میرے ہاتھ میں مہیب گرج کے ساتھ تھرتھرائی اور وہ دونوں کو لیوں سے چھلنی ہو کر گر پڑے۔ اول خیر نے غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دروازہ کھولا اور اس طرف آ گیا جہاں میں مزید دو دشمن حملہ آوروں کو جہنم واصل کر چکا تھا۔

یہ وہ کمرے چھوڑ کر تہ خانے والے کمرے کے رخ پر واقع تھا جس کے دائیں طرف ایک کوریڈور تھا۔ اول خیر نے اس سمت دوڑتے ہوئے مجھے بھی اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ تب تک میں پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ کوریڈور ویران تھا۔ ہم دونوں آگے بڑھتے ہوئے تہ خانے تک آ گئے۔ مگر یہ دیکھ کر میں اور اول خیر دونوں ہی حیرت زدہ رہ گئے کہ تہ خانے کا زینہ اور دروازہ اوپر کو اٹھا ہوا تھا گویا تہ خانہ ان کی نظروں میں پہلے سے آ چکا تھا۔

”اول خیر! بات سمجھ میں نہیں آئی… یہ تہ خانہ…“

”او… خیر کا کا…“ وہ میری بات کاٹ کر بولا۔

”میرے دل میں ابھرنے والا خطرہ غلط نہ تھا۔ جب وہ ابلیس صفت انسپکٹر روشن خان تلاشی لینے یہاں آیا تھا تو اسے شبہ ہو گیا ہوگا کہ یہاں ایک خفیہ تہ خانہ بھی ہے اور یقیناً ہم دونوں بھی اندر موجود ہوں گے۔“

”مگر…“ میں نے کہنا چاہا مگر وہ آگے بولتا رہا۔

”میری بات سنتا جا کا کا! انسپکٹر روشن خان شیطانی دماغ کا آدمی ہے۔ خالی کر مجھے گرفتار کرنا اس کا مقصد نہیں تھا۔ وہ مجھے مردہ دیکھنا چاہتا ہے۔ دشمن کی طرف سے اسے بھی ایک ٹاسک ملا ہوا ہے۔ بیگم صاحب کی خود یہاں موجودگی ہی اس بات کا سب سے بڑا ثبوت تھا کہ تو ادھر ہی موجود ہے۔ انسپکٹر مکاری سے دانستہ بیگم صاحب کے جھانسے میں آ گیا اور اپنی پولیس فورس سمیت بظاہر ناکام لوٹ گیا مگر لوٹتے ہی اس نے ممتاز خان کو فون پر سب بتا دیا ہوگا کہ اب وہ خود نمٹ لے۔“

اول خیر کے اس زرخیز تجزیے پر مجھے اس کی ذہانت کا معترف ہونا پڑا۔ یہ حقیقت بھی تھی کہ اس سے ملتا جلتا تجزیہ میرے بھی دل و دماغ کے نہاں خانے میں لاشعوری طور پر موجود تھا۔ جس کے باعث میں ایک بے نام سی الجھن میں مبتلا ہو گیا مگر میری چھٹی حس تب سے ہی مسلسل خطرے کا

الارم بجا رہی تھی۔

اول خیر نے پُر سکون انداز میں ایک دروازے کو ذرا کھولا اور اندر جھانکا۔ پھر مجھے اشارہ کیا۔ یہ اسٹور تھا۔ وہاں نسبتاً کم پاور کا بلب روشن تھا یہاں بڑے بڑے مین سوئچ کے الیکٹرک بورڈ نصب تھے۔ باہر رات اترنے لگی تھی۔ اول خیر نے ایک عقل مندی کا کام یہ کیا کہ سارے مین سوئچ آف کر دیے۔ یکلخت پوری عمارت تاریکی میں ڈوب گئی۔

”کا کا! اب یہ سب اندھے ہو گئے ہیں۔ عمارت کی بھول بھلیوں میں الجھ کر رہ جائیں گے۔ آ، میرے ساتھ۔“

اس نے کہا اور اسٹور روم سے باہر آ گیا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا کہیں میں بھٹک نہ جاؤں۔ اس نے سیل فون کی ٹارچ بھی آن کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی کیونکہ وہ اس عمارت کے چپے چپے سے واقف تھا۔ میں اور اول خیر اندازے سے تاریک ماحول کو ٹٹولتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ دفعتاً میرے چہرے سے خنک ہوا کا جھونکا ٹکرایا۔ جس کا مطلب تھا ہم عمارت کے کسی بیرونی گوشے کی طرف نکل آئے تھے۔ یہ کسی مختصر صحن کا برآمدہ تھا۔ اوپر تاروں بھرا آسمان تھا مگر حیرت کی بات تھی اس جانب کوئی دروازہ دکھائی نہ دیا تھا ہاں ایک تاریک چوکھٹ سے راستہ ضرور تھا۔ اول خیر مجھے لیے اسی سمت بڑھا۔ اندر پھر وہی گھپ تاریکی تھی اور ہوا کا دخل ندارد… اول خیر نے مجھے اندھیرے میں کھڑا کر دیا اور ہلنے جلنے سے منع کیا۔ بعد میں معلوم ہوا یہ کوئی گیراج تھا اور یہاں جابجا آہنی انجر پنجر بکھرے ہوئے تھے۔ صرف اول خیر بغیر روشنی کے تاریکی کو ٹٹولتا ہوا چند قدم آگے بڑھا تھا اس کے بعد میں نے دیکھا جیسے تاریکی کے بطن میں ہلکی روشنی کا چراغ جلا ہو۔ اول خیر نے کوئی دروازہ کھولا اور اس کی جھری بنا کر دوسری جانب دیکھنے لگا پھر وہ نصف حد تک دروازہ وا کیے باہر نکل گیا۔ چند ثانیوں بعد اس نے ہلکی آواز دے کر مجھے بلایا۔ میں بھی اندازے سے اسی سمت تاریکی میں آگے بڑھا۔ باہر تاروں کی مقدور بھر روشنی میں مجھے اول خیر پُراسرار ہیولے کے مانند کھڑا نظر آیا۔ جانے یہ عمارت کا کون سا بیرونی حصہ تھا جس کی دیوار کے ساتھ ہم دونوں دم بخود ہیولوں کی طرح کھڑے تھے۔

اچانک ایک ساعت شکن دھماکا ہوا۔ پوری عمارت جیسے لرز اٹھی۔ میں خود دری طرف ہل گیا۔ ابھی ہم ایک دھماکے سے سنبھل نہیں پائے تھے کہ دوسرا شدید دھماکا ہوا۔ پھر تیسرا… یہ دھماکا تو کہیں اس قدر اپنے قریب سنائی دیا تھا

کہ ہمیں بہ دیواریں گرتی محسوس ہوئی تھیں جس کی آڑ لیے ہم کھڑے تھے۔ تیز بہ دھماکا اس گیراج نما کمرے کی چھت پر ہوا تھا جہاں ہم تھوڑی دیر پہلے موجود تھے۔

”دشمن نے ہینڈ گرنیڈ پھینکنا شروع کر دیے ہیں۔“ مجھے اول خیر کی سرسراتی آواز سنائی دی۔ پھر اس نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا اور چلایا۔ ”بھاگ کاکے۔“ ہم دونوں سامنے کے رخ پر دوڑ پڑے۔ ہمارے عقب میں لرزہ خیز دھماکے ہو رہے تھے۔ کوئی پانچ یا چھ کے قریب دستی بموں کے دھماکے ہوئے تھے۔ دشمن شاید ہماری مضبوط گھات کے سامنے بے بس ہو گیا تھا۔ اور اسی لیے اس نے پوری عمارت کو ہی اڑا دینے کا منصوبہ کر لیا تھا۔ اگر اول خیر بروقت عمارت سے باہر نکلنے کی منصوبہ بندی نہ کرتا تو یقیناً ہم اس جلتی سلگتی عمارت کے تنور میں بھون دیے جاتے۔ عمارت کے جس خفیہ گوشے سے اول خیر مجھے لے باہر نکلا تھا، یہ دشمنوں کی نظر سے یا تو بچا ہوا تھا یا پھر اس طرف انہوں نے کوئی خاص توجہ نہ دی تھی مگر ہمارے عقب میں ذرا فاصلے پر عمارت چشم زدن میں آگ کی لپیٹ میں آ گئی تھی اور اس کی سلگتی ہوئی روشنی میں ہم دونوں ہی نہا گئے تھے اور یہی ہمارے لیے مصیبت بنی۔ آتش فشاں گولیوں کی بوچھاڑ خوفناک تڑتڑاہٹ کے ساتھ ہم پر برسنے لگی۔ ہم دونوں نے ہی دوڑتے ہوئے خود کو زمین پر گرا لیا تھا۔ گولیوں کی انشیں ”جھپک“ مجھے اپنے چہرے پر صاف محسوس ہوئی تھی۔

”کاکے! آگے بڑھتا رہ... رکنا مت۔“ مجھے اول خیر کی آواز سنائی دی۔ میں کہنیوں اور پیٹ کے بل جتنی تیزی سے آگے بڑھ سکتا تھا، بڑھنے لگا۔ گولیوں کی خوفناک تڑتڑاہٹ کے دوران مجھے عقب میں کئی تیز چیختی ہوئی آوازیں بھی سنائی دی تھیں۔ یقیناً دشمن اس بات سے باخبر ہو گئے تھے کہ ہم دونوں عمارت سے صحیح سلامت باہر نکلنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ یہ ہمارے حق میں اچھا ثابت نہ ہوا تھا... بصورت دیگر... خاموشی سے فرار ہونے کا یہ اچھا موقع ہمارے ہاتھ لگا تھا کیونکہ دشمن یہی سمجھتا رہتا کہ ہم عمارت کے اندر محبوس ہو کر بے بسی سے اپنی موت کے منتظر ہیں مگر اب دوبارہ دشمن ہمارے تعاقب میں لگ چکے تھے۔ ان کی تعداد اب بھی زیادہ تھی، گاڑیاں بھی تھیں ان کے پاس جبکہ میں اور اول خیر عمارت سے باہر بے یار و مددگار تھے۔ زندگی کے تعاقب میں ایک بار پھر موت... کا فاصلہ گھٹتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

اس خوں ریز کشاکش کے دوران میں رات پوری طرح اتر چکی تھی۔ اس کی تاریک چادر نے اگرچہ ہمیں ڈھانپ رکھا تھا لیکن بدقسمتی سے ہم پہلے ہی دشمنوں کی نظروں میں آچکے تھے۔ وہ ہم پر مختلف سمتوں سے گولیوں کی بوچھاڑ کر رہے تھے جبکہ میں اور اول خیر خود کو زمین پر گرا بچکے تھے ہمیں سامنے کچھ فاصلے پر پہلے کیکر کے جنگل میں داخل ہونا تھا۔

یکلخت فائرنگ کا سلسلہ تھم گیا اور ہمیں مزید آگے سرکنے کا موقع مل گیا۔ ہمارے عقب سے جیسے روشنی کا سیلاب امڈ پڑا۔ دشمن اپنی گاڑیوں میں ہمارے تعاقب میں آرہے تھے۔ اول خیر اٹھ کر دوڑ پڑا تو میں نے بھی بے اختیار اس کی تقلید کر ڈالی۔ ہم آگے پیچھے اندھادھند دوڑنے لگے۔ یہاں بھی میں نے اول خیر کی پیش قدمی کی حرکت کو نوٹ کیا۔ گویا وہ اس جنگل کے گمنام راستوں سے اچھی طرح واقف تھا اور شاید کسی خاص مقام پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جنگل میں پھیلی ندا آدم جھاڑیوں اور سیدھے تنوں والے پیڑوں نے ہمیں کسی حد تک آڑ فراہم کر دی تھی مگر ایسا زیادہ دیر تک ممکن نہیں ہوسکتا تھا، ہمارا جلد سے جلد کسی محفوظ مقام پر پہنچ جانا بے حد ضروری تھا۔

میرا خیال درست ثابت ہوا، جلد ہی ہم ایک مختصری کھنڈر نما عمارت کے اندر داخل ہو چکے تھے۔ ہماری سانس بری طرح پھولی ہوئی تھی اور ایک دوسرے سے بات کرنا دوبھر ہو رہا تھا۔

''بس کاکے... اب اس سے زیادہ ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔'' اول خیر نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بمشکل کہا۔

''مگر یہ محفوظ مقام نہیں ہے ہمیں پیش قدمی جاری رکھنا ہوگی... یہاں ایک ہی دستی بم کافی ہوگا۔'' میری بات کا جواب اول خیر کے پاس نہ تھا۔ اس کی خاموشی میں شکست خوردگی اور مایوسی جھلکتی محسوس ہوئی تھی۔ اور تب میرے ذہن میں اچانک ایک خیال آیا... یہ ایک تلخ حقیقت تھی۔ بے رحم موت ہمارے تعاقب میں تھی بلکہ بہت قریب بھی... گاڑیوں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں اور کسی وقت بھی ان ہیڈلائٹس میں یہ عمارت آشکار ہو سکتی تھی۔ اس کے بعد دشمنوں کا مقصد ہرگز ہمیں پکڑنا یا پکڑ کے لے جانا نہیں تھا۔ انہیں تو ہمیں بالخصوص مجھے دیکھتے ہی موت کے گھاٹ اتار دینا تھا۔

''اول خیر! ہمیں اس عمارت سے باہر نکلنا ہوگا۔''

میں نے کہا۔

''او خیر کاکے!'' وہ بولا تو اس کے لہجے میں مایوسی نہ تھی۔ ایسے حالات میں بھی اس کی جی داری کم نہ ہوئی تھی۔ وہ آگے بولا۔ ''ادھر کچھ دشمنوں کو پھڑکا کر مرنا بہتر ہے۔ تیرا اور میرا زندگی کا ساتھ بس اتنا ہی تھا۔''

ایسے میں مجھے مرشد بابا کے اطفال گھر میں کہے ہوئے الفاظ یاد آنے لگے۔ ''شہزی بیٹا! انسان کچھ تو بہ ایک سادہ سا فلسفۂ زندگی ہے کہ زندگی اور موت صرف اللہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے زندگی سے کبھی مایوس مت ہونا۔ چاہے موت چند قدموں یا کچھ ساعتوں کے فاصلے پر ہی کیوں نہ کھڑی ہو جو مایوسی جیسے کفر کو جھٹلا کر موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آخری حد تک نبرد آزما رہتے ہیں تو وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور اس کے اٹل احکامات پر پورا بھروسا رکھتے ہیں... یہی ایمان کی پہلی منزل انسان کو اللہ کی پناہ میں لے آتی ہے۔ پھر چاہے یہ دنیاوی ہو یا اخروی... وہ بندے کا مقدر کہلاتی ہے۔''

''اول خیر! اب جیسا میں کہوں... ویسا ہی کرنا ہے۔'' معاً میرے منہ سے تحکم آمیز الفاظ برآمد ہوئے۔ میں تاریکی میں اس کے چہرے کا صحیح طرح جائزہ لینے سے تو قاصر ہی تھا مگر مجھے یقین تھا میرے عجب لہجے اور سرائی آواز پر وہ چونکا ضرور ہوگا۔

بالآخر دشمنوں کی تینوں گاڑیاں عمارت کے قریب آکر یک دم رک گئیں۔ مگر اس طرح کہ ہر گاڑی نے عمارت کا ایک حصہ گھیر رکھا تھا۔ تین مختلف سمتوں سے عمارت کا گھیراؤ ظاہر کرتا تھا کہ انہیں ہماری اندر موجودگی کا پورا یقین تھا جیسا کہ ہمیں بھی اندازہ تھا۔

عمارت کا رقبہ مختصر ہونے کے باعث ان کی تینوں گاڑیوں کا درمیانی فاصلہ بھی زیادہ نہ تھا۔ میری تیز نظریں بڑی مشاقی سے ان کی پوزیشن کا جائزہ لے رہی تھیں۔ گاڑیوں سے ہتھیار بردار دشمن نیچے اتر چکے تھے اور تب میں نے ایک نسبتاً موٹے ٹھگنے شخص کو دیکھا اور اس کی جیب میں سر پر منڈلاتے خطرے کو فراموش کر گیا۔ یہ جنگی خان تھا۔ وہی جنگی خان جس نے عابدہ کو اغوا کرنے کا ناقابل معافی جرم کیا تھا اور اس وقت میرے ہاتھوں سے بچ نکلا تھا جب اس کے اڈے پر میں نے اشرف کو اس کی نظروں کے سامنے جہنم واصل کیا تھا۔ اس وقت وہی اپنے ساتھیوں کو ''لیڈ'' کر رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔

"دستی بم پھینکو۔" معاً اس کی غراتی آواز رات کے سناٹے میں ناٹیوں کی گھرر گھرر کرنے شور میں ابھری۔

اس آواز میں نفرت اور جوشِ انتقام کا غضب ناک طوفان جھلکتا محسوس ہوتا تھا۔

وہ سب گاڑیوں کے عقب میں پوزیشن سنبھالے ہوئے تھے اور پھر تین افراد کی ٹولیوں میں سے ایک ایک فرد نے دستی بم ہاتھ میں لے کر پن نکال کر بولنگ کرنے کے انداز میں بیک وقت تین بم عمارت کی جانب اچھال دیے۔ ساعت شکن دھماکوں سے آس پاس کا ماحول تک لرز اٹھا اور عمارت کے اندر سے شعلے اور دھوئیں کا رقصِ اجل شروع ہو گیا۔ دستی بم پھینکنے کے چند ثانیوں بعد ہی جنگی خان کی گرجتی آواز ابھری جو مجھے للکار سے مشابہ لگی۔

"آگے بڑھو... اور ان دونوں کو بھون کر رکھ دو۔"

اس حکم کی فوراً تعمیل کے لیے کل چھ مسلح دشمن بیک وقت عمارت کی طرف لپکے۔

دشمن کے سر پر پہنچنے سے صرف چند لمحات قبل عین آخری وقت پر میرے ذہن میں ایک خیال ابھرا تھا کہ ان جنگل میں اس عمارت کو دیکھتے ہی دشمن کا لامحالہ یہ سمجھنا کہ ہم نے پناہ کے لیے یقیناً ادھر کا ہی رخ کیا ہوگا۔ اور یوں ان کی ساری توجہ کا اس کھنڈر نما عمارت کی طرف مبذول ہونا یقینی امر تھا اور کوئی خیال یا شبہ سرپرست ان کے دل و دماغ سے کوسوں دور رہتا۔ لہٰذا میں نے اول خیر سمیت فوراً حرکت کی اور اسے مختصر ترین لفظوں میں اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ اس کے بعد ہم دونوں ہی عمارت سے نکل کر دو مخالف سمتوں میں ذرا فاصلے پر قدِ آدم جھاڑیوں میں چھپتے اور کپنیوں کے بل جا رکے۔

دشمنوں کے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ جہاں وہ ہماری موت کا سامان کر رہے تھے، خود ان کی موت محض چند فٹ کے فاصلے پر انہیں نگلنے کو تیار ہے۔

مجھے چند فٹ کے فاصلے پر گاڑی کے موٹے ٹائر اور ان کے ساتھ کھڑے دشمنوں کی ٹانگیں نظر آ رہی تھیں۔ یقیناً... دوسری سمت پر اول خیر کی بھی یہی پوزیشن ہوگی اور اس نے اب کیا کرنا تھا، یہ میں اسے پہلے ہی سمجھا چکا تھا۔

دشمنوں کی تعداد تقسیم ہوئی۔ اب جنگی خان کے ہمراہ صرف دو افراد تھے۔ باقی دو ٹولیوں میں محض ایک ایک آدمی تھا۔ باقی چھ افراد کھنڈر عمارت کی جانب جا چکے تھے۔ اور اس سے پہلے پولٹری فارم کی عمارت میں چھ سے آٹھ دشمن ہمارے ہاتھوں ہلاک ہو چکے تھے۔ میں نے سب سے پہلے حرکت کی۔ میری طرف والی ٹولی میں صرف ایک دشمن بظاہر چوکس انداز میں کھڑا تھا۔ میں... آواز اس کے قریب سے رینگتا ہوا جیپ کے نیچے سے ہوتا ڈرائیونگ سیٹ کے رخ پر آ گیا۔ میرا سو فیصد اندازہ تھا کہ چابی اگنیشن سوئچ میں لگی ہوگی اور ایسا ہی ہوا۔ جیپ بغیر بند کی تھی۔ میں نے ذرا سر ابھارا اور میری آنکھوں میں چمک لہرا گئی۔ جیپ کے پچھلے کھلے حصے میں دو بھاری رائفلیں اور کچھ کریکر بم رکھے ہوئے تھے۔ میں گریا سانس روکے جیپ کی ڈرائیونگ کے قریب آ چکا تھا اور یہاں بونٹ کے دائیں جانب مجھے حسبِ توقع صرف ایک دشمن سامنے کھڑا نظر آ رہا تھا جس کا رخ کھنڈر عمارت کی طرف تھا۔ اس وقت ان سب کی توجہ اپنے ان چھ مسلح ساتھیوں پر مرکوز تھی جو دھواں اگلتی عمارت کے اندر ہماری "متوقع" تلاش میں بڑھ چکے تھے۔ جیپ بغیر چھت کے ہونے کی وجہ سے اس کا دروازہ نہ تھا۔ محض نصف دروازے کا خلا تھا۔ میں اس خلا سے ذرا ابھر کر پائیدان تک آیا اور پھر اگلی دونوں سیٹوں کے درمیان سے سانپ کی طرح رینگتے ہوئے عقبی حصے میں آ گیا۔ اب سب کچھ بہت تیزی کے ساتھ عمل کرنے کا متقاضی تھا۔

میں نے دو کریکر بم اٹھا لیے۔ ایک پوری قوت سے اس لینڈ کروزر کی طرف اچھال دیا جہاں جنگی خان اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ موجود تھا۔ دھماکا ہوا اور مجھے ان کی چیخیں سنائی دیں۔ اسی وقت گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ یہ اول خیر کی طرف سے "کارِ خیر" ہوا تھا۔ میری طرف کا دشمن بری طرح بوکھلایا۔ میں تب تک دوسرا کریکر بھی پھینک چکا تھا۔ پھر پھرتی سے جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ اسٹارٹ کرنے کے عمل سے لے کر اسے تیزی سے حرکت میں لانے کا دورانیہ صرف چند سیکنڈوں پر محیط تھا۔

دوسرے کریکر نے لینڈ کروزر کو نقصان پہنچایا تھا۔ عمارت کی طرف سے فائرنگ ہوئی تھی۔ اندر موجود دشمن خطرہ بھانپتے ہی پلٹے تھے مگر تب تک انہیں دیر ہو چکی تھی۔ میں نے جیپ کا اسٹیئرنگ کاٹا اور تیزی سے یوٹرن لیا۔ اسی اثنا میں تاریکی سے ایک ہیولے نے میری جیپ پر جست لگائی۔ یہ اول خیر تھا۔ اس کے سوار ہوتے ہی میں جیپ کا ایکسلریٹر دباتا چلا گیا۔ جیپ کا انجن طاقتور تھا اور ٹائر چوڑے۔ رسّی چھوٹتے ہی جیپ غراتی ہوئی تیزی سے دوڑنے لگی۔

"اوخیر... کاکا جی... روکے جیو۔" اول خیر میرے برابر کی سیٹ پر سنبھل کر بیٹھتے ہی خوشی سے چیخا۔

"تم نے دوسری جیپ کے ٹائر برسٹ کر دیے تھے؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"ہاں کاکا! آخری بوسٹ میں نے ان کے پچھلے ٹائروں پر کیا تھا۔" وہ خوشی سے بولا۔ "تو نے استادوں کا استاد نکلا دے کاکے... جسم سولا کی... مان گئے تجھے۔"

"اول خیر! گاڑی تم چلاؤ... مجھے راستوں کا علم نہیں۔" میں نے کہا اور ان خطرے کے مقام سے کافی آگے جا کر ہم نے سیٹیں بدل ڈالیں۔ ہم گویا دشمنوں کی ناک کے نیچے سے نکل جانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ایک خوں ریز معرکہ سر کیا تھا ہم نے اپنی زندگی کا گویا... یہ بڑا جوا کھیلا تھا ہم نے۔ ہمت ہماری تھی اور مدد خدا کی تھی۔ ہم کامیاب ہوئے تھے، اب وقت کی ڈور ہمارے ہاتھ میں تھی۔ پیچھے دشمن ہمارا تعاقب کرنے سے قاصر تھے کیونکہ ان کی دونوں گاڑیاں ہم نے ناکارہ بنا دی تھیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس مرتبہ کریکر بم پھینکنے کے بعد جنگل خان کا کیا حشر ہوا ہوگا مگر اندازہ تھا، وہ اگر مرا نہیں تو شاید زخمی ضرور ہوا ہوگا۔ میرے اعصاب شل تھے اور دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ مصیبت کی گھڑی سے نکلتے ہی اس طرح کا احساس کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ سکون کی حالت میں ذہن بھی کچھ دیر کو گم سا رہ جاتا ہے۔ یہ بالکل اسی طرح کی کیفیات ہوتی ہیں جیسے جسم میں لگنے والی تازہ چوٹ کا بعد میں زیادہ درد محسوس ہوتا ہے۔ اگلے چند منٹوں میں ہم اس مختصر سے کیکر کے جنگل سے باہر تھے۔

سامنے پختہ سڑک تھی۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ اول خیر کہاں کا رخ کرتا۔ تاہم میرے استفسار پر وہ جیپ کو تیزی سے پختہ سڑک پر لاتے ہوئے جواباً بولا۔

"کاکے! ابھی کچھ پتا نہیں... کسی جگہ ٹھہر کر بیگم صاحبہ سے بات کرتے ہیں۔"

حالات کی کشاکش نے مجھے پچھلے کئی گھنٹے سے اس طرح جکڑ رکھا تھا کہ میں عابدہ سے بھی بات نہیں کر سکا۔ اس کا خیال آتے ہی میرا دل بوجھل سا ہونے لگا۔ وہ عارفہ کے ساتھ امریکا روانہ ہونے والی تھی جس وقت اس نے مجھ سے فون پر بات کی تھی، اس وقت فلائٹ کنفرم نہیں تھی، تاہم یہ اس نے ضرور بتایا تھا کہ آج بالکل سیٹ کنفرم ہوتے ہی وہ روانہ ہو جائے گی۔ کوئی اپنا جسم و جاں سے پیارا نفس ایک شہر سے دوسرے شہر جاتا ہے تو دل و دماغ کی کیا حالت ہونے لگتی ہے۔ عابدہ تو میری رگِ جاں میں دوڑتے لہو کی گردش تھی۔ وہ دوسرے شہر نہیں بلکہ دوسرے ملک جا رہی تھی۔ کئی ہزاروں لاکھوں میل دور... نجانے کتنے بحرِ اعظم کتنے نخلستان، سمندر، بحر بیکراں کے اس پار... امریکا... میرا دل کٹ رہا تھا۔

دوہرا عذاب جاں تو یہ تھا کہ میں اس کو سی آف کرنے کے لیے ایئرپورٹ بھی نہیں جا سکتا تھا۔ پھر وہ تو بھی مجھ سے ایسے حالات میں جدا ہو رہی تھی کہ میرا اپنا مستقبل غیر یقینی تھا۔ دشمن اور پولیس میرے تعاقب میں تھے اور میں بے رحم موت کی ایک جھلک سے بچنے کی تگ و دو میں تھا۔ ایسے حالات میں عابدہ کا مجھ سے کوسوں دور جانا مجھ سے زیادہ اس بےچاری کے لیے جاں گسل تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو ایسے حالات میں وہ مجھے چھوڑ کر نہ جاتی۔ لیکن حالات کی مجبوری ایسی تھی کہ ہم پر کچھ صلۂ رحمی کے فرائض بھی عائد تھے۔

عارفہ، سرمد بابا کے مرحوم بیٹے کی بیوی تھی...... یہ وہی عورت تھی جس نے اپنے شوہر کو ہی نہیں ایک بیٹے کو بھی اپنے قابو میں کر رکھا تھا اور پھر اس بیٹے (اپنے شوہر) کے ذریعے اپنے بوڑھے سسر سیٹھ منظور وڑائچ کو سرمد بابا بنا کر اللہ باؤس میں لاوارثوں کی طرح پھنکوا دیا تھا مگر بعد میں وہ خود بھی مکافاتِ عمل سے نہیں بچ پائی۔ ادھر اس کا شوہر (سرمد بابا کے بیٹے) کا کار ایکسیڈنٹ میں اچانک انتقال ہوا تو دوسری طرف ڈاکٹروں نے عارفہ کی بیماری سے متعلق اذیت ناک انکشاف کیا کہ اس کا جگر ناکارہ ہو چکا ہے... بس... تقدیر نے پلٹا کھایا۔ سرمد بابا ایک پھر سیٹھ منظور کہلائے... عارفہ کو اپنی بیماری، اس کا علاج، وہ بچے، کاروبار یہ سب اکیلے سنبھالنا ناممکن نظر آیا اور وہ اولڈ ہوم (دارالحفاظ) آ کر بابا سے معافی تلافی کر کے اپنے ہمراہ لے گئی۔

سرمد بابا بھی بڑے دل کے آدمی تھے عفو و درگزر کی تفسیر تھے وہ اپنے مرحوم بیٹے کی ناگہانی موت پر آنسو بہاتے اپنی نادان بیوہ بہو کا اور دو پوتے پوتی کا سہارا بننے کے لیے چل رہے... مرد، مرد ہوتا ہے۔ بوڑھا ہو تو بھی شیر ہوتا ہے۔ سرمد بابا بوڑھے... مگر شیر تھے۔ انہوں نے سرمد بابا سے ایک بار پھر سیٹھ منظور وڑائچ بن کر سب کچھ سنبھال لیا۔ یہاں تک کہ اب وہ عارفہ کو علاج کی خاطر امریکا بھیج رہے تھے۔

"کاکا! تو کدھر کھو گیا؟" دفعتاً میں اول خیر کی آواز پر چونکا اور خیالات کے بھنور سے ابھرا تو اپنے گرد ویران تاریک ماحول پایا۔ اول خیر نے غالباً جیپ پختہ سڑک سے

کہیں کچے میں اتار کر قدرے محفوظ جگہ پر روک دی تھی۔ احتیاط کے پیش نظر اس نے ہیڈ لائٹس گل کر دی تھیں۔ انجن بھی بند کر رکھا تھا۔ اوپر کھلے آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ آخر راتوں کا پھیکا چاند دور کہیں جھکا ہوا تھا۔ چاروں اطراف مدہم، نیم تاریک ویرانہ تھا۔ کہیں سے گیدڑوں کے بولنے کی آواز آجاتی تھی۔ تاروں کی نیم روشنی میں ہمارے اردگرد خشک جھاڑیوں، ٹیلوں کی جھلک تھی۔

اول خیر نے اپنا سیل فون نکالا اور میں نے بھی یہی کیا۔ فی زمانہ اس سہولت نے فوری رابطہ اور کسی بھی جگہ رابطہ کا جو توڑ نکالا تھا، اس نے معیار زندگی ہی نہیں بدلا تھا بلکہ دل و دماغ اور جذبات، سوچوں اور خیالات کی ہر سمت ایکسرسائز کا بھی باعث بنا تھا جس کا ثبوت اسکرین پر آئی ہوئی ان گنت ''مس کالز'' کو دیکھ کر میرے دل کی تیز ہوتی دھڑکنیں تھیں۔ میرے سیل فون پر عابدہ سمیت کئی لوگوں کی مس کالز چمک رہی تھیں۔ کچھ ایس ایم ایس بھی تھے۔ میں نے سب سے پہلے ایس ایم ایس چیک کیے۔ ان میں عابدہ کا ایس ایم ایس سب سے پہلے پڑھا اور جیسے جیسے پڑھتا گیا میرا دل بیٹھتا چلا گیا۔

عابدہ... میری کال کا... میری آواز کا... اس جدائی کی جاں گسل گھڑیوں کی درد انگیزی کے دارفتہ اظہار کا... انتظار کر کے... بالآخر حسرت و یاس اور مجبور و آس کا اپنے سینے پر بھاری پتھر رکھ کر مجھ سے کوسوں دور... امریکا جا چکی تھی۔ میری دھڑکتی سانسوں کی ڈور الجھنے لگی۔ اس نے مجھے ایس ایم ایس کیا تھا کہ وہ میرے فون کا اور مجھ سے بات کرنے کا انتظار کرتی رہی... بالآخر ناکام ہو کر وہ طیارے میں سوار ہو گئی تھی۔ اس نے میرے لیے بہت دعائیں کی تھیں، میرے حالات سنورنے کی... میری لمبی عمر کی... اور دوبارہ ملن کی... اسے اندازہ تھا کہ میں کن حالات کا شکار ہوں اس لیے اس نے کوئی شکوہ نہ کیا تھا۔ تاہم اس نے بہت جلد مجھ سے دوبارہ نیلی فونک رابطہ اور سردار بابا کے توسط سے اپنی خیریت و خیر و خبر دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کی مس کال بھی آئی ہوئی تھی۔ اب اسے کال کرنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ میں نے اپنے...... اللہ بڑے ول کے غبار پر قابو پانے کی کوشش چاہی۔ ایک کال سردار بابا کی تھی، بیگم صاحبہ اور آسیہ کے علاوہ... نذیر خان کی بھی مس کال درج تھی۔

اول خیر نے مجھ سے کہا۔ ''بیگم صاحبہ سے پہلے بات کرو۔'' میں اس کا اشارہ سمجھ گیا۔ اور اپنے سیل فون سے بیگم صاحبہ سے رابطہ کیا تو دوسری جانب سے ان کی خوابیدہ سی آواز ابھری۔

''کیا ہوا... شہزور؟ تم لوگ فون ہی ریسیو نہیں کر رہے ہو۔ خیر بیت سے تو ہو؟''

''اول خیر'' سے ان کی مراد میں اور اول خیر ہی تھے۔ میں نے مختصر الفاظ میں اب تک کی ساری روداد کہہ سنائی تو وہ انہیں انگار کر رہا تو دوسری جانب مکمل سناٹا طاری رہا۔ جیسے یہ اطلاع ان کی توقع کے برخلاف تھی۔ پھر چند پل خاموشی کے اسی طرح گزر گئے تو ان کی دوبارہ آواز ابھری۔

''اس وقت تم دونوں کہاں ہو؟''

''اسی علاقے کے ایک تاریک ویرانے میں ہیں اور دشمنوں کی جیپ ہمارے قبضے میں ہے۔''

''یہ سب اچھا نہیں کیا ممتاز خان نے... اس رذیل پولیس انسپکٹر روشن خان سے تو میں نمٹ لوں گی... تم ایک کام کرو شہزور! کسی طرح بیگم ولا پہنچنے کی کوشش کرو۔'' مجھے بیگم صاحبہ کی اس بچکانا بات پر حیرت ہوئی۔ شاید ان حالات نے ان کا دماغ بھی ماؤف کر ڈالا تھا۔

''شاید آپ نے اب تک کے حالات کی خطرناکی کا ٹھیک طرح اندازہ نہیں لگایا بیگم صاحبہ!'' میں نے پرمتانت لہجے سے کہا۔ ''ان حالات کے تانے بانے آپ کی رہائش گاہ بیگم ولا سے ہی جڑے ہوئے تھے۔ آپ کی پولٹری فارم والے ٹھکانے پر آمد نے اس ٹھکانے کو خفیہ نہیں رہنے دیا اور پولیس سمیت دشمن آپ کا تعاقب کرتے ہوئے وہاں آن پہنچے۔ انسپکٹر روشن کو عمارت کی تلاشی کے دوران ہی اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ ان کا شکار (یعنی میں) اس عمارت میں موجود ہے۔ یہی نہیں اسے خفیہ خانے کا بھی پتا چل گیا تھا مگر چونکہ اس کا ارادہ مجھے گرفتار کرنے کا سرے سے تھا ہی نہیں، لہٰذا وہ مکارانہ خاموشی اختیار کیے... بظاہر ناکام لوٹ گیا... مگر جاتے ہوئے اس نے اپنے راب تو از چودھری ممتاز خان کو مطلع کر دیا کہ اس کا شکار عمارت کے اندر ہی موجود ہے۔ لہٰذا اور اپنے مسلح آدمی روانہ کر کے... اس قبضے کو گرفتاری کی نوبت آنے سے پہلے ہی نمٹا رہے کیونکہ ممتاز خان کو میری گرفتاری نہیں میری موت مقصود تھی۔ اب یہ میری چھٹی حس تھی جو مجھے ایسے کسی انجانے خطرے کا بار بار احساس دلا رہی تھی۔ کیونکہ آپ کا فوراً وہاں پہنچنا شاطر انسپکٹر روشن خان کے لیے بڑے روشن کا باعث بنا تھا کہ آپ یقیناً اپنے اس خفیہ ٹھکانے پر مجھ سے ہی ملنے یا میری مدد کی خاطر ہی وہاں پہنچی تھیں۔ یہ سوچ کر مجھے

وقت سے پہلے محتاط ہونا پڑا۔ اگر ہم نہ خانے میں بیٹھے اس خوش فہمی میں مبتلا رہتے کہ اب خطرہ ٹل گیا تو بے موت مارے جاتے۔ چنانچہ آپ لوگوں کے جانے کے تھوڑی دیر بعد میں اور اول خیر نہ خانے سے نکل کر کسی ممکنہ خطرے کے پیش نظر... عمارت کی کھڑکی سے باہر جھانکتے رہے تھے اور تب ہی ہمیں پولیس کے آدمی... وہاں سے خاموشی کے ساتھ کھسکتے ہوئے دکھائی دیے، جنہیں انسپکٹر روشن نے جاتے وقت ان چند پولیس والوں کو شاید اس لیے وہاں متعین کر رکھا ہو گا کہ اس کے کارندے ہی کہیں ہم اس عمارت سے فرار ہونے کی کوشش نہ کر سکیں... جب تک ممتاز خان کے مسلح آدمی وہاں نہیں پہنچ جاتے اور روشنی ہوا انہیں تھوڑی دیر بعد ہی دانستہ وہاں سے کھسک جانے کا حکم ملا... اس کے محض چند سیکنڈوں بعد ہی مسلح حملہ آوروں نے عمارت پر بلا بول دیا۔"

بیگم صاحبہ کو مختصراً صراحت کے ساتھ یہ سب بتانا ضروری تھا۔ یہ سب سن کر دنگ سی ہو گئیں پھر بولیں۔ "شہزی! تم واقعی بہت پہنچی ہوئی شے ہو۔ تمہاری ذہنی فراست اور حالات کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت بہت بلند ہے۔ میری اک ذرا سی غفلت کی وجہ سے تم بال بال موت کے منہ میں جانے سے بچے ہو۔ میں پھر یہی کہوں گی کہ یہ تمہاری غیر معمولی درست قیافہ شناسی اور محتاط روی تھی کہ تمہیں وقت سے پہلے بہت سی باتوں کا اندازہ ہو گیا اور تم محتاط ہو گئے۔"

"اس کے باوجود آپ مجھے بیگم ولا بلانے پر بضد ہیں؟" میں نے کہا۔

"لیکن پھر تم اور کدھر جاؤ گے شہزی!" وہ پریشان ہو کے بولیں۔ "ممتاز خان اپنے بیٹے کی اس حادثاتی موت پر پاگل ہو رہا ہے اور تمہارے خون کا پیاسا بھی۔ اپنے بیٹے کی موت کا ذمے دار وہ تمہیں ہی سمجھ رہا ہے اور اب مجھ سے بھی کوئی رعایت نہیں برتے گا۔ حالانکہ اپنے بھتیجے کی موت کا مجھے بھی از حد دکھ ہے۔ وہ میرے ہاتھوں میں کھیلا ہوا تھا مگر..." ان کی آواز بھرا گئی اور وہ اپنا جملہ بھی پورا نہ کر سکیں۔ ایک مردم شناس، مضبوط اعصاب اور ارادوں کی مالک جیسے دار عورت کو میں نے پہلے کبھی یوں آزردہ ہوتے نہ دیکھا تھا۔ بے شک حالات اور وقت کی تیز دھوپ نے انہیں سخت بنا رکھا تھا مگر ان کے اندر ایک نرم خو اور رقیق مزاج عورت کا دل بھی دھڑکتا تھا۔ میں ان سے کچھ کہنا چاہتا تھا کہ وہ دوبارہ ذرا سنبھلنے کے بعد فوراً بول پڑیں۔

"تمہیں شاید نہیں پتا شہزی! اپنے چھوٹے بھائی فرخ پر غلطی سے گولی چلانے کے بعد نوشابہ کی اپنی حالت بھی ابھی تک غیر ہے اسپتال میں بستر پر ہے اور پاگل پن کے دورے پڑ رہے ہیں۔ بھائی بہن کی دشمنی میں اس حد تک بڑھ جانے کا میں نے کبھی نہیں سوچا تھا... یہ بات ممتاز خان بھی جانتا تھا لیکن اب... وہ یہی سمجھ رہا ہے کہ میں نے تمہارے ذریعے فرخ کو مروانے کی انتقاماً کوشش کی تھی۔"

"انتقاماً؟" میں استفساریہ بڑبڑایا۔

"ہاں ممتاز خان نے لطیف شاہ کو مروایا تھا۔" وہ جیسے اپنی دھن میں اپنی رو میں کہہ گئیں۔

"لطیف شاہ؟ یہ... یہ... کون تھا بیگم صاحبہ؟ کیا آپ کا شوہر... معافی چاہتا ہوں۔" میں بھی رو اور وہ میں نجانے کیا کہہ گیا تھا۔

"آہ... مت پوچھو یہ سب شہزی! ایک بڑی خوں ریز داستان ہے یہ..." دوسری جانب سے بیگم صاحبہ کی بڑی درد انگیز اور کرب میں ڈوبی آواز ابھری۔ "تم ایسا کرو... شہزی! ملتان سے کہیں باہر نکل جاؤ بلکہ اس صوبے سے ہی نکل جاؤ... سندھ یا بلوچستان کی طرف کوچ کر جاؤ... تب تک یہاں کے حالات سنبھالنے اور اپنے اور تمہارے حق میں کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔"

"بیگم صاحبہ! میں تھوڑی دیر کے لیے رابطہ منقطع کرتا ہوں۔ میں اور اول خیر آپس میں کچھ سوچ لیں پھر آپ کو آگاہ کرتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

"اوخیر... کاکے... بیگم صاحبہ نے تجھے آخر کار لطیف شاہ کے بارے میں بتا دیا؟" مجھے اول خیر کی دھیمی آواز سنائی دی۔ تاریکی میں ہم دونوں کے چہرے محض ہیولوں کی صورت نظر آ رہے تھے۔ قریب ہی کوئی گیدڑ زور سے چیخ کر بھاگا۔ ایک لمحے کو میرا دل زور سے دھڑکا۔ اول خیر نے سب سن لیا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"یار! یہ لطیف شاہ کون تھا؟" اس کے جواب میں اول خیر نے مجھ سے جو کہا تھا، اس نے مجھے متحیر کر دیا۔

"وہ تم تھے... شہزی کاکے...!"

"کیا...؟ میں...؟ یہ کیا کہہ رہے ہو تم اول خیر؟ تم ہوش میں تو ہو... مجھے بتاؤ کیا گورکھ دھندا ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں یار کاکے! یہ واقعی بڑا پُراسرار گورکھ دھندا ہے۔" وہ ایک گہری سانس خارج کرکے اسرار بھرے لہجے

لمبے لہراتے حسین بال ہمیشہ کے لیے۔
MEDICAM
SHAMPOO
مہینے بھر کا شیمپو
MEDICAM
SHAMPOO
SHIKAKAI
ANTI DANDRUFF
AMLA
HERBAL
ANTI-LICE
KALONJI

میں بولا۔

”سارے فساد کی جڑ یہی گورکھ دھندا ہے۔“

اول خیر سب جانتا تھا۔ بیگم صاحبہ کا ماضی کیا تھا اور حال کیا ہے لیکن جانے کیوں وہ مجھے بتانے سے ہمیشہ ہی احتراز برتتا آیا تھا۔ کبھی کہتا تھا... اسے کچھ نہیں معلوم اور جب بھی بیگم صاحبہ کے ماضی کے حوالے سے کوئی بات نکلتی تو بے اختیار اس کے منہ سے... کبھی کچھ ایسے ہی الفاظ نکل جاتے تھے جیسے وہ بہت کچھ جانتا تھا اور جانتا بھی کیوں نہ ہوگا۔ آخر کو وہ بیگم صاحبہ کے... کار پردازوں میں نمبر دو کی حیثیت رکھتا تھا۔ کھیل وارا کے علاوہ اول خیر بھی بہت کچھ جانتا ہوگا۔ بھلا نہیں وہ، یہ بھی جانتا تھا کہ میرے سلسلے میں بیگم صاحبہ کا رویہ اس قدر نرم خو کیوں ہو جایا کرتا تھا اور... اور... اب... آج کسی لئیق شاہ... نامی شخص کے ذکر پر اول خیر کا بے اختیار مجھ سے یہ کہنا کہ ”لئیق شاہ... تم سے... شہزی شاہ کے۔“ مجھے بے طرح چونکنے پر مجبور کر گیا۔ میں نے اول خیر کو جھنجوڑ ڈالا۔

”یار! تم بھی مجھے اس پراسرار گورکھ دھندے میں الجھا دو گے۔ مجھے ایک بار یہ سب بتا کیوں نہیں دیتے تم... اول خیر؟“

میری بات پر اس کی... بے تاثر سی ہنسی کی ہلکی آواز سنائی دی پھر بولا۔ ”اوخیر... کا کے! میں تجھے یہ سب نہ بتا کر ہی تو اس پراسرار... گورکھ دھندے سے بچانا چاہتا ہوں۔“ وہ پھر پہلو تہی کرنے لگا۔

ایسے ہی وقت میں مجھے اپنے سیل فون کی تھرتھراہٹ محسوس ہوئی۔ فون ہنوز میرے ہاتھ میں ہی دبا ہوا تھا۔ میں نے چونک کر اسکرین پر نظر ڈالی اور یکبارگی میرا دل زور سے دھڑکا۔ یہ زبیر خان کی کال تھی۔ اس سے پہلے میں ایک بار سیل پر مختصراً گفتگو کر چکا تھا۔ ایسے کڑے وقت میں میرا اس سے بات کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر پھر جانے کیا سوچ کر میں نے اس کی کال ریسیو کر ہی ڈالی۔ کیونکہ بقول آسیہ اور خود زبیر خان کے... میرے بگڑنے حالات اور کٹھن راہوں کو ہموار کرنے میں اس کی مدد ضروری تھی۔ اگرچہ یہ مدد مشروط ہی تھی۔

”شہزاد خان! میں بہت دیر سے ٹرائی کر رہا تھا... تم ٹھیک تو ہو؟“... اس نے بوجھل آواز میں پوچھا پھر فکرمندی سے بولا۔ ”تم میرے پاس کب پہنچ رہے ہو؟“

میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”میں خود ابھی ایک مصیبت میں گرفتار ہوں اور اس سے نکلنے کی تگ و دو میں مصروف ہوں۔“

خاموشی اور ساکت ماحول کے باعث اول خیر بھی دوسری طرف کی باتیں بآسانی سن رہا تھا۔

”مجھے معلوم ہے... تم پر چودھری الف خان کے بیٹے ممتاز خان نے عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے۔“ وہ بولا۔

”نہ صرف یہ بلکہ اس ممتاز خان کے جواں سال بیٹے فرخ کے قتل کا الزام بھی تمہارے سر تھوپ دیا گیا ہے۔ ویسے تم اس وقت ہو کہاں؟ میرا مطلب ہے تھانے وغیرہ میں یا کسی اور جگہ...؟“ زبیر خان نے پوچھا۔ مجھے اس کے لہجے سے فکر کی پرچھائیں نمایاں طور پر محسوس ہوئی۔ میں نے جواباً کہا۔

”فی الحال تو میں اس طرح کی گرفت سے آزاد ہوں۔“

”ملتان میں ہو؟“ فوراً پوچھا گیا۔

”جی ہاں۔“

”کھلاں والی آسکتے ہو؟ میرے پاس... مگر یاد رکھنا... میں نے تمہاری ساتھی آسیہ کے منگیتر ریحان کو چھوڑ کر تمہاری طرف دوستی اور صلح کا ہاتھ بڑھایا ہے... کیونکہ... میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ مجھے اپنے ذرائع سے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ...“

”جی ہاں! زبیر خان صاحب۔“ میں نے اسے تفصیل کی ”قند مکرر“ کی زحمت سے بچانے کی غرض سے فوراً کہا اور آگے بولا۔ ”میں آپ کا مشکور رہوں گا... ساتھ ہی مجھے خوشی ہوئی کہ میری طرف سے آپ کے دل میں جو غلط فہمی تھی وہ دور ہو گئی... میں بھی کوشش کروں گا آپ کے کام آنے کی مگر بدقسمتی سے...“

”تمہاری خیریت اب ہمارا وسیع تر مفاد بن گئی ہے نوجوان۔“ میں اس کی آواز اس کے لہجے کی گھمن گرج اور بات پر چونکے بنا نہ رہ سکا۔ فوراً میرے منہ سے نکلا۔

”میں آپ کے کس کام آ سکتا ہوں؟“

”ہاں! تم کہ ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں، بڑے دوستانہ انداز میں کہ ہمیں تم سے کیا کام ہے۔“ وہ بولا۔ مجھے حیرت تھی کہ زبیر خان کوئی معمولی حیثیت کا آدمی نہ تھا۔ بھلا مجھ سے اسے کون سے کام کی محتاجی آن پڑی تھی۔

”دیکھو نوجوان! ہیرے کی قدر صرف جوہری ہی جانتا ہے۔ میری طرف سے تم پر کوئی قدغن کوئی زبردستی نہیں

ہے اور نہ ہی ریحان کی آزادی کو میں نے مشروط بنایا۔ حقیقت کا علم ہونے ہی میں نے نہ صرف اسے چھوڑ دیا بلکہ تمہاری طرف سے بھی اپنا دل فوراً صاف کرلیا مگر مجھے خوب اندازہ ہے کہ میں جس سانپ پر پاؤں رکھنا چاہتا ہوں وہ بھاری بھر صرف تمہارا ہی ہوسکتا ہے، میرا نہیں۔"

"کام کی نوعیت جان سکتا ہوں؟" میں نے گفتگو سمیٹنے کی غرض سے کہا تو وہ بولا۔

"ابھی میں کیا کہوں؟ تم خود بے شمار خطرات اور مصیبتوں میں گھرے ہوئے ہو۔ پہلے تمہیں اس شکنجے سے آزاد کرانا چاہتا ہوں میں۔ اس کے بعد میں تمہیں بتاؤں گا کہ تم میرے کس کام آسکتے ہو۔ وہ بھی تمہاری مرضی پر منحصر ہوگا کہ تم کرتے ہو یا نہیں۔"

"آپ میری کیا مدد کرسکتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"کم از کم ممتاز خان والے معاملے میں تو تمہاری مدد کرہی سکتا ہوں۔"

"یہ مدد کھلاں والی... میں رہنے ہوئے نہیں ہو سکتی... اس وقت ملتان میں وہ میرا عرصۂ حیات تنگ کیے ہوئے ہے۔" میں نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ "چودھری ممتاز خان کے خلاف میرا ایک پرانا کیس بھی یہاں کی عدالت میں چل رہا ہے مگر میں اپنا رخ اس کے خلاف بیک وقت قانونی اور ذاتی، دونوں قسم کی جنگ میں پھنسا رہا ہوں۔ تاہم میرے لیے زیادہ اہم قانونی جنگ ہے جس کی میں نے اپنے بہی خواہوں کے ساتھ مکمل تیاری کرلی تھی اور جیت کے امکانات بھی روشن تھے کہ اچانک آپ کی مداخلت کے باعث سارا کھیل بگڑ گیا۔ معذرت کے ساتھ... زبیر خان صاحب! پتا نہیں آپ کو اس حرکت کا کتنا فائدہ ہوا؟ میں نہیں جانتا، ہاں البتہ ممتاز خان کے حق میں آپ کی یہ مداخلت سو فیصد سود مند ثابت ہوئی۔ ورنہ صورتِ حال اس کے برعکس ہوتی اور میرے بجائے اس وقت ممتاز خان پولیس سے چھپتا پھر رہا ہوتا۔"

قدرے صراحت بھری گفتگو کا موقع ملا تو میں نے گلے شکوے بھی کرڈالے۔ وہ اس کا برا منائے بغیر بولا۔

"مجھے بھی اس کا از حد قلق اور پچھتاوا ہے نوجوان!" اس کے لہجے میں حد درجے پشیمانی اور معذرت تھی۔ میں نے بھی اپنے دل کے گویا پھپھولے پھوڑ ڈالے اور یاسمین ملک کے حوالے سے بھی اس کی جیرہ دستی یاد دلائی تو وہ بولا۔

"اس لالچی اور بے ضمیر آدمی کی تم فکر مت کرو... یاسمین ملک جیسے لوگوں کا ایمان صرف پیسا ہے۔"

"تو پھر آپ اسے آسیہ والی ویڈیو کلپ کے سلسلے میں مجبور کریں۔ یہ آپ کا میرے لیے ایک بہت بڑا کام ہوگا اور چودھری ممتاز خان کے خلاف قانونی پھندا بھی تنگ ہو جائے گا۔" میں نے ایک اہم بات کی طرف اس کی توجہ دلائی تو دوسری جانب تکلف پر سوچ کی خاموشی چھا گئی پھر اس کی آواز ابھری۔

"اگر یہ بات ہے تو تم اس کی فکر نہ کرو شہزاد! میں ابھی یاسمین ملک سے رابطہ کرتا ہوں۔"

"بس تو پھر آپ اس سے رابطہ کریں اور اسے مجبور کریں کہ وہ اپنے ٹی وی چینل کی ایک سابقہ رپورٹر مس آسیہ سے پورا پورا تعاون کرے۔ جیسا وہ کہے ویسا ہی کرے اور خاطر جمع رکھے۔ اس سے کوئی غلط کام نہیں لیا جائے گا جس سے کسی کی حق تلفی یا ناانصافی ہو۔ اس طرح آپ کی وجہ سے ہمارا جو کھیل عین وقت پر بگڑا تھا وہ شاید دوبارہ بہتری کی طرف مائل ہو جائے۔" میں نے "شاید" کا لاحقہ لگانا ضروری سمجھا کیونکہ اب ممتاز خان کے بیٹے فرخ کی حادثاتی موت کے بعد اس کے خلاف صورتِ حال کچھ زیادہ ہمارے لیے "حوصلہ افزا" نہیں رہی تھی۔

"تم کسی بات کی فکر نہ کرو نوجوان! یاسمین ملک وہی کچھ کرے گا جو تم یا آسیہ چاہے گی۔ میری اس سے بھی بات ہوچکی ہے۔" زبیر خان نے کہا تو میں بولا۔

"بہت شکریہ آپ کا زبیر صاحب! میں بھی آپ کے کام آنے کی کوشش کروں گا مگر یاد رہے کسی کارندے یا کارپرداز کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک دوسرے کے کام آنے والے دوست اور خیرخواہ کی حیثیت سے۔"

"بالکل... تو پھر میں تم سے امید رکھوں؟"

"امید پر دنیا قائم ہے۔ بس ذرا یہ معاملہ سنبھل جائے۔"

"فکر نہ کرو... میں یاسمین ملک سے بات کرنے کے بعد مس آسیہ سے بھی بات کروں گا۔"

"میں بھی بہت جلد آپ سے ملنے کی کوشش کروں گا۔" یہ کہتے ہوئے رسمی الوداعی کلمات کے بعد رابطہ منقطع کردیا۔

"اوخیر..." رات کی دھند کی خاموشی میں مجھے ساتھ بیٹھے ارل فیر کی مخصوص آواز سنائی دی۔ میرے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ رقصاں ہوگئی۔ میں نے اسی وقت آسیہ سے رابطہ کرکے اسے زبیر خان سے دوسری بار ہونے والی "مہر

حاصل ''گفتگو کے بارے میں بتایا تو وہ خوشی کے پُرجوش احساس تلے بولی۔

''شہزی! اب ہمارا کھیل وہیں سے شروع ہوگا جہاں سے اس کی ڈور ٹوٹی تھی۔ تم دیکھنا اب کیسے اونٹ پہاڑ تلے آتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''کیا اس تازہ صورتِ حال کے باوجود بھی بہتری کی امید رکھنی چاہیے؟'' وہ میری بات کا اشارہ سمجھتے ہوئے بولی۔

''آف کورس... تم کیا سمجھ رہے ہو شہزی! کہ میں یہاں باجی کے گھر ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھی ہوں؟''

میں اس کی بات پر چونکے بنا نہ رہ سکا۔ وہ آگے بولی۔ ''میں اور باجی خانم شاہ نے تمہاری ہدایت کے مطابق اسپیشل انویسٹی گیشن اینٹی کرائم سیل کے آپریشن انچارج... میجر راشد باجوہ سے بالمشافہ ملاقات کی تھی اور انہیں ساری صورتِ حال اور سول لائن پولیس کی جانب داری سے بھی آگاہ کیا تھا۔ تم سے آج صبح ہونے والی گفتگو سے متعلق بھی یہ بات واضح کی گئی کہ فرخ کا قتل حادثاتی طور پر اس کی اپنی بہن نوشابہ کے ہاتھوں ہوا اور تمہیں یہ اہم اطلاع بھی دیتی چلوں شہزی کہ مبینہ طور پر نوشابہ پولیس کو درست بیان دینے پر رضامند ہے کہ گولی اس کے پستول سے چلی تھی لہٰذا جب باجوہ صاحب نے اس سلسلے میں بذاتِ خود نوشابہ سے ملاقات کرنی چاہی تو ان کی طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر ٹرخا دیا... اور شاطر چودھری ممتاز نے اسے اپنی بیٹی سے ملنے ہی نہ دیا۔ وہ یقیناً اندرونِ خانہ اپنی بیٹی پر دباؤ ڈالنے کی اس مذموم کوشش میں ہے کہ یہ قتل اس کے ہاتھوں نہیں بلکہ سوچے سمجھے ارادے اور منصوبے کے تحت تم نے ہی کیا ہے۔''

اسما کی آواز فرطِ جوش سے لرز رہی تھی۔ یہ حقیقت تھی کہ خود میرا وجود بھی اسی جوش کے زیرِ اثر مرتعش ہونے لگا تھا۔ گویا میری ہر طرف سے روٹھی ہوئی تقدیر اب بھرپور طریقے سے میرا ساتھ دینے پر اتر آئی تھی۔ زبیر خان کا اچانک ایک دشمن سے میرا دوست بن جانا پھر میری خاطر خواہ طریقے سے مدد کے لیے بھی آمادہ ہو جانا اور اسما کے ساتھ باقاعدہ میرے حق میں چلانے والی اس کا رِخیر مہم میں شامل ہونا... یہ سب خوش آئند باتیں نہیں تو کیا تھیں؟ اس پہ اول خیر نے بڑا امید افزا اور مسرت آمیز حاصل تبصرہ کرتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں مجھ سے کہا۔

''او... خیر... کاکا! اسی لیے ممتاز خان نے فوری طور پر اپنے مسلح درندہ صفت آدمیوں کے ذریعے تمہیں ہلاک کرنے کی ناپاک کوشش کی تھی۔ یقیناً اسے بھی ان ساری باتوں کا ادراک ہو چلا ہے کہ اب تم بہت جلد قانون کی گرفت سے آزاد ہونے والے ہو۔''

''ہاں، اول خیر!'' میں نے خوش آئند تصورات کے بھرپور احساس سے مغلوب ہو کے کہا۔ ''ہو سکتا ہے کل کا سورج بہت اہم اور خوش گوار تبدیلیوں کے ساتھ طلوع ہو۔''

''انشاء اللہ... ایسا ہی ہوگا کاکے۔'' اول خیر نے میری تائید کر ڈالی۔ ''لیکن کاکے! اب ہمیں یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا چاہیے۔ ممتاز خان کو اب تک اس بات کی اطلاع مل گئی ہوگی کہ ہم اس کے خونی ہرکاروں کے چنگل سے نکل بھاگے ہیں۔ اس نے مزید آدمی ہماری تلاش میں روانہ کر دیے ہوں گے۔''

اس کا خدشہ بجا تھا۔ میں نے سیل فون کی اسکرین پر وقت دیکھا۔ پو پھٹنے والی تھی اور صبح دم بیدار ہونے میں ایک دو گھنٹے ہی تھے۔ تازہ صورتِ حال اور ٹیلی فونک رابطوں پر زبیر خان اور اسما وغیرہ سے گفتگو ہونے کے بعد اب میرا اسما کے ہاں یعنی ایڈووکیٹ خانم شاہ کی رہائش گاہ پر جانا ناگزیر ہو گیا تھا کیونکہ زبیر خان نے یاسمین ملک کی جانب سے مثبت جواب کی توقع دلائی تھی۔ لائیو پروگرام... خانم شاہ کی رہائش گاہ سے ہی نشر ہونے کا دوبارہ بندوبست کیا جانے والا تھا۔ پہلی والی ویڈیو کلپ کی تردید و صفائی میں یہ لائیو پروگرام کرنا از حد ضروری تھا۔ اس بار صورتِ حال نسبتاً زیادہ حوصلہ افزا بھی نظر آتی تھی کیونکہ اب اس پروگرام کو کوئی اور نہیں بلکہ وہی چینل نیلی کاسٹ کرے گا جس سے پہلے والی ویڈیو کلپ نشر ہوئی تھی۔

''پھر ہمیں یہ جیپ چھوڑنا ہوگی کسی مسافر لاری کا سفر اختیار کرنا پڑے گا۔'' میں نے کہا تو وہ بولا۔

''پر کاکا! اس مختصر سفر کے دوران میں ناکے پر پولیس چیکنگ ہو سکتی ہے اور شہر کے اندر تو بڑی سخت چیکنگ ہوگی۔ چاہے جتنا بنا ہم بہروپ بدلنے کی کوشش کریں، ممتاز خان کے مخبر ہرکاروں کی نظروں سے ہم نہیں بچ سکتے۔ تو جانتا ہے کاکے! ممتاز خان کی انتہائی کوشش یہی ہوگی کہ وہ تجھے فوراً ٹارگٹ کرے کیونکہ بعد میں وہ اتنے آسانی سے پولیس مقابلہ قرار دلوا سکتا ہے۔''

اس کی بات قابلِ غور تھی۔ ملتان اس وقت میرے لیے ''ہائی رسک'' بنا ہوا تھا۔ مگر میرا خانم شاہ کی رہائش گاہ تک پہنچنا بھی ضروری تھا۔ معاً میرے ذہن میں ایک

قریب آئی... جو میں نے فوراً اول خیر کے گوش گزار کر دی۔ وہ کچھ مطمئن اور کچھ غیر مطمئن انداز سے بولا۔

"کاکے! کام تو یہ بھی خطرناک ہی ہوگا مگر مسافر لاری سے بہرحال کم ہی ہے۔"

"بس تو پھر بسم اللہ کرتے ہیں... کم سے کم خطرے والا راستہ اختیار کرتے ہیں۔"

"چل کاکے، پھر لے اللہ کا نام... جو ہوگا دیکھا جائے گا۔" وہ بولا اور جیپ آگے بڑھا دی۔

خچر چلانے سے دگنی رفتار کے ساتھ بغیر ہیڈلائٹس آن کیے ہم مین شاہراہ کے قریب پہنچے۔ جیپ کو ایک نسبتاً بلند کچے ٹیلے کی آڑ میں روک کر ہم دونوں نیچے اتر آئے اور پیدل مین شاہراہ کی طرف ہو لیے۔ پختہ سڑک ہماری نظروں کے فاصلے پر تھی۔ وہاں چمکتی روشنیاں متحرک نظر آرہی تھیں۔ مین شاہراہ پر ٹریفک رواں دواں تھی۔ قریب ہی نصف قدِ آدم سوکھی جھاڑیاں تھیں۔ یہ دو رویہ شاہراہ ہی تھی اور جس رخ پر ہم تھے وہ ملتان کی طرف جانے والی سڑک تھی۔ میرے منصوبے کے مطابق ہمیں کسی باربردار ٹرک پر سفر کرنا تھا جو ملتان شہر کی طرف گامزن ہوتا۔

اب ہمیں ایسے ٹرک کی تلاش تھی جو سامان سے لدا ہوتا... ٹرک کے انتظار میں ہم ایک موڑ کے قریب جھاڑیوں میں دبک کر بیٹھ گئے۔ موسم کے تیور بدلنے لگے تھے۔ سرمائی ابتدا تھی، فضا میں ٹھنڈ اترنے لگی تھی۔ ہم دونوں نے بھاری چادریں اوڑھ رکھی تھیں۔ یہ ایک طرح سے ہمارے چہروں کو بھی نصف حد تک چھپانے کی تدبیر بنی ہوئی تھی۔

رات کے آخری گزرتے پہر میں سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی، عموماً ایسے وقت میں باربردار ٹرک ہی آتے جاتے نظر آتے ہیں۔ دو آئل ٹینکر، ایک ٹرک ہماری آنکھوں کے سامنے سے گزرے تھے۔ ابھی تک ہمارے "مطلب" کا ٹرک ہمیں نظر نہیں آیا تھا... ہم موزوں جگہ پر ہی دبکے بیٹھے تھے۔ مشرق کی سمت پو پھٹنے لگی تھی، اچانک ایک چھوٹے سائز کا راکٹ ٹرک گھرگھراتا ہوا آتا دکھائی دیا۔ یہ ہمیں اپنے مطلب کا محسوس ہوا۔ میں نے ہولے سے اول خیر کا ہاتھ دبایا۔ وہ بھی ہوشیار ہو کے بیٹھ گیا۔ ٹرک قریب آرہا تھا اور اس موڑ پر حسبِ توقع اس کی رفتار کم سے کم ہونے لگی۔ پھر جیسے ہی اس کا رخ مڑا... ہم دونوں بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ جھاڑیوں سے نکلے اور ٹرک کے پیچھے دوڑتے چلے گئے اور پھر اس کے آہنی کنڈوں پر ہاتھ اور پاؤں جما کر چپک گئے۔ یہ ٹرک واقعی ہمارے مطلب کا تھا یعنی زیادہ لدا پھندا نہیں تھا۔ یہ کباڑیے کا ٹرک تھا اور اسکریپ لا رہا تھا۔ ظاہر ہے اس کا رخ ملتان کی کباڑ مارکیٹ کی طرف تھا... یہاں ہمیں تھوڑی کوشش سے اندر چھپ کر... بیٹھنے کی جگہ مل گئی۔

موڑ کراس کرتے ہی ڈرائیور نے ٹرک کو ریس دی۔ گیئر بدلنے کی گھرگھراہٹ ابھری اور ٹرک نے نسبتاً تیز رفتار پکڑ لی۔ تاہم اب بھی اس کی رفتار فقط اتنی ہی تھی کہ اگر ہم اترنا بھی چاہتے تو بہ آسانی اس پر سے چھلانگ لگا کر اتر سکتے تھے۔

دل و دماغ کو کچھ تسلی ہونے لگی مگر بہرحال یہ بات بھی طے تھی کہ اب ہم بتدریج خطرات کی جانب بڑھ رہے تھے۔ اس ٹرک کی چیکنگ ہوسکتی تھی اگرچہ اس کا احتمال کم ہی تھا مگر لوہے اور زنگ آلود انجر پنجر سے لدے اس ٹرک کو کچھ زیادہ سخت چیکنگ کے مرحلے سے نہیں گزارا جاسکتا تھا۔ اس کی مجھے امید تھی۔

"کاکا! ہوشیار... ٹول پلازا آرہا ہے۔" خاصی دیر بعد اول خیر نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ مطلب تھا کہ ہم اپنی خفیہ جگہ پر نظرثانی کرلیں۔

ٹرک کی رفتار بتدریج کم ہونے لگی۔ سویرا ہونے لگا۔ ٹرک ٹول کیبن سے گزر کر سائڈ میں رک گیا۔ انجن اسٹارٹ ہی رہا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنا شروع ہوگیا۔ جس خطرے سے اس وقت میں دوچار تھا اس کی اذیت سے صرف میں ہی واقف تھا... کیونکہ میرے لیے اس خطرے کا دوسرا نام موت تھا۔

کچھ آوازیں سنائی دینے لگیں... ڈرائیور شاید پولیس والوں سے کچھ "جگاڑ" کر رہا تھا۔ معاملہ اگر وہیں تک تھا تو کچھ امید افزا تھا۔ ایک آہنی کڑے کی آڑ سے میں نے ٹرک کے سرے کی طرف دیکھا جو کھلا پڑا تھا جبکہ ہم ٹرک کے درمیانی حصے میں چھپے بیٹھے تھے۔ کھلے حصے سے مجھے ایک وردی پوش اہلکار نظر آیا۔ وہ کنڈوں اور آہنی رخنوں پر پاؤں اور ہاتھ پھنسائے اسکریپ اور کباڑ پر سرسری سی نگاہ ڈال رہا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ اتر گیا۔ ٹرک کا انجن اسٹارٹ ہی تھا۔ تھوڑی دیر بعد ٹرک کی ریس کی مخصوص آواز ابھری اور وہ ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گیا۔ میں نے سکون کی سانس لی۔ یہ اہم ناکا تھا۔ اب ٹرک شہر کے اندر داخل ہونے والا تھا۔ اندر شہر کے کسی ناکے پر بھی ٹرک کی چیکنگ ہوسکتی تھی۔

ٹرک اب شہر میں داخل ہو چکا تھا۔ سوئے اتفاق یا پھر میری خوش نصیبی تھی کہ پھر دوبارہ اسے کسی نے نہیں روکا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ ہمارا انجانا رہنما یہ ٹرک ایسے کسی متوقع اور امید افزا قریبی مقام سے گزرتا ہے جہاں سے خانم شاہ کی رہائش گاہ نزدیک پڑتی... مگر اس کے ساتھ ہمیں یہ ڈر بھی تھا کہ اگر یہ پہلے ہی اپنے کسی مطلوبہ مقام پر پہنچ گیا تو ہمارا نظر آجانا لازمی امر تھا۔ لہٰذا ہمیں کسی ایسی صورتِ حال کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے ہی ٹرک سے اتر جانا چاہیے تھا۔

ایک ایسے ہی موقع پر ہم دونوں سرک کر ٹرک کے سرے پر آگئے۔ ٹرک کھڑکھڑاتا ہوا مدھم رفتار سے چل رہا تھا۔ اب وہ ایک بازار کے قریب سے گزر رہا تھا۔ ابھی الصباح کے باعث بازار میں خریداروں کی تعداد کم ہی تھی البتہ متعلقہ لوگ، دکان دار، مزدور جائے بغیر بیچے نظر آئے۔ یہ بیک وقت سبزی منڈی اور فروٹ مارکیٹ نظر آتی تھی۔ ایک مقام پر ٹرک کی رفتار بہت کم ہوگئی۔ وہ شاید کسی اور گاڑی کو راستہ دے رہا تھا۔ پھر رک گیا۔ ہم نے اترنا یہی مناسب سمجھا۔ کسی کی نظروں میں آئے بغیر ہم ٹرک سے اترنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہم منڈی میں داخل ہو گئے ہماری نظریں گرد و پیش کا بھی جائزہ لے رہی تھیں۔ میں نے اندازہ لگانے کی کوشش چاہی تو عقدہ کھلا یہاں سے ایڈورکیٹ خانم شاہ کی رہائش گاہ زیادہ دور نہیں تھی بشرطیکہ ہم گلیوں، محلوں کے درمیان سے شارٹ کٹ اختیار کرتے گزرتے۔ ہم دونوں نے اس پر تبادلۂ خیال کیا اور چل پڑے۔

اب تک کی صورتِ حالات تسلی بخش نظر آتی تھی مگر جانے کیوں دل و دماغ ایک بار پھر شکوک و شبہات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ میں نے ذہن میں ابھرنے والے ایک خیال کے تحت ارل خیر سے کہا۔

”یار! تمہارا کیا خیال ہے پولیس یا دشمنوں نے خانم شاہ کی رہائش گاہ کی بھی خفیہ نگرانی نہیں کر رکھی ہوگی؟“

”اوخیر... کاکے!“ وہ مسکرایا۔ ”اس کا خیال تجھے اب آیا ہے۔ میرے تو بہت پہلے سے یہ خدشہ دماغ میں کلبلا رہا تھا۔“

”تم میرا مطلب نہیں سمجھے۔“ میں نے متانت سے کہا۔ ”ایسے میں ہم اندر کیسے داخل ہو پائیں گے؟“

”سمجھ گیا تھا تیری بات کا مطلب کاکے... وہاں پہنچ کر صورتِ حال کا جائزہ لیں گے بلکہ تو ایک کام کر۔“ وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔

”آسیہ سے رابطہ کر اور اسے بھی اس خدشے سے باخبر کر دے... ساتھ ہی اپنی آمد کی اطلاع بھی دے دے۔“

ہم باتیں کرتے ہوئے محتاط روی سے چل رہے تھے۔ منڈی خاصی بڑی تھی یہاں سے ایک ذیلی سڑک پار کر کے ہم اوسط درجے کے ایک رہائشی علاقے میں داخل ہو گئے۔ یہ منڈی کے سامنے سڑک پار کا متوسط سا علاقہ تھا۔ زیادہ تر مزدور پیشہ افراد یہاں مقیم تھے۔ سرگشت کے انداز میں چلتے ہوئے ایک نسبتاً خالی جگہ پر رک کر میں نے جیب سے سیل نکالا اور آسیہ سے رابطہ کیا۔ وہ بے چینی سے میری منتظر تھی۔ پر جب اسے یہ معلوم ہوا کہ میں ملتان میں ہی ہوں اور ان کے بہت قریب ہوں تو وہ خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے بولی۔

”شہزی! بس اب جلدی پہنچ جاؤ یہاں۔ سارے معاملات ٹھیک ہو گئے ہیں، یاسین ملک کا فون آیا تھا۔ زبیر خان کے کہنے پر انور بازید، کیبنٹ ہم سے پورا تعاون کرنے پر رضامند ہو گیا ہے۔ بس تم آجاؤ... ایک بار تمہاری لائیو ریڈ یو کلپ اس چینل سے زور دار طور پر نشر ہو گئی تو سمجھو تمہارے دشمنوں کو منہ کی کھانی پڑے گی... تمہاری ضمانت کے امکانات بھی روشن ہو جائیں گے۔“

”ہاں، یہ سب ٹھیک ہے آسیہ! لیکن دشمنوں کی ابھی بھی انتہائی کوشش میری شہ رگ کے قریب پہنچنا ہے...“ پھر لمحہ بھر توقف کے بعد بولا۔ ”میں نے تمہیں اسی لیے فون کیا تھا، آنے سے پہلے میں اس بات کی تسلی چاہتا ہوں کہیں تمہاری باجی کا گھر خفیہ نگرانی کی زد میں تو نہیں۔ میں تو بھی محتاط رہوں گا مگر تم بھی اپنے طور پر ذرا باہر کا غیر محسوس طریقے سے جائزہ لے کر مجھے بتاؤ اور کے...؟“ وہ میری بات کا مطلب سمجھ گئی اور دوبارہ رابطے کا کہہ کر منقطع کر دیا۔

ارل خیر میرے اس پُراندیش خیال سے متفق تھا۔ ہم دونوں اسی طرح تنگ گلیوں اور محلوں کا سہارا لیتے ہوئے بالآخر ایڈووکیٹ خانم شاہ کے گھر کے قریب جا پہنچے۔ یہ نسبتاً پوش علاقہ تھا گلیوں کی جگہ کھلے اور چوڑے راستے تھے زیادہ تر کھلے کشادہ مکانات اور جدید اسٹائل کے بنگلے بنے ہوئے تھے۔ مطلوبہ بنگلے کے راستوں کی حدود میں داخلے کے بعد ہم از حد محتاط ہو گئے، جو تھے نمبر کا بنگلا خانم شاہ کا تھا۔ مجھے وہاں قریب میں ایک ٹھیلے والا کھڑا نظر آیا۔

کھڑا کیا تھا بلکہ اس طرف ہی دو آدمی اپنے ٹھیلے کو دھکیلتا ہوا چلا آرہا تھا جہاں ہم موجود تھے۔ مگر ہم نے دیکھا وہ رک گیا۔ کچھ لوگ آتے جاتے دکھائی دیے... جانے کیوں میرے چونکے پن کی ساری حسیات ٹھیلے والے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ وہ رک کر ہلکے فیروزی رنگ والے اس بنگلے کے گیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا... پھر ذرا آگے جا کر رک گیا۔ اسی دوران میں نے آسیہ کو دیکھا وہ کسی گھریلو ملازمہ کے ہمراہ باہر ایک طرف سے چلی آرہی تھی۔ اس کی حرکات وسکنات میں مضطربانہ پن تھا۔ میں نے غور کیا تھا کہ بظاہر ٹھیلے والا بار بار گردن موڑ کر آسیہ کی طرف دیکھ رہا تھا پھر جب آسیہ اور وہ ملازمہ نما عورت بنگلے کے گیٹ سے اندر داخل ہوگئیں تو میں چونکا، ٹھیلے والے نے اپنی ڈھیلی ڈھالی قمیص سے ایک سیل نکالا اور کسی سے بات کرنے لگا۔ اسی لمحے دو افراد مجھے اس سمت سے نمودار ہوتے دکھائی دیے جدھر سے آسیہ اور وہ ملازمہ عورت ابھری تھیں۔ ٹھیلے والے نے سیل اپنے کان سے لگایا مگر پھر ان مذکورہ دو افراد کو دیکھتے ہی اس نے سیل اپنے کان سے فوراً ہٹا لیا۔ اس کی حرکت مجھے چونکا گئی تھی، وہ دونوں آدمی اس کی سمت بڑھے اور قریب آکر وہ تینوں آپس میں گفتگو کرنے لگے۔ ٹھیک اسی وقت مجھے اپنے سیل کی تھرتھراہٹ محسوس ہوئی۔ یہ آسیہ کی کال تھی، میں نے اول خیر سے ان تینوں آدمیوں پر نظر رکھنے کا کہا اور خود ذرا سبک ہو کے آسیہ کی کال سننے لگا۔

''شہزی! میرا خیال ہے تمہارا خدشہ درست ہے۔ میں ماسی کے ساتھ باہر نکلی تھی بظاہر سودا سلف لیا اور گردوپیش کا جائزہ لینے پر مجھے چند لوگوں کی مشکوک نقل وحرکت محسوس ہوئیں۔'' وہ دھیمی آواز کے ساتھ بتا رہی تھی۔ ''دو آدمیوں کو تو بارہا ادھر میں نے اپنا تعاقب کرتے ہوئے بھی پایا... ایک پولیس گاڑی بھی راستے کے سرے پر کھڑی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا... تمہارا خفیہ داخلہ کس طرح ممکن ہو؟'' اس کے لہجے سے پریشانی مترشح تھی۔ جواباً میں نے اسے تمام صورت حال سے آگاہ کر دیا۔

''شہزادہ تم ابھی دور ہی رہنا کہیں ان کی نظر تم پر نہ پڑ جائے۔ مجھے لگتا ہے ان لوگوں کا ذرا دور موجود پولیس گاڑی والوں سے خفیہ رابطہ ہے۔''

''تم بے فکر رہو۔ میں محتاط ہوں۔'' میں نے اسے تسلی دینی چاہی مگر وہ بولی۔

''لیکن شہزی! تمہارا یہاں آنا ضروری ہے جس آخری مرحلے کی ہم نے تیاری کر رکھی ہے، اسے مکمل کرنا ضروری ہے۔''

''میں کچھ سوچتا ہوں۔'' میں نے تشفی آمیز لہجے میں کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ اول خیر میری طرف متوجہ تھا۔ اسی دوران اچانک میری نگاہ اول خیر کے عقب میں پڑی۔ ٹھیلے والا اپنے ٹھیلے کو دھکیلتا ہوا نمودار ہوا تھا اور اب کھڑا ہو کے ہماری جانب گھورے جا رہا تھا۔ یکلخت میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔ میں نے اول خیر سے دبی آواز میں کہا۔

''خبردار! چونکنا مت... ٹھیلے والا تمہارے پیچھے کھڑا ہے۔ وہ اسی طرف دیکھ رہا ہے۔'' اس کے چہرے پر سناٹے کی کیفیت طاری ہوگئی۔

آسیہ سے باتوں کے دوران جانے کب اول خیر میری طرف متوجہ ہو گیا تھا... اور اس دوران ٹھیلے والا آگے کو سرک آیا تھا۔ ہم دونوں... بالکل غیر محسوس طریقے سے اس کی طرف دیکھے بغیر بظاہر ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہوئے سیدھے ہاتھ کی طرف مڑ گئے۔ اس دوران میں نے کن انکھیوں سے ٹھیلے والے کی طرف دیکھا اور یکبارگی میرا دل خطرے کے پیش نظر زور سے دھڑک اٹھا۔ وہ اب دوبارہ سیل فون کو کان سے لگائے ہوئے تھا اور بار بار ہماری طرف گردن موڑ کر دیکھ بھی رہا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ اب اس نے ٹھیلے سمیت اپنا رخ بھی ہماری طرف موڑ لیا تھا اس کے ٹھیلے پر سبزیاں رکھی ہوئی تھیں۔ میں اور اول خیر دو بنگلوں کے درمیان بنے ایک خالی پلاٹ کی طرف آگئے اور پھر یہاں سے ایک دوسرے راستے پر آگئے۔ ٹھیلے والا وہ مشکوک آدمی اتنی جلدی اس طرف نہیں گھوم سکتا تھا مگر میں نے اول خیر کو ادھر ہی رکنے کا اشارہ کیا... اور خود تیز تیز قدموں سے خالی پلاٹ کا راستہ طے کر کے دوسری طرف گھوم کر اس مشکوک ٹھیلے والے کی عقبی سمت پر آن رکا۔ وہ انہی دونوں آدمیوں کو الٹی جانب ہاتھ کے اشارے سے کچھ بتا رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے مذکورہ وہ دونوں آدمی اس کے پاس سے ہٹ گئے تھے اور اب شاید اس کے بلانے پر دوبارہ اس سے آملے تھے۔ میں نے ان دونوں کو تیزی کے ساتھ اسی سمت کی طرف بڑھتے دیکھا جہاں ذرا دیر پہلے میں اور اول خیر موجود تھے اب شک وشبے کی کوئی گنجائش نہ رہی... کہ ہم متوقع نگرانی کی زد میں آچکے تھے۔

میں نے سرعت سے پلٹا اور اول خیر کو اشارہ کیا۔ ہم دونوں تیزی سے ایک بنگلے کی بیرونی دیوار کی مخالف آگئے۔ جی اس جگہ پر آکر چھپ گئے جدھر گھنے پودوں کے جھنڈ دار بیل

ہوئے آگے بڑھ گئے تھے۔ سرِدست ہمارا اِدھر اُدھر دوڑنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ دوسرے جس جگہ ہم چھپے تھے یہاں سے ہم مشکوک ٹھیلے والے کی نقل و حرکت پر بھی نظر رکھے ہوئے تھے۔ اپنے دونوں ساتھیوں کو ہمارے پیچھے روانہ کرنے کے بعد وہ پھر سیل پر کسی سے رابطے میں مصروف تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ دشمن تھے یا پولیس کے مخبر۔ تاہم دونوں میں کوئی فرق نہ تھا کیونکہ دونوں کا مقصد میرے سلسلے میں ایک ہی تھا۔ یعنی مجھے دیکھتے ہی ''شوٹ'' کر دینا۔

''کاکے! ہمیں فوراً یہاں سے رفوچکر ہونا پڑے گا۔ دشمن یا پولیس کو ہماری بھنک پڑ چکی ہے۔'' اول خیر نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ وہ غلط نہیں تھا ٹھیلے والے کا بار بار سیل فون پر رابطہ کرنے کا انداز یہی ظاہر کر رہا تھا کہ وہ مزید ''کمک'' بلانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ایسے میں اس علاقے کی ناکابندی ہو سکتی تھی۔

اس خطرے کو محسوس کر کے ہم عقبی سمت سے پودوں کے جھنڈ کو خیرباد کہہ کر نکلے ہی تھے کہ سامنے میں آ گئے۔ وہ دونوں آدمی ہمارے سامنے کھڑے تھے۔ پھر ایک نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش چاہی تو پستول کی جھلک دیکھتے ہی جیسے میری رگوں میں خون مثل پارا بن گیا۔ میں نے اس پر چیتے کی سی جست لگا دی۔ اسے مجھ سے اس قدر پھرتی کی توقع نہ تھی جبکہ میری تو جان پر بنی ہوئی تھی جب تک وہ یا اس کا دوسرا ساتھی سنبھلتا، میں اسے اپنے ساتھ رگیدتا ہوا لے گیا اور زمین پہ آ رہا۔ دوسرے کی پروا نہیں تھی کیونکہ اسے قابو کرنے کے لیے اول خیر موجود تھا۔ اپنے مدمقابل کو زمین پر گراتے ہی میں نے اپنے دائیں ہاتھ کا بھاری گھونسا پوری قوت سے اس کی ناک پر جڑ دیا۔ یہی دھوپ کی گرمی حسب توقع اول خیر کے حصے میں بھی آئی۔ اس نے تو اپنا پستول نکال کر اس کی بھرپور ضرب اپنے مدمقابل کی کنپٹی پر رسید کر دی تھی، وہ بے حرکت و ساکت ہو گیا جبکہ میرے نیچے دبا ہوا مدمقابل ناک پر گھونسا کھانے کے باوجود ہوش میں تھا۔ وہ تربیت یافتہ معلوم ہوتا تھا اور سخت جان بھی۔ اپنے دونوں ہاتھ میری گردن پر جما کر وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ تڑپا اور مجھے قوت سے دور اچھالنے کی کوشش چاہی مگر اسی دوران میں اس کا چہرہ میری ٹانگ کی زد میں آ گیا جو اس کے لیے ''ڈبل شاک'' ثابت ہوا۔ اس کے چہرے پر پڑنے والی میری زوردار لات کی ضرب نے اس کا سر پشت کی جانب دیوار سے بری طرح ٹکرا دیا تھا۔ نتیجتاً وہ وہیں بے حس و حرکت ہو گیا۔

جب تک میں اور اول خیر سنبھلتے، اچانک ایک سائرن بجاتی گاڑی کی آواز ابھری۔ پولیس جیپ کو اس سمت مڑتے دیکھ کر ہمارے پاس دوڑنے کا موقع نہیں رہا تھا۔ ناچار ہمیں انہی جھنڈ دار پودوں کی آڑ میں پناہ لینی پڑی جہاں تھوڑی دیر پہلے ہم موجود تھے... شکر تھا کہ پولیس کی ہم پر نگاہ نہیں پڑی تھی، دوسرے یہ کہ ایک بنگلے کی شمالی دیوار ہمیں آڑ فراہم کیے ہوئے تھی، تاہم بھاگنے یا دوڑنے کی صورت میں دیکھ لیے جانے کا زیادہ امکان تھا۔

پولیس موبائل ہماری پچھلی چھپی... آنکھوں کے سامنے آ رکی تھی، ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص کو دیکھ کر میں سناٹے میں آ گیا۔ اگرچہ اس ملعون سے ٹکراؤ کی مجھے پوری توقع تھی مگر ایسے حالات میں نہیں کہ میں بے بسی کی تصویر بنا چھپا بیٹھا تھا اور وہ میری دہشت کی نظروں کے سامنے تھا... اور سامنے بھی کیا محض دو تین فٹ کے فاصلے پر تھا۔ ممتاز خان کا راتب خور انسپکٹر روشن کا بدہیئت چہرہ میں کیسے بھلا سکتا تھا جو ماورائے قانون ''پولیس گردی'' کا شیدائی تھا۔ یہ وہی مردود تھا جس نے اپنے نجی ٹارچر سیل میں مجھے غیر انسانی تشدد کا نشانہ بنایا تھا اور اب میری جھلک دیکھنے کو بے تاب تھا کہ دیکھتے ہی مجھے گولی مار دینے کا اس درندہ صفت کو خصوصی اختیار... حاصل تھا۔ نابابا... اول خیر نے بھی اس موذی کو دیکھ لیا تھا اور اسی سبب اس نے دھیرے سے میرا کندھا دبایا تھا۔ میں نے نظر بچا کر بغور اس کے چہرے کا جائزہ لیا جو جوش غیظ اور آتش انتقام سے سرخ ہو کے تمتا تا نظر آ رہا تھا۔ وہ یک دم اپنی طرف کا دروازہ کھول کے نیچے اترا تو دوسرے پولیس والے بھی اتر کر اس کے قریب ہی مؤدبانہ کھڑے ہو گئے۔ اسی دوران میں، میں نے ٹھیلے والے کو دیکھا جو بڑے احترام سے انسپکٹر روشن خان کو صورت حال سے آگاہ کر رہا تھا۔

''سر جی! میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی ان دونوں کو دیکھا تھا۔ مجھے پورا یقین ہے ان میں ایک تو اپنا شکار ہی تھا۔ میں نے فوراً نذیر اور لالے کو مطلع کر دیا وہ انہی کے تعاقب میں گئے تھے۔''

''ان دونوں سے رابطہ کرو... ابھی۔'' انسپکٹر روشن کی آواز بھی اس کے بدہیئت چہرے اور بدخصلت فطرت کی طرح بھدی تھی۔

ٹھیلے والے نے فوراً اپنا سیل نکالا۔ اسی اثنا میں انسپکٹر روشن اپنے ساتھی اہلکاروں کو چاروں طرف پھیل جانے کا

گم رہے رہا تھا۔ میرا دل جیسے کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ صورتِ حال جان لیوا حد تک خطرناک ہو چکی تھی۔ اسی دوران جیسے قریب ہی بم پھٹا... تھوڑے فاصلے پر بے ہوش پڑے ان دونوں "سفید پوش" پولیس اہلکاروں میں سے جو باشعور برادر لالا! ہی تھے، ایک کی جیب میں موجود سیل کی تیل گنگنائی۔ میرا اور اول خیر کا رگوں میں دوڑتا خون خشک ہو گیا۔ ادھر جیسے انسپکٹر روشن کو بچھو نے ڈنک مارا۔ اس کے ساتھی اہلکار بھی برقی طرح بدکے۔

"ارے سر جی! وہ دونوں تو ادھر لیٹے پڑے ہیں۔" ایک نے فوراً آواز کی سمت رکٹ کرنے کے بعد تقریباً چلا کر کہا۔ باقی بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ یا اللہ خیر وہی ہوا۔ ہم نے جن دونوں کو اتنا غفیل کر دیا تھا، وہی ہمارے لیے خطرناک ثابت ہونے لگے۔

"یہ ضرور ان دونوں کی حرکت ہے۔ تم لوگ جاؤ سب تلاش کرو، وہ ادھر ہی ہوں گے۔" میری گنگی ہوئی سماعتوں میں انسپکٹر روشن کی بھنبھناہٹ جیسی غراہٹ ٹکرائی۔ دو اہلکار انہیں ہوش میں لانے کی تدبیر یں کرنے لگے۔ میں نے پودوں اور پتوں کی آڑ سے دیکھا۔ انسپکٹر غیظ و غضب کے انداز میں پلٹا اور اپنے سیل فون پر کسی سے رابطہ کرنے لگا۔ پھر بولا۔ "چودھری صاحب! شکار تک ہم پہنچ ہی گئے ہیں۔" پھر اس نے اب تک کی تفصیل مختصراً الفاظ میں دہرا دی۔ پھر دوسری جانب سے کچھ سننا رہا۔ اس کے بعد بولا۔

"آپ فکر نہ کریں، پولیس نے علاقے کو گھیرے میں لے لیا ہے آپ کے آدمیوں کو بھی بتا دیا ہے۔ جی... جی... میرا بھی یہی خیال ہے۔ وہ سکتا ہے شکار بظاہر ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کر خود ہی چوہے دان میں آن پھنسا ہے۔ اس نے آپ کے دونوں آدمیوں کو بے بس کر کے سیدھا... خانم ستار کی رہائش گاہ کا ہی رخ کیا ہوگا... جی... جی چودھری صاحب... لیکن ہم اس طرح اس کی رہائش گاہ میں داخل نہیں ہو سکتے۔ کوئی اور آدمی ہوتا تو میں سب کو چھت سے الٹا لٹکا دیتا... مگر آپ تو جانتے ہی ہیں... یہ ایک خاتون وکیل کا گھر ہے۔ بات ناممکن تو نہیں ہے مگر مشکل ہے۔ میں ابھی اس کا حل سوچتا ہوں۔ ویسے ہم نے مطلوبہ بنگلے کو بھی گھیرے میں لے رکھا ہے۔ میں ابھی اندر جا کر دیکھتا ہوں... پھر آپ کو بتاتا ہوں۔ آپ بے فکر رہیں... اسے دیکھتے ہی شوٹ کر دیا جائے گا۔"

اس نے بات ختم کی... وہ یقیناً اپنے داتا نواز چودھری ممتاز سے بات کر رہا تھا۔ وہ قانون کا ایک ذمے دار محافظ ہوتے ہوئے قانون کی جس طرح دھجیاں بکھیر رہا تھا، وہ ماورائے قانون ہی نہیں دائرۂ انسانیت سے بھی خارج نظر آتا تھا... اصولاً اس وقت اسے یہ ساری رپورٹ اپنے محکمے کے افسر کو دینی چاہیے تھی۔

"کاکا! ہم زیادہ دیر یہاں محفوظ نہیں رہ سکتے۔" میرے ساتھ دبکے بیٹھے اول خیر نے میرے کان میں ہلکی سی سرگوشی کی۔

"اس سے پہلے کہ پولیس کی مزید تعداد یہاں اکٹھی ہو... ہمیں نکلنا چاہیے۔" میں نے اس کی اس بات پر غور کرنے کے انداز میں سر کو اثباتی جنبش دی... پودوں کا یہ جھنڈ... زیادہ دیر ہمیں تحفظ نہیں دے سکتا تھا۔

سرکنے کی صورت میں پودوں اور پتوں میں سرسراہٹ کی آواز ایٹم بم کی طرح ابھرنے کے مترادف تھی، کیونکہ وہ دونوں اہلکار بالکل قریب ہی دوسری طرف منہ کیے کھڑے تھے۔ خوف کی وجہ سے ہم نے گویا اپنی سانسیں تک بھی روک رکھی تھیں۔ میں نے بہت ہلکی سرگوشی میں اس خدشے کا اظہار اول خیر سے بھی کیا کہ ہماری حرکت کی صورت میں ہمیں محفوظ اور دبنا: میں لیے ہوئے یہ پودے اچانک جانچ کر ان دونوں پولیس اہلکاروں کو اس طرف متوجہ کر سکتے ہیں۔

اچانک ہی ایک طرف سے پانی کا جنگر کھڑکھڑاتا ہوا گزرنے لگا۔ اس کے شور کی آواز خاصی بلند تھی۔ اول خیر نے میرا شانہ دھیرے سے دبایا اور بائیں جانب سرک گیا۔ اس کا مطلب سمجھ کر میں نے بھی فوراً اس کی تقلید کی۔ ہم دونوں پودوں کے جھنڈ کے اندر سے رینگتے ہوئے دونوں اہلکاروں کی نظروں سے بچتے بچاتے خالی پلاٹ والی جگہ پر آگئے اور دیوار سے چپکے چپکے آگے بڑھے۔ اسی وقت ایک تیز آواز ابھری۔

"رک جاؤ... ورنہ گولی مار دوں گا۔" وہ ایک سفید پوش پولیس اہلکار تھا یا پھر دشمن..... اس نے گویا بم پھاڑ ڈالا تھا، ہم دونوں سے خالی پلاٹ کی دیوار کے سرے تک آچکے تھے اور وہ اہلکار ہمارے عقب میں اچانک نمودار ہوا تھا اور غالباً ہمیں یوں چوروں کے سے انداز میں سرکتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔

"بھاگ... کاکا!" اول خیر دھیمے سے بولا اور یک دم مجھے کھینچتا ہوا دیوار کا سرا پار کر گیا۔ عقب میں گولی چلی جو دیوار کے کنارے کو چھیدتی ہوئی گزر گئی، سنگ ریزے میرے چہرے سے ٹکرائے۔ ہم دونوں نے دیوانہ وار دوڑ لگا دی۔

عقب میں شور گونج گیا۔ پولیس سائرن کی گونج ہمارے رہے سہے اوسان خطا کرنے کا باعث بنے گی۔

پولیس شاید ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ کیونکہ جیسے ہی ہم نے ایک بلاک عبور کیا، بائیں جانب دو پولیس اہلکار نمودار ہوئے۔ ایک کو رائفل سیدھی کر کے فائر کا موقع مل گیا۔ گولی چلی اور میں زد میں آگیا۔ بھاری رائفل کی تین انچ لمبی گولی کے ڈیڑھ سوت دہانی ٹکڑے نے میرے بائیں بازو کا گوشت پھاڑ ڈالا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا بازو کٹ کر الگ ہو گیا ہو۔ میں بھاگتے بھاگتے لڑکھڑایا۔ میری اذیت ناک چیخ نے اول خیر کو تشویش زدہ کر دیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے مجھے گرنے سے سنبھالا دینے کی کوشش چاہی اور دوسرے ہاتھ کی باکمال پھرتی سے اس نے اپنے شلوار کے نیفے میں اڑسا ہوا پستول نکال کر یکے بعد دیگرے دو فائر داغ دیے۔ دونوں پولیس اہلکار ہماری طرف پیش قدمی کرتے ہوئے دائیں بائیں دیواروں کی آڑ میں ہو گئے۔

"کاکا! ہوش کر... اس درد کو پی جا۔ وہ دیکھ، اِدھر گلی ہے۔ وقت نہیں ہے ہمارے پاس، بھاگ۔"

اول خیر نے جوش اور بے بسی کے زور سے عجیب سی آواز میں مجھ سے کہا اور پھر جیسے میں نے اپنے بازو کی کھولتی ہوئی اذیت کو بھلا دیا۔ آنکھوں اور دماغ میں چھائی دھند سے جنگ کا دورانیہ محض چند سیکنڈوں تک محیط رہا اور پھر جیسے سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ قدم تھوڑے سے لڑکھڑائے مگر اول خیر کے سہارا دیے بغیر دوبارہ جم گئے۔ ہم دوڑنے لگے۔ دوسرا بلاک پار کیا تو دفعتاً ایک سوزوکی ہمارے عین سامنے آگئی۔ ڈرائیور اگر بروقت بریک نہیں لگاتا تو اس سے ٹکرا کر ہمارے وجود یقیناً دور جا گرتے۔ اول خیر نے مجھے سنبھالتے ہوئے آگے بڑھنا چاہا مگر میں جیسے اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔ اول خیر کو حیرت ہوئی۔ وہ منہ کھولے میرا چہرہ تکنے لگا جبکہ میری نظریں سوزوکی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے اپنے ہم عمر شخص پر جم کر رہ گئی تھیں اور غالباً اس نے بھی مجھے پہچان لیا تھا اور اس کا چہرہ بھی پیلا پڑ سا ہو گیا۔ پولیس کے سائرن گونج رہے تھے۔ دفعتاً ڈرائیور دروازہ کھول کر نیچے اترا۔ وہ مجھے اور میں اسے بھلا کیسے بھول سکتے تھے؟ یہ شوکت حسین عرف شوکی تھا۔ شکیلہ کا بھائی۔ پہلے تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا مگر میں "اطفال گھر" کے رہنے والے اپنے اس قدر قریبی ساتھی کو کیسے بھول سکتا تھا۔ یہ شوکت حسین ہی تھا... شکیلہ کا بھائی، دبنی شکیلہ... جسے میں اوکاڑہ کی جتی بائی اور پھر بعد میں شفقت راجا کے بجنر باصفت دلال کے شیطانی چنگل سے چھڑا کر لانے میں کامیاب ہوا تھا۔ بعد میں اسے میں نے سردار بابا کی محفوظ پناہ میں دے رکھا تھا۔ اس کے بعد عابدہ نے مجھے بتایا تھا کہ شکیلہ... اپنے بھائی شوکت حسین کے ساتھ چلی گئی تھی اور پھر دونوں بھائی بہن ہنسی خوشی ایک چھوٹے سے کرائے کے مکان میں رہنے لگے تھے۔ پل کے پل یہ سب باتیں میرے ذہن میں گھوم گئیں۔

"شہزی بھائی! جلدی کرو... پیچھے سوار ہو جاؤ۔"

شوکی بولا۔ وقت کی نزاکت اور صورت حال کا ادراک شاید اسے پہلے ہی سے تھا۔ اسی سبب اس نے بھی شناسائی کلمات میں ذرا بھی وقت ضائع نہ کیا۔ اول خیر کے لیے وہ اجنبی تھا۔ تاہم اس حد تک تو وہ بھی سمجھ ہی گیا تھا کہ ہم دونوں بہرحال باشناسا تھے۔ تاہم میرے زخمی بازو سے خون رستے دیکھ کر شوکی کی آنکھوں میں تشویش کے سائے لہرا گئے۔ میں اور اول خیر ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر سوزوکی کے پچھلے حصے میں جا سوار ہوئے۔ اس میں فروٹ کی چوبی پیٹیاں لدی ہوئی تھیں اور اوپر کینوس چڑھا ہوا تھا۔ کچھ جگہ خالی تھی، کچھ ہم نے پیٹیاں کھسکا کر بنا ڈالی اور سوار ہو گئے۔ شوکی نے سوزوکی آگے بڑھانے میں دیر نہیں لگائی۔ سوزوکی ایک جھٹکے سے آگے بڑھی اور بتدریج اس کی رفتار تیز ہوتی چلی گئی۔

☆☆☆

ایسی نازک اور خطرناک گھڑی تھی جب میں بے رحم موت کی سفاک نظروں کی عین زد میں تھا۔ شوکی کا عین وقت پر سامنا ہونا محض اتفاق نہیں ہو سکتا تھا۔ اس میں ضرور تائیدِ ایزدی کارفرما تھی۔ مجھے خود پر نیکوکار اور پارسائی کا دعویٰ نہ تھا، نہ ہی میں دودھ کا دھلا تھا۔ میں تو خود ایک گناہ گار انسان تھا اور موقع بموقع دعائے عافیت میں اپنے اللہ کے حضور دانستہ و نادانستہ گناہوں کی معافی ہی مانگا کرتا تھا... مگر قدرت کے بھی کچھ مخفی اصول ہوتے ہیں جنہیں وسیع النظری اور گہری سوچ سے سمجھا جا سکتا ہے۔ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے جیسی مثالیں ایسے ہی نہیں تخلیق ہوئیں۔ زندگی کی پُرعافیت بہاروں سے پل کے پل موت کے بے رحم شکنجے کی جکڑ میں پھنس جانا اور موت کے اندھیروں کے قعرِ فنا میں لڑھکتے ہوئے اچانک زندگی کی مامون پناہ میں آجانا... یہ تائیدِ ایزدی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

اپنے مضطرب بازو کے زخم پر میں نے ایک ہاتھ رکھا ہوا تھا جس پر تھوڑی سی کوشش سے اول خیر نے اپنی چادر کا ایک کونا پھاڑ کر لپیٹ دیا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ زخم کی تکلیف، درد، اذیت اور

جلن کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ میں نے ہونٹ اور دانت بھینچ رکھے تھے۔ ارل خیر... مجھے سنبھالنے کے انداز میں لپٹا ہوا تھا اور بار بار کہے جا رہا تھا۔ ''حوصلہ رکھو... کاکے... حوصلہ رکھو یار... تم خطرے سے باہر ہو۔'' میں صرف اپنے سر کو اثبات میں ہی جنبش دے سکا تھا۔ بازو کی تکلیف معمولی نہ تھی۔ رائفل کی بے رحم گولی نے بازو ادھیڑ ڈالا تھا... مجھے فرسٹ ایڈ کی سخت ضرورت تھی۔ نجانے کتنا خون بہہ چکا تھا اور اب بھی بہہ رہا تھا۔ میں بار بار ہوش اور بے ہوشی کے درمیان ڈولتا اور خود پر طاری ہونے والی غنودگی کو دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر کب تک، آخر بے ہوشی مجھ پر حملہ آور ہونے میں کامیاب رہی اور مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

بے ہوشی سے ہوش و خرد کے درمیان کتنا وقت بیتا، مجھے نہیں معلوم پر آنکھ کھلنے پر مجھے ایک نیا چہرہ دکھائی دیا... نرم، نازک مہربان چہرہ... کشادہ آنکھوں سے ٹپکتی شہد جیسی مٹھاس جیسے چہروں میں مجھے عابدہ کا ہی چہرہ دکھائی دیتے لگتا تھا اور اس چہرے کو بھی دیکھ کر بے اختیار میرے کپکپاتے لبوں سے ''عابدہ'' نکل گیا... مجھ پر جھکے ہوئے خوابناک سے چہرے پر بیداری کی جھلک نمودار ہوئی، اور ایک نرم سی آواز میری سماعت سے ٹکرائی اور دعائیہ کلمات تھے جو میری عابدہ کے لیے اس مہربان نرم و نازک چہرے کے دلآویز ہونٹوں سے برآمد ہوئے۔

''اللہ عابدہ کو اپنی امان میں رکھے شہزی! تمہیں ہوش آ گیا۔''

ہوش میں آتے ہی مجھے سب کچھ یاد آتا چلا گیا اور یہ بھی پہچان گیا کہ میرے سامنے کس کا چہرہ تھا... یہ شکیلہ تھی یہ ایک چھوٹا کمرا تھا مگر بہت نفاست سے سجا ہوا تھا۔ ایک سیدھ روشن تھا۔ میں عام سے مگر صاف ستھرے بیڈ پر دراز تھا۔ میرا اوپری بدن برہنہ تھا حسیات جاگیں تو مجھے بازو کی تکلیف کا احساس ہوا۔ جہاں اب ہلکی ہلکی ٹیسیں تو اٹھ رہی تھیں لیکن اس پر اب ایک نرم سی ٹھنڈک کا احساس بھی تھا۔ میں نے سر گھما کر دیکھا وہاں خاصی موٹی سفید رنگ کی بینڈیج بندھی ہوئی تھی۔

''اب کیسا محسوس کر رہے ہو تم؟'' معاً شکیلہ نے پوچھا۔ وہ میرے قریب بیڈ کی پائنتی پر ٹکی بیٹھی تھی۔ اس کے گھنے بھورے بال بالی نصف شانے پر اور نصف اس کے چمکتے اور پرکشش چہرے پر جھول رہے تھے۔ اس نے پھول دار سوٹ پہن رکھا تھا جو اس کی دلکشی اور حسن و نزاکت میں اضافہ کر رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اب اپنے بھائی شوکت حسین کے ساتھ نسبتاً بہتر اور پرسکون زندگی گزار رہی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں... مم... مگر میرا ساتھی کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ مسکرا کر بولی۔ ''وہ اور بھائی دوسرے کمرے میں باتیں کر رہے ہیں، تمہیں بھوک لگی ہے؟'' اس کے یاد دلانے پر مجھے بھوک کا احساس ہونے لگا مگر حلق میں کانٹے چبھتے ہوئے زیادہ محسوس ہوئے، میں نے اس سے پانی مانگا۔

قریب رکھی تپائی پر شیشے کا جگ اور گلاس رکھا تھا۔ گلاس میں پانی انڈیل کر شکیلہ مجھے سرہانے سے سہارا دینے کے لیے ایک بار پھر مجھ پر جھک گئی، اس کے بدن کی حرارت اور خوشبو میرے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔ اس نے گلاس میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ میں غٹاغٹ پورا گلاس خالی کر گیا۔

''اور دوں؟'' شکیلہ نے محبت سے پوچھا۔

''نہیں۔'' میں سیدھا ہو کے لیٹ گیا اور آنکھیں موند لیں۔ پھر دوبارہ آنکھیں کھولیں اور قریب بیٹھی شکیلہ سے پوچھا۔ ''میرے بازو کی پٹی کس نے کی؟''

''محلے کے ایک ڈاکٹر کو بلا لیا تھا، اس نے ہی ڈریسنگ کی تھی۔'' اس نے جواب دیا۔ میری آنکھوں میں تشویش کے سائے لہرائے جنہیں بھانپ کر شکیلہ بولی۔ ''فکر نہ کرو۔ اسے کچھ نہیں بتایا گیا... ویسے بھی اس جیسے نیم حکیم ڈاکٹروں کا مقصد صرف پیسا کمانا ہوتا ہے، انہیں ان معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی اور نہ ہی وہ خود کو کسی ایسے معاملے میں پھنسانا پسند کرتے ہیں۔''

''ڈریسنگ تو اس نے ٹھیک کی ہے نا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، وہ اپنے کام میں خاصا تجربہ کار ہے اور کسی اچھے سرجن اور ڈاکٹر کے انڈر طویل عرصے تک کام کرتا رہا ہے، اس کی مہارت کی جھلک نے تمہارے ساتھی کو بھی متاثر کیا تھا۔ یہ ایک کیپسول اور گولی کھا لو تاکہ زخم خراب نہ ہونے پائے۔''

درمیانی دروازے پر کھٹکے کی آواز ابھری۔ میں نے ارل خیر و رشوکی کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔

شکیلہ سر پر دوپٹا درست کیے ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ میرے بیڈ کے قریب ایک سینٹر ٹیبل نما تپائی سی پڑی تھی

جس پر پرانے کُشن سجے تھے۔ وہ دونوں وہاں بیٹھ گئے۔

''کیسے ہو کاکا؟'' اول خیر نے میری طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

''کافی بہتر ہوں۔'' میں نے مختصراً کہا پھر اس کے ساتھ بیٹھے شوکی سے بولا۔ ''شوکی! میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھول سکتا۔ تم نے خود کو خطرے میں ڈال کر... ہماری جان بچائی۔''

''اور تم نے جو میری پیاری سی بہنا شکیلہ کو مجھ سے ملا کر احسان کیا تھا، کیا وہ تم بھول گئے؟'' شوکی مسکرا کے بولا۔ یہ جملہ اس نے ایک نظر قریب کھڑی اپنی بہن شکیلہ پر ڈالتے ہوئے کہا۔ میں جھینپی سی مسکراہٹ سے بولا۔

''ارے یار! دوستوں میں کیسا احسان۔ یہ تو فرض ہوتا ہے۔''

''تو پھر میں نے بھی تم پر کوئی احسان نہیں کیا، یہ میرا فرض تھا۔''

''مجھے عابدہ نے تمہارے اور شکیلہ کے بارے میں بتایا تھا۔'' میں نے ہولے سے کہا۔ ''مگر تم تو سبزی منڈی میں تھے یہ سوزوکی ڈرائیور کب سے بن گئے؟''

''چھوڑو یار! لمبی کہانی ہے۔'' وہ بولا۔ میں نے محسوس کیا اس کے چہرے پر ایک لمحے کو تلخ کوشی کے آثار نمودار ہوئے جیسے اس سے کوئی تلخ یاد وابستہ ہو۔

میں نے پوچھا۔ ''اب کیا کرتے ہو؟''

وہ بولا۔ ''کرائے کی سوزوکی لے رکھی ہے۔ منڈی سے سبزی اور فروٹ ادھر اُدھر پہنچاتا ہوں۔ اللہ کا شکر ہے اچھی گزر ہو رہی ہے۔ یہ مکان کرائے کا ہے پر یار... شہزی! تمہارے بارے میں خبریں خاص طور پر دیکھتا اور پڑھتا رہا ہوں، مجھے افسوس ہے شہزی! تم ایک لمبے چوڑے گمبھیر معاملے میں پھنسا دیے گئے ہو۔ اس وقت ہم سب اگر اطفال گھر سے آزاد اور ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے ہیں تو ایسا صرف تمہاری وجہ سے ہے۔ تم نے ہم لوگوں کی خاطر اپنے اطفال گھر کے ساتھیوں کی خاطر کتنی بہادری اور جانفشانی سے اپنی جان کی بھی پروا کیے بغیر اتنی قربانیاں دی ہیں، وہ ہم کبھی نہیں بھلا سکتے... بلکہ ایک موقع پر تو میں تمہیں غدار اور دشمن بھی سمجھنے لگا تھا مگر بعد میں مجھے احساس ہوا کہ میں غلطی پر تھا، دوست! تم واقعی اس مثال کی زندہ تفسیر ہو کہ انسان کی زندگی کا مقصد دوسروں کے ساتھ بھلائی کرنا ہوتا ہے۔ مجھے تم پر فخر ہے دوست۔'' وہ جذباتی ہونے لگا۔

اول خیر میری تعریف پر فخر و خوشی سے پھول کر بولا۔ ''یار! شوکی! میرا یار شہزی بڑا اچھا بندہ ہے۔ بے شک یہ اپنے لیے نہیں... دوسروں کے لیے جیتا ہے اور جی دار بھی بڑا ہے۔''

''یار شہزی! مجھے اول خیر نے تمہارے مزید حالات سے بھی باخبر کر دیا ہے۔'' شوکی سنجیدہ ہو کر دوبارہ بولا۔ ''یقین کرو... میں خود بھی تم سے ملنا، تمہاری مدد کرنا اور تمہارے کام آنا چاہتا تھا۔ تم یقین کرو، آج تمہیں دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔ میں اور اول خیر دوسرے کمرے میں یہی تبادلۂ خیال کر رہے تھے کہ...''

''میرا خیال ہے... شہزی بھائی کو آرام کرنے دیا جائے، یہ موضوع بعد کے لیے اٹھا لو... کھانا بھی تیار ہے۔'' دفعتاً شکیلہ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ دیوار پر لگے سستے سے وال کلاک پر اس وقت دو بج رہے تھے۔ شکیلہ نے بڑی نفاست سے کھانا بنایا تھا۔ میری پشت کے پیچھے بڑا سا گاؤ تکیہ لگایا گیا تھا۔ میں نے اپنے بستر پر ہی کھانا کھایا تھا جبکہ دوسرے بیڈ پر اول خیر اور شوکی نے دسترخوان بچھا کر کھایا تھا۔ شکیلہ نے مرغی کا سالن اور دستر پلاؤ بنایا تھا۔ میٹھے میں دودھ سوئیاں تھیں۔ میری حالت اور کیفیت کافی سنبھل گئی تھی۔ بعد میں چائے کا دور چلا اور ایک بار پھر ہم محوِ گفتگو ہو گئے۔ میں آسیہ سے بات کرنا چاہتا تھا اور جب تک ہم اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اب ورلڈ شو پروگرام شوکی کے گھر سے کیا جائے۔ وہ سب میرا چہرہ تکنے لگے جبکہ میں آسیہ کے سیل کا نمبر پنچ کر کے دھڑکتے دل کے ساتھ فون اپنے کان سے لگائے ہوئے تھا۔

آسیہ سے رابطہ ہوا تو وہ کافی متوحش اور تشویش زدہ تھی۔ ظاہر ہے اس کی وجہ میں ہی تھا۔ اس نے پہلے تو میری خیر بہت پوچھی میں نے مختصراً اپنے بارے میں صرف اس قدر ہی بتایا کہ میں جہاں ہوں بالکل ٹھیک ہوں۔ اپنے زخمی ہونے کا بھی میں نے اسے ابھی نہیں بتایا تھا۔ تب اس نے بتایا کہ اس کی باجی کے بنگلے کے باہر ہونے والی فائرنگ کے باعث ماحول کشیدہ ہو گیا تھا۔ پھر انسپکٹر روشن کی معیت میں پولیس نے ناظم شاہ کے گھر کا دروازہ بھی کھٹکھٹایا تھا مگر اسے زیادہ دخل اندازی کی جرأت نہ ہو سکی۔ تاہم اس کا انداز جارحانہ تھا... مگر زیادہ کھل نہ کھلا سکا۔

''زبیر خان کی طرف سے بھی تمہارے حق میں تردیدی بیان جاری ہو چکا ہے۔'' آسیہ نے حسبِ توقع ایک نئی اطلاع دی۔

"باجی نے اس کے بیان کو قابل کرلیا ہے۔ اب کسی طرح یہ اہم کام ہو جائے تو پھر تمہارے سلسلے میں کافی مثبت پیش رفت ہونے کی امید ہے۔"

میں نے کہا۔ "سنو آسیہ! میرا خیال ہے اب یہ پروگرام تمہاری باجی کے ہاں ہونا تو ناممکن ہی ہے... کیا تم اس پروگرام کا بندوبست کسی اور مقام پر کرسکتی ہو؟"

"تم کہاں ہو؟" اس نے فوراً پوچھا۔

میں نے اسے شوکت حسین اور شکیلہ کے بارے میں مختصراً بتایا تو وہ بولی۔ "یہ ٹھیک رہے گا اور یقیناً یہ کافی حد تک محفوظ جگہ بھی ہوگی۔"

میں نے کہا۔ "بالکل، یہاں مجھے کوئی خطرہ تو نہیں لیکن... تمہاری طرف سے خطرے کا اندیشہ ضرور لاحق رہے گا... تم سمجھ رہی ہو ناں میری بات؟"

"ہاں، میں سمجھ رہی ہوں۔" وہ میری بات پر غور کرنے کے انداز میں بولی۔ "میں بہت محتاط ہو کے گھر سے نکلوں گی، مجھے اپنی بھی خفیہ نگرانی کا یقین کی حد تک شبہ ہے مگر..."

"تم اپنا حلیہ بدل کر بھی نکل سکتی ہو۔" میں نے اسے راہ سُجھاتے ہوئے کہا۔ "لیکن تمہیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہوگی۔ پولیس یا دشمن کے آدمی تمہارا تعاقب کرتے ہوئے یہاں بھی پہنچ سکتے ہیں۔"

"ہاں، میں اس بات کا پورا خیال رکھوں گی۔ مگر تم بے فکر رہو۔ میں ان سب کو جل دے کر نکل آؤں گی۔ تم فکر نہ کرو۔ میں ایسے کام کرنا جانتی ہوں۔" اس نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔

مجھے یہ تسلی تھی وہ ایک عام لڑکی نہیں ہے بلکہ انویسٹی گیٹیو اور کرائم رپورٹر تھی مگر دشمن بھی کم کا نہ تھے۔

"تم کب تک نکلو گی؟" میں نے پوچھا۔

جواباً وہ بولی۔ "کوشش تو میری جلد از جلد ہوگی کیونکہ ہمیں اتنا اہم معاملے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔"

"مگر جلد بازی بھی ہمارے لیے خطرناک ثابت ہوگی۔" میں نے کہا۔ اس سلسلے میں اس نے ایک بار پھر مجھے تسلی دی اور میرے موجودہ ٹھکانے کا پتا مانگا۔ میں نے شوکی کے گھر کا پتا اسے بتا دیا۔

اس کے بعد میں نے سرمد بابا سے بھی بات کی، انہیں بھی مختصراً اپنی خیریت سے آگاہ کیا اور انہیں تسلی دی کہ بہت جلد سب ٹھیک ہونے والا تھا۔ انہیں میری طرف سے بہت سخت تشویش آمیز فکر لاحق تھی۔ وہ کسی شفیق بزرگ کی طرح ہر وقت میری فکر میں مبتلا رہتے تھے۔

"میرے بچے! میں تمہارے لیے اللہ کے حضور بہت دعا مانگتا رہتا ہوں۔" وہ روہانسا ہو کے بولے۔

میں نے کہا۔ "بابا! شاید آپ کی دعا کے طفیل ہی اب تک زندہ ہوں۔ آپ میری فکر نہ کریں۔ انشاء اللہ بہت جلد سب ٹھیک ہو جائے گا۔" لمحہ بھر توقف کے دوران دوسری جانب سے مجھے بابا کے زیرِلب "آمین" کہنے کی آواز سنائی دی۔

میں نے کہا۔ "بابا! عابدہ سے تو میری دوبارہ بات نہ ہوسکی تھی۔ کیا وہ خیریت سے امریکا پہنچ گئی ہے؟"

عابدہ سے متعلق پوچھتے ہوئے میرا دل بے قابو سا ہونے لگا تھا۔ بابا نے تسلی دی کہ ائرپورٹ پر اترتے ہی اپنے پہنچنے کی اطلاع دے دی تھی۔ عارفہ نے یہ بھی بتایا تھا کہ عابدہ بہت مضبوط اعصاب کی لڑکی ہے۔ ابتدا میں وہ تھوڑا گھبرا رہی تھی مگر اب اس نے خود کو کافی سنبھال لیا ہے اور میرا پورا خیال بھی رکھ رہی ہے وغیرہ۔ تاہم وہ مجھ سے بات کرنے کے لیے بھی بے چین ہو رہی تھی، عارفہ نے کہا تھا کہ وہ...... نئے نمبر سے کسی وقت اور بہت جلد مجھ سے رابطہ کرے گی۔ میں نے ایک گہری سانس لے کر اپنے اندر چھلنے والی نامعلوم سی بے چینی کو کم کرنے کی کوشش چاہی اور پھر رابطہ منقطع کر دیا۔

مجھے خود بھی عارفہ کے فون کا بے چینی سے انتظار تھا۔ نہ جانے کیوں جب سے عابدہ ہزاروں میل دور امریکا عازمِ سفر ہوئی تھی، مجھے ایک بے نام سی بے کلی نے گھیر رکھا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ ایک شہر سے دوسرے شہر نہیں بلکہ ایک براعظم سے دوسرے براعظم کو سدھار چکی تھی۔ بے شک اس میں ایک نیک مقصد ہی کا جذبہ کارفرما تھا۔ عارفہ کی صحت یابی اور ان کے بخیر و عافیت.... امریکا سے پاکستان لوٹ آنے کے لیے میں دعا گو بھی تھا۔ عارفہ کے علاج معالجے اور ان کی واپسی ایک ماہ کے اندر ہی متوقع تھی مگر یہ ایک ماہ کا عرصہ مجھے ایک صدی کے برابر محسوس ہونے لگا تھا۔

"آپ نے کیا کہا؟" ارل خیر نے مجھے سوچ میں گم دیکھ کر پوچھا۔ میں نے اسے آسیہ کے پروگرام سے آگاہ کر دیا۔ شوکت اور شکیلہ کا بھی خیال اور مشورہ یہی تھا کہ اب آسیہ والی سیڈ یا کارروائی ادھر ہی نمٹانا زیادہ بہتر ہے۔

"بس اب دعا کرو کہ آسیہ بخیر و عافیت یہاں پہنچ جائے۔" ارل خیر نے پُراندیش لہجے میں کہا۔

میں نے شوکت کے چہرے کی طرف دیکھا۔ مجھے اس کے چہرے سے کوئی ڈر و خوف کے آثار نظر نہیں آئے۔ دونوں بہن بھائی بڑے کھلے دل کے تھے۔ وہ دونوں اس کم عمری میں اسی قسم کے حالات سے گزرتے رہے تھے مگر پھر بھی مجھے ان کا احساس تھا لہٰذا میں نے شوکی کی طرف تکتے ہوئے ممنون لہجے میں کہا۔

"یار شوکی! ہماری وجہ سے تم..."

"بس... بس... آگے کچھ مت کہنا۔" شوکی نے فوراً میری بات کا مطلب سمجھتے ہوئے مجھے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔

"یہاں ایسا کچھ بھی نہیں ہو رہا جس سے ہمیں کسی قسم کا خطرہ ہو اور ہو بھی تو مجھے پروا نہیں بلکہ مجھے خوشی ہوگی کہ ہم بھی تمہارے کسی کام آسکیں۔" بھائی کی بات پر شکیلہ بھی بولی۔

"ہاں شہزی بھائی! آپ نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر اب تک ہمارے لیے جو کچھ کیا، اس کا تو یہ عشر عشیر بھی نہیں۔ اللہ آپ کے حالات جلد سے جلد بہتر کرے۔ آپ اسے اپنا ہی گھر سمجھیں۔"

"تم دونوں کے خلوص کی میں دل سے قدر کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "درحقیقت یہ آخری اسٹیپ ہی میری زندگی کا ایک اہم موڑ ثابت ہونے والا ہے۔ اس سے عام لوگ اصل حقائق سے آگاہ ہو جائیں گے اور میری قانونی پوزیشن بھی بہتر ہو جائے گی۔ قوی امکان ہے کہ میری بریت بھی ہو جائے۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔" شکیلہ کے لبوں سے بے اختیار نکلا تو اول خیر اور شوکی نے بھی ہولے سے انشاء اللہ کہا۔

میں نے اول خیر کو دیکھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔

"میرا خیال ہے اس سلسلے میں آپ کو ایک بے حد نازک مگر اہم قدم نہیں اٹھانا چاہیے۔"

ابھی ہم سب اس کی طرف مستفسرانہ نظروں سے دیکھ ہی رہے تھے کہ اس نے خود ہی اپنی بات کی وضاحت بھی کر دی۔

"تمہارا کیا خیال ہے کاکے! آپ کو یہ قدم اٹھانے سے پہلے میجر باجوہ صاحب کو اعتماد میں نہیں لینا چاہیے۔ میرا مطلب ہے اگر وہ انہیں اپنے اس اقدام کے بارے میں آگاہ کر دے اور ان کی مدد سے یہاں..."

"نہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر دو مطلب

بھکاری ادیب (مالک مکان سے): "آج سے چند سال بعد لوگ کہا کریں گے۔ اس مکان میں ملک کا ایک نامور ادیب رہا کرتا تھا۔"
مالک مکان: "جناب، اگر آپ نے پچھلے چھ ماہ کا کرایہ آج شام تک ادا نہ کر دیا تو لوگ یہ بات کل ہی سے کہنا شروع کر دیں گے۔"

بھی سمجھ کر... قطعیت سے کہا۔ "اس پر میں پہلے غور کر چکا۔ یہ خیال میرے ذہن میں بھی آیا تھا مگر ابھی یہ قبل از وقت ہوگا۔ یہ ایک طرح سے پریس ریلیز ہے۔ جس کا براہ راست تعلق... عوام اور رائے عامہ سے ہے۔ ایسے کسی لائیو پروگرام میں ایک ذمے دار سرکاری افسر کی شمولیت کو اول تو میجر باجوہ قبول ہی نہیں کریں گے، بالفرض کوئی اور قانونی اور پیچیدہ راستے پر ڈالنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ جس میں خطرات بہت زیادہ ہیں۔ ابھی تو ہم انہیں یہ بھی باور نہیں کروا سکے ہیں کہ انسپکٹر روشن کا سلوک میرے ساتھ ماورائے قانون، ذاتی مخاصمت اور جانبدارانہ رہا ہے۔ انسپکٹر روشن کی ماورائے قانون ریشہ دوانیوں کے منہ زور گھوڑے کو سر عام لگام دینے کے لیے فی الوقت یہ لائیو پروگرام نشر ہونا ضروری ہے، کسی ذمے دار اور فرض شناس قانونی اہلکار کو شامل کیے بغیر۔" سب نے میری بات پر صاد کیا پھر کو جنبش دیتے ہوئے اول خیر نے مجھ سے توصیفی لہجے میں کہا۔

"او خیر کا کا... تیرا ذہن تو یار بک بنی سے اور دور تک گھتیاں کھولتا ہے۔"

میں نے شکیلہ اور پھر شوکی کی طرف دیکھ کر خاصے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "آپ بلاشبہ ایک خطرناک اور دور کی قدم اٹھانے جا رہی ہے۔ تم دونوں کو احساس تو ہوگا... اس میں تمہارے لیے بھی خطرہ ہو سکتا ہے... میں نہیں چاہتا تھا کہ ایسا ہو مگر..."

"یار شہزی! یہ تم بار بار پٹری سے اترنے کیوں لگ جاتے ہو؟" شوکی نے میری طرف دیکھ کر یک دم بات کاٹی۔ شکیلہ بھی اس کی بات پر کھلے دل سے مسکرا دی۔

"آخر کو آپ بھی تو ہے نا... اس نے اپنے مستقبل، ریحان اور اپنی جان محض تمہاری خاطر خطرے میں ڈال رکھی ہے۔ بے شک ایسا وہ اپنی ایک غلطی کے ازالے کے طور پر کر رہی ہے مگر آج زمانہ کوئی اپنا قصور، اپنی غلطی تسلیم نہیں کرتا۔ اس پر مستزاد عملی طور پر اس کے ازالے

کا بھی مظاہرہ کرے۔" شکیلہ نے آسیہ کے سلسلے میں اچھا خاصا تبصرہ کر ڈالا۔ شوکی میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کے بولا۔

"شہزی! اب دوبارہ ایسی بات نہ کرنا یار! تم نے ہماری خاطر بھی تو بہت کچھ کیا ہے۔اب دعا کرو کہ آسیہ خیریت سے یہاں تک پہنچ جائے۔"

میرا اپنا ارادہ یہی تھا کہ یہ پروگرام ہوتے ہی میں اور اول خیر یہاں سے فوراً کوچ کر جائیں۔ ایڈووکیٹ خانم شاہ میرے کیس کے سلسلے میں تمام ہیپر ورک مکمل کر چکی تھی۔ اس پروگرام کے لائیو آن ائر ہوتے ہی اس کی ویڈیو کلپ، زبیر خان کا تردیدی بیان اور نوشابہ سے متعلق حقیقت تک سارا ہوم ورک کرنے کو وہ تیار بیٹھی تھی۔

سہ پہر کے چار بج چکے تھے۔ ہم چاروں ایک کمرے میں موجود تھے۔ میرے زخمی بازو کی ٹیسیں کچھ کم ہوئی تھیں۔ شکیلہ اس درمیان میں چائے بنا لائی تھی۔ دو گھنٹوں میں چائے کا یہ دوسرا دور تھا۔ ہم سب آسیہ کے بخیر و عافیت یہاں پہنچنے کی دعائیں مانگ رہے تھے۔

اچانک میرے سیل فون کی بیل بجی اور بند ہو گئی۔ میں ذرا چونکا۔ اسکرین پر نمبر دیکھا۔ اچانک دوبارہ بیل بجی۔ میں بیڈ پر سیدھا ہو کر اسکرین پر ابھرنے والے نمبر کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔ نمبر نامعلوم تھا مگر اس کے ڈیجیٹلز کی تعداد زیادہ تھی۔ مجھے حیرت ہوئی، تب اچانک میرے ذہن کو جھٹکا لگا۔ یہ بیرون ملک سے آنے والی کال تھی۔ یکلخت میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں اور فوراً سیل کان سے لگا کر ہیلو کہا۔ میرے ہیلو کہنے کے پورے دو تین سیکنڈوں بعد عابدہ کی آواز ابھری۔ میرا پورا وجود مرتعش ہونے لگا۔

"شہزی!... میں بول رہی ہوں عابدہ۔"

"ہا... ہاں... ہاں... میں سن رہا ہوں... تم... تم... کیسی ہو... خیریت سے پہنچ گئی ہو ناں؟" ایک دو سیکنڈ بعد عابدہ کی آواز ابھری۔

فاصلہ طویل ہونے کے باعث ایک دو سیکنڈ کا وقفہ درمیان میں آتا تھا۔

وہ بولی۔ "ہاں ہم خیریت سے پہنچ گئے ہیں۔ یہاں نیویارک سٹی کے ایک اسپتال میں ہیں۔ عارفہ باجی کے ڈاکٹرز نے کچھ ٹیسٹ لیے ہیں۔ ان کے رزلٹ آتے ہی ان کا آپریشن کر دیا جائے گا۔" مجھ سے ہزاروں میل دوری سے باتیں کرتے اس کی آواز بھی کانپ رہی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ اس وقت اسی اسپتال کے لینڈ لائن نمبر سے بات کر رہی ہے۔

"شہزی! تم میری فکر مت کرنا، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم اپنی خیریت سے آگاہ کرو۔ تمہارا معاملہ کہاں تک پہنچا؟" وہ متفکر ہونے لگی۔ میں نے اسے اپنی طرف سے بھی حوصلہ افزا اطلاع دینا ضروری سمجھا۔ آخر میں اس نے کہا۔

"عارفہ باجی آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ لو ان سے بات کرو۔"

عارفہ سے بات کرنے کا میرا یہ پہلا موقع تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ عابدہ ایک لمحے کے لیے بھی فون سے دور ہو مگر مجبوری تھی۔ تھوڑی دیر بعد ایک کمزور سی آواز ابھری۔

"کیسے ہو شہزاد؟" میں اپنے بارے میں بھلا اسے کیا بتاتا۔ وہ خود بستر مرگ پر تھی لہٰذا میں نے اس کی طبیعت پوچھی۔

"آپ کیسی ہیں؟"

"میں بھی ٹھیک ہوں۔ بس دعا کرو۔ آپریشن کامیاب ہو جائے۔"

"انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔ ہم سب کی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔"

"شہزاد! میں دراصل تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی۔ یہ تمہاری بہرحال بڑی قربانی ہے کہ تم نے عابدہ کو اتنی دور بھیجنے کی اجازت دی۔"

"میں نے کوئی احسان نہیں کیا عارفہ صاحبہ! سرمد بابا کے مجھ پر اور عابدہ پر اس سے زیادہ بڑے احسانات ہیں اور پھر وہ ہم دونوں کو اپنے بچوں جیسا ہی سمجھتے ہیں۔ ہماری تو بس یہی دعا ہے کہ آپ جلدی اور مکمل صحت یاب ہو کے دوبارہ وطن واپس لوٹ آئیں۔"

عارفہ سے واجبی سی گفتگو کرنے کے بعد میری آخر میں عابدہ سے بات ہوئی مگر اسے مجھ سے زیادہ بات کرنے کا موقع نہ مل سکا اور لائن کٹ گئی یا پھر شاید اسپتال کی انتظامیہ نے اتنا ہی وقت دے رکھا تھا یا پھر کوئی اور وجہ تھی بہرطور... عابدہ سے گفتگو کر کے میرے دل کی کچھ ڈھارس بندھ گئی تھی۔ جانے کیا بات تھی جب میں عابدہ سے بات کر لیتا تھا تو دل کو عجیب سی تسکین محسوس ہوتی تھی میرے حوصلے مزید بلند ہونے لگتے تھے، میری طوفانوں میں گھری... زندگی کو سکون ملنے لگتا تھا۔

اول خیر، شکیلہ اور شوکت حسین خاموشی سے بیٹھے میرا چہرہ تک رہے تھے۔ میں نے ایک گہری سانس خارج کر

کے اول خیر کی طرف دیکھا اور اسے طلب کیجے میں پوچھا۔

"آسیہ سے رابطہ کیا جائے؟"

"کر کے دیکھ لو... اس کی مہم کہاں تک پہنچی ہے؟" اس نے کہا۔ میں نے دھڑکتے دل سے آسیہ کا نمبر ملایا۔ رابطہ ہوتے ہی اس کی پرتشویش آواز ابھری۔

"شہزی! مجھے کوئی بڑی گڑبڑ محسوس ہو رہی ہے۔" اس کی بات سن کر مجھے اپنے پیٹ میں گرہیں پڑتی محسوس ہونے لگیں۔

"کیوں خیریت؟ تم ابھی نکلی نہیں ہو؟" میں نے پوچھا۔

"دو تین بار کوشش کر چکی ہوں۔" وہ جواباً فکرمندی سے بولی۔ "مگر مجھے واپس لوٹنا پڑا۔ بہت سخت نگرانی ہو رہی ہے۔ ایک بار تو مجھے گھیرنے کی کوشش کی گئی تھی، بڑی مشکل سے واپس گھر لوٹی تھی۔ شہزاد! ممتاز خان نے سارا زور اس طرف لگا رکھا ہے۔ مجھے دال میں کالا لگتا ہے۔ یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے ممتاز خان کو پہلے ہی سے ہماری مہم کا پتا لگ گیا ہے۔"

اس کی بات سن کر میرے ذہن رسا میں جھماکا ہوا۔ ممتاز خان کو ہماری مہم کا پتا لگنے کا اندیشہ بعید از قیاس نہیں ہو سکتا تھا۔ ان عوامل اور تازہ صورت حال پر فوراً غور کرنے کی ضرورت تھی۔ میں نے آسیہ سے دوبارہ رابطہ کرنے کا کہہ کر فون بند کیا اور اول خیر کی طرف متوجہ ہوا، پھر اسے آسیہ کی گفتگو سے آگاہ کیا۔ ممتاز خان کو ہماری مہم سے آگاہ کرنے والا یاسین ملک بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے سوچا۔ اس کی وجہ بڑی ٹھوس تھی۔ بےشک اس نے زبیر خان کے دباؤ یا روپے پیسے کے لالچ میں ہم سے تعاون کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی تھی لیکن یہ معاملہ اس کے اپنے نجی ٹی وی چینل کی ساکھ کا بھی تھا۔ بھلا کون سا ایسا ٹی وی چینل ہو سکتا تھا جو پہلے اپنے رپورٹرز کی ویڈیو کلپ دکھانے کے بعد اس کی تردید میں دوبارہ ایک نئی ویڈیو کلپ لائیو دکھاتا۔ یہی بات مجھے پہلے بھی کھٹک رہی تھی۔

جب میں نے اپنے اس خیال کا اظہار کیا تو اول خیر غصے سے دانت پیس کر بولا۔ "مجھے بھی اس ضمیر فروش یاسین ملک پر پہلے سے شبہ تھا مگر دل نہیں مانتا تھا کہ وہ درون خانہ ممتاز خان کے ساتھ ساز باز کرے گا۔"

"یہی میں اس کا مفاد تھا۔ یاسین ملک ہمیں ڈبل کراس کر رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"مجھے ایک بات سمجھ نہیں آ رہی ہے۔" شوکی نے کہا۔

ہم سب مستفسرانہ نظروں سے اس کا چہرہ تکنے لگے۔

”فرض کرلیا جائے کہ ہمارا یاسمین ملک والا اندیشہ درست بھی ہو تو... دشمنوں کو وسیع تر مفاد کے لیے آسیہ کا راستہ کھوٹا کرنے کے بجائے اس کا تعاقب کرنا چاہیے تھا۔ تاکہ انہیں اپنے شکار... یعنی خدانخواستہ تم تک پہنچنے میں آسانی ہوتی۔ انہوں نے ایسا کیوں نہیں کیا؟“

شوکی کی بات غورطلب تھی۔ جس سے میرا خیال باطل ثابت ہوتا تھا کہ یاسمین ملک نے درمیان میں کوئی چکر چلایا تھا مگر فوراً ہی اس کی بہن شکیلہ نے توجیہ پیش کردی۔

”اس کے باوجود ہمیں یاسمین ملک والے خدشے کو صرف نظر نہیں کرنا چاہیے۔ باتیں دونوں ہی ہوسکتی ہیں۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تمہارا صبح میں خانم شاہ کی رہائش گاہ کے قریب پولیس اور دشمنوں سے ہونے والا تازہ ٹکراؤ بھی چودھری ممتاز خان کی ساری توجہ اس طرف مرکوز کرنے کا باعث بن سکتا ہے پھر آسیہ بھی کوئی معصوم لڑکی تو نہیں تھی کہ منہ اٹھائے یہاں آنے کے لیے نکل پڑتی۔ ممکن ہے دشمنوں یا ”سفید پوش“ پولیس نے آسیہ کی خفیہ نگرانی یا تعاقب کیا، آسیہ پہلے ہی سے غیر معمولی طور پر محتاط تھی اس لیے خطرہ محسوس کرتے ہوئے وہ یہاں آنے کے بجائے واپس پلٹ گئی۔“

اس پر اول خیر نے میری آسیہ سے فون پر ہونے والی گفتگو کی ایک بات پر توجہ دلاتے ہوئے اپنے خیال کا اظہار بھی کرڈالا۔

”تم یہ بھی تو بتارہے تھے کہ بقول آسیہ کے... کچھ مشتبہ افراد نے اسے گھیرنے کی بھی کوشش چاہی تھی اگر انہیں صرف آسیہ کا تعاقب کرنا مقصود ہوتا تو پھر وہ ایسا کیوں کرتے؟ انہیں آسیہ کو نکلنے کا موقع دینا چاہیے تھا۔“

بات الجھ گئی تھی۔ میرا اپنا ذہن چکرانے لگا۔ ایک متوقع خدشے کی تائید ہوتی تو دوسرے لمحے اس کی تردید ہو جاتی۔ ہر بات سائنس اینڈ جلیبی کی کسوٹی پر برابر فٹ پائی جاتی۔ بالآخر میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

”میرا خیال ہے، یہ پل صبر و تحمل اور غیر معمولی محتاط روی سے کام کرنے کا متقاضی ہے... دشمنوں کو بہرحال ہمارے اس اہم قدم اٹھانے کی بھنک پڑ چکی ہے۔“

اس دوران میں ہم نے ٹی وی آن رکھا تھا۔ شکیلہ ٹی وی کیبل پر مختلف نیوز چینلز کو آن آف کررہی تھی۔ آسیہ نے مجھے بتایا تھا کہ زبیر خان کا نزدیکی بیان اخبارات میں بھی آچکا تھا جسے خانم شاہ فائل کرچکی تھی۔ اب... آخری مرحلہ ہی باقی بچا تھا۔ اس کے بعد وہ میری طرف سے عدالت میں صفائی پیش کرنے کا مقدمہ داخل کرتی۔ ہم سب گومگو سے بیٹھے تھے کہ اول خیر نے ایک مشورہ دیا۔

”کیا خیال ہے اس سلسلے میں زبیر خان کی مدد کیوں نہ لی جائے جبکہ وہ یہ مشورہ تمہیں دے بھی چکا ہے کہ ہم اس کی طرف کوچ کرنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔“ میں نے زبیر خان کے اس مشورے کو قابل عمل نہیں سمجھا تھا مگر اب ان مخدوش حالات میں اول خیر کے یاد دلانے پر مجھے بھی غور کرنے کی ضرورت محسوس ہورہی تھی مگر اس میں کئی قباحتیں تھیں۔ اس سلسلے میں شوکت اور شکیلہ نے تو کوئی جملہ نہ بولا البتہ میں نے ہی کہا۔

”مگر یہ ہمارا اور زیادہ خطرناک عمل ہوگا اس کے لیے ہمیں ہی نہیں... آسیہ کو بھی... کئی گھنٹوں کا طویل سفر کرنا ہوگا بجلاں والی نزدیک نہیں ہے جبکہ آسیہ بے چاری کا تو یہاں پہنچنا ہی محال ہورہا ہے۔“

”آسیہ کے یہاں آنے اور بجلاں والی پہنچنے میں زمین آسمان کا فرق ہوگا کاکے!“ اول خیر پُرسوچ لہجے میں بولا۔ ہم تینوں سوالیہ نظروں سے اس کا چہرہ تکنے لگے۔ لہٰذا اس نے اپنی بات کی وضاحت کی۔ ”وہ لوگ آسیہ کے اس طویل سفر سے جھنک بھی سکتے ہیں، وہ یہی سمجھیں گے کہ آسیہ نے اپنے گھر لاہور کی راہ لی ہے۔“

”اسے اغوا بھی تو کیا جاسکتا ہے؟“ میں نے فوراً کہا۔ اس پر اول خیر کو چپ سی لگ گئی۔ اچانک میں نے سوچا اب آسیہ سے رابطہ کرلینا چاہیے کیونکہ سردست ہم اس مسئلے کا کوئی حل نکالنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ اب اس سے پوچھنا تھا کہ وہ کیا کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ ابھی میں آسیہ سے بات کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اس کی کال آگئی۔ میں نے فوراً دھڑکتے دل سے اس کی کال وصول کی اور ہیلو کہا تو دوسری جانب سے بے ہنگم شور کی آواز سنائی دی۔ جس سے یکبارگی میرا دل زور سے دھڑکا۔ پہلا خیال میرے ذہن میں یہی ابھرا تھا کہ آسیہ اب گھر کی خاموش اور پُرسکون فضا کے بجائے کہیں باہر تھی۔ دوسرے لمحے ہی اس کی پُرجوش آواز ابھری۔

”شہزی! میں کسی طرح باہر نکلنے میں کامیاب ہوچکی ہوں اور شاید... میرا خیال ہے میں نے انہیں جل دینے میں بھی کامیابی حاصل کرلی ہے۔“

اس خوش کن اطلاع پر میرا دل خوشی سے بلیوں اچھل پڑا۔ میں پُرمسرت لہجے میں بولا۔ ''خدا تمہاری مدد کرے۔ یہ موقع تمہیں کیسے ملا؟ اور تم ابھی کہاں ہو؟'' جواباً اس کی آواز ابھری۔

''میرے پاس زیادہ وقت نہیں، بس ایک موقع مل گیا تھا۔ ایک گزرتے ہوئے احتجاجی جلوس کی ریلی میں داخل ہو گئی تھی۔ آگے جا کر میں لوگوں کے سمندر سے نکل آئی اور اب ایک رکشے میں سوار ہوں۔ تم پلیز جلدی سے مجھے ایک بار پھر اپنے دوست شوکت حسین کے گھر کا پتا سمجھا دو۔''

میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اسے دوبارہ سے پتا سمجھا دیا اور اسے مزید محتاط رہنے کی تلقین بھی کر ڈالی۔ اس کے بعد آسیہ نے رابطہ منقطع کر دیا۔ میری گفتگو سے اول خیر وغیرہ بھی سمجھ چکے تھے، تاہم میں نے اندیشوں اور خطرات میں گھری اس خوش خبری سے انہیں بھی آگاہ کر دیا۔ آسیہ اب کسی بھی وقت یہاں پہنچنے والی تھی۔ اب نجانے کیوں میرے دل و دماغ میں بار بار یہ وسوسے اور اندیشے... خدشات چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ کیا آسیہ کی صورت میں یہاں خطرات کی یلغار ہونے والی ہے۔ جس کی لپیٹ میں شوکت حسین اور شکیلہ بھی آ سکتے تھے۔ تاہم مجھے آسیہ پر مکمل بھروسا تھا کہ اس... خطرے کی کا احساس اسے بھی پورا پورا تھا۔ اسی لیے وہ..... یہاں آتے ہوئے ذرا سی بھی غفلت کا مظاہرہ نہیں کرے گی۔ اب ہم چاروں آسیہ کے بخیر و عافیت کامیابی سے یہاں پہنچنے کی دعا کیں ہی کر سکتے تھے۔

☆☆☆

ایک گھنٹا بیت گیا۔ شام کے چھ بج چکے تھے۔ گھر کے ایک کمرے میں ہم چاروں رم بخود سے بیٹھے تھے۔ کمرے میں سناٹے کی فضا تھی، یہ خاموشی دھڑکتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ یوں لگتا جیسے اس کے ساتھ ہمارے دم بخود وجود بھی دھڑک رہے ہوں اور ہم جیسے کسی بڑے طوفان کی متوقع آمد کے منتظر بیٹھے ہوں۔ میرے بازو کے زخم میں اب درد بھی نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا مگر ہلانے جلانے سے ہلکی ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔ بقول شوکی کے ڈاکٹر نے مجھے درد کا ٹیکا لگا رکھا ہے... کچھ گولیاں، کیپسول تپائی پر ایک چھوٹے کاغذی پڑے میں لپٹے پڑے تھے جس کی ایک خوراک شکیلہ مجھے دے چکی تھی تاہم میں چارپائی پر اٹھ بیٹھا تھا۔

اول خیر نے مجھے آسیہ سے رابطہ کرنے کو کہا۔ اسے تشویش ہونے لگی کہ آسیہ اب تک کیوں نہیں پہنچی تھی؟

اس دوران میں شوکت سودا سلف لینے باہر چلا گیا اور شکیلہ نے باہر صحن کا رخ کیا۔ میں اور اول خیر اب کمرے میں اکیلے موجود تھے۔ میں نے آسیہ کے سیل پر رابطہ کیا۔ اس نے مجھے تسلی بخش اطلاع دی۔

''شہزی! میں دو تین رکشے بدل چکی ہوں... وجہ تم جانتے ہو۔ اب میں سیدھی تمہاری طرف ہی آ رہی ہوں... او کے بائے۔'' اس نے فوراً رابطہ منقطع کر دیا۔ میں نے اول خیر کو بتا دیا۔ اسے کچھ اطمینان ہوا۔ اس کا بھی یہی خیال تھا کہ آسیہ کی طرف سے تاخیر دانستہ تھی۔ وہ ایسا احتیاط کے پیش نظر کر رہی تھی۔

آسیہ اب کسی بھی وقت یہاں پہنچنے والی تھی۔ میرے دل کو نجانے کیوں ایک بار پھر نامعلوم سی بے چینی محسوس ہونے لگی۔ شاید ان حالات میں یہ ایک فطری ردعمل تھا۔ مجھے پیاس محسوس ہونے لگی۔ کمرے میں رکھا پانی کا جگ خالی تھا۔ اس کے ساتھ گلاس رکھا تھا۔ اول خیر نے میری نظریں بھانپ لیں۔

''پانی پینا ہے؟''

''ہاں یار! پیاس لگی ہے۔''

''شکیلہ بہن کو آواز دوں؟''

''نہیں، میں خود لے آتا ہوں پانی۔'' میں نے اسے شکیلہ کو آواز دینے سے منع کر دیا اور چارپائی سے کھڑا ہونے لگا تو اول خیر نے مجھے فوراً آگے بڑھ کر سہارا دیا۔ مجھے چکر سا آیا مگر میں نے فوراً خود کو سنبھال لیا۔

''یار کاکے! میں خود چلا جاتا مگر اچھا نہیں لگتا شکیلہ میری بہن جیسی ہے پر یار! تیری بات اور ہے۔''

''میں سمجھ رہا ہوں یار! اس لیے تو خود جا رہا ہوں۔ تو بیٹھ وہ بے چاری پہلے ہی ہماری بہت خدمت کر رہی ہے۔ میری تیمارداری بھی اسی نے کی۔ میں اسے بار بار تنگ نہیں کرنا چاہ رہا۔'' میں نے اس کی بات سمجھ کر کہا اور پھر کمرے سے باہر صحن میں آ گیا۔ خالی گلاس میرے دائیں ہاتھ میں تھا۔

میرے سیدھے ہاتھ پہ کچن تھا وہاں موجود شکیلہ پر میری نگاہ پڑ گئی۔ وہ شاید رات کے لیے کچھ تیار کر رہی تھی۔ وہ پیڑھی پیڑے (چوکی) پہ بیٹھی تھی۔ چوکی پر بیٹھنے کی مجبوری یہ ہوتی ہے کہ اس پہ خاص انداز سے بیٹھ کر ہی کام کیا جا سکتا ہے اور جس ''خاص'' انداز میں شکیلہ بیٹھی تھی وہ اس نے مجھے اس کی طرف سے نظریں جھکانے پر مجبور کر رہا تھا۔ اس کا بھرا بھرا کسا ہوا شبابی گداز بدن کمان کی طرح کھنچا ہوا تھا۔

ورنہ احتیاطاً کے چیل نظر اتار کر اس نے قریب چارپائی پر رکھ چھوڑا تھا۔ نصف آستین سے جھانکتے اس کے بھرے بھرے گورے بازو بھی نمایاں تھے۔ میں ادھر ادھر دیکھنے لگا اور ساتھ ہی تھوڑا سا کھنکھارا تب وہ میری طرف متوجہ ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ لپک کر پہلے دوپٹا اٹھانے کی کوشش کرے گی مگر میری آہٹ پاتے ہی بولی۔

''او سوری! میں پانی کا جگ بھر کے رکھنا بھول گئی۔''

اس نے شاید میرے ہاتھ میں پکڑا خالی گلاس بھی دیکھ لیا تھا۔

''نہیں کوئی بات نہیں، میں خود پانی لے لیتا ہوں... کہاں رکھا ہے پانی؟'' میں نے اسے اٹھنے کی زحمت سے بچانے کی غرض سے کہا مگر وہ ایسے ہی رسوئی سے اٹھ کر میرے قریب آ گئی۔ اس نے دوپٹا ابھی نہیں اٹھایا تھا۔ وہ میرے بازو پر بندھی بینڈیج کو دیکھ کر بولی۔

''درد تو نہیں ہو رہا اب؟ لاؤ گلاس دو مجھے... تم اندر چلو میں پانی لاتی ہوں...'' میں نے خالی گلاس اس کی طرف بڑھا دیا۔ ناچار نظریں اٹھانا پڑیں۔ تنگ اور اونچی آستینوں کی قمیص کا گلا بھی ''زی'' کی صورت کشادہ تھا۔ اس کی ہوش ربائی سے بچنے کی خاطر میں نے پھر اپنی نظروں کا زاویہ اس کی طرف سے پھیر لیا اور کمرے کی جانب مڑ گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ایک دوسرا پانی سے بھرا جگ اٹھا لائی۔ گلاس بھی پکڑ رکھا تھا۔ اب اس نے دوپٹا لے رکھا تھا۔ میں اور اول خیر چارپائی پر بیٹھے تھے۔ شکیلہ نے پانی سے بھرا جگ اور گلاس رکھا پھر خالی جگ اٹھا کر مجھ سے بولی۔

''آسیہ کا کچھ پتا چلا؟''

''ہاں وہ آ رہی ہے۔'' میں نے مختصراً کہا۔

''بہت دیر کر دی اس نے پہنچنے میں۔'' شکیلہ نے کہتے ہوئے ریشمی کمر سے ذرا جھک کر ایک ہاتھ سے میز پر دھرے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلا اور پھر گلاس اٹھا کر میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے شکریہ کہہ کر گلاس اس کے ہاتھ سے لیا اور جوابا اسے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہونے والی آسیہ سے گفتگو کے بارے میں اسے بتا دیا۔ وہ خاموشی سے باہر نکل گئی۔ میں نے پانی پیا۔ اول خیر کو بھی پیاس لگ گئی۔ وہ اپنے لیے دوسرے گلاس میں پانی انڈیلنے لگا۔ میں نے اول خیر سے پرسوچ لہجے میں کہا۔

''یار! میں چاہ رہا تھا آسیہ کے یہاں پہنچنے تک ہم میں سے کسی ایک کو گھر سے باہر ذرا فاصلے پر کھڑے ہو کے کسی مشتبہ نقل و حرکت پر بھی نگاہ رکھنی چاہیے۔''

''خیال تو برا نہیں ہے تمہارا... کاکے۔'' پانی کا گلاس خالی کر کے اسے تپائی پر رکھتے ہوئے اول خیر نے میرے خیال کی تائید میں کہا۔ ''لیکن یہ کام کم از کم میں اور تو انجام نہیں دے سکتے۔''

''شوکت کرے گا یہ کام۔'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ ''وہ آسیہ کے یہاں بہ خیر و عافیت پہنچ جانے کے بعد تھوڑی دیر تک گرد و پیش پر نظر رکھے گا کہ کہیں کوئی آسیہ کے تعاقب میں یہاں تک آنے میں کامیاب تو نہیں ہو گیا۔ اس کے بعد وہ بھی اندر آ جائے گا۔''

''ہاں شوکت باہر ہی گیا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے اسے فون پر بتا دو؟'' اول خیر نے کہا۔ میں نے سیل لگا کر شوکی سے رابطہ کیا۔ وہ سودا لے کر گھر ہی آ رہا تھا۔ میں نے اسے ساری بات سمجھا دی۔ اور پوچھ بھی لیا کہ اس کے ہاتھوں میں زیادہ بھاری سامان تو نہیں ہے۔ اس نے بتایا تھا کہ کچھ خاص سامان نہیں، وہ گھر کے پاس ذرا فاصلے پر بنے ایک سگریٹ کیبن والے کے پاس کھڑا ہو جائے گا اور یونہی گپ شپ لگاتے ہوئے گرد و پیش پر نظر رکھے گا۔ ہم آسیہ کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔

اپنی آخری گفتگو میں آسیہ نے بتایا تھا کہ وہ رکشا گھر سے دور ہی کھڑا کر کے اتر جائے گی اور پھر اسے فارغ کر کے پیدل آگے بڑھے گی۔

تھوڑی دیر اور گزر گئی۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ ہم دونوں ٹھٹکے۔ یقیناً آسیہ ہی تھی۔ ہم دونوں ہی کمرے سے باہر صحن میں آ گئے۔ شکیلہ بھی کچن سے نکل آئی تھی۔ بالآخر میں نے ہی آگے بڑھ کر دھڑکتے دل سے دروازہ کھولا اور... دروازہ کھلتے ہی یک دم آسیہ مجھے دیکھتے ہی ''غڑاپ'' سے اندر داخل ہو گئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں بڑا سا ہینڈ بیگ بھی تھا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ شاید اس نے رکشے والے کو گھر سے کچھ زیادہ ہی فاصلے پر چھوڑ دیا تھا اور پیدل آتے ہوئے یہاں تک وہ خاصی ہانپ گئی تھی۔ شکیلہ سے اس کی یہ پہلی ملاقات تھی۔ غائبانہ تعارف تھا... ہم اسے اندر کمرے میں لے آئے۔ وہ میرے بازو میں بندھی پٹی کو دیکھ کر پریشان سی ہو گئی۔ میں نے مختصراً لفظوں میں اسے بتا دیا۔ اور تسلی بھی دی کہ ہڈی بچ گئی ہے بازو کی...

شکیلہ اس کے لیے پانی کا گلاس بھر لائی۔ اس نے پانی پیا اور دیر تک اپنے حواس بحال کرتی رہی۔

اول خیر کو میں نے دیکھا اور وہ فوراً باہر دروازے کی طرف لپکا تھا۔ اندر کمرے میں آسیہ کو شکیلہ کے ساتھ چھوڑ کر

میں بھی باہر صحن میں آگیا...... اول خیر بڑے محتاط انداز میں بیرونی دروازے کی باریک متوازی جھریوں سے باہر دیکھ رہا تھا... اور چند منٹوں تک اسی طرح رہا پھر پلٹا۔ میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور پوچھا۔ "سب ٹھیک ہے؟"

"ہاں، اب تک تو ٹھیک ہے تو..... شوکت سے رابطہ کر کے اپنا سیل مجھے دے۔" اس نے کہا۔ میں نے فوراً شوکت سے رابطہ کیا اور کیا۔

"اول خیر تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔" پھر سیل اول خیر کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے شوکت سے بات کی شوکت نے اسے بتایا کہ اس نے ایک لڑکی (آسہ) کو بڑا سا ہینڈ بیگ اٹھائے اپنے گھر میں داخل ہوتے دیکھ لیا ہے۔

"گڈ! اب ایک کام کرو شوکی یار شاوا! ذرا گشت کے انداز میں پچیس تیس قدموں تک راؤنڈ بائیں اور سامنے چہل قدمی کر کے اور گرد و پیش کا جائزہ لو... تم چند منٹ بعد گھر میں داخل ہو جانا۔"

شوکت عرف شوکی کو یہ ہدایت دینے کے بعد اول خیر نے مجھے سیل فون لوٹا دیا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ مگر وہ ویسے ہی کھڑا رہا اور تھوڑی دیر بعد خود بھی آگے بڑھ کر دروازے تک جاتا اور اس کے ساتھ لگ کر باہر جھانکنے لگتا۔

وہ مسلسل اس وقت تک کرتا رہا جب تک کہ شوکی اپنا مقررہ وقت یہ فیصلہ ڈیوٹی پوری کر کے نہیں لوٹ آیا... اس کے بعد شوکت نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

"سب ٹھیک ہے۔" کا گرین سگنل بھی دے دیا۔ اس کے ہاتھ میں سپر اسٹور کے دو تین شاپنگ بیگ تھے، جنہیں اس نے باورچی خانے میں رکھ دیا تھا۔ اس کے بعد ہم تینوں کمرے میں آگئے۔ شکیلہ نے وہاں مزید دو کرسیاں ڈال رکھی تھیں۔

میں نے دیکھا آسہ اپنے ہینڈ بیگ کو کھولے ہوئے تھی۔ اور اندر سے انیک ہتھیاروں کے بیچے لیپ ٹاپ اور ایک بڑے گول لینس والا کیمرا نکالے اس کی ایڈجسٹنگ وغیرہ میں لگی ہوئی تھی۔ اس کے نازک اندام چہرے سے اس وقت عجب طرح کا جوش مترشح تھا۔ اس وقت وہ آہنی ارادوں اور کچھ کر گزرنے کے جذبے سے معمور نظر آرہی تھی جبکہ شکیلہ ایک طرف کھڑی بڑے غور سے اس کی ایک ایک حرکت کو نوٹ کر رہی تھی۔ یہ سب دیکھ کر میرے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ رقصاں ہو گئی۔ اول خیر کے چہرے پر البتہ گہری... سنجیدگی طاری تھی۔

اخبار بینی

میرے ایک دوست کو اخبارات پڑھنے کا بہت چسکا تھا جس کے نتیجے میں وہ پاگل ہو گیا ہے اور اس کے ذہن میں عجیب طرح کے خوف اور ڈر ابھی جمع ہو گئے ہیں۔ ایک دن وہ میرے پاس آیا تو بہت گھبرایا ہوا تھا، کہنے لگا۔ "مجھے کچھ ہو گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا مطلب؟" بولا۔ کوئی ایک ہفتہ ہوا جاڑوں میں جب اپنے گھر کی گھنٹی بجاتا ہوں اور اگر اندر سے چند منٹ تک جواب نہ ملے تو میرا ذہن دو، تمام کہانیاں تیار کرنے لگتا ہے جو روزانہ سرخیوں کے ساتھ اخبارات میں شائع ہوتی ہیں۔ میں تصوراتی طور پر دیوار پھلانگ کر گھر میں داخل ہوتا ہوں تو مجھے ٹی وی لاؤنج میں اپنے بچے خون میں لت پت نظر آتے ہیں، ان کی گردنیں تن سے اسی طرح جدا ہوتی ہیں جیسے اخباروں میں چھپی ہوئی تصویروں میں دکھایا گیا ہوتا ہے۔ میں چیختا ہوا گھر سے باہر نکل جاتا ہوں۔ اہل محلہ مجھے دلاسہ دے رہے ہیں پھر اگلے روز کے اخبارات کی سرخیاں مجھے یاد آتی ہیں، جب سات جنازے اکٹھے اٹھے تو کہرام مچ گیا۔ برابر برابر پڑی ہوئی سات لاشوں کی تصویر بھی چھ کالم میں چھپی ہوتی ہے۔ بین کرتی ہوئی عورتوں میں کسی خوش شکل خاتون کو آہ و زاری کرتے دکھایا جاتا ہے۔"

"چند منٹ دروازہ نہ کھلنے پر تمہارا یہ حال ہو جاتا ہے، تم پاگل تو نہیں ہو گئے؟"

تھوڑی دیر بعد آسہ ساری تیاری مکمل کر چکی۔ اس کے بعد اپنا سیل فون نکال کر ہاتھ میں پکڑتے ہوئے بولی۔

"تمام تیاری مکمل ہے۔ میں اب پاسٹن ملک کو فون کر کے بتانے لگی ہوں کہ وہ ہمیں اپنے چینل میں "بریکنگ نیوز" کے ساتھ آن ائر لائیو کرے۔"

آسہ نے ابھی اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ اچانک باہر دروازے پر دستک کی آواز ابھری۔ ہم سب گویا ایک ساتھ ہی دھڑک اٹھے اور بےوقوفوں کی طرح ایک دوسرے کے چہرے کی طرف تکنے لگے۔

"یہ کون آگیا اس وقت؟" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ میری نظریں شوکی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

شوکی بڑبڑایا۔ "میں جا کر دیکھتا ہوں۔"

اول خیر نے کہا۔ "ٹھہرو، ایک دم دروازہ مت کھولنا، پہلے جھانک کر دیکھ لینا۔"

شوکی نے اثبات میں سر ہلا دیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ آسہ اور شکیلہ کے چہروں پر تشویش کے آثار ابھر آئے تھے۔ میں بھی باہر آگیا۔ میں نے دیکھا شوکی دروازے کی جھری پر جھکا باہر جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

جبکہ اول خیر، ہاتھ میں اپنا پسٹول پکڑے دروازے کے دائیں جانب چوکس کھڑا ہو گیا۔ میں نے بھی فوراً حرکت کی اور اپنے دائیں ہاتھ سے میگارو نکال لیا اور دروازے کی دوسری سمت دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔

شوکی نے سیدھے کھڑے ہو کر ایک طمانیت بھری سانس لے کر ہلکی آواز میں ہمیں بتایا۔

”باہر ڈینگی مچھر مار مہم کے تین افراد کھڑے ہیں۔ وہ یقیناً گھر میں اسپرے کرنا چاہتے ہیں۔“

میرے اور اول خیر کے چہروں پر الجھن سی تھی۔ شوکی ازراہ تشفی بولا۔ ”فکر کی کوئی بات نہیں۔ یہ مہم پورے شہر کی گلیوں اور محلوں میں جاری ہے۔ کل یہ لوگ ہمارے محلے کے پچھواڑے آئے تھے آج شاید اس طرف کی باری ہے۔“

اول خیر نے دھیمی آواز میں شوکت سے کہا۔ ”انہیں کل آنے کا کہہ دو۔“ ادھر آسیہ اور شکیلہ بھی حیران پریشان سی کمرے سے باہر نکل آئی تھیں... میں انہیں آگاہ کرنے لگا۔ تب ہم اول خیر کا مشورہ آسیہ نے بھی سن لیا تھا، آگے بڑھ کر بولی۔

”یہ بات شک کرنے والی ہے۔“ ہم نے اسے راستہ دیا۔ شوکی بھی دروازے کے پیچھے سے ہٹ گیا۔ آسیہ نے دروازے کے قریب منہ کر کے پوچھا۔ ”کون...؟“

”ڈینگی مچھر مار مہم کے سلسلے میں تھوڑا سا اندر اسپرے کرنا چاہتے ہیں۔“ دوسری جانب سے بھی ایک عورت کی آواز ابھری۔

اس پر مجھے اور اول خیر کو حیرت ہوئی اور میں نے شوکی کو ٹہوکا دے کر پوچھا۔ ”تم تو کہہ رہے تھے باہر تین افراد ہیں، یہ عورت کہاں سے ٹپک پڑی۔“ شوکی اسی اطمینان بھری مسکراہٹ سے بولا۔

”میں نے تین افراد ہی کہا تھا۔ یہ دو مردوں اور ایک عورت کی ٹیم پر ہی مشتمل ہوتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے چہروں پر ماسک چڑھائے ہوتے ہیں۔“

ادھر آسیہ انہیں ٹالنے کی غرض سے بولی۔ ”خاتون! آپ لوگ کل آجائیے گا۔ آج ذرا مہمان آئے ہوئے ہیں۔“ دوسری جانب سے اس بار ایک مرد کی آواز ابھری۔

”او بی بی! آپ کیسے عجیب لوگ ہو۔ ڈینگی مچھر نے پورے پنجاب میں تباہی مچا رکھی ہے۔ یہ گھر گھر مہم کی جا رہی ہے ہم دوبارہ نہیں آسکتے۔ یہ سرکاری حکم ہے۔ اگر آپ انکار کرتی ہیں تو ٹھیک ہے ہم لوٹ جاتے ہیں مگر ہمیں اس گھر کا نمبر اور شکایت انتظامیہ کے آفس میں درج کرانی پڑے گی اور رفیوز کی صورت میں آپ کو بھاری جرمانے کا نوٹس بھی مل جائے گا۔“

ہم سب الجھن آمیز پریشانی کا شکار ہو گئے مگر شوکی نے ہمیں تسلی دیتے ہوئے دوبارہ کہا۔

”گھبرانے کی بات نہیں۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ آج کل یہ ڈینگی مار مہم ہر جگہ کی جا رہی ہے۔ پانچ منٹ سے بھی کم وقت میں یہ اپنا کام کر کے چلے جائیں گے۔“ اس کی بات پر ہمیں صاد کرنا پڑا اور پھر ہمارے اشارے پر اس نے دروازہ کھول دیا۔ میں نے اور اول خیر نے نہ صرف اپنے پسٹول چھپا لیے بلکہ اپنے اوپر اوڑھی ہوئی چادروں میں اپنے چہرے بھی نصف حد تک ڈھانپ لیے تھے۔ تین افراد اندر داخل ہوئے، ان کے ہاتھوں میں فوارے اور سلنڈر تھے انہوں نے ہماری طرف دیکھے بغیر پروفیشنل انداز میں اپنا کام کرنا شروع کر دیا۔ وہ صحن میں بنی نالیوں، غسل خانہ اور کونوں کھدروں میں اسپرے کرنے لگے۔ میری آنکھیں ان کے چہروں کا جائزہ لے رہی تھیں مگر ماسک چڑھے ہونے کے باعث دکھائی نہیں دیے۔ سب نے مقدور بھر کوشش سے اپنی ناکوں پر ہاتھ رکھے رہے۔ اسپرے کی جانے والی دوائی کی بو تیز اور ناگوار تھی۔ رفتہ رفتہ مجھے اپنا دماغ گھومتا ہوا محسوس ہونے لگا... اور پھر اسی دوران میں نے اول خیر اور آسیہ کو کھڑے ڈولتے دیکھا۔ ہم میں سے سب سے پہلے شکیلہ دھڑام سے بے ہوش ہو کے گری تھی، آسیہ بھی گرنے لگی۔ اب مجھے اسپرے کی دوائی سے زیادہ خطرے کی بو محسوس ہونے لگی۔ میرے پورے وجود میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ مجھے اپنا دماغ بھی ماؤف سا ہوتا محسوس ہونے لگا۔ اتنے میں اول خیر کی ڈولتی ہوئی آواز سنائی دی۔

”کک... کاکے... ہم... مار کھا گئے۔“ پھر ایک زوردار ”دھپ“ کی آواز سے میں نے بھاری بھرکم وجود رکھنے والے اول خیر کو بھی گرتے دیکھا۔ میں نے اپنے مختل پڑتے حواسوں کو سنبھالا دینے کی کوشش میں ہاتھ میگارو کی طرف بڑھانا چاہا جو قمیص کے نیچے شلوار میں اڑسا ہوا تھا مگر پھر یکلخت جیسے میرے وجود کی توانائی بھی جاتی رہی، ٹانگیں کپکپانے لگیں اور جسم کا بوجھ برداشت نہ کر پائیں۔ غالباً آخری گرنے والا فرد میں ہی تھا۔

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

قاتل دوست

کاشف زبیر

دوست سے دشمن بننے کا سفر طے کرنے میں دیر نہیں لگتی... اور کبھی عمر کی منزلیں تمام ہو جاتی ہیں... تین دوستوں کی کہانی... ان کی زندگی کا مقصد لوگوں کی زندگیوں سے کھیلنا تھا... اپنے اس شوق اور ذریعۂ معاش کو وہ چاہتے ہوئے بھی خیرباد نہ کہہ سکے...

زندگی میں بھٹکے ہوئے پتلوں کا دردناک انجام

"شبیر!" میں نے بہت عرصے بعد جلال خان کی آواز سنی۔

"جلال خان۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "بہت دنوں بعد یاد کیا۔"

"تم فوراً آجاؤ میرے پاس۔ میرا ڈیفنس والا گھر دیکھا ہے نا؟" اس نے میری بات نظرانداز کر کے کہا۔

"میں آسکتا ہوں لیکن مسئلہ...؟"

"افضال غائب ہے کل رات سے۔"

افضال، جلال کا اکلوتا بیٹا ہے اور اس کے غائب ہونے کا مطلب تھا کہ جلال زندگی کے سب سے پریشان کن حالات سے دوچار ہے۔ میں نے کہا۔ ”میں آرہا ہوں۔“

جلال، میں اور شعبان پرانے وقتوں کے ساتھی تھے۔ ہم ایک ساتھ پڑوسی ملک سے اس شہر میں وارد ہوئے تھے۔ جب ہمارے ملک میں جنگ چھڑی تو ہم تینوں کالج میں پڑھ رہے تھے۔ اس وقت ہم نوجوان تھے اور اپنا کیریئر بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ روزگار کی کمی نہیں تھی بس اس شہر میں اپنی جگہ بنانی تھی اس لیے ہمیں بہت کوشش اور محنت کرنا پڑی۔ بالآخر ہم کامیاب رہے اور شہر کے ایک حصے پر ہم نے اپنی اجارہ داری قائم کر لی۔ جو کام پہلے ہم کرتے تھے اب وہ کام ہمارے لیے دوسرے کرنے لگے۔ مگر دس سال بعد حالات بدل گئے۔ میدان میں نئے نئے کھلاڑی آگئے اور وہ زیادہ حریص اور زیادہ سفاک تھے جیسے ایک زمانے میں ہم اپنے پچھلوں کے لیے زیادہ حریص اور زیادہ سفاک تھے اس لیے وہ ہمارا مقابلہ نہ کر سکے۔ اسی طرح جب دوسرے آئے تو ہمیں پیچھے ہٹنا پڑا۔ یہ بقا کے لیے لازمی تھا۔ اگر آدمی میدان سے نہ ہٹے تو مارا جاتا ہے۔ اس لیے ہم نے لائن بدل لی۔

لائن بدلی تو ہمارا گروپ ٹوٹ گیا۔ جلال خان بلڈر بن گیا۔ شعبان اور میں اسی لائن میں رہے لیکن ہم نے حیثیت بدل لی تھی۔ اب ہم باس نہیں رہے تھے مگر کسی کے ملازم بھی نہیں بنے، بلکہ دوسروں کے لیے ٹھیکے پر کام کرنے لگے تھے، اس طرح ہم نے اپنی آزاد حیثیت بھی برقرار رکھی تھی۔ جلال فائدے میں رہا۔ چند سال پہلے اس نے سارے غلط دھندے چھوڑ دیے اور اب صاف ستھرے کام کر رہا تھا، اسے ضرورت نہیں تھی کیونکہ دولت کی اس کے پاس کمی نہیں تھی۔ وہ بڑا آدمی بن گیا تھا، اس نے ہم سے تعلق توڑا تو نہیں لیکن محدود کر لیا تھا۔ آج میں نے شاید چار سال بعد اس کی آواز سنی تھی۔ میں نے راستے میں شعبان کو کال کی۔ ”جلال کی طرف جانا ہے، اس کا بیٹا افضال غائب ہے۔“

”اس نے بلایا ہے؟“

”ہاں اسی لیے جا رہا ہوں۔“

”میں بھی آتا ہوں لیکن مجھے دیر لگے گی۔“ اس نے کہا تو عقب سے کسی عورت کی مدھم آواز آئی۔

”کون ہے، کہاں جا رہے ہو؟“

میں نے کال کاٹ دی، میں سمجھ گیا کہ شعبان کو کیوں دیر لگے گی۔ میری طرح وہ بھی اکیلا تھا۔ ہم خاندان رکھنے والے لوگ نہیں تھے کیونکہ ہماری زندگی وصیت کا کچھ پتا نہیں تھا۔ شعبان، جلال سے کچھ متنفر تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ جلال نے ہمیں استعمال کیا اور اپنی زندگی بنالی اور ہمیں ایسے ہی چھوڑ دیا۔ جبکہ میرا خیال تھا کہ جلال پر ہمارا کوئی فرض نہیں تھا کہ وہ ہمارے لیے کچھ کرتا۔ جب تک ہم ساتھ رہے ہمارا حساب برابر کا تھا۔ ہم سے الگ ہونے کے بعد اس نے جو کیا اور جو کمایا، اس میں ہمارا کوئی حصہ نہیں تھا۔ بہرحال شعبان اس کا دشمن نہیں ہوا تھا۔ بس یہ شکوہ تھا جو اس نے میرے سامنے کیا تھا۔ دیکھا جائے تو اس کا شکوہ غلط بھی نہیں تھا کیونکہ جلال اس پوزیشن میں تھا کہ چاہتا تو ہمیں اس دلدل سے نکال کر اوپر لے جاتا مگر اس نے شاید کسی وجہ سے ایسا کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

ہم تینوں میں جلال سب سے تیز تھا۔ اس کا دماغ بھی تیز تھا اور غصہ بھی۔ پستول اس کی جیب میں اور اس کے ہاتھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں رہتا تھا اور وہ ٹریگر دبانے میں دیر نہیں کرتا تھا۔ اپنی ان ہی خصوصیات کی وجہ سے وہ آگے تھا اور ایک طرح سے ہمارا باس بن گیا تھا۔ پلاننگ میں ہم تینوں شامل ہوتے تھے مگر کسی بھی عمل میں انچارج وہ ہوتا تھا۔ اس کے خیال میں اس کی یہ حیثیت اب بھی برقرار تھی اس لیے اس نے مجھ سے پوچھا نہیں بلکہ صرف اپنا فیصلہ سنایا کہ مجھے اس کے پاس آنا ہے۔ میں پہلی بار اس کی عالی شان محل نما کوٹھی میں داخل ہوا۔ اس سے پہلے میں نے اسے صرف باہر سے دیکھا تھا۔ جلال پورچ میں موجود تھا اور اس کے ساتھ ڈی ایس پی شمس ملک تھا۔ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا کیونکہ اس سے آئے دن واسطہ پڑتا رہتا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر آہستہ سے جلال سے کچھ کہا اور اس نے زیر لب جواب دیا۔ میں نے تاثرات سے شمس ملک کا سوال اور جلال کا جواب بھانپ لیا تھا۔

”جلال خان، افضال کیسے غائب ہوا؟“ میں نے سلام دعا کے بعد پوچھا۔

”تم نے میرا پرانا گھر دیکھا ہے؟“

جلال کا پرانا گھر اچھی طرح دیکھا ہوا تھا کیونکہ اس گھر میں بہت سا وقت ہم نے ساتھ گزارا تھا پھر جلال نے شادی کی تو وہاں سے ہمارا ڈیرا ختم ہو گیا۔ ”افضال وہاں تھا؟“ میں نے پوچھا۔

جلال نے سر ہلایا اور پھر شمس ملک کی طرف دیکھا۔

”مجھے امید ہے پولیس جلد اس کا پتا چلا لے گی؟“

”میری پوری کوشش ہوگی۔“ شمس ملک نے سنجیدگی

سے کہا اور اس سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔ اس کی گاڑی گیٹ سے نکل رہی تھی کہ شعبان اندر آیا۔ اس نے شمس کی طرف دیکھا اور ہمارے قریب چلا آیا۔ اس نے بلاتمہید کہا۔

''پولیس والوں سے توقع بیکار ہے۔''

جلال نے سر ہلایا۔ ''پھر بھی ان کو اطلاع کرنی پڑتی ہے۔ میں نے اسی لیے تم دونوں کو بلایا ہے۔''

جلال ہمیں ایک چھوٹے سے کمرے میں لے آیا۔ یہاں چاروں طرف اس کی بنائی ہوئی عمارتوں اور اپارٹمنٹس کے ماڈلز سجے ہوئے تھے۔ دیواروں پر نقشے اور اسی قسم کی چیزیں تھیں۔ شاید یہ جگہ وہ آفس کے لیے استعمال کرتا تھا۔ جلال نے مقامی لڑکی سے شادی کی تھی۔ اس کی چار بیٹیاں تھیں اور ایک بیٹا افضال سترہ برس کا تھا اور کالج میں پڑھ رہا تھا۔ جلال خود اسکول کی حد تک تعلیم یافتہ تھا مگر اس نے اپنے بچوں کو پڑھایا تھا۔ دو بیٹیوں کی شادی ہو چکی تھی اور دو گریجویٹ تھیں جبکہ دو غیر شادی شدہ بیٹیاں یونیورسٹیز میں پڑھ رہی تھیں، ایک ایم بی اے کر رہی تھی اور دوسری نے ایم بی بی ایس میں داخلہ لیا تھا۔ جلال، افضال سے بے پناہ محبت کرتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ مشکل ترین حالات میں پُرسکون رہنے والا جلال اس وقت سخت مضطرب تھا۔ اس نے الماری سے وہسکی کی بوتل نکالی۔ میں نے اشارے سے منع کیا تو جلال نے حیرت سے کہا۔

''تم نے چھوڑ دی ہے؟''

''قدرت نے چھڑوا دی ہے، السر ہو گیا ہے۔''

جلال نے اپنے اور شعبان کے لیے گلاس بنائے اور ہم میز کے گرد رکھے چھوٹے صوفوں پر بیٹھ گئے تو شعبان نے پہل کی۔ ''وہ کہاں سے غائب ہوا ہے؟''

''غائب نہیں، وہ اغوا ہے۔'' جلال نے انکشاف کیا۔

''تمہارے پرانے گھر سے؟'' میں نے کہا۔

''ہاں، مجھے قطعی علم نہیں تھا کہ وہ دوستوں کے ساتھ وہاں چلا جائے گا۔ کل میں ایک پارٹی میں تھا۔''

جلال نے بتایا کہ افضال اپنے دوستوں حامد اور سہیل کے ہمراہ وہاں گیا تھا۔ یہ مکان عام طور سے بند رہتا تھا اور جب جلال کو ضرورت ہوتی تب استعمال کرتا تھا مگر اس کی ضرورت شاذ ہی پیش آتی تھی۔ جلال کی اس سے پرانی یادیں وابستہ تھیں اس لیے اس نے یہ مکان فروخت نہیں کیا۔ افضال مغرب کے بعد گھر سے نکلا تھا۔ اس وقت بارش ہو رہی تھی۔ حامد اور سہیل بڑے تھے اور ان کی بچپن سے دوستی تھی۔ حامد اور سہیل کا بیان ہے کہ وہ بارش کو انجوائے کرنے گئے کیونکہ یہاں بہت کم بارش ہوتی ہے۔ اس شام بادل گھر کر آئے تھے اور موسلا دھار بارش ہوئی تھی۔ بارش انجوائے کرتے ہوئے وہ جلال کے پرانے گھر تک پہنچ گئے۔ گیٹ بند تھا مگر وہ اسے پھلانگ کر اندر گئے۔ افضال جانتا تھا کہ داخلی دروازے کی ایک چابی کہاں رکھی ہوتی ہے۔ اس نے وہاں سے چابی نکالی اور وہ اندر آ گئے۔ مکان ڈیکوریٹ تھا اور وہاں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ حد یہ کہ فریج اور فریزر میں کھانے پینے کا سامان بھی تھا۔

انہوں نے کولڈ ڈرنکس کی بوتلیں نکالیں اور نشست گاہ میں بیٹھے تھے کہ اچانک چار نقاب پوش اندر آ گئے۔ افضال نے داخلی دروازہ بند نہیں کیا تھا اس لیے وہ آرام سے اندر گھس آئے۔ انہوں نے ان تینوں کو پکڑ لیا۔ حامد اور سہیل کو تشدد کا نشانہ بنایا اور انہیں بے بس کر کے وہ افضال کو لے گئے۔ ان کے مطابق آنے والوں نے ایک لفظ بھی نہیں بولا۔ وہ سب تنومند اور طاقتور تھے اور وہ افضال کو لینے آئے تھے۔ دو افراد اسے پکڑ کر باہر لے گئے اور دو ان کے سروں پر موجود رہے۔ پھر وہ بھی باہر نکل گئے۔ جب تک حامد اور سہیل باہر آئے گاڑی اتنی دور جا چکی تھی کہ اس کی عقبی سرخ روشنیاں بھی مشکل سے نظر آ رہی تھیں۔ آنے والوں نے ہاتھوں میں دستانے پہنے ہوئے تھے اس لیے انہوں نے اپنی انگلیوں کے نشانات بھی نہیں چھوڑے تھے۔

''انگلیوں کے نشانات۔'' شعبان نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''اگر وہ اپنی تصویر بھی چھوڑ جاتے تب بھی ہماری پولیس انہیں نہیں پکڑ سکتی۔''

''بات پولیس کی نہیں ہے۔'' جلال نے سرد لہجے میں کہا۔ ''انہیں خوف میرا ہوگا۔''

''ہاں!'' شعبان کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔ ''تم کسی زمانے میں کچھ تھے لیکن اب صرف ایک بزنس مین ہو۔''

جلال کا چہرہ بگڑ گیا، اس نے غرا کر کہا۔ ''میں جلال ہوں، تم یہ بات اچھی طرح جانتے ہو۔''

شعبان نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اب تم صرف ایک شوہر اور باپ ہو۔ تم جلال ہوتے تو ہمیں نہ بلاتے۔''

''شعبان...!'' میں نے اسے ٹوکا۔ ''جلال ہمارا دوست ہے۔''

''اگر دوست ہے تو دوست بن کر بات کرے۔'' شعبان نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ''یہ خود کو اب بھی دادا باس سمجھ رہا ہے۔''

''ایسا نہیں ہے۔'' جلال کا لہجہ مدھم ہو گیا۔

”کوئی وجہ تو ہوگی تب ہی ان لوگوں نے اپنی شناخت پوشیدہ رکھی۔“ میں نے موضوع بدل دیا۔ ”کیا کسی نے تم سے رابطہ کیا؟“

”نہیں۔“

”ہوسکتا ہے وہ رابطہ کریں۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

”تمہارا مطلب ہے اسے تاوان کے لیے اغوا کیا گیا ہے؟“ شعبان نے پوچھا۔

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ جلال نے سر ہلایا۔

”اور اگر ایسا نہیں ہوا ہے تو؟“

میں اور جلال چونک گئے۔ ”کیا مطلب؟“ جلال نے کہا۔

”تمہارے بہت سے پرانے کھاتے بھی ہیں۔“ شعبان کا لہجہ معنی خیز ہوگیا۔

”تمہارا مطلب ہے کسی نے دشمنی نکالنے کی کوشش کی ہے؟“

”ایسا بالکل ہوسکتا ہے۔“ شعبان نے سر ہلایا۔ ”جلال نے ماضی چھوڑ دیا ہے لیکن بعض اوقات ماضی، انسان کو نہیں چھوڑتا۔“

”یہ تو ہے۔“ میں نے سر ہلایا اور جلال کی طرف دیکھا۔ ”تم ہم سے کیا چاہتے ہو؟“

یک دم جلال تھکا ہوا اور مایوس نظر آنے لگا۔ اس نے کہا۔ ”بہت عرصے بعد میں مشکل میں پڑا تو مجھے تم دونوں کی یاد آئی۔ ابھی صورت حال واضح نہیں ہے اس لیے میں کہہ نہیں سکتا کہ مجھے تمہاری کس قسم کی مدد کی ضرورت پڑے گی۔“

”دوست ہم تمہارے ساتھ ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”کیا خیال ہے چل کر مکان دیکھ لیا جائے۔“

”ابھی وہاں پولیس ہے وہ نشانات دیکھ رہی ہے۔“

”کیسے نشانات۔“ شعبان نے کہا۔ ”اگر کوئی نشان ہوگا بھی تو بارش نے اسے صاف کر دیا ہوگا۔“

”دیکھ لینے میں حرج نہیں ہے۔“ میں نے اصرار کیا۔ ”ہم پولیس کے کام میں حارج نہیں ہوں گے۔“

اپنی اپنی وجوہات کی بنا پر شعبان اور جلال دونوں اس کے لیے تیار نہیں تھے مگر میرے اصرار پر مان گئے۔ ہم جلال کی گاڑی میں روانہ ہوئے۔ یہ جدید ماڈل کی بلٹ پروف گاڑی تھی جو مقامی طور پر بہت کم نظر آتی ہے۔ جلال کا سابق گھر زیادہ بڑا نہیں تھا۔ یہ بلاک شروع سے بہت غیر آباد تھا۔ اب کچھ آبادی ہوگئی تھی مگر اس گھر کے آس پاس کچھ نہیں تھا۔ سب سے نزدیکی گھر بھی سو گز کے فاصلے پر تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ لڑکے یہاں کیوں آئے تھے۔ جلال کی موجودہ کوٹھی سے یہ جگہ ایک کلومیٹر دور تھی۔ صرف کٹھل ملنے کے طور پر انی دور آنا سمجھ میں نہیں آرہا تھا جبکہ اس مکان میں ایسا کچھ نہیں تھا جو ان لڑکوں کی دلچسپی کا باعث ہوتا۔ وہاں ایک پولیس موبائل کھڑی تھی۔ جلال نیچے اترا تو ایک ایس آئی دوڑا آیا اور اس نے جلال کو تقریباً سلیوٹ کیا۔

”تم لوگوں نے کام مکمل کر لیا؟“

”جی لیب والے کر رہے ہیں۔“

میں مسکرا دیا۔ مجھے لیب والوں کی کارکردگی کا اچھی طرح اندازہ تھا۔ ہم اندر آئے جہاں جلال کو دیکھتے ہی تام نہاد مستعدی کا مظاہرہ کیا جانے لگا۔ جلال بھی یہ بات سمجھتا تھا اس لیے اس نے پولیس والوں کو وہاں سے رفع ہو جانے کا حکم دیا اور وہ اس کے حکم پر سچ مچ چلے بھی گئے۔ ان لوگوں نے نشانات تو کیا اٹھانے تھے خود وہاں خاصے نشانات چھوڑ گئے۔ میں نے مکان کا معائنہ کیا۔ اس کے سامنے والے حصے میں ایک بڑا ڈرائنگ روم تھا۔ اسے لاؤنج بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس کے دروازے کے سامنے ہی شیشے کا ایک بڑا سا ریک تھا اور اس کی ٹوٹی کرچیاں چاروں طرف بکھری ہوئی تھیں۔ اسی طرح شیشے کی سینٹرل ٹیبل بھی ٹوٹ گئی تھی۔ ایک طرف ڈرائنگ چیئر الٹی پڑی تھی۔ کچھ تو چیں بھی ادھر ادھر پڑے تھے۔ مجموعی طور پر جرم کا منظر واضح تھا۔

برآمدے کی سیڑھیوں پر اور آگے جوتوں کے چند نشانات تھے کیونکہ جس وقت نقاب پوش اندر گھسے تو بارش ہو رہی تھی اور اس سے جوتوں کے نشانات بن گئے تھے۔ ان کی تصاویر لے لی گئی تھیں اس لیے اب ان پر آرام سے چل پھر رہے تھے۔ ہماری آمد سے پہلے لیب والے یہ کام کر چکے تھے۔ ابھی میں اندر جانے کا سوچ رہا تھا کہ ایس آئی باہر سے آیا۔ اس کی صورت دیکھ کر میں کھٹک گیا۔ اس نے اپنا موبائل جلال کی طرف بڑھایا۔

”ڈی ایس پی صاحب ہیں۔“

جلال بھی چونکا۔ اس نے فون لیا۔ ”ہیلو... ہاں ملک... کیا ہوا...؟ کیا... کہاں ہے وہ...؟“ جلال کہتے ہوئے چلایا۔ ”مجھے بتانے کیوں نہیں ہو؟... اچھا اچھا میں آرہا ہے۔“

جلال نے موبائل ایس آئی کو واپس کیا اور بولا۔ ”کہاں جانا ہے؟“

”میرے ساتھ آیئے۔“ اس نے کہا۔ جلال نے

اپنی گاڑی پولیس موبائل کے پیچھے لگا دی تھی۔ میں نے جلال کے شانے پر ہاتھ رکھا تو اس نے پوری قوت سے اسٹیرنگ پر مکا مارا۔ شمس ملک نے واضح نہیں کیا تھا لیکن اس نے جس طرح جلال کو بلایا تھا اس نے صورت حال کو واضح کر دیا تھا۔ چند منٹ بعد ایک نالے کے پاس رکے جس میں ابھی تک بارش کا پانی بہہ رہا تھا اور ایک ایمبولینس سروس کے رضا کار ایک لاش پر چادر ڈھک رہے تھے۔ اسے نالے سے نکالا تھا۔ جلال نیچے اترا تو شمس ملک خود آگے آیا۔ اس نے جلال کو روکا مگر وہ اسے دھکا دے کر لاش کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے اس پر سے چادر اٹھائی اور پھر دہاڑ مار کر اس سے لپٹ گیا۔

☆☆☆

میں جلال کے ساتھ تھا اور وہ مسلسل پی رہا تھا۔ اسے روکنا بے کار تھا۔ وہ کسی کی نہیں سنتا کیونکہ اس کا نقصان بہت بڑا اور ناقابل تلافی تھا۔ آج افضال کا سوم تھا۔ میں کل تک اس کے ساتھ تھا پھر رات میں گھر چلا گیا۔ صبح اس نے پھر بلا لیا۔ میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "اگر تم نے مجھے اس لیے بلایا ہے کہ میرے سامنے بیٹھ کر پیتے رہو تو میرا رکنا بے کار ہے۔"

"تب میں کیا کروں؟" اس نے تلخ لہجے میں کہا۔

"میں جانتا ہوں، تمہارا دکھ بہت بڑا ہے لیکن اس طرح ہوش سے بیگانہ ہو جانا مسئلے کا حل نہیں ہے۔ تمہیں بھابی اور بچیوں کو بھی دیکھنا ہے۔"

"میں کیا کروں؟" اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ "میرے اندر آگ جل رہی ہے۔"

"اسے استعمال کرو۔ ان لوگوں کا پتا چلاؤ جنہوں نے یہ کام کیا ہے۔"

افضال کی لاش پانی میں ڈوبی رہی تھی اس لیے کسی قدر پھول گئی تھی مگر اس کے جسم پر تشدد کا کوئی نشان نہیں تھا صرف ایک گولی کا نشان تھا جو اس کے ماتھے پر لگی تھی اور وہ جان لیوا ثابت ہوئی تھی۔ پوسٹ مارٹم کے مطابق اس کی موت کا وقت تقریباً وہی تھا جو اس کے اغوا کا وقت تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اغوا کرنے والے اسے اس نالے تک لائے جو جائے وقوعہ سے صرف آٹھ سو گز کی دوری پر تھا۔ انہوں نے وہاں افضال کو شوٹ کیا اور لاش پھینک کر چلے گئے۔ بارش نے نالے کے آس پاس تمام نشان مٹا دیے تھے۔ لاش ایک سبزی ہاکر نے دیکھی جس کے ذمے نالے کی نگرانی تھی۔ اس نے پولیس کو اطلاع دی۔ میری بات پر جلال نے گلاس اتنی سختی سے بھینچا کہ وہ ٹوٹ گیا اور اس کی کرچیاں جلال کے ہاتھ کو زخمی کر گئیں۔ میں نے رومال نکال کر اس کے ہاتھ پر باندھا۔ اسے شاید زخم کا احساس بھی نہیں تھا اس نے میری طرف دیکھا۔

"انہیں کیسے تلاش کروں، انہوں نے اپنا کوئی نام و نشان ہی نہیں چھوڑا۔"

"پولیس کا کیا کہنا ہے؟"

"صفر۔" اس نے تلخی سے کہا۔ "وہ کچھ پتا نہیں چلا سکی۔"

"جلال، یہ قتل میری سمجھ سے باہر ہے۔ اگر کسی نے تم سے انتقام لیا ہے تب بھی یہ اندھا انتقام سمجھ میں نہیں آیا۔" میں نے اس کی طرف دیکھا۔ "تمہارا کیا خیال ہے تمہارا ایسا کوئی دشمن ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "پہلے بہت رنجشیں تھیں، تم بھی جانتے ہو لیکن وقت کے ساتھ ساتھ سب ختم ہو گیا۔ لوگ مر گئے، یہاں سے چلے گئے یا بات ختم ہو گئی۔ ایسا کوئی شخص میرے ذہن میں نہیں آ رہا جو اتنے عرصے بعد اس حد تک جائے۔"

"یہ تمہارا خیال ہے، تم دوسروں کے بارے میں کیا کہہ سکتے ہو؟" میں نے کہا تو وہ چونک گیا۔

"ہاں، میں دوسروں کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں؟"

"تب قاتلوں کو تلاش کرنے کی سوچو۔" میں نے کہا۔ "اسٹائل سے لگ رہا ہے کہ یہ پیشہ ور لوگ تھے اور ان کا گینگ ہے۔ اس شہر میں پیشہ ور قاتلوں کے کتنے ایسے گینگ ہوں گے جو اتنے منظم انداز میں کام کریں۔"

"شاید چند ایک۔" جلال نے سوچتے ہوئے کہا۔ "جو سیاسی تنظیموں سے تعلق رکھتے ہیں وہ اس طرح خود کو چھپا کر کام نہیں کرتے ہیں وہ کھلے عام سب کر جاتے ہیں اور تم جانتے ہو میرا کسی سیاسی تنظیم سے نہ تعلق رہا ہے اور نہ تنازعہ۔"

"تب یہ تمہارے کسی مخالف کا کام ہے اور وہ کوئی بھی ہو سکتا ہے۔"

"اگر ایسا ہے تو میں اس تک کیسے پہنچوں؟"

"قاتلوں کے ذریعے۔" میں نے جواب دیا۔ "تمہارے انڈر ورلڈ سے تعلقات تو ہیں..."

"یہ پرانی بات ہے۔" جلال نے بات کاٹ کر کہا۔ "اب میری وہاں خاص جان پہچان نہیں ہے۔ یہ کام تم دونوں کر سکتے ہو۔"

''ہم دونوں...'' میں نے انکار کرنا چاہا۔

''ایک منٹ... کوئی جواب مت دو۔ میں کل تمہارے پاس آؤں گا۔'' جلال نے سوچ کر کہا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس کے ذہن میں کوئی بات آگئی ہے۔

اگلے دن جلال میرے اور شعبان کے سامنے تھا۔ وہ میرے گھر آیا تھا اور میں نے شعبان کو بھی بلا لیا تھا۔ وہ راضی نہیں تھا لیکن میں نے کہا کہ وہ ایک بار جلال کی بات سن لے اس کے بعد چاہے تو انکار کر دے۔ ماضی کے تعلق کی بنیاد پر ہم اتنا تو کر سکتے تھے۔ شعبان مان گیا اور میرے پاس آگیا۔ میرے گھر کام کرنے والی ثمینہ موجود تھی مگر جلال کے آنے کے بعد میں نے اسے چھٹی دے دی۔ جلال کچھ دیر خاموشی سے بیٹھا رہا پھر اس نے اپنے کوٹ سے ایک بڑے سائز کا لفافہ نکال کر ہمارے سامنے رکھا۔ ''یہ بیس لاکھ روپے ہیں۔ اتنے ہی میں اس وقت دوں گا جب تم قاتلوں کو تلاش کر لو گے۔''

بیس لاکھ خاصی رقم تھی مگر ہم نے کوئی ردعمل نہیں دیا۔ اس کے بجائے شعبان نے پوچھا۔ ''اگر ہم ناکام رہے؟''

''تو کچھ نہیں، بات ختم ہو جائے گی۔'' جلال نے دونوں ہاتھ میز پر پھیلائے۔ ''یہ تمہارے وقت اور محنت کی قیمت ہے اگلے بیس لاکھ کامیابی کا انعام ہوگا۔''

مجھے عجیب سا لگ رہا تھا۔ آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ ہم نے آپس میں کسی کام کا معاوضہ دیر سے کو دیا ہو۔ ہم مل کر کام کرتے تھے اور رکما کر آپس میں تقسیم کر لیتے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ جلال ہمیں آفر کر رہا تھا۔ میں ججھک رہا تھا اور شعبان کچھ اور سوچ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، یہ رقم مناسب ہے۔''

''مجھے تم سے اسی سوال کی توقع تھی۔''

''کیونکہ میں بے وقوف نہیں ہوں۔'' شعبان نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے بیس لاکھ کا چارا دیکھ کر ہم فوراً منہ ماریں گے؟ نہیں جلال خان ہمارے پاس عقل ہے اور میری عقل کہہ رہی ہے کہ معاملہ بہت بڑا ہے اور خطرہ بھی بہت بڑا ہے۔ جو لوگ تمہارے اکلوتے بیٹے کو قتل کر سکتے ہیں ان کے لیے دو افراد کو مزید دنیا سے رخصت کرنا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔''

میں جو پہلے دخل دینے والا تھا شعبان کی اس بات پر خاموش ہو گیا۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ جلال ارب پتی نہیں مگر ارب پتی تھا۔ ذرائع بتاتے تھے اس کی کوٹھی کی مالیت ہی ایک ارب روپے سے زیادہ تھی۔ اس کے ظاہری اثاثوں کے مقابلے میں اس کے پوشیدہ اثاثے بہت زیادہ تھے۔ ٹھیک ہے بیس لاکھ روپے ہمارے لیے بڑی رقم تھی مگر اس کے لیے یہ رقم زیادہ نہیں تھی۔ جلال نے میری طرف سے مایوس ہو کر شعبان سے کہا۔ ''تم کیا چاہتے ہو؟''

شعبان نے لفافہ واپس اس کی طرف سرکا دیا۔ ''ایک بات تو یہ ہے کہ ہم دوست ہونے کے ناتے تمہاری مدد کریں گے۔ اس کے بدلے تم سے ایک روپیہ بھی نہیں چاہیے۔ دوسرے ہمارے اپنے دھندے بھی ہیں اور ہم ان کو بھی وقت دینے پر مجبور ہیں۔''

''مجھے دوسرا طریقہ منظور ہے۔'' جلال نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''اپنی ڈیمانڈ بتاؤ۔''

''ایک کروڑ روپے کام کے اور کامیابی کی صورت میں ہم دونوں کو ایک ایک کروڑ روپے بونس ملے گا۔''

''مجھے منظور ہے۔'' جلال نے کہا۔

☆☆☆

''یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔'' میں نے اگلے دن شعبان سے کہا۔ میں اس کے گھر آیا تھا۔ ''جلال ہمارا دوست ہے۔''

''یہ خیال اسے نہیں آیا کہ وہ ہمارا دوست ہے؟'' شعبان نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''تم نے دیکھا اس نے دوستی کو ایک طرف رکھا اور فوراً باس بننے کو تیار ہو گیا۔ اب ہم اس کے لیے کام کرنے کے پابند ہیں۔ ہم نے اپنے وقت کی اصل... قیمت وصول کر لی ہے۔''

شعبان ٹھیک کہہ رہا تھا لیکن میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔ ''ہم نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا ہے۔ قاتل اندھیرے میں ہیں، ان تک پہنچنے کے لیے ہمیں اندھیرے میں ہاتھ مارنے پڑیں گے اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہمارا ہاتھ کس پر پڑے گا۔''

شعبان میری بات سمجھ گیا۔ اس کے چہرے پر تشویش تھی مگر پھر اس نے سر جھٹکا۔ ''ہمارا کام ہی خطرہ مول لینا ہے۔''

''لیکن اندھا خطرہ ہم نے کبھی مول نہیں لیا۔''

''اب تو لے لیا ہے، یہ بتاؤ آغاز کیسے کرنا ہوگا؟''

''ہماری نظر میں جتنے بھی درمیان کے آدمی ہیں، ان سب کو چیک کرنا ہوگا۔''

''میں نے بھی یہی سوچا ہے۔''

''کام کا آغاز ابھی کرنا ہے۔'' میں نے کہا اور آدھے گھنٹے بعد ہم پرانے شہر کی گنجان آبادی میں ایک سال خوردہ عمارت کے نیچے موجود تھے۔ ہمیں اس کے چوتھے فلور تک جانا تھا۔ سیڑھیاں چڑھ کر ہم اوپر آگئے۔ مطلوبہ

دروازے پر دستک دی تو اندر سے ایک کھردری آواز آئی۔
"بھاگ جاؤ، ابھی میں کسی سے نہیں مل سکتا۔"
شعبان نے میری طرف دیکھا اور پیچھے ہٹ کر دروازے پر ایک بھرپور لات ماری۔ دروازہ کھل گیا اور ہم اندر داخل ہوئے۔ دوسرے کمرے میں سر بلی اور طویل قامت چاچڑ پڑا ہوا تھا۔ یہ اس کی ذات نہیں نام تھا۔ چاچڑ ویسے تو منشیات فروش اور منشیات کا عادی تھا مگر وہ درمیان کے آدمی کا کردار بھی ادا کرتا تھا اور دو پارٹیوں کے درمیان بات یا سودا کراتا تھا۔ وہ شہر کی جرائم پیشہ سوسائٹی کے بارے میں چلتا پھرتا انسائیکلوپیڈیا تھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے کوئی اثر نہیں لیا مگر جب شعبان نے اس کے ٹخنے پر اپنا بھاری جوتا رکھا تو وہ بلبلا کر ہوش میں آگیا۔ اس نے ہمیں دیکھا اور خرخر و لہجے میں بولا۔
"تم...؟"
"ہاں... ہم... نے پہچان لیا ہے۔" میں نے اس کے پاس پنجوں کے بل بیٹھ کر کہا۔ "یہ بھی جان گئے ہو گے کہ ہم کیوں آئے ہیں؟"
شعبان دروازہ بند کر آیا تھا اگرچہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ یہاں کوئی چھینک بھی مارتا تو اوپر سے نیچے تک سب کو اطلاع مل جاتی تھی۔ چاچڑ نے فوراً انکار کیا۔
"ماں قسم نہیں جانتا۔"
شعبان نے دوبارہ اس کے ٹخنے پر جوتا رکھا تو وہ چیخنے دھاڑنے لگا۔ میں نے اس کی چیخ و پکار کی پروا کیے بغیر اس کے کمرے سے ایک رسی تلاش کی۔ اس کا ایک سرا پانی کے وزنی کولر سے باندھا اور دوسرا پھندا بنا کر چاچڑ کے گلے میں ڈالا اور اسے گھسیٹ کر کھڑکی کے پاس لے آیا۔ کولر کھڑکی کی چوکھٹ پر رکھ کر میں نے اس سے پوچھا۔ "جلال خان کے بیٹے افضال کے قتل میں کون لوگ ملوث ہیں؟"
"میں نہیں جانتا۔" اس نے دہشت سے کہا۔ میں نے کولر کو ذرا سا ہاتھ مارا تو اس نے چیخ ماری۔ "ماں قسم نہیں جانتا۔"
میں نے اس بار ہاتھ مارا تو کولر باہر گر گیا اور رسی کا پھندا چاچڑ کی گردن میں تنگ ہونے لگا۔ اس نے دونوں ہاتھ سے رسی تھام لی تھی مگر اسے تنگ ہونے سے روکنا مشکل تھا۔ اس کا سانس رک رہا تھا اور وہ پاؤں رگڑ رہا تھا۔ میں نے پستول نکال لیا۔ "تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں۔"
چاچڑ کی آنکھیں حلقوں سے ابل آئی تھیں اور اس کا بڑا سا منہ غیر معمولی طور پر کھلا ہوا تھا مگر اس کا سر مسلسل نفی میں ہل رہا تھا۔ وہ بس چند لمحوں کا مہمان لگ رہا تھا۔ میں نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "یہ نہیں بتائے گا۔"
"تو بات ختم کرو، ہم کسی اور سے پوچھ لیں گے۔"
میں نے چاچڑ کے سر کی طرف پستول کر کے ایک گولی چلائی اور پھر ہم دونوں باہر کی طرف بڑھے۔ باہر نکلنے سے پہلے میں نے پلٹ کر چاچڑ کی طرف دیکھا جو رسی کٹ جانے سے سانس بحال ہونے پر دیوانہ وار سانس لے رہا تھا۔ میں نے اسے خبردار کیا۔ "اگر ہمارے بارے میں ایک لفظ بھی نکالا تو اگلی بار تم اس کھڑکی سے باہر جاؤ گے۔"
ہم نیچے آئے تو شعبان نے مایوسی سے کہا۔ "یہ تو کچھ بھی نہیں ہوا۔"
"میں نے کہا، ہم اندھیرے میں ہاتھ ماریں گے۔"
شعبان چلا گیا تھا اور میں نے بھی گھر کا رخ کیا۔ ثمینہ صفائی کر کے واشنگ مشین لگائے کپڑے دھو رہی تھی۔ وہ تقریباً تیس سال کی سرخی مائل سفید رنگت اور دلکش نقوش والی عورت تھی۔ جسم نازک تھا مگر محنت اتنی کر لیتی تھی۔ مجھ جیسے اکیلے آدمی کے گھر کام کرنے پر اسے بہت کچھ سننے کو ملا مگر اس نے کبھی پروا نہیں کی تھی۔ مجھ سے کچھ کہنے کی کسی میں جرأت نہیں تھی۔ وہ صبح سویرے آتی اور سب سے پہلے میرے لیے ناشتا بناتی تھی۔ جب میں ناشتا کرتا تو وہ گھر کی صفائی کرتی۔ ہفتے میں ایک بار واشنگ مشین لگا کر کپڑے دھو دیتی تھی۔ جانے سے پہلے وہ دوپہر کا کھانا بنا کر جاتی تھی۔ ہانڈی اتنی ہوتی کہ رات تک چل جاتی تھی اگر مجھے کہیں باہر جانا ہوتا تو میں اسے منع کر دیتا تھا۔ وہ بیوہ تھی۔ دو سال پہلے اس کا شوہر ہنگاموں میں اندھی گولی کا نشانہ بن گیا۔ وہ دہی بڑے کا ٹھیلا لگاتا تھا۔ اس کے مرنے پر ثمینہ بے سہارا ہوئی تو اپنا اور اپنے بچے کا پیٹ بھرنے کے لیے اسے باہر نکلنا پڑا۔
ایک بار میں نے گلی کے چند لفنگوں کو سبق دیا جو اس کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ تب وہ میرا شکریہ ادا کرنے آئی اور جب اسے پتا چلا کہ میں اکیلا رہتا ہوں اور اپنا سب کام خود کرتا ہوں تو اس نے اصرار کر کے میرے گھر میں کام شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ وہ بہت سی باتوں میں دخیل ہو گئی تھی اور اسے میرے ماضی کے بارے میں بہت کچھ پتا چل گیا تھا۔ ادھیڑ عمر ہونے کے باوجود میں مرد تھا اور میں نے جلد محسوس کر لیا کہ ثمینہ کیوں دوسروں کی باتیں سن کر بھی میرے ہاں کام کر رہی تھی مگر میرے پاس اس کے خاموش سوال کا جواب نہیں تھا۔ میں واپس آیا تو اس نے کہا۔ "یہ وہی جلال

ہے نا جس کے ساتھ تم کام کر رہا تھا؟"

"ہاں یہ وہی ہے۔"

"مجھے یہ شخص اچھا نہیں لگا۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔ "یہ بہت خود غرض ہے۔"

وہ جلال کے بارے میں ٹھیک کہہ رہی تھی۔ "ہاں مگر وہ میرا دوست ہے۔"

"تم اس کے لیے کام کر رہے ہو؟"

"اس کے بیٹے کو کسی نے اغوا کر کے مار دیا ہے، وہ چاہتا ہے میں اس کے قاتلوں کو تلاش کروں۔"

"یہ تو خطرناک کام ہے۔" وہ بے چین ہو گئی۔

"ہاں پر میں خطرناک کام ہی کرتا ہوں تو جانتی ہے۔"

"اس کے بیٹے کے ساتھ کیا ہوا؟" ثمینہ نے پوچھا۔

میں نے اسے مختصراً بتایا کہ افضال کے ساتھ کیا ہوا۔ اس نے پھر پوچھا۔ "پولیس کیا کہتی ہے؟"

"اس نے کیا کہنا ہے۔"

"ایسا نہ کہو، ہماری پولیس کبھی سستی پر وہ مجرم کو جانتی ضرور ہے، پہلے اسے نہ پکڑے یا پکڑے تو وہ عدالت سے چھوٹ جائے۔"

ثمینہ کی بات نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے جلال سے پولیس رپورٹ کے بارے میں پوچھا نہیں تھا۔ لنچ کے بعد میں نے اسے کال کی۔ "مجھے پولیس رپورٹ چاہیے، مکمل رپورٹ، اس میں لیب کی رپورٹ بھی شامل ہونی چاہیے۔"

"تین گھنٹے بعد آ کر دیکھ لینا۔" اس نے کہا۔ دو گھنٹے بعد میں گھر سے نکل گیا۔ جلال میرا منتظر تھا اور کسی قدر ہوش میں تھا۔ "تم لوگوں نے کچھ کیا؟"

"ہاں، ایک آدمی کو پکڑا مگر وہ بے خبر نکلا۔ کچھ لوگ اندھیرے میں تیر چلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

جلال نے فوٹو کاپیز پر مشتمل ایک فائل میرے حوالے کی۔ اس میں ایف آئی آر سے لے کر وقوعے کی منظر کشی اور پوسٹ مارٹم سے لے کر لیب کی رپورٹس شامل تھیں۔ لیب رپورٹ کے مطابق افضال کو نائن ایم ایم کی پستول سے شوٹ کیا گیا تھا مگر طریقہ میرے ذہن میں چبھ رہا تھا۔ اغوا اور اس کے فوراً بعد قتل سے ظاہر تھا کہ قاتل اسی نیت سے آئے تھے۔ کام بہت صفائی سے ہوا تھا اور انہوں نے پیشانی پر صرف ایک گولی مار کر قتل کو یقینی بنا لیا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ کام بہت ٹھنڈے دل سے ہوا ہے اور اس کے پس پشت انتقامی جذبہ نہیں تھا ورنہ افضال کی تشدد زدہ لاش ملتی۔ جلال نے مجھے مخاطب کیا تو میں چونکا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "کیا یہ ٹارگٹ کلرز کا کام ہے؟"

"سو فیصد لگ رہا ہے مگر ایک چیز سمجھ نہیں آ رہی ہے، انہوں نے قتل ہی کرنا تھا تو افضال کو لے کیوں گئے۔ ٹارگٹ کلرز کبھی یہ زحمت نہیں کرتے۔ اگر اغوا مقصد تھا تو لے جا کر اس طرح شوٹ کر دینا سمجھ سے بالاتر ہے؟"

جلال کے چہرے پر پریشانی نظر آنے لگی۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہ دو باتیں ذہن میں میچ نہیں کر رہی ہیں۔"

"یہ شہر کا محفوظ ترین علاقہ ہے یہاں نہ صرف نجی سیکیورٹی بہت زیادہ ہے بلکہ پولیس بھی مستعد ہوتی ہے۔ ایسے میں کسی کو اغوا کرنا بہت مشکل کام ہے۔"

"تم بھول رہے ہو، کچھ عرصے پہلے ایک مافیا لیڈر کو یہیں سے تین گلی سے اٹھا کر کھلے عام لے جایا گیا تھا۔"

"وہ الگ بات ہے، اس میں سب ملے ہوئے تھے۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ دوسرا معاملہ ہے۔ مجھے لگ رہا ہے بظاہر سب اس طرح نہیں ہوا ہے جیسا کہ ہمیں نظر آ رہا ہے۔"

"پھر کیسے ہوا ہے؟" جلال نے کہا۔

"یہی پتا چلانا ہے۔" میں نے جواب دیا اور پھر ہچکچا کر پوچھا۔ "اگر تم قاتلوں کا پتا چلا لو گے تو تم کیا کرو گے؟"

جلال کے چہرے پر پرانا جلال نظر آیا تھا، اس نے بہت سفاک لہجے میں کہا۔ "میں انہیں اپنے ہاتھ سے ماروں گا۔"

"چاہے وہ کوئی بھی ہو۔"

میری اس بات پر جلال نے چونک کر مجھے دیکھا۔ "کوئی بھی ہو سے کیا مراد ہے؟"

"اگر وہ تمہارا کوئی قریبی فرد نکل آیا۔"

"وہ کوئی بھی ہو، میں اسے بخشوں گا نہیں۔"

میں نے فائل اٹھائی۔ "یہ میں ساتھ لے جا رہا ہوں، ہو سکتا ہے اس سے کوئی نشان مل جائے جو قاتلوں تک رہنمائی کرے۔"

"ٹھیک ہے لے جاؤ۔" اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

میں کھڑا ہوا۔ "پھر ملیں گے۔"

"ایک منٹ۔" جلال نے اشارہ کیا۔ "یہ بتاؤ شعبان میرے بارے میں کیا خیال رکھتا ہے۔"

میں چونکا۔ "یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"میں نے محسوس کیا ہے، وہ مجھ سے خوش نہیں ہے۔"

میں نے سر ہلایا۔ ”جب تم نے لائن تبدیل کی اور ہم سے تعلق ختم کرلیا تو اس نے اس بات کو بہت محسوس کیا تھا۔“

”کیا وہ میرے خلاف کچھ زیادہ ہی سوچتا رہا ہے؟“ جلال کا لہجہ معنی خیز ہوگیا۔

”نہیں، وہ ایسے ہی جب ذکر ہوتا تو وہ شکوہ کردیتا تھا، اس نے خود سے کبھی تمہارے خلاف کچھ نہیں کہا۔“

”شبیر!“ جلال کا لہجہ سرد ہوگیا۔ ”کہیں تم اس کی وکالت کرنے کی کوشش تو نہیں کررہے؟“

”نہیں دوست جو حقیقت ہے وہ بیان کررہا ہوں۔“ میرا لہجہ بھی سرد ہوگیا۔ ”تم ہمیں جانتے ہو، بلاوجہ کوئی گمان پالنے کی کوشش مت کرو۔“

جلال چپ ہوگیا مگر اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ مجھ سے متفق نہیں تھا۔ میں اس کے عالی شان بنگلے سے نکل آیا۔ اس کے اور ہمارے اسٹیٹس میں بہت فرق آگیا تھا۔ یہی فرق دوستی میں بھی آیا تھا۔ البتہ جلال کی فطرت نہیں بدلی تھی وہ اسی طرح جلد بدظن ہوجانے والا شخص تھا۔

میں نے گھر آنے کے بعد شعبان کو کال کی۔ میں نے اسے جلال سے ہونے والی گفتگو سنائی۔ شعبان غصے میں آگیا۔ ”وہ کیا سمجھتا ہے رقم دے کر ہمیں خرید لیا ہے، میں یہ رقم اس کے منہ پر ماروں گا۔“

”غصے میں مت آؤ دوست۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”یہ مت بھولو کہ جلال اور ہم میں بہت فرق آگیا ہے، وہ بہت دولت مند ہے اور آج کے دور میں دولت ہی طاقت ہے۔“

”تب وہ دولت سے اپنے بیٹے کے قاتل کا پتا کیوں نہیں چلا لیتا؟“

”وہ یہی کررہا ہے اور میں نے تمہیں اس لیے کال کی ہے کہ تم محتاط رہو۔ اس کا شبہ بڑھانے سے گریز کرو۔“

شعبان چپ ہوگیا پھر اس نے کہا۔ ”او کے، میں خیال رکھوں گا۔“

میں نے فائل کھولی اور اسے لے کر کچن میں آگیا۔ اپنے لیے چائے تیار کی اور اس دوران میں لڑکوں کے بیانات پڑھتا رہا۔ ان کے بیانات تقریباً ایک جیسے تھے کیونکہ سب کچھ بہت تیزی سے اور ان کے سامنے ہوا تھا۔ ان کے مطابق یہ سب مشکل سے تین چار منٹ میں ہوگیا تھا۔ میں نے ان کے بیانات کئی بار پڑھے۔ میں نے جلال کو کال کی۔ ”مجھے حامد اور سنبل سے بات کرنی ہے۔“

”میں بلالیتا ہوں۔“

”نہیں، میں ان سے الگ الگ باہر بات کرنا چاہتا ہوں۔“

جلال نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”او کے، میں بندوبست کرتا ہوں لیکن وہ پولیس کو بیان دے چکے ہیں اور وہ اس فائل میں شامل ہے۔“

”میں نے دیکھ لیا ہے، میں مزید پوچھنا چاہتا ہوں ہو سکتا ہے کوئی کام کی بات سامنے آجائے۔“

”ٹھیک ہے، میں کچھ دیر میں بتاؤں گا۔“ اس نے کہا اور پھر ایک گھنٹے بعد کال کی۔ ”وہ کل تم سے یونیورسٹی میں مل سکتے ہیں۔“

میں اگلے دن یونیورسٹی پہنچا۔ گیٹ پر گارڈز نے روکا تو میں نے جھوٹ بولا کہ میں اپنے بیٹے کی وجہ سے آیا ہوں۔ اس نے کسی ٹیچر سے بدتمیزی کی تھی۔ اپنی صورت اور حلیہ میں نے شریفوں والا ہی رکھا تھا اس لیے گارڈز نے مجھے اندر جانے دیا۔ پولیس رپورٹ میں دونوں کی تصاویر شامل تھیں کیونکہ وہ زخمی ہوئے تھے اور ان کی تصویریں لی گئی تھیں۔ حامد کے بارے میں معلوم کیا تو وہ بائیولوجی ڈیپارٹمنٹ میں تھا۔ وہ کلاس میں تھا اور میں باہر اس کا انتظار کرنے لگا۔ وہ باہر نکلا تو میں نے اسے روک لیا۔ ”حامد، جلال نے تمہیں میرے بارے میں بتایا ہوگا، میں شبیر ہوں۔“

اس کا رنگ ایک لمحے کو اڑا۔ ”جی کیا پوچھنا ہے آپ نے؟“

”میرے ساتھ آؤ۔“ میں اسے باہر لان میں ایسی جگہ لے آیا جہاں ہماری بات سننے والا کوئی نہیں تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر نظر جما کر کہا۔ ”میں تم سے صرف چند سوالات کروں گا اور مجھے امید ہے تم ٹھیک ٹھیک جواب دو گے۔“

”جی۔“

”تم لوگ جب باہر نکلے تو کیا پہلے سے افضال کے پرانے گھر جانے کا ارادہ تھا؟“

”نہیں ہم پارٹی انجوائے کررہے تھے، جب اس کے گھر کے پاس پہنچے تو افضال نے ہم سے اندر چلنے کو کہا۔ اس نے کہا تھا ہم اندر کچھ کھا پی بیٹھیں گے۔“

”تمہارا کہنا ہے کہ تم لوگ گیٹ پھلانگ کر اندر گئے کیونکہ گیٹ پر تالا تھا، مگر جب پولیس وہاں آئی تو گیٹ کا تالا کھلا ہوا تھا؟“

”مجھے نہیں معلوم، میں نے بھی کھلا دیکھا تھا۔“

”اگر تم لوگ وہاں اتفاق سے پہنچے تو افضال کو اغوا کرنے والے وہاں کیسے پہنچ گئے، ان کو کیسے پتا کہ تم

لوگ وہاں آؤ گے؟"

اس نے پھر نفی میں سر ہلایا۔ "میں نہیں بتا سکتا ہو سکتا ہے وہ پہلے سے چھپا کر رہے ہوں۔"

لڑکا سہما ہوا تھا مگر ہوشیار بھی تھا۔ اس نے بہت نپے تلے انداز میں جواب دیے تھے۔ میں نے اگلا سوال کیا۔

"جب نقاب پوش اندر آئے تو تم کہاں تھے؟"

"میں بڑے صوفے کے پیچھے ریکس پر رکھی چیزیں دیکھ رہا تھا۔"

"سہیل اور اقبال کہاں تھے؟"

"اقبال دروازے کے پاس تھا اور اندر آتے ہی دو نقاب پوشوں نے اسے قابو کر لیا۔ باقی دو ہماری طرف آئے تھے۔ سہیل ذرا دور چھوٹے صوفے پر بیٹھا تھا۔ اسے قابو کرنے والے نقاب پوش نے اسے وہیں پکڑ لیا تھا۔"

انہوں نے تمہیں مارا۔" میں نے اس کے ہونٹوں پر مندمل ہوتے نشان کو دیکھ کر کہا۔

"ہاں مجھے اور سہیل کو گھونسوں اور لاتوں سے مارا تھا۔" اس نے اپنی پسلی پر ہاتھ رکھا۔ "یہاں ابھی تک درد ہو رہا ہے۔"

"جب نقاب پوش تمہیں مار رہے تھے تو تم نے یا سہیل نے مزاحمت نہیں کی؟"

"کی تھی مگر وہ بہت طاقت ور اور ماہر تھے۔ جنہوں نے اقبال کو پکڑا تھا، وہ اسے کھینچ کر باہر لے گئے اور باقی دو نے اس وقت تک ہمیں قابو میں رکھا جب تک انہیں باہر سے سیٹی کی آواز نہیں سنائی دی۔ پھر وہ اتنی تیزی سے نکلے کہ جب تک میں اور سہیل باہر آئے وہ جا چکے تھے۔"

"تم ان کی گاڑی نہیں دیکھ سکے؟"

"نہیں لیکن اس کی عقبی روشنیوں سے لگ رہا تھا کہ وہ کوئی درمیانی گاڑی ہے۔ شاید کوئی لگژری جیپ تھی۔"

"پھر تم نے کیا کیا؟"

"ہم نے انکل جلال کو کال کی۔ وہ پانچ منٹ میں آ گئے اور پھر انہوں نے پولیس کو کال کی تھی۔"

"کیا اس وقت بارش ہو رہی تھی؟"

"نہیں، بارش آٹھ بج کر چالیس منٹ پر..... رک گئی تھی۔ انکل جلال کو آٹھ بج کر اڑتیس منٹ پر کال کی تھی۔"

اس نے وقت کا پورا حساب رکھا تھا حالانکہ وہ..... بدحواس تھے اور ایسے میں آدمی کو اتنی درستی کے ساتھ وقت یاد نہیں رہتا ہے۔ میں نے اس سے چند سوالات اور کیے اور پھر سہیل کو تلاش کیا۔ وہ ملیر بی اے میں تھا۔ درحقیقت تینوں

بی آنرز میں تھے۔ سہیل نے میرے سوالوں کے تقریباً وہی جواب دیے جو ساجد نے دیے تھے۔ ان میں بہت معمولی سا فرق تھا۔ وہاں سے نکل کر میں نے شعبان کو کال کی۔ اس نے کہا تھا کہ آج وہ کچھ اور افراد کے بارے میں پتا چلائے گا اور پھر ہم ان سے مل کر معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ وہ قاتلوں کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟ ہم.....

اگلے چار پانچ دن بہت مصروف رہے۔ ایک ایک کر کے ہم نے تقریباً تمام ہی افراد کو کھنگال لیا تھا۔ مگر ان میں سے کسی ایک سے بھی کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہو سکی تھی۔

اس دوران میں خاصی مشکلات پیدا ہوئیں۔ ایک بار تو ہم پکڑے جانے سے بال بال بچے تھے کیونکہ جس وقت ہم اس ٹھکانے میں تھے اسی وقت پولیس اور دوسرے قانون نافذ کرنے والے اداروں نے وہاں مشترکہ کارروائی کی تھی اور ہم بہ مشکل نکل سکے تھے۔ ایک ہفتے سے زیادہ وقت گزر جانے کے بعد بھی پیش رفت صفر تھی اور جلال نے ہمیں بلایا تھا۔ وہ ہمیں ایک کروڑ روپے دے چکا تھا اس لیے اب پوچھنا اس کا حق تھا۔ پہلے میں پہنچا اور جلال کو رپورٹ دی تھی۔ اس نے سرگرمی سے کہا۔ "نتیجہ کیا نکلا؟"

"کچھ بھی نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "اس قسم کی تلاش مشکل سے کامیاب ہوتی ہے، یہ بات تم بھی سمجھتے ہو۔ ہمارے پاس کوئی جادو کی چھڑی نہیں ہے۔ ہم نے زیر زمین دنیا میں اپنے تمام تعلقات استعمال کر کے دیکھ لیے ہیں بلکہ یہ کہنا درست ہو گا کہ تعلقات خراب کر لیے ہیں، اب وہ ہمارے لیے کچھ نہیں کریں گے۔"

"تمہیں ان لفنگوں کا محتاج ہونا بھی نہیں چاہیے۔" اس نے ناگواری سے کہا۔

"حالانکہ ضرورت پڑنے پر لفنگے ہی کام آتے ہیں۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ شعبان آ گیا اور خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گیا۔

"مجھے اور کتنا انتظار کرنا پڑے گا؟"

"زیادہ نہیں۔" شعبان نے کہا۔ "کیونکہ ہم جو کر سکتے تھے وہ تقریباً کر چکے ہیں۔ جو رہ گیا ہے وہ بھی چند دن میں کر کے دیکھ لیں گے، ہو سکتا ہے کوئی نتیجہ نکل آئے۔"

"ورنہ میرے کروڑ روپے گئے۔" جلال نے طنز کیا۔

"ظاہر ہے۔" شعبان نے اسی لہجے میں جواب دیا۔ "تم نے کروڑ دیے ہیں لیکن ہم نے آگے کے لیے اپنا اتنا ہی نقصان بھی کر لیا ہے۔ ہم چھوٹے پیمانے پر ہاتھ پاؤں ہلا کر کام کرنے والے لوگ ہیں۔ تمہارے کام میں ہمیں کھل

کر سامنے آنا پڑا۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ اس ایک ہفتے میں ہم نے کتنا نقصان اٹھایا ہے۔"

"شعبان ٹھیک کہہ رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم نے تمہاری دوستی کی خاطر یہ کام لیا اور جب لیا تب بھی کہہ دیا تھا کہ کامیابی کی کوئی ضمانت نہیں ہے اس لیے مہربانی کر کے تم اپنا رویہ درست کرو۔"

جلال کے جبڑے بھنچ گئے مگر رفتہ رفتہ اس کے چہرے پر نرمی نمودار ہونے لگی۔ اس نے گہری سانس لی۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو، میں زیادہ ہی بول گیا۔"

"جلال ہم اپنی سی پوری کوشش کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اگر تمہارے ذہن میں کوئی لائن ہے تو بتاؤ ہم اس پر بھی کام کر کے دیکھ سکتے ہیں۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میرے ذہن میں کوئی لائن نہیں ہے۔"

"تب ہمیں اپنی کوشش کرنے دو، ابھی ہم نے ہار نہیں مانی ہے۔" میں نے کہا۔ "میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے، میں اس پر کام کروں گا پھر تمہیں اس کا نتیجہ بتاؤں گا۔"

ہم جلال کے گھر سے نکلے تو شعبان نے پوچھا۔

"آئیڈیا کیا ہے؟"

"ابھی نہیں، میں نے کہا نا کہ مجھے اس پر کام کرنے دو۔"

شعبان کی گاڑی خراب ہو گئی تھی، وہ ٹیکسی کر کے آیا تھا اور واپسی کے لیے اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اسے چھوڑ دوں۔ وہ صنعتی علاقے میں ایک متروک فیکٹری کی عمارت میں رہتا تھا۔ اس فیکٹری کا مالک جو اب بیرون ملک تھا جاتے ہوئے شعبان کو یہاں بٹھا گیا تھا۔ اسے خطرہ تھا کہ فیکٹری کی قیمتی زمین پر کوئی قبضہ نہ کر لے۔ ایک طرح سے شعبان اس قیمتی جگہ کا چوکیدار تھا۔ وہ ٹھاٹ سے وہاں رہتا تھا اور فیکٹری کے مالک سے تنخواہ بھی وصول کرتا تھا۔ اس نے وہاں آفس کی عمارت میں دو کمرے سیٹ کر لیے تھے۔ فیکٹری کا اصل چوکیدار اب اس کے کام بھی کر دیا کرتا تھا۔ وہ ایک طرح سے شعبان کا ذاتی ملازم بن گیا تھا۔ میں نے اسے فیکٹری کے گیٹ پر چھوڑا اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

میری رہائش ایک متوسط آبادی میں تھی۔ جب میں نے یہاں مکان لیا تو زیادہ آبادی نہیں تھی اور زیادہ تر چھوٹے درجے کے لوگ رہتے تھے مگر پھر شہر کے وسط میں ہونے کی وجہ سے اس کی قیمت بڑھی تو غریب غربا زمین اور مکان فروخت کر کے یہاں سے چلے گئے اور اب یہاں زیادہ تر متوسط طبقے کے لوگ رہتے تھے۔

ثمینہ کھانا بنا کر رکھ گئی تھی۔ کھانا کھا کر میں کچھ دیر چہل قدمی کر کے واپس آیا اور سونے سے پہلے غسل کر رہا تھا کہ موبائل کی بیل بجی اور خاصی دیر تک بجتی رہی۔ میں باہر آیا تو دیکھا شعبان کی کال تھی۔ میں نے اسے جوابی کال کی تو بیل جانے لگی مگر اس نے کال ریسیو نہیں کی۔ میں نے دوبارہ نمبر ملایا۔ اس بار اس نے ریسیو کی اور کاٹ دی۔ میں نے تیسری بار بیل دی تو فون بند تھا۔ میں فکر مند ہو گیا۔ میرے پاس فیکٹری کا نمبر تھا۔ میں نے وہاں کال کی اس پر بھی کوئی ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ میری فکر بڑھ گئی۔ میں نے کچھ سوچا اور اپنا پستول لے کر گھر سے نکل آیا۔

بیس منٹ بعد میں فیکٹری پہنچ گیا۔ رات بارہ بجے وہاں سناٹا اور ویرانی تھی۔ آس پاس اکا دکا فیکٹریوں میں نائٹ شفٹ میں کام ہو رہا تھا مگر اس سے سناٹے پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا تھا۔ میں نے گیٹ چیک کیا۔ چوکیدار

اہلیت

ایک کمپنی کا منیجر ماہر نفسیات بھی تھا۔ کمپنی کے مالک کو ایک سیکریٹری کی ضرورت تھی۔ منیجر نے کہا کہ آنے والی لڑکیوں کا انٹرویو نفسیاتی طریقے سے وہ خود لے گا اور مالک نے حامی بھر لی۔

منیجر نے تین امیدوار لڑکیوں کو ایک ساتھ کمرے میں بلالیا اور پہلی لڑکی سے پوچھا۔ "دو اور دو؟"

"چار۔" لڑکی نے جواب دیا۔

منیجر نے یہی سوال دوسری لڑکی سے کیا۔

"بائیس۔" دوسری لڑکی نے بتایا۔

منیجر نے تیسری لڑکی سے بھی یہی پوچھا۔

"چار بھی ہو سکتے ہیں اور بائیس بھی۔" تیسری لڑکی کا جواب تھا۔

منیجر نے تینوں لڑکیوں کو باہر بھیج دیا اور مالک سے بولا۔

"پہلی لڑکی نے وہ جواب دیا جو بچی بھی دے سکتی تھی۔ جبکہ دوسری یہ سمجھی کہ ہم کوئی چال چل رہے ہیں اور اس نے بائیس کہا۔ لیکن تیسری لڑکی کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھی اس لیے اس نے دونوں جواب دیے اب آپ کسے پسند کریں گے؟"

"سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والی لڑکی کو رکھ لو۔" مالک نے جواب دیا۔

وہیں سوتا تھا مگر گیٹ کھلا ہوا تھا اور چوکیدار اپنی چارپائی پر نہیں تھا۔ میں ذرا آگے گیا تو زمین پر ایک گٹھڑی سی نظر آئی۔ میں نے اسے سیدھا کیا تو وہ چوکیدار تھا۔ کسی نے اس کی پشت میں گولی ماری تھی، وہ مر چکا تھا۔ میں نے اپنا پستول نکال لیا اور دبے قدموں آفس بلڈنگ کی طرف بڑھا۔ فیکٹری کی دیوار کے ساتھ شیڈ تھا جس کے نیچے گاڑیاں پارک کی جاتی تھیں۔ عمارت کا داخلی دروازہ بھی کھلا ہوا تھا اور اندر سے ٹی وی چلنے کی آواز آرہی تھی۔ شعبان کی عادت تھی کہ وہ بہت بلند آواز کرکے ٹی وی دیکھتا تھا۔ اس وقت بھی آواز خاصی بلند تھی۔ میں اندر آیا تو شعبان لاؤنج میں ٹی وی کے سامنے صوفے پر بیٹھا ہوا تھا اس کی پشت میری طرف تھی۔

میں نے آس پاس دیکھا اور دبے قدموں آگے بڑھا۔ جب نزدیک آیا تو اسے ساکت پاکر میری آنکھوں کے آگے اندھیرا آگیا تھا۔ شعبان کے ماتھے پر سوراخ تھا اور اس سے خون نکل کر اس کے چہرے پر پھیل گیا تھا۔ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے اس کا چہرہ چھوا۔ خون تازہ تھا۔ یعنی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی جب قاتل نے اسے شوٹ کیا۔ میں نے دونوں کمرے چیک کیے مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ باقی عمارت خالی اور مقفل رہتی تھی۔ قاتل شاید میری آمد سے کچھ پہلے نکلا تھا۔ شعبان کا موبائل پاس پڑا تھا اور یقیناً قاتل نے میری کال کاٹ کر اسے آف کیا تھا۔ میں نے جلال کا نمبر ملایا۔ اس نے قدرے دیر سے کال ریسیو کی اور بولا۔ ''ہاں شبیر، کیا ہوا؟''

''شعبان کو کسی نے قتل کردیا ہے۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''شاید یہ ہماری گزشتہ ایک ہفتے کی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔''

جلال کچھ دیر کے لیے چپ رہ گیا۔ ''تمہارا مطلب ہے کسی ایسے نے کام کیا ہے جسے خطرہ ہو کہ تم اس تک نہ پہنچ جاؤ۔''

''ممکن ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یا ہوسکتا ہے کہ ہمارا نشانہ بننے والے کسی شخص نے انتقام لیا ہو۔''

''یہ کسی درمیانی آدمی کا کام نہیں لگتا ہے۔'' جلال بولا۔

''اسی لیے تو میں کہہ رہا ہوں کسی نے انتقام لیا ہے، کسی کو بھڑکا کر ان سامنے ہے۔''

جلال نے گہری سانس لی۔ ''سب جانتے ہیں کہ شعبان کہاں رہتا ہے ان کا کام آسان ہوگیا۔ سنو شبیر، میں نہیں چاہتا کہ تم بھی کسی قاتل کا نشانہ بن جاؤ اس لیے تم فی الحال منظر سے غائب ہوجاؤ۔''

جلال کے کہنے سے پہلے میں نے سوچ لیا تھا مگر اس سے یہی کہا۔ ''میں سوچوں گا۔''

''سوچو مت فوری عمل کرو، میرا ایک ہٹ ہے وہاں چلے جاؤ، اس کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔''

''وہاں کوئی ہوتا ہے؟''

''نہیں لیکن تمہیں اس کی چابی داخلی دروازے کے اوپر بنے کارنس پر مل جائے گی۔''

''میں آج تو نہیں کل جاؤں گا۔'' میں نے جواب دیا اور موبائل بند کردیا۔ میں نے اپنے ایک خفیہ ٹھکانے کا رخ کیا۔ ہم جیسے لوگوں کو اس قسم کے ٹھکانے بنا کر رکھنے پڑتے ہیں۔ میرا یہ ٹھکانا اس حد تک خفیہ تھا کہ اس کے بارے میں شعبان کو بھی علم نہیں تھا۔ یہ چھوٹا سا فلیٹ ایک پوش علاقے میں تھا جہاں پڑوسی کو پڑوسی کے بارے میں پتا نہیں ہوتا اور نہ ہی تجسس ہوتا ہے کہ کون کیا کررہا ہے؟ شعبان کے قتل نے میرا ذہن منتشر کردیا تھا اور میں فی الحال کہیں سکون سے بیٹھ کر سوچنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے یہ جگہ بہت موزوں تھی۔

میں فلیٹ میں آیا اور لاؤنج میں صوفے پر ڈھیر ہوگیا۔ صورت حال یک دم ہی سنگین ہوگئی تھی۔ اگر شعبان کا قتل ہماری مہم جوئی کا نتیجہ تھا تو لازمی بات تھی کہ اس کے بعد میری باری ہے۔ اب قاتل میری تلاش میں ہوں گے۔ جو چیز شروع میں موہوم سا خدشہ تھی، وہ اچانک اپنی پوری ہولناکی کے ساتھ سامنے آگئی تھی۔ شعبان کی موت بھی افضال کی طرح صاف ستھری تھی۔ اس کے گھر میں کہیں افراتفری اور ہنگامے کے آثار نہیں تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ شعبان ٹی وی دیکھ رہا تھا جب قاتل نے اچانک اس کے سامنے آکر اس کے سر میں سوراخ کردیا۔ گویا وہ اسے قتل کرنے ہی آیا تھا۔ زخم کا نشان چھوٹا تھا اور گولی دوسری طرف سے نہیں نکلی تھی۔ واردات میں چھوٹا ہتھیار استعمال ہوا تھا۔

میرے حواس ذرا بحال ہوئے تو میں نے فریج سے کولڈ ڈرنک کا ٹن نکال کر ایک ہی سانس میں خالی کردیا اور پھر ٹہلتا اور سوچتا رہا۔ اس رات مجھے بہت دیر سے نیند آئی تھی۔ اگلے روز دیر سے اٹھا اور تیار ہوکر باہر نکل آیا۔ مجھے کئی کام نمٹانے تھے۔ ان سے فارغ ہوکر میں نے جلال کو کال کی۔ وہ میرا ہی منتظر تھا کیونکہ قتل والی رات سے میں نے موبائل بند کیا ہوا تھا۔ اس نے فوراً کہا۔ ''تم کہاں تھے، میں بہت پریشان ہوا۔''

''میں ایک خفیہ جگہ تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

''پولیس نے کارروائی کی؟''

''ہاں میں نے اطلاع کردی تھی۔ پولیس نے لاشیں اٹھوا کر پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دی تھیں۔ مدپورٹ بھی آگئی ہے شعبان اور چوکیدار کو ایک ہی ہتھیار سے قتل کیا گیا ہے۔ پولیس کے مطابق یہ واردات کم سے کم دو افراد نے کی ہے۔''

''وہ شعبان کو قتل کرنے آئے تھے کیونکہ اسے ہلنے کی مہلت بھی نہیں ملی، دوری وی دیکھتے ہوئے نشانہ بنا۔''

''اب وہ تمہارے پیچھے آئیں گے۔'' جلال نے اضطراب سے کہا۔ ''تم جلد از جلد ساحلی ہٹ چلے جاؤ۔''

''میں کچھ کام نمٹا لوں، اس کے بعد جاؤں گا۔''

''کام زندگی سے زیادہ اہم نہیں ہیں۔''

''کچھ کام زندگی سے زیادہ اہم ہوتے ہیں۔''

میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔ شام تک میں مصروف رہا۔ جو کام کرنے تھے وہ کرلیے اور پھر میں نے شام کے وقت جلال کے بتائے ہٹ کا رخ کیا۔ آسمان پر گہرے بادل تھے اور لگ رہا تھا کہ آج پھر بارش ہوگی۔ میں ہٹ تک پہنچا تو تاریکی چھا چکی تھی۔ چابی مجھے دروازے کے اوپری کارنس پر مل گئی۔ میں لاک کھول کر اندر آیا۔ روشنی کرکے میں نے ہٹ کا جائزہ لیا۔ یہ ایک بیڈروم اور لاؤنج پر مشتمل تھا۔ فرنیچر کم مگر اعلیٰ درجے کا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جلال نے اسے اپنی کچھ خفیہ سرگرمیوں کے لیے رکھا ہوا تھا۔ میں نے کچھ دیر آرام کیا۔ آٹھ بجے بارش شروع ہوگئی۔ دس بجے اس کی شدت میں کمی آئی مگر بارش تھمی نہیں تھی۔ بارہ بجے سے ذرا پہلے ہٹ کا داخلی دروازہ کھلا۔ آنے والے نے چابی استعمال کی تھی۔ دروازے میں اندر کی سمت سے بند کرنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ لاؤنج میں تاریکی تھی اس لیے آنے والا بس ایک ہیولا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اندر آکر خاموشی سے دروازہ بند کیا اور بیڈروم کی طرف بڑھا۔ بیڈروم کا دروازہ بہت خاموشی سے کھولا اور پھر ہاتھ آگے کیا جس میں پستول تھا۔ بیڈ کی طرف اس نے تین فائر کیے اور پھر چونکا تھا۔ اس نے ہاتھ آگے کرکے بیڈروم کی روشنی جلائی۔ میں نے عقب سے کہا۔

''جلال، تم میرے نشانے پر ہو پستول پھینک دو، کوئی غلط حرکت مت کرنا ورنہ مجھے افسوس ہوگا۔ اس کے باوجود کہ تم شعبان کے قاتل ہو۔''

وہ ساکت رہ گیا پھر اس نے پستول پھینک دیا اور دونوں ہاتھ اوپر کیے۔ وہ بولا تو اس کا لہجہ پُرسکون تھا۔ ''تو تم جان گئے۔ تم نے بستر پر تکیہ اچھا بنایا ہے۔''

''ہاں میں جان گیا۔ تم نے کئی غلطیاں کیں، اول میں نے تمہیں نہیں بتایا کہ شعبان گھر میں مارا گیا ہے مگر تم نے کہہ دیا۔ تم اس وقت راستے میں تھے اور راستے ہی کار کے باوجود ٹریفک کا بانا شور مجھے سنائی دے رہا تھا۔ دوسرے تم نے چوکیدار کا ذکر کیا جبکہ سب اسے شعبان کا ملازم سمجھتے تھے اور بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ وہ فیکٹری کا چوکیدار تھا۔ تیسرے شعبان کو افضال کے انداز میں مارا گیا۔''

''ہاں۔'' جلال میری طرف مڑا۔ ''اس نے افضال کو قتل کیا کیونکہ اسے مجھ سے پرخاش تھی۔''

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''افسوس کہ تم ہمیشہ کی طرح جلد باز ثابت ہوئے۔ تم نے شعبان کو اپنے گمان کی وجہ سے قتل کیا حالانکہ اس نے یہ کام نہیں کیا۔''

''تب کس نے کیا، اس نے خود تسلیم کیا کہ اسے مجھ سے شکایت تھی۔''

''شکایت دوستوں میں ہوتی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے لگیں۔'' میں نے کہا اور پردے کے پیچھے سے نکل کر لاؤنج میں روشنی کی۔ ''مگر تم نے دوستی کا قطعی لحاظ نہیں کیا۔ پہلے بھی جب تمہارا مطلب پورا ہوگیا تو ہم سے تعلق ختم کرلیا اور اب بھی تم نے ایک بے گناہ شخص کو اپنے شبہے کی بھینٹ چڑھا دیا۔''

''اگر شعبان قاتل نہیں ہے تو کون ہے؟''

''افضال کا قاتل کوئی نہیں ہے، شاید وہ خود اپنا قاتل ہے۔''

جلال نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔ ''تمہارا دماغ درست ہے، کیا افضال نے خودکشی کی تھی؟''

''نہیں لیکن اس کا محرک وہ خود تھا۔'' میں نے کہا اور پستول سے اشارہ کیا۔ ''بیٹھ جاؤ، میں تمہیں بتاتا ہوں۔''

☆☆☆

سہیل اور حامد ساحل پر منتظر تھے اور پریشان تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ان کے چہرے سفید پڑ گئے۔ ساحل پر دور تک کوئی نہیں تھا۔ میں نے ان کے پاس آکر کہا۔ ''میں جاننا چاہوں گا کہ یہ سب کیسے ہوا؟''

سہیل نے حامد کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولا۔ ''یہ حادثہ تھا؟''

''میں شروع سے جاننا چاہتا ہوں۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''ایک ایک بات، اسی میں تم دونوں کی بچت ہے۔''

''ہم سچ کہیں گے۔'' حامد نے کہا۔

افضال، سہیل اور حامد بارش انجوائے کرنے باہر نکلے

تھے۔ وہ گھر والوں سے چھپ کر بیئر کی بوتلیں لے کر آئے تھے حالانکہ اس میں چھپنے والی کوئی بات نہیں تھی۔ اُم الخبائث تینوں گھروں میں پانی کی طرح موجود رہتی تھی۔ وہ پی رہے تھے اور سڑکوں پر گھوم رہے تھے۔ اسی دوران میں وہ جلال کے پرانے گھر کے سامنے جا نکلے تو افضال نے کہا۔

"آؤ اندر چلتے ہیں۔"

وہ گیٹ پھلانگ کر اندر گئے۔ افضال نے خفیہ جگہ چھپائی چابی نکالی اور وہ اندر آ گئے۔ یہاں داخلی دروازے کے ساتھ گھر کی چابیوں کا گچھا تھا جس میں گیٹ کے تالے کی چابی بھی تھی۔ یہاں انہوں نے فریج سے امپورٹڈ بیئر کے ٹن نکالے اور ان سے شغل کرنے لگے۔ ساتھ میں وہ ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ سہیل نے افضال سے کہا۔ "یار تیرا باپ اتنی بڑی توپ ہے، پاپا بتاتے ہیں کہ وہ گن بھی بانا گن تھا۔"

"مگر اس کے پاس ایک بھی گن نہیں ہے۔" حامد ہنسا۔ "اسے بانا گن دو آؤٹ گن۔"

"میرے پاپا کے پاس بہت سی گنز ہیں۔" افضال نے تردید کی۔

"کہاں ہیں، ہمیں تو ایک بھی نظر نہیں آئی۔"

"یہاں ہیں، میں تمہیں دکھاؤں گا مگر تم وعدہ کرو کہ کسی سے کہو گے نہیں اور نہ ہی انہیں چھیڑو گے؟"

سہیل اور حامد نے شرارت سے ایک دوسرے کو دیکھا اور اقرار کر لیا۔ افضال نے ماسٹر بیڈ روم کا دروازہ کھولا۔ وہاں ریک پر ایک ڈبا رکھا تھا، اس ڈبے میں گنی پستول تھے۔ سہیل اور حامد نے جھپٹ کر دو پستول اٹھائے اور افضال کے منع کرنے کے باوجود وہ لان میں نکل آئے۔ بارش میں وہ ایک دوسرے سے جھوٹ موٹ کی لڑائی لڑنے لگے۔ منہ سے فائرنگ کی آوازیں نکال رہے تھے۔ افضال پریشان تھا اسے معلوم تھا کہ جلال کو یہ بات معلوم ہو گئی تو اس کی شامت آ جائے گی۔ اس لیے وہ ان کے پیچھے بھاگ رہا تھا انہیں روک رہا تھا اور ان سے پستول واپس دینے کو کہہ رہا تھا۔ بارش زور و شور سے جاری تھی۔ حامد زیادہ بے قابو ہو رہا تھا وہ پستول سیدھا کیے ہوئے لان میں گھوم رہا تھا اور خیالی فائرنگ کر رہا تھا۔ اچانک افضال نے عقب سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور جیسے ہی پستول کی نال اس کے سر کی سیدھ آئی تو نہ جانے کیسے گولی چل گئی۔ افضال ہوا میں اچھلا اور نیچے گر کر ساکت ہو گیا۔ وہ دونوں اس کی طرف جھپٹے اور چیخ چیخ کر اسے آوازیں دیتے رہے مگر وہ نیچے گرنے سے پہلے ہی مر چکا تھا۔

اس کے بعد سہیل اور حامد نے سوچا کہ اگر انہوں نے سچ بتایا تو وہ پھنسیں گے اور پولیس سے زیادہ انہیں جلال کا خوف تھا۔ وہ اس کے بارے میں اچھی طرح جانتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اس جرم کو چھپانے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے سب سے پہلے پستول صاف کر کے اسی جگہ رکھے جہاں سے نکالے تھے۔ تمام تالے بند کیے اور پھر افضال کی لاش لے جا کر بارش کے پانی کی نکاسی والے نالے میں ڈال دی۔ ان کا خیال تھا کہ لاش بہہ کر سمندر میں چلی جائے گی۔ دوسری طرف انہوں نے ایک کہانی تیار کی اور پھر جلال کو کال کی۔ کیونکہ کہانی مصنوعی تھی اس لیے وہ کچھ زیادہ ہی کھل تھی اور مجھے اسی سے شک ہوا۔ میں نے جب سہیل اور حامد سے بات کی تو مجھے لگا کہ وہ کچھ چھپا رہے ہیں اس لیے میں نے ایک پلان بنایا۔ میں نے سہیل کو کال کی اور اسے بتایا کہ ایک پڑوسی جو اپنے گھر کی چھت پر تھا اس نے سب دیکھ لیا ہے اور میں نے اس سے معلوم کر لیا ہے۔ لیکن پولیس یا جلال تک بات لے جانے سے پہلے میں ان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ سہیل، حامد کی نسبت کم چالاک اور کم ہمت تھا، وہ میرے دھوکے میں آ گیا اور مان گیا۔ میں نے یہ کال ریکارڈ کر لی اور پھر حامد سے بات کی اور انہیں یہاں ساحل پر بلا لیا۔ انہوں نے ساری کہانی کھول کر رکھ دی، اور اس بار اس میں کوئی جھوٹ نہیں تھا۔

☆☆☆

جلال ساکت بیٹھا ہوا میری بات سن رہا تھا۔ جب میں چپ ہوا تو اس نے کہا۔ "یہ سچ ہے؟"

"تم معلوم کر لو، تم معلوم کر سکتے ہو۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "ان لڑکوں کو اٹھوا لو اور حقیقت اگلوا لو۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" جلال نے قدرے شرمندہ انداز میں کہا۔

میں کھڑا ہو گیا۔ "تمہاری دوستی کے ناتے میں نے آخری بار کچھ کیا ہے، امید ہے اب تم مجھ سے کبھی رابطہ نہیں کرو گے۔"

"تمہارا انعام؟" اس نے عقب سے کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن تم دینا ہی چاہتے ہو تو شعبان کے لیے کسی ضرورت مند کو دے دو۔" میں نے جواب دیا اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ بارش اب رک گئی تھی اور بادل چھٹنے سے کہیں کہیں آسمان دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے گہری سانس لی اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

گیتوں کا شکاری

بشریٰ امجد

لے دے نوبے زندگی کے ساز کی
زندگی آواز نئی آواز ہے

شوق... ذوقِ حسن کی پرچھائیں میں چھپا ہوتا ہے... وہ بھی اپنے شوق کے ہاتھوں مجبور تھا... لفظوں کے مفہوم سے ناآشنا... سازوں کے ردھم کا شیدائی اچانک ہی اپنی جان کو خطرے سے دوچار کر بیٹھا... قاتل اور مقتول کے درمیان صرف ایک سُریلی آواز حائل تھی...

کو اجاگر کرتی ایک انوکھی خیال آرائی

کار موڈی کو ریڈیو نیوز کا پتا نہیں تھا۔ کیونکہ وہ اس وقت اپنی نوٹ بک اور قلم کے ساتھ بسز میں تھا۔ ٹیپ ریکارڈر سنتے ہوئے الفاظ کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''گی چی بڑ......''

جنگلین فوک گیتوں کے ساتھ یہ بڑی مشکل تھی کہ جزیرے کے مختلف حصوں میں موجود لوگ ایک ہی گیت کو مختلف انداز میں گاتے تھے۔ بعض ایک مقام پر سمجھ میں آجاتے لیکن جزیرے کے کسی دوسرے حصے میں فوک گیت

گھٹنے میں نہایت دشواری کا سامنا کرنا پڑتا۔

وہ ایک سال سے جمیکا کے ذرک گیت ٹیپ کی مدد سے جمع کر رہا تھا۔ یہ اس کی ہابی تھی۔ آخری چھ درجن کے قریب ٹیپس نے کارموزی کو سخت مشکل میں ڈالا ہوا تھا۔

"جنابِ عالی..."

وہ ریڈیو نیوز نہیں سن سکا تھا لیکن ہاؤس کیپر نے سن لی تھی۔ کیونکہ ریڈیو، کچن میں اس کے قریب تھا جہاں وہ مصروفِ کار تھی۔ خبر سنتے ہی وہ چولھا ہانڈی بھول گئی۔ اس نے ایک وزنی تیز دھار والی چھری بلکہ چھرا ہاتھ میں دبوچا اور کارموزی کے کمرے کی جانب بھاگی۔

کارموزی سمجھ گیا کہ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اس نے نوٹ بک بند کر دی۔

"کیا بات ہے مسز شنیفرڈ؟"

"وہ بھاگ نکلا ہے، جناب۔"

"کون؟"

"جارگی۔ ابھی ابھی ریڈیو سے خبر چلی ہے۔"

"جارگی فرار ہو گیا ہے؟" کارموزی اٹھ بیٹھا۔

"جناب وہ آپ کو ختم کرنے سیدھا یہاں آئے گا۔"

کارموزی نے ٹیپ ریکارڈر آف کر دیا۔ "کیا انہوں نے ریڈیو پر بتایا کہ وہ کس وقت فرار ہوا؟"

"گزشتہ شب۔" مسز شنیفرڈ نے عالمِ وحشت میں جواب دیا۔ "اس کا مطلب وہ کسی بھی وقت یہاں پہنچنے والا ہے۔"

"اس موسلا دھار بارش میں؟"

"بارش تو کیا طوفان بھی اسے روک نہیں سکتا۔" وہ چلائی۔

کارموزی کسمسایا اور کمرے کی واحد کھڑکی کی جانب دیکھا۔ تیز بارش کی وجہ سے باہر دھندلی تھی۔ اوپر چھت سے پانی کا ریلا نیچے گرتا تو کھڑکی کے سامنے واضح آبی پردہ سا بن جاتا۔

سال کے اس مہینے میں ایسی بارش کئی دن تک جاری رہ سکتی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ گاؤں کی طرف جانے والی ٹوٹی پھوٹی سڑک بارش کے پانی میں گم ہو چکی ہوگی اور وہ کار کے ذریعے گاؤں تک نہیں پہنچ سکتا۔ نیز مقامی پولیس تین میل کے فاصلے پر تھی۔ ایسی رات میں وہاں تک پیدل پہنچنا بہت دشوار تھا۔

مسز شنیفرڈ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ تو تو اور جارگی پہنچنے والا ہو گا۔ ممکن تھا کہ وہ اس وقت آس پاس ہی ہو۔ اگر وہ آس پاس ہوا تو ایسے میں کارموزی کا باہر نکلنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

☆☆☆

دو مہینے پہلے کی بات ہے جب جارگی کی محبوبہ گولڈی ہینڈرسن کی لاش اس حالت میں ملی تھی کہ اس کا گلا کٹا ہوا تھا۔ پورا ڈسٹرکٹ باخبر تھا کہ یہ جارگی کا کارنامہ ہے۔ وہ کسی صورت یہ بات برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ گولڈی ہینڈرسن کسی اور مرد کی جانب متوجہ ہو۔ سب جانتے تھے لیکن پولیس تک جانے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔ جو بھی یہ حماقت کرتا، جارگی اس کے ٹکڑے کر دیتا۔

لیکن "جان کارموزی" پولیس تک جا پہنچا۔ مسز شنیفرڈ کی طرح مقتولہ کارموزی کے گھر کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ اس نے پولیس کو جارگی کی دھمکیوں اور گولڈی ہینڈرسن کے خوف کے بارے میں بتایا۔ تفتیش میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔

جارگی کے گمان میں نہ تھا کہ کوئی پولیس تک جانے کی جرأت کر سکتا ہے۔ اس کا ذاتی نما خون آلود چھرا برآمد ہو گیا۔ تفتیش میں سی آئی ڈی نے اس سے اعترافِ جرم کرا لیا۔

بہر قامت جارگی کو گرفتار کر لیا گیا۔ مقدمہ چلا اور جارگی پر جرم ثابت ہو گیا۔ سزائے موت ہوئی اور اسے قید میں ڈال دیا گیا۔ وہ تھا اور موت کا انتظار...

اب خبر آئی تھی کہ وہ موت کی سزا پانے سے قبل ہی فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ برہم مزاج وہ تو بدلے کی آگ میں جھلس رہا ہو گا۔ اس بات میں شک و شبے کی گنجائش نہ ہونے کے برابر تھی کہ وہ سیدھا کارموزی تک نہیں آئے گا۔ کارموزی کو ایسی کسی بھی خوش فہمی کی قیمت جان دے کر چکانی پڑتی۔

کارموزی کی آنکھوں میں موت ناچ رہی تھی تاہم اس نے اپنی اندرونی حالت مسز شنیفرڈ پر ظاہر نہیں ہونے دی۔ اس نے ٹائپنگ پیپر پر جلدی سے ایک مختصر پیغام ٹائپ کیا اور اسے لفافے میں بند کر کے مسز شنیفرڈ کے حوالے کیا۔

"پلیز اسے پولیس اسٹیشن تک پہنچا دو۔" اس نے کہا۔ وہ کھانے کے بارے میں کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔

"کچن کو میں دیکھ لوں گا۔" کارموزی نے جواب دیا۔ "تمہیں جانے میں دقت ہو گی لیکن واپسی میں تم پولیس کے ساتھ آ جانا۔"

مسز شنیفرڈ کے چہرے پر ہراس تھا تاہم وہ چھرا چھوڑ

کر برسی رات میں باہر نکل گئی۔ یہ اوہام پرست اور پسماندہ لوگ تھے۔

ادھر سڑک کی حالت بگڑتی جارہی تھی۔ کارموڈی سوچ رہا تھا کہ کیا مسز شنیفرڈ اس کی ہدایت پر عمل کرے گی؟ شاید نہیں۔ بارش سدراہ تھی۔ یہ لوگ بارش سے بھی گھبراتے تھے۔ اس کے پاس چھتری بھی نہیں تھی۔ اوپر سے تاریکی، وقفے وقفے سے آسمانی بجلی کی گرج اور چمک۔

وہ گھر چلی جائے گی اور صبح آکر کوئی بہانہ کر دے گی۔ بارش اور سڑک کی عدم موجودگی سے بڑھ کر بہانہ اور کیا ہوسکتا ہے؟ کم از کم وہ یہاں سے تو نکل گئی ہے اور خطرے سے باہر ہے۔ کارموڈی نے دھیان مسز شنیفرڈ کی جانب سے ہٹالیا۔

بہرحال کچھ تو کرنا پڑے گا۔ سب سے پہلے اس نے داخلی دروازے کو لاک کیا۔ واپس آکر چھرا اٹھایا اور وسیع ہال سے گزر کر کچن میں آگیا۔ اس نے چولھا بند کر دیا۔ جو کچھ موجود تھا، جلدی جلدی اسے داخلِ شکم کیا اور کافی کا کپ لے کر اپنے کمرے کی جانب چل پڑا۔ یہ ایک بڑا دو منزلہ پرانا مکان تھا۔

کمرے کا دروازہ بند کرنا بے معنی تھا۔ لاک ندارد تھا۔ بیشتر دروازوں کا یہی حال تھا۔ تقریباً نصف کے قریب کھڑکیاں زنگ کے باعث لاک نہیں کی جاسکتی تھیں۔ جو لاک تھیں، وہ بھی کوئی قابل ذکر مزاحمت پیش کرنے سے قاصر تھیں۔

داخلی دروازہ اس نے بند تو کر دیا تھا۔ تاہم اس نے کسی قسم کا تحفظ محسوس نہیں کیا۔ خوف اس پر حاوی ہوتا جارہا تھا۔ مسز شنیفرڈ کا چھوڑا ہوا چھرا اس کا واحد ہتھیار تھا۔ چھرا اس کے دشمن کے پاس بھی ہوگا۔ دونوں میں واضح فرق تھا۔ وہ جارگی جیسے وحشی کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ آتشِ انتقام نے ویسے ہی اسے آگ بگولا کیا ہوا ہوگا۔

وہ خود کو چوہے دان میں پھنسا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ تاہم اس کا ذہن کام کر رہا تھا۔ کچھ نہ کچھ تو اسے کرنا تھا۔ اس نے خوف پر قابو پانے کی کوشش کی اور بستر پر دراز ہو گیا۔ اچانک روشنی مدھم پڑ گئی۔ ہر اس کی لہر اس کے بوردانِ خون میں شامل ہوگئی۔ یہاں بجلی درہاپر موجود ٹربائن کی مدد سے پہنچتی تھی۔ اس کی سانس رک سی گئی۔ چند سیکنڈ بعد روشنی پھر سابقہ حالت میں آگئی۔ کارموڈی نے رکی ہوئی سانس خارج کی۔

چھرا اس کے نزدیک ڈوبتے شخص کی طرح محض ایک تنکے کا سہارا تھا۔

معاً اسے ٹیپ کا خیال آیا۔ ریکارڈر اسی کے کمرے میں موجود تھا۔ اس کے ذہن میں ایک انوکھا خیال آیا اور آنا نے دامن تھام لیا۔ اس نے اٹھ کر اپنے مطلب کی ٹیپس جمع کیں، پھر واپس بستر پر آگیا۔ اگر بجلی کسی وجہ سے چلی بھی جاتی ہے تو ریکارڈر بیٹری سے چلتا رہے گا۔ اس نے سوچا۔

اس نے زندگی میں کبھی گن کی شکل نہیں دیکھی تھی، نہ کوئی تیز دھار ہتھیار اپنے پاس رکھا تھا۔ البتہ یہاں کے پہاڑی باسیوں اور خانہ بدوشوں کے لیے یہ ایک عام بات تھی۔ اسے چھرا تو نہیں کہہ سکتے۔ یہ ایک وزنی خم دار چھوٹی تلوار کی طرح مہلک ہتھیار تھا جس کی دھار کو وہ بلیڈ کی طرح آبدار رکھتے تھے۔ یہی تلوار نما ہتھیار جارگی کے پاس بھی رہتا تھا۔ فرار کے بعد ایسا ہتھیار حاصل کرنا اس کے لیے معمولی بات تھی۔

کارموڈی ان جزائر کا باشندہ نہیں تھا۔ اسے تلوار نما ہتھیار سے زیادہ اپنے ریکارڈر اور ٹیپس پر بھروسا تھا۔ ان پہاڑی علاقوں میں وہ واحد آدمی تھا جس کے پاس ٹیپ ریکارڈر تھا۔ اب تک بہت کم لوگوں کا "جادو کے ڈبے" سے تعارف ہوا تھا۔ وہ لوگ کارموڈی کے ریکارڈر کو جادو کا ڈبا ہی سمجھتے تھے۔

دفعتاً اس کا دل زور سے دھڑکا۔ یہ کیا تھا؟ اس نے سماعت کسی اجنبی آواز کو سننے پر مرکوز کر دی۔ اسے لگا جیسے چوبی سیڑھیوں پر "چرچر" کی آواز آئی ہو۔ وہ غور کرتا رہا۔ لیکن ہوا اور تیز بارش کی آوازوں کے سوا کچھ سنائی نہ دیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے ریکارڈر آن کر دیا، لیکن پلے کا بٹن دبانے سے رک گیا۔

"نہیں، ابھی نہیں۔" اس نے خود سے کہا۔

"چرچر" کی آواز پھر ابھری۔ کوئی دروازہ کھلا اور بند ہوگیا۔ کارموڈی کے اعصاب بُری طرح کشیدہ ہوگئے۔ دشمن آن پہنچا تھا۔

تھوڑے سے وقفے پر پھر کوئی دروازہ کھل کر بند ہوگیا۔ موت کا ہرکارہ زندگی کی تلاش میں تھا۔ زندگی اور موت کے درمیان ریکارڈر کی ایک معمولی سی بٹن حائل تھی۔ پھر بھی کارموڈی نے بٹن والے حصے کے وسط پر ہاتھ رکھ دیا اور پلے کا بٹن دبا دیا۔

یہ ٹیپ اس نے ایک ماہ قبل کنگسٹن کے جزیرے کی ایک پارٹی میں ریکارڈ کیا تھا۔ چوبی سیڑھیاں چرچرا گئیں... کارموڈی نے آواز دھا دی۔

اسپیکر سے مختلف قسم کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔

بات چیت، قہقہے... پارٹی کا شور شرابا۔

سیڑھیاں چڑھنے کی آواز رک گئی۔ کارموزی کا ایک ہاتھ چہرے کے رستے پر تھا اور وہ سیدھا بت بنا بیٹھا دروازے کو گھور رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر پسینا نمایاں تھا۔

کمرے کے باہر کوئی آواز نہیں تھی جبکہ کمرے کے اندر یوں لگ رہا تھا کہ متعدد افراد موجود ہیں۔ ٹیپ گھومتی رہی۔ منٹ گزرتے رہے... کارموزی کا بدن اکڑ گیا۔ وہ مستقل دروازے کو گھور رہا تھا۔ 30 منٹ، 45 منٹ اور 60 منٹ۔ ٹیپ ختم ہوگئی۔ کمرے کے اندر اور باہر سناٹا تھا۔ بڑے نازک حالات تھے۔ کیا جارگی چلا گیا ہے؟ اگر اس نے دھوکا نہیں کھایا تو کسی وقت بھی اندر گھس آئے گا۔

کارموزی نے دوبارہ ٹیپ چلانے کا ارادہ کیا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ پہلے اسے ٹیپ ریوائنڈ کرنی پڑے گی۔ اس طرح پارٹی کا وقفہ قدرے طویل ہو جائے گا۔ جو غیر فطری لگے گا اور آوازیں بھی دوبارہ ایک جیسی سنائی دیں گی۔ اس میں خطرہ تھا۔

یک لخت لائٹ چلی گئی۔

اندھیرا۔ خاموشی۔ موسم کے شور سے بلند سینے کے اندر کا شور تھا۔

باہر چوبی تختے نے پھر چر...ر...ر...ر... کی آوازیں نکالیں۔ کارموزی گرتے گرتے بچا۔ بھاری قدموں کی آہٹ واضح تھی لیکن یہ آہٹ رک رک کر آرہی تھی۔ وقفوں کے ساتھ۔ یقیناً جارگی غیر یقینی کا شکار تھا۔

کارموزی نے اندھیرے میں اپنی مطلوبہ دوسری ٹیپ تلاش کرنے کی ناکام کوشش کی۔ اس پر گھبراہٹ طاری تھی۔ مجبوراً جو بھی ٹیپ ہاتھ لگی وہ اس نے ریکارڈر کے سپرد کی۔ پھر اسے بیٹری پر کر کے ایک بار پھر پلے کا بٹن دبایا۔ سرسراہٹ ہوئی لیکن کوئی آواز برآمد نہیں ہوئی۔

اندھیرے اور گھبراہٹ کے باعث اس نے غلط بٹن دبا دیا تھا۔

کارموزی نے احتیاط سے اپنی غلطی درست کی اور ریکارڈر سے ایک سُریلی آواز بلند ہوئی۔

اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ قاتل کمرے کے دروازے تک پہنچ گیا ہے۔

سریلی آواز فوک سانگ کی تھی۔ یہ سریلی آواز درجنوں گیت گا چکی تھی۔ لیکن یہ گیت خاص طور پر کارموزی کے لیے تھا۔

کسی نے کمرے کے دروازے پر ہاتھ رکھا۔ کارموزی کا دل حلق میں دھڑک رہا تھا۔ دروازے کے پیچھے جو بھی تھا وہ گیت کی آواز سن کر تھم گیا تھا۔ ایک منٹ... دو منٹ... تین منٹ۔ کچھ بھی نہیں ہوا۔ پھر اچانک کسی وزنی چیز کے گرنے کی آواز آئی۔ پھر وحشت میں ڈوبی ہوئی ایک زوردار چیخ بلند ہوئی۔

تھڑ... تھڑ... تھڑ... بھاری قدم تیزی سے سیڑھیاں اتر رہے تھے۔ جارگی خوف زدہ انداز میں فرار ہو رہا تھا۔ یعنی موت کارموزی کو سونگھ کر چلی گئی تھی۔

☆☆☆

گیت اس وقت بھی فضا میں گونج رہا تھا جب کارموزی نے مکان سے باہر چیخ پکار کے ساتھ فائرنگ کی آواز سنی۔

کچھ دیر بعد کارپورل ڈیلی اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ وہاں پہنچا۔ مسز شبنز بھی ساتھ تھی۔ ڈیلی نے فلیش لائٹ کی روشنی بستر پر ڈالی۔ تاکہ لاش کا جائزہ لے سکے۔ لیکن وہاں کارموزی کو زندہ حالت میں دیکھ کر سب دنگ رہ گئے۔ ادھر کارموزی حیران تھا کہ مسز شبنز اس کے اندازوں کے برعکس تھانے تک جا پہنچی تھی۔

”ہم نے اسے مکان سے نکلتے وقت مار گرایا تھا۔“ ڈیلی کی آواز آئی۔ ”لیکن... تم کیسے بچ گئے، یہ کیا کرشمہ ہے؟“ مدھم روشنی میں دروازے کی دوسری جانب جارگی کا تلوار نما ہتھیار پڑا تھا۔ کارموزی نے اسی کے گرنے کی آواز سنی تھی۔

ڈیلی کی توجہ ریکارڈر کی طرف گئی۔ گیت ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ ڈیلی کا منہ کھلا رہ گیا۔ اس نے گیت اور گلوکارہ کی آواز پہچان لی تھی۔ وہ حیرت کے عالم میں ریکارڈر کو دیکھ رہا تھا۔ ”یہ کیا چیز ہے۔ ریڈیو تو نہیں ہے؟“ اس نے سوال کیا۔

”یہ ریڈیو کا بڑا بھائی ہے۔“ کارموزی نے جواب دیا۔

”گولڈی ہینڈرسن؟“ اس کے منہ سے سرسراتی آواز نکلی۔ ”یہ گولڈی ہینڈرسن کا گیت ہے۔“

”ہاں۔“ کارموزی نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ اس نے ریکارڈر اٹھایا اور اسپیکر کی جالی پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔

میاں بیوی دونوں جواری تھے... دونوں میں سے ایک کو ہر وقت ناکامی سے دوچار ہونا پڑتا تھا... ناکامیوں اور بڑھتی ہوئی رنجشوں نے اسے مجبور کردیا کہ وہ آخری بار ایسا جوا ضرور کھیلے گا... جو نہ صرف یادگار ہوگا... بلکہ اسے جیت سے بھی ہمکنار کرے گا...

ساحر اور ہیجان انگیز لمحوں کو دوچند کرتی خونی روداد...

خونی جوا

ماہ نور

مسز ڈولان ایک منہ پھٹ عورت تھی۔ اکثر عادات میں وہ دوسری عورتوں سے مختلف تھی۔ وہ اپنے فیصلے خود کرنے کی عادی تھی۔ بسا اوقات وہ دوسروں کی توقعات کے برخلاف عمل کر جاتی تھی۔ ایسا ہی اس نے ڈولان کی بہن کی تدفینی رسوم کے موقع پر کیا۔ اس کی بہن کا انتقال تپ دق کی بیماری سے ہوا تھا اور اس نے آخری وقت تک سگریٹ نوشی ترک نہیں کی تھی۔

تدفینی مراحل کے اخراجات مسز ڈولان نے برداشت کیے۔ بعض احباب نے دبی زبان میں تبصرہ کیا۔ ''وہ اس کی بہن نہیں تھی پھر بھی اس نے... کم از کم اس کے ہزار ڈالر خرچ ہوئے ہوں گے۔''

مسز ڈولان کی جانب کسی نے توجہ نہیں دی۔ وہ شرکا

کی نگاہوں سے بچنے کے لیے پھولوں کی آڑ لے لی۔ تمام صورتِ حال نے اسے بدمزہ کر دیا تھا۔ دوسری جانب اس کی بیوی نے بھی اس کے احساسات کی پروا نہیں کی۔

☆☆☆

"یوں لگ رہا تھا کہ وہ تمہاری بہن نہیں، میری بہن تھی۔" مسز ڈولان نے تلخ تبصرہ کیا۔ "تمام توجہ میرے اوپر تھا۔ میرے احباب متعجب تھے، اگرچہ وہ کچھ بولے نہیں۔"

ڈولان ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے پاس کوئی جواب نہیں ہے، نہ ہی اس کی بیوی کسی جواب کی منتظر ہے۔

دونوں پوکر (تاش کا کھیل) کے شوقین تھے۔ سارے فساد کی جڑ یہی کھیل تھا۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں ڈولان نے اسے بتایا تھا کہ اس کھیل میں کبھی بڑا داؤ مت لگانا۔ یہی اس کی غلطی تھی۔ مسز ڈولان اور ٹاپ کی عورت تھی۔ کسی بھی قسم کا کھیل اس کا جنون تھا۔ داؤ جتنا بڑا اس کا جنون بھی اتنا ہی فزوں تر۔

اس نے شوہر کی ہدایت کے برعکس بڑے داؤ لگانے شروع کر دیے۔ دس میں آٹھ بار وہ جیت جاتی۔ ڈولان حیران و پریشان تھا۔ چھوٹے داؤ لگا کر بھی اس کی مالی حیثیت کمزور ہوتی جا رہی تھی۔

ڈولان حسد اور احساسِ کمتری کا شکار ہونے لگا۔ فرسٹریشن سے مغلوب ہو کر اس نے ایک دو خود بھی بڑا داؤ لگایا اور ہار گیا۔

اب وہ پوکر کھیلنے کی پوزیشن میں ہی نہیں تھا۔ مسز ڈولان کی طعن و تشنیع میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہ اس معاملے میں احمق تھی جو ایک بدحال مرد کی انا سے کھیل رہی تھی اور ڈولان کے اندرونی جذبات سے بے خبر تھی۔

ڈولان کی بے وقعتی کا احساس شدید ہوتا گیا۔ بالآخر اس کی بہن کی تدفین بھی اس کی بیوی کو گراں گزری۔ بعد از اں اس نے ڈولان کی بے عزتی بھی خوب کی۔ جو...... ڈولان خاموشی سے سہہ گیا کیونکہ وہ ایک فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔

☆☆☆

اس روز پھر پارٹی کا اہتمام تھا اور ڈولان کو علم تھا کہ وہاں لاٹری جوا بھی کھیلا جائے گا۔ ڈولان نے وہاں نہ جانے کا عندیہ دیا تو مسز ڈولان حسبِ معمول بھڑک اٹھی۔

"تم ایک ناکام جواری ہو۔" اسٹیج مجیشن (جادوگر) کے طور پر بھی تم قابلِ قبول تھے... اور تم جانتے ہو کہ میں وہاں تنہا گئی تو دوست احباب میرا کتنا مذاق اڑائیں گے۔"

ڈولان کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کی بیوی کا اشارہ اس کی بہن کی تدفین کی جانب تھا۔ اس نے بمشکل ضبط سے کام لیا۔ اس کا دل تو چاہ رہا تھا کہ اسی وقت اس خود غرض، احمق عورت کا گلا دبا دے جو شوہر کو سنبھالنے کے بجائے اپنی ہی دنیا میں مگن تھی۔ اس کی بادجیت بڑھتی جا رہی تھی۔ اس رویے کی وجہ اور سبب وہ خوب جانتا تھا۔ اسے علم تھا کہ جیکب اور اس کی بیوی کس منزل کی جانب بڑھ رہے ہیں۔

ڈولان پوکر میں ناکام ہو گیا تھا۔ اس نے دوسرا کھیل منتخب کر لیا تھا جو پوکر سے زیادہ خطرناک تھا۔ وہ یہ کھیل ایک ہی بار کھیل سکتا تھا۔ اسے یہ کھیل ہر حال میں جیتنا تھا ورنہ عجلت کے سبب یہ کھیل بھی پوکر سے زیادہ تباہ کن ثابت ہوتا...

ڈولان نے پارٹی میں شریک ہونے کی ہامی بھر لی۔ مسز ڈولان کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اسے گمان بھی نہ تھا کہ ڈولان کے ذہن میں کیا پک رہا ہے۔

☆☆☆

یہ ایک بے ہودہ اور خرافات سے بھرپور پارٹی تھی۔ ڈولان ایک طرف کونے میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ مختلف کھیل کھیلے جا رہے تھے۔ ڈائس، پوکر، فلیش، رڈاوٹ، اسنوکر۔ جام اچھل رہے تھے۔ ڈانس، میوزک، بے حیائی عام تھی۔

ڈولان نے جیکب کو بھی دیکھا۔ جو اسی میز پر موجود تھا جہاں اس کی بیوی پوکر کھیل رہی تھی۔ وہ کوئی ماہر کھلاڑی نہیں تھی۔ ڈولان حیران تھا کہ اس کی قسمت کا ستارہ اتنی دیر تک کیوں کر چمک رہا تھا۔ اس نے کچھ عرصے انتظار کیا کہ اس کی جیت کا سلسلہ اچانک ٹوٹنے لگا اور پوکر کی لت پھر اسے قلاش کیے بغیر نہیں چھوڑے گی۔ تاہم اب اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ یہ اس کی خام خیالی ہے۔ فوری طور پر ایسے امکانات دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

چاقو زنی کے کھیل میں اچانک ہی کسی نے اختراع کی اور ایک نئی طرز کا جوا شروع ہو گیا۔ بورڈ کے ساتھ ایک آدمی چاروں ہاتھ پیر پھیلا کر کھڑا ہو گیا۔ چاقو زن کے پاس چار چاقو تھے۔ دو چاقو اس نے اجنبی کی بغلوں کے نیچے لکڑی میں پیوست کرنے تھے۔ ایک چاقو دونوں پھیلی ہوئی ٹانگوں کے درمیان اور چوتھا چاقو سب سے آخر میں سر سے چند انچ اوپر... شرطیں لگنے لگیں۔ ہال میں سنسنی پھیل گئی۔

ڈولان بھی اعصابی کشیدگی کا شکار ہو گیا تھا جس شخص

نے خود کروائی پر لگا یا تھا جس سے زیادہ رقم اسے ملی تھی۔ اس کھیل نے زبردست ہلچل پیدا کردی تھی۔

حیرت انگیز طور پر چاروں چاقو نشانے پر لگے اور ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ پتا نہیں چاقو پھینکنے والے کا کمال تھا یا اس شخص کی قسمت زوروں پر تھی۔ تاہم اس کی دلیری میں کوئی شک نہیں تھا۔

اس کی قسمت پر رشک کرتے ہوئے، انخونی نامی شرابی نے بھی خواب دیکھنا شروع کردیے اور لکڑی کے تختے کے ساتھ جا کر چپک گیا۔ ہال میں تالیوں کی گونج بلند ہوئی۔ شروع کے دو چاقو بغلوں کے نیچے نشانے پر لگے۔ حاضرین سنسنی میں تھے۔

زرلان کو چوتھے چاقو سے زیادہ تیسرے کی فکر تھی۔ تیسرا خطا ہوتا یا چوتھا، اس کا تصور ہی ہولناک تھا۔ دونوں صورتوں میں اس کھیل کا مجبرہ کے لیے خاتمہ ہوجاتا۔

چاقوزن، تیسرا وار کرنے کے لیے توجہ مرکوز کر رہا تھا۔ زرلان نے دیکھا کہ انخونی کے چہرے پر تناؤ کی کیفیت تھی۔ بجلی طور پر بدحواسی کا شکار ہو رہا تھا۔

تیسرا وار کیا گیا اور انخونی کی درد میں ڈوبی ہوئی چیخ نے ہال میں سناٹا طاری کر دیا۔ زرلان کرسی سے اچھل پڑا۔ چاقو انخونی کے نازک ترین مقام سے محض دو انچ کے فاصلے پر اس کی ران میں پیوست ہوگیا تھا۔

انخونی کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ جیسے ہی اسے اپنی "مردانگی" کے بچنے کا احساس ہوا تو اس کی رنگت کچھ بحال ہوئی۔ ممبرز نے اسے اٹھا کر صوفے پر لٹا دیا۔ فرسٹ ایڈ کا بندوبست کیا جانے لگا۔ زرلان کے خیال میں انخونی کی لک بھی بری نہیں تھی۔ نہ صرف وہ ایک عذاب ناک وار سے بچ گیا تھا بلکہ چوتھے جان لیوا وار کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔

"ہے کوئی اور شیر دل؟" کسی دل جلے نے نعرہ لگایا۔ تاہم چاقوزن نے ہی ہاتھ اٹھا لیے۔ یوں یہ خطرناک کھیل جلد ہی اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

انخونی مرہم پٹی کروا کر اپنے ساتھی کے ساتھ نکل چکا تھا۔

محفل کا ہنگامہ ہاؤ ہو دوبارہ شروع ہو چکا تھا۔ یہ ہوش مندوں نہیں بلکہ بدمستوں کی محفل تھی۔

کچھ دیر بعد ہی ایک "بدشکل" سے نوش نے ریوالور نکال کر چھت کی جانب فائر کیا۔ یک دم خاموشی چھا گئی۔ اس نے سب کے سامنے چیمبر خالی کیا، پھر ایک گولی چیمبر میں داخل کردی۔ پھر اس نے چرخی گھمائی اور معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا۔

"ہم یہ کھیل "کریزی کلب" میں کھیلتے تھے۔" اس نے بلند آواز میں کہا۔ "داؤ بھی اونچا اور خطرہ بھی بہت زیادہ۔"

زرلان کے سوا کسی کو بھی اس کی بات سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔

کچھ افراد نے مخالفت کی لیکن زیادہ تر ممبرز مستی اور ہیجان میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ کچھ دیر پہلے ہونے والے حادثے کو بھلا بیٹھے تھے۔

دفعتاً زرلان کے ذہن میں ایک خیال چمکا۔ وہ سمجھ گیا کہ کیا ہونے جا رہا ہے۔ داؤ اونچا تھا اور مسز زرلان کی شرکت کے امکانات روشن تھے۔

کیا اس کے منصوبے کے عمل کا وقت آگیا ہے؟ اس نے سوچا۔ کیا وہ دوسرا کھیل شروع کر دے؟ پہلی اور آخری بار۔۔۔

"اکثر لوگ کھیلتے ہیں۔ زندگی تو خود ایک خطرہ ہے، بڑا ہاتھ مارنے کے لیے بڑا خطرہ مول لینا پڑتا ہے۔ جیتنے کے امکانات زیادہ ہیں۔ چھ کے مقابلے میں ایک۔ چیمبر میں صرف ایک گولی ہے۔ کون قسمت آزمائے گا؟" بدشکل نے ریوالور گھمایا۔

زرلان نے اپنی بیوی کی جانب دیکھا۔ ہیجان اور نشے کے باعث اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

ایک نوجوان جواری نے ہاتھ کھڑا کر دیا اور ہال میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ موسیقی کی آواز تیز ہوگئی۔

ہال کے وسط میں نوجوان کو ایک کرسی پر بٹھایا گیا۔ بدشکل نے اصول، ضوابط اور داؤ کی رقم کی تشریح کی اور اس کا طریقۂ کار بتایا۔

ریوالور کی نال نوجوان کی کنپٹی سے لگا دی گئی۔ اس سے قبل کھیل میں اس کی رضامندی کے بیان پر دستخط لیے گئے تھے اور دو گواہان نے بھی دستخط کیے تھے۔

نوجوان کا چہرہ پرسکون تھا۔ بدشکل نے چرخی گھمائی، سکتہ زدہ حاضرین کی جانب دیکھا اور لبلبی دبا دی۔ کلک کی آواز آئی اور نوجوان فاتحانہ انداز میں مسکراتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ ایک شور بپا تھا۔ نوجوان میز پر رکھی ہوئی بھاری رقم سمیٹ رہا تھا۔ بعض لڑکیاں اور مرد اس کا شانہ تھپک رہے تھے۔ بعض رقص کر رہے تھے۔

"تم۔۔۔ تم وہاں کیوں بیٹھے ہو؟" بدشکل نے زرلان

کرنا طلب کیا۔ زرلان کی راہ آسان ہموار ہو گئی۔ ذرا ہمت
کرنی تھی۔ ایسا سنہری موقع اسے پھر نہیں ملتا۔
وہ اچانک کھڑا ہو گیا۔ اگر وہ کامیاب ہو گیا تو ایک
تیر سے دو شکار ہونے تھے۔ دولت بھی آتی اور بد دماغ بیوی
سے بھی نجات مل جاتی۔ اعترافی تحریری بیان کی موجودگی
میں... اس کے پکڑے جانے کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بس
اسے اپنی سابقہ مہارت کا مظاہرہ کرنا تھا جو اس نے برسوں
بطور "اسٹیج میجیشن" کام کر کے حاصل کی تھی۔
زرلان کی نگاہ بوکر کی میز پر گئی۔ مسز زرلان کی
آنکھوں میں واضح حیرت تھی۔ علاوہ ازیں پہلی بار زرلان
نے اس کی آنکھوں میں نفرت کی جھلک بھی دیکھی۔ اس نے
مسکرا کر بیوی کی جانب ہاتھ ہلایا۔
تالیوں کی گونج میں وہ بدشکل کے قریب کرسی پر بیٹھ
گیا۔ کھیل کی آڑ میں وہ زر روپے کے لیے ذہن بنا رہا تھا۔
"ایسا خطرناک جوا میں اندھا دھند نہیں کھیلتا۔" اس
نے اپنے منصوبے کا آغاز کیا۔
"کیا مطلب؟" بدشکل بولا۔
"میں ریوالور اور گولیاں چیک کروں گا۔"
"کیا تم بے ایمانی کا الزام لگا رہے ہو؟" بدشکل نے
منہ بنایا۔
"میری جان داؤ پر لگی ہے۔ کیا میرا حق نہیں ہے کہ
میں اپنے طور پر مطمئن ہو جاؤں؟" زرلان نے نرمی کی بجائے
جواب دیا۔
حاضرین نے اس کی حمایت کی۔
بدشکل نے ریوالور اور گولیاں اس کے حوالے کر
دیں۔ زرلان نے چیمبر کی اکلوتی گولی بھی نکال لی اور چیمبر کا
جائزہ لیا۔ ریوالور کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ گولیوں سے کھیلتا
رہا۔ اس کے ہاتھ کی حرکات میں عجیب طرح کی تیزی تھی۔
"ٹھیک ہے۔" اس نے ریوالور اور چھ گولیاں بدشکل
کو واپس کر دیں اور تحریری بیان پر دستخط کیے۔ بدشکل نے
ایک گولی ریوالور میں ڈالی۔
"ایک منٹ۔" زرلان نے ڈرامائی حرکت کی۔
"دوسری گولی ڈالو، اسے واپس نکالو۔" زرلان کی آواز بلند تھی۔
چند قہقہے بلند ہوئے اور بدشکل نے زرلان کو ایسی
نظروں سے دیکھا جیسے وہ کسی پاگل کو دیکھ رہا ہو۔ زرلان
کے چہرے پر بے نیازی تھی۔ بدشکل نے گولی تبدیل کر کے
نال زرلان کی کنپٹی سے لگا دی۔
"ایک منٹ۔" زرلان نے ہاتھ نچایا۔
"اب کیا ہے؟" بدشکل غرایا۔
"باقی پانچ گولیاں میری مٹھی میں رہیں گی۔" زرلان
نے کہا۔ پارٹی میں پھر قہقہے بلند ہوئے۔
"دماغ خراب ہے کیا؟" بدشکل کی تیوریوں پر بل
پڑ گئے۔
"ہاں، ظاہر ہے دماغ خراب ہے، ورنہ اپنی جان کو
خطرے میں کیوں ڈالتا۔" زرلان نے ڈھٹائی سے جواب
دیا۔ "دوسری بات، اس قسم کا جوا میں پہلی بار کھیل رہا
ہوں۔ تمہارے خیال میں اتنے لوگوں میں کتنے یہ ہمت
دکھا سکیں گے؟"
"چھوڑو، چھوڑو۔" حاضرین نے شور مچایا۔ بدشکل
نے منہ بنا کر پانچوں گولیاں زرلان کے حوالے کر دیں۔
بہرحال کمیشن تو اسے بھی ملنا تھا۔
زرلان کو سو فیصد یقین تھا کہ اگر وہ کامیاب ہو گیا تو
اگلا کھلاڑی خود اس کی بیوی ہو گی۔
بدشکل نے ریوالور پھر اس کی کنپٹی پر رکھ دیا۔
"پلیز، ایک منٹ۔" زرلان نے ہاتھ اٹھایا۔
بدشکل اس مرتبہ بھنا گیا۔ "مسٹر! چلو اٹھو یہاں سے۔"
"کسی کو نہیں پتا آگے کیا ہونے والا ہے۔" زرلان
نے اس کے اشتعال کو نظرانداز کر دیا۔ "اس لیے میری
خواہش ہے کہ میں ایک بار اپنی بیوی کو پیار کر لوں، وہ اس
میں بھلا غصہ کرنے کی کیا بات ہے؟" زرلان نے بوکر میز کی
جانب دیکھا۔
حاضرین نے پھر تالیاں بجائیں اور مسز زرلان
تاثرات کو عارضی رکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ آج زرلان
اسے بار بار حیران کر رہا تھا۔
بوسہ دے کر وہ واپس میز پر آ گئی۔ "مر جائے تو اچھا
ہے۔" اس نے دل ہی دل میں کہا۔
بدشکل زچ ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ زرلان کوئی اور
حرکت کرتا، اس نے پھرتی سے چرخی گھمائی اور فائر کر دیا۔

☆☆☆

"کلک..."
اس مرتبہ شور کافی بلند تھا۔ اپنی بیوی کے چہرے پر
مایوسی کی جھلک زرلان کے سوا کوئی اور نوٹ نہ کر سکا۔
زرلان داؤ پر لگی رقم جیبوں میں بھر رہا تھا۔
"کوئی اور... کوئی اور... اتنی کم رقم میں اتنی
دولت کہاں کمائی جا سکتی ہے؟" بدشکل حاضرین کو اکسا رہا
تھا۔ "مرنا تو ویسے بھی ہے، کوئی ایکسیڈنٹ میں مارا جاتا ہے،

کوئی جواری کے ہاتھوں گزر جاتا ہے۔ ہمت کیجیے سرو نے۔"

آخر ایک سرد کھڑا ہو ہی گیا۔ وہ مرد "مسز ذولان" تھی۔ اس کی چال ناہموار تھی۔ ذولان کے چہرے پہ مسکراہٹ رینگ رہی تھی۔

اس نے آگے بڑھ کر بیوی کو روک لیا۔ "ڈارلنگ! یہ کیا کر رہی ہو۔ ہم دونوں ایک ہیں۔ یہ جیتی ہوئی رقم اپنی ہی سمجھو۔ کیا ضرورت ہے جان کو خطرے میں ڈالنے کی۔"

ذولان کی اس بات نے سب کو متاثر کیا۔ تاہم یہ صرف ذولان ہی جانتا تھا کہ وہ باز نہیں آئے گی۔

ذولان کے الفاظ کے سب لوگ گواہ تھے۔ حالانکہ ان الفاظ نے مسز ذولان کے لیے مہمیز کا کام کیا تھا۔

☆☆☆

محفل کا جوش و خروش عروج پر تھا۔ کیونکہ اس خوفناک کھیل کا نیا کھلاڑی ایک عورت تھی۔

ذولان، بیوی کے قریب تھا۔ اس نے ایک بار پھر ریوالور اور گولیاں اپنے قبضے میں لے لی تھیں۔ بدشکل کا رہا سہا شک دور ہو گیا کہ ذولان ایک سنکی آدمی ہے۔

ذولان پنجوں کے بل بیوی کے قدموں میں بیٹھا اسے اس خطرناک کھیل سے باز رکھنے کی تلقین کر رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ چند لیموں کے قریب تھے۔ وہ ریوالور اور گولیوں سے کھیل رہا تھا۔ کسی کی نگاہ بھی اس کے ہاتھوں کی طرف نہیں تھی۔ انہیں دھڑکا تھا کہ یہ سنکی آدمی اپنی بیوی کو کرسی سے اٹھا لے جائے گا۔

حاضرین کو مایوسی..... ہو رہی تھی کہ کہیں مسز ذولان، شوہر کی بات مان ہی نہ لے اور کھیل شروع ہونے سے پہلے ہی ختم نہ ہو جائے۔

دوسری طرف "بدشکل" بھی بدمزہ ہو رہا تھا کہ کہیں "سنکی" کھیل ہی ختم نہ کرا دے۔ بہرحال وہ اس کی بیوی تھی اور بدشکل شخص اس کے معاملے میں مداخلت نہیں کر سکتا تھا۔ تاہم اسے مسز ذولان کی ڈھٹائی اور دلیری پر حیرت تھی۔ وہ متواتر ذولان کی باتیں رد کر رہی تھی۔

پھر ذولان چہرے پر مایوسی کے تاثرات لیے کھڑا ہو گیا۔ اس نے ریوالور بدشکل کے حوالے کر دیا۔ ریوالور بدست نے اطمینان کی سانس لی ہی تھی کہ ذولان نے جھپٹ کر ہتھیار اس سے چھین لیا۔

"نہیں، وہ احمق ہے۔ قسمت بار بار ساتھ نہیں دیتی، اسے کچھ ہو گیا تو بہت برا ہو گا۔"

ذولان ایک اسٹیج مجیشن کی طرح مہارت سے اپنی مرضی کا منظر نامہ تشکیل دے رہا تھا۔

"تم نے مجھ سے پوچھ کر اس کھیل میں حصہ لیا تھا؟" اچانک مسز ذولان بھڑک اٹھی۔ "میری قسمت تم سے زیادہ اچھی ہے سب جانتے ہیں۔ مجھے تو حیرت ہے کہ تم بچ کیسے گئے؟"

مسز ذولان کے رد عمل نے بدشکل کو حوصلہ دیا۔ "مسٹر! اس معاملے سے الگ رہو۔ وہ پہلے ہی تحریری بیان پر دستخط کر چکی ہے۔" اس نے ریوالور لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

ذولان نے شکست خوردہ انداز میں ریوالور اس کے حوالے کر دیا۔ "بیگم! جلد پتا چل جائے گا کہ تم کتنی خوش قسمت ہو؟" ذولان نے سوچا۔

ہیجان اور سنسنی یا دنی پر پھر سے طاری ہو گئی۔ بدشکل آدمی نے ریوالور مسز ذولان کی کنپٹی پر رکھ کر بلا تامل لبلبی دبا دی۔

مسز ذولان کوئی آواز نکالے بغیر کرسی سے لڑھک گئی۔

گولی سر میں اتر گئی تھی۔ خون ہی خون... ہال میں سناٹا طاری تھا۔ ذولان نے ایک لمحے کے لیے بھونچکا رہنے کی اداکاری کی۔ پھر بدشکل آدمی پر پل پڑا۔ جتنی دیر میں وہ اپنے حواس میں واپس آتا، اتنی دیر میں ذولان نے اس کی ناک پر گھونسا جڑ دیا اور ریوالور چھین لیا۔ ذولان جب بگلا مرنے کرسی سے کھڑا ہوا تھا اس وقت سے متواتر ایک کامیاب اسٹیج مجیشن کا رول ادا کر رہا تھا۔ اس نے صرف ایک ہی خطرہ مول لیا تھا، وہ خطرہ تھا خود "خونی کھیل" میں شریک ہونے کا۔

بدشکل کی ناک سے خون جاری ہو گیا۔ سناٹا یک لخت شور شرابے اور افراتفری میں تبدیل ہو گیا۔ ذولان نے صفائی اور اطمینان سے باقی پانچوں گولیاں ریوالور سے نکال کر بدشکل کے کوٹ کی جیب میں منتقل کر دیں اور ریوالور کا دستہ اس کے سر پر بجانے لگا۔ ناک کی چوٹ نے اسے پہلے ہی نڈھال کر رکھا تھا۔

حاضرین میں سے چند نے ذولان کو پکڑ کر گھسیٹا۔ "قاتل... قاتل..." ذولان چیخ رہا تھا۔ کسی نے پولیس کو فون کر دیا۔

☆☆☆

جب پولیس وہاں پہنچی تو ذولان اس وقت بھی "قاتل... قاتل..." کے نعرے بلند کر رہا تھا۔ پولیس نے پہلا کام یہ کیا کہ نیم پاگل مسٹر ذولان اور بظاہر بکھیا سردہ مسز ذولان کو اسپتال پہنچایا۔

ذولان، اس وقت بھی قاتل... قاتل چیخ رہا تھا جبکہ اس کا دل ہنس رہا تھا۔

شیکسپیئر کا کہا ہوا ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے کہ زندگی ایک اسٹیج ہے جس پر ہم سب اداکار ہیں جو اپنا اپنا کھیل دکھا کے چلے جاتے ہیں... یہی اداکار زندگی کے آغاز سے انجام تک ایک جوا کھیلتا ہے... جس میں خطرات اور حادثات کی بازی پہلی سانس کے ساتھ لگتی ہے اور آخری سانس تک جاری رہتی ہے... تخلیق کے نقائص ہوں یا بیماریاں... وہ زندگی کے ہر نومولود کو شکست سے دوچار کرنا چاہتے ہیں مگر زندگی مقابلہ کرتی ہے اور یہ کھیل انسانی تدبیر اور نوشتۂ تقدیر کے ساتھ زندگی کے تمام اہم اور غیر اہم فیصلوں میں جاری رہتا ہے... خوشی... غم... نفع... نقصان... دوستی... دشمنی... محبت اور نفرت... سب ہار جیت کے وہ روپ ہیں جن سے ہر انسان ایک جواری بن کے سامنا کرنے پر مجبور ہوتا ہے... جواری... انسانی جذبوں کے ردعمل سے جنم لینے والی وہ کہانی ہے جو نگر نگر گلی گلی اور گھر گھر بنتی بھی لگتی ہے اور پرائی بھی... آپ بیتی بھی اور جگ بیتی بھی... تجسس اور حیرانی کے سارے رنگ دکھلاتی جادو اثر تحریر...

جواری

احمد اقبال

سولہویں قسط

میرے سامنے سے کے پیچھے جو دائیں جانب ریشم کی تصویر چھپی ہوئی تھی۔ ویسا ہی پنسل اسکیچ تھا جیسا کہ اشتہاری مجرموں کے خاکے بنانے والے پولیس کے آرٹسٹ تیار کرتے ہیں۔ وہ سب سے پہلے چہرے کا خاکہ لیتے ہیں کہ وہ بیضوی تھا، کتابی، لمبوترا یا گول...... پھر اس پر آنکھیں بناتے ہیں۔ ہونٹ، ناک اور بس جو اصل صورت کے قریب ترین ہوں، پھر گردن اور بالوں کا اسٹائل، وہ تبدیل کرتے جاتے ہیں یہاں تک کہ تصویر اصل کے قریب آجاتی ہے۔ سو فیصد نہ سہی نوے فیصد سہی۔

یہ تصویر دیکھتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ کس نے شائع کرائی ہوگی۔ بس اس کی عبارت بہت مختلف تھی۔ میں نے اس سے پہلے ''شہری ہوشیار باش'' کے عنوان سے کسی دھوکے باز کی تصویر بھی دیکھی تھی۔ کسی کو عاق کرنے پر باپ کی طرف سے بیٹے کی تصویر بھی دیکھی تھی اور ایک بار یوں بھی کہ ''فلاں لوٹ آؤ...... تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔'' جو عموماً گھر سے کسی بات پر ناراض ہو کے چلے جانے والے بیٹوں کی جدائی سے بدحال والدین شائع کراتے تھے لیکن اس تصویر میں ریشم کا نام تھا نہ انور کا...... اس کے نیچے دو شعر لکھے ہوئے تھے۔

میں شرمسار ہوں میری خطا معاف کرو
گناہ گار ہوں میری خطا معاف کرو
اگر میں عہدِ وفا پر نہیں رہا قائم
قصوروار ہوں میری خطا معاف کرو

میں انور کے اس ''تلاشِ گمشدہ'' والے اشتہار پر دم بخود رہ گیا۔ اس کی جذباتی اپیل نے بھی مجھے متاثر کیا۔ وہ ذہین آدمی تھا اور میرا خیال تھا کہ ساری دنیا دیکھنے اور کتابی علم حاصل کرنے سے اسے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ وہ ذہنی طور پر وہی روایتی مرد اور جاگیردار ہے۔ معلوم نہیں اس کی شخصیت میں یہ انقلاب کیوں آیا۔ شاید یہ سب پانے کی امید میں سب گنوا دینے کا ردِعمل تھا۔ وہ ریشم کے ساتھ روزِ بد سے بھی شادی کا خواہش مند تھا تاکہ بیمار سائیں کے حصے کی نصف جائداد بھی مل جائے۔ پہلے ریشم گئی پھر روزِ بد تو اس کے دماغ نے بیوہ بھابی شاہینہ کو رواج کے مطابق اپنے نکاح میں لینے کا بھی سوچا لیکن وہ میرے علاوہ کسی کو قبول کر ہی نہیں سکتی تھی اور انور اس کے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتا تھا۔ آخری دھچکا شاہینہ کی موت اور بیمار سائیں کے سارے خاندان کا خاتمہ تھا۔ باپ مر گیا تھا اور میں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

یہ اشتہار شمار ہو جانے کے بعد رونما ہونے والی تبدیلی کا مظہر تھا۔ تنہائی کی سزا کا ردِعمل تھا اور اس احساس کی ترجمانی کرتا تھا کہ انور کو اب زمین کی نہیں سہاروں کی ضرورت کے خیال نے مجبور کر دیا تھا۔ نہ وہ شاعر تھا اور نہ شاعرانہ ذوق رکھتا تھا۔ معلوم نہیں یہ دو شعر اسے کہاں سے ملے تھے جو اس کے جذبات کی مکمل ترجمانی کرتے تھے۔ اس نے بہت جلد اپنی شکست مان لی تھی اور اشارہ دے دیا تھا کہ یہ اس انور کا اعتراف نہیں جو اب باپ کے ساتھ تایا کی ساری زمین اور جائداد کا اکلوتا مالک بن گیا ہے بلکہ یہ دوستی اور محبت سے محروم ہو کے اکیلے رہ جانے والے انور کی پکار ہے۔

انور نے اپنا نام بھی نہیں لکھا تھا نہ ریشم کا......

نہ اسے اپنی رسوائی منظور تھی اور نہ ریشم کی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی امید بر آئی اور اشتہار خود ریشم نے یا شمس نے دیکھ لیا تب بھی مقصد حاصل ہو جائے گا۔ کسی نے دیکھا اور ریشم سے پوچھا تب بھی اس کی فریاد اثر کرے گی۔ پوچھنے والے کو ریشم انکار کر دے کہ تصویر سے مشابہت اتفاقیہ ہے، تب بھی انور کی آواز اس کے دل تک پہنچ جائے گی۔ اکیلے میں اور راتوں کو خواب میں ستاتی رہے گی۔ وہ اسے نظرانداز نہیں کر پائے گی۔

یہ امید مجھے بھی تھی کیونکہ اس جذباتی اپیل کا اثر مجھ پر بھی ہوا تھا۔ اس کی محبت کو وقت کی گرد کے نیچے دبانے والی ریشم صرف اسے بھلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ اس میں ناکام تھی۔ جیسے کہ سب محبت کرنے والے ہوتے ہیں وہ بے بس تھی۔ گو وہ میرے سامنے اس کا اظہار نہیں کرتی تھی مگر میں جانتا تھا۔ میں کچھ کر نہیں سکتا تھا اس لیے خاموش تھا۔ انور نے راکھ میں دبی ہوئی چنگاری کو ہوا دے دی تھی۔ اب وہ شعلہ پھر بھڑک اٹھے گا مگر وہ تنہا نہیں تھی۔ جس عورت نے اسے بیٹی بنا لیا تھا وہ بڑی باقاعدگی سے یہی اخبار پڑھتی تھی۔ اب تک اس نے بھی ریشم کی تصویر دیکھ لی ہوگی اور اس وقت ریشم سامنے بیٹھی رو رہی ہوگی۔ بتا رہی ہوگی کہ اسے واپس بلانے والا کون ہے۔ میں یہ فرض بھی نہیں کر سکتا تھا کہ خالہ اسے انور جیسے لالچی اور بے وفا شخص سے دور رہنے کا مشورہ دے رہی ہوں گی۔ کہیں گی کہ بیٹی رہو، کوئی ضرورت نہیں ایسے شخص کے پاس خود لوٹ کر جانے کی...... اگر وہ خود بھی آئے تو انکار کر دینا۔ ایسے شخص پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ کل وہ اپنے معافی نامے سے بھی پھر سکتا ہے۔

نہیں، خالہ بھی ریشم کو مجبور کر رہی ہوں گی کہ اسے معاف کرو۔ وہ ہی صبح کے بھولے کی شام کو لوٹ آنے کی مثال۔

اسے ایک چانس دو۔ اسے سبق حاصل ہو گیا ہے۔ اب وہ ساری عمر تمہاری محبت کے احسان تلے دبا رہے گا کیونکہ معاف کر کے احسان تم نے کیا ہے۔ ریشم خاک مزاحمت کرے گی۔ خالہ کہتی کی کہ اسے بلاؤ۔ یہاں آنے والا مجھ سے بات کرے...... شادی میں کراؤں گی تمہاری...... تمہاری طرف سے بات میں کروں گی۔ او مائی گاڈ...... سب کی بگڑی بنانے والے خدا...... تو نے میرے سارے اندیشے دور کر دیے۔ مجھے ذمے داری کے بوجھ سے سبک دوش کر دیا۔

استاد چائے لینے اندر گیا تھا۔ واپس آیا تو اس نے مجھے اپنی سوچ میں منہمک پایا۔ وہ کچھ دیر دیکھتا رہا کہ اخبار پر نظر جمائے میں اپنے خیالوں میں غرق ہوں تو اس نے مجھے آگے اخبار کو دیکھا اور پھر اس تصویر کو جس پر میری نظر جم کے رہ گئی تھی۔ پھر اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”کون ہے یہ؟ نورین؟“

میں چونک پڑا۔ ”نہیں استاد! یہ ریشم ہے۔“

”اور اس سے معافی مانگنے والا ہی...... انور ہے؟“

وہ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ ”چل چائے پی۔“

”یہ تو بڑا زبردست ڈراما ہے۔ اگر اس نے دیکھ لیا۔“

”اگر کبھی...... وہ اب تک دیکھ چکی ہوگی۔“ میں نے اسے بتایا۔

وہ میری صورت دیکھتا رہا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے، وہ کیا فیصلہ کرے گی؟“

میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”اب مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ میں اس کو چھوڑ آیا محفوظ سمجھ کے۔ لیکن وہ عمر میں چھوٹی ہے مجھ سے...... اور عورت ہے۔ چھوٹی بہن ہمیشہ بڑے بھائی کی طرف دیکھتی ہے سہارے کے لیے...... فیصلے کی گھڑی میں۔“

”اتنا جذباتی مت ہو، چلا جا اس سے ملنے...... کس نے روکا ہے تیرا راستہ مگر فرید......“

”استاد تم مرواؤ گے مجھے۔ میرا نام فرید نہیں، سلیم ہے۔ فرید وہ مجرم تھا جو پھانسی سے پہلے فرار ہو گیا تھا۔“

”سو بار زبان پر چڑھا ہوا ہے اس لیے منہ سے نکل جاتا ہے۔ میں اپنی بات کر رہا تھا۔ مجھے بتا میں کیا کروں؟“

”دلدل میں اتر جانے کے بعد نکلنا واقعی مشکل ہوتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”کوئی باہر سے کھینچ لے تو ہو سکتا ہے۔“

”میں نے تجھے کہا تھا کہ غائب ہو جا۔ یہ مشکل ہے تو پھر اسی سے مدد مانگ جو تجھے استعمال کر رہے۔“

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ دیر ہم خاموش بیٹھے چائے پیتے رہے۔ میرا ذہن ریشم کے معاملے میں الجھا ہوا تھا۔ اکیلی وہ خود کو کتنی مجبور اور بے یار و مددگار محسوس کرے گی۔ خالہ جو خود مدد کی محتاج ہیں ریشم کی کیا مدد کریں گی اور ریشم صرف پریشان ہوگی، روئے گی رات رات بھر...... انور سے رابطہ کرے کہ نہ کرے۔ کس کے ذریعے اور کیسے رابطہ کرے؟ اسے معلوم ہے کہ انور کہاں ہے مگر کیا وہ اکیلی روانہ ہو جائے؟ خط لکھے یا فون کرے تو کہاں سے اور پھر کیا کہے۔

استاد گاما کی آواز نے مجھے چونکایا۔ ”میں نے بتایا تھا تجھے کہ اس ڈاکو کا نام و نشان مٹانے کا کام میرا نہیں تھا۔ کسی اور نے کہا تھا جسے میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔“

”ہاں مگر کون تھا وہ...... یہ تم نے نہیں بتایا تھا۔“

وہ بولتا رہا۔ ”ہم جو ڈاکو کہلاتے ہیں، ہمارے نام کی بڑی وحشت ہے۔ سب سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے سفاک ہوتے ہیں۔ مال کے ساتھ جان لینے میں دریغ نہیں کرتے۔ مگر ایسا نہیں ہے سلیم۔ سب ایسے نہیں ہوتے۔ ہم لوٹتے ضرور ہیں لیکن ان کو جو لوگوں کا خون چوس کے دولت جمع کر لیتے ہیں۔ اس خزانے پر سانپ بن کے بیٹھے رہتے ہیں، نہ خود پر خرچ کرتے ہیں نہ کسی اور پر...... خدا گواہ ہے کہ ہم نے آج تک کسی غریب کو نہیں لوٹا۔ غریب سے میری مراد ہے یہ دکاندار، بابو اور چھوٹے موٹے افسر۔ جو پیسا پیسا جوڑ کے گھر بناتے ہیں، گاڑی خرید لیتے ہیں اور بچوں کو اچھی تعلیم دلاتے ہیں۔ یہ بھی کوئی سرمایہ دار، جاگیردار نہیں ہوتے۔“

”یہاں سلطانہ ڈاکو اور ولایت میں رابن ہڈ کی غریب نوازی مشہور ہے۔“

وہ خفیف ہوا۔ ”وہ قصے کہانیوں کی بات ہے لیکن آج بھی بڑے ڈاکو ہیں، وہ چور اٹھائی گیرے نہیں۔“

میں نے کہا۔ ”تو با خاندانی قسم کے وضعدار ڈاکو۔“

”یہ مذاق کی بات نہیں۔ میں اپنی بات نہیں کرتا۔ بڑے نام والے ڈاکو ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جو دولت کے لیے جان نہیں لیتے۔ مجبوری ہو تو الگ بات ہے کہ اپنی جان پر بن جائے۔ ایسا دو بار ہوا فر...... سلیم...... کسی نے غلط اطلاع دی، کسی نے کہا بھی پولیس اور اس کے مخبر جو جے وار ہوتے ہیں۔ بڑا کاروباری آدمی تھا۔ بڑے گھر میں

رہتا تھا۔ پتا چلا سونا بہت رکھتا ہے گھر میں۔ بعد میں پتا چلا کہ سونا خاندانی تھا۔ دادی سے ماں کو اور ماں سے بہو کو ملا۔ اب اپنی بیٹی کے لیے رکھا تھا۔ اندر سے وہ کھوکھلا ہو چکا تھا۔ کوٹھی، بینک کے پاس گروی تھی۔ قرض کہاں سے ادا کرتا، خود مقروض تھا۔ خاندانی سونے کو بچا رکھا تھا ورنہ سب بیچنے والا تھا۔ جب مجھے معلوم ہوا تو میں خود واپس کرنے گیا۔"

میں حیرانی سے سنتا رہا۔ "کتنا سونا تھا؟"

"ہوگا بیس لاکھ کا، مگر یار...... آج تک مجھے دکھ ہے۔ وہ شخص اسی رات ہارٹ فیل ہونے سے مر گیا۔ اس کی بیوہ نے مجھے بہت کوسا۔ روتی رہی...... مگر میں نے ہاتھ جوڑے اور زیور واپس کر دیا۔ وہ بعد اس لڑکی کی شادی بھی ہوئی اور میں بن بلائے گیا۔ کون جانتا تھا مجھے وہاں...... مگر میں نے لڑکی کی ماں کو تحفہ دیا تو اس نے شاید پہچان لیا تھا مجھے، مگر وہ بولی نہیں۔ مجھ سے چیک لے لیا۔ دس میں پانچ لاکھ روپے تھے۔ تقریباً اتنا ہی قرض تھا بینک کا جو اس نے گھر کو گروی رکھ کے لیا تھا۔ بہت عرصے بعد ادھر جانا ہوا تو پتا چلا کہ ماں بھی نہیں رہی لیکن اس گھر میں بیٹی داماد رہتے ہیں۔"

"اور دوسرا واقعہ۔"

وہ چپ ہو گیا اور باہر دیکھتا رہا۔ "تجھے بتا دیا تھا میں نے...... اپنی شادی کا واقعہ۔"

"او وہ تمہاری زندگی دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ جیسے دن رات...... ایک طرف تم اتنے خود مختار ہو کہ ڈاکوؤں کے گروہ کے سردار ہو۔ تمہارے نام کی دہشت ہے لیکن دوسری طرف تم اتنے مجبور اور لاچار ہو کہ ایک زندگی نہیں گزار سکتے۔"

"ایسا ہی ہے چیز سلیم۔" اس نے آہ بھری۔

"کچھ لوگ اتنے طاقتور ہیں کہ تم ان کے حکم کے غلام ہو۔ ان کے حکم پر تم نے اس پیر کی درگاہ کا سراغ مٹا دیا۔ سب جلا دیا۔ جو سامنے آیا اسے مار دیا۔ اپنی مرضی سے نہیں، یہ کسی کا حکم تھا کہ اس ڈبا پیر کا نام و نشان باقی نہ رہے۔"

اس نے بے بسی سے اقرار میں سر ہلا دیا اور دوسری طرف دیکھتا رہا۔

میں نے کہا۔ "کس نے دیا تھا یہ حکم؟"

"میں نام نہیں لے سکتا کسی کا بھی۔"

"وہ مراد کا بھگے دار باپ تھا؟" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

گاما رستم کا رنگ اڑ گیا۔ "نہیں۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو استاد...... اور میں جانتا ہوں اس نے تمہیں کیوں استعمال کیا۔ اس کا بیٹا مراد کچھ عرصے قبل پیر کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ پیر نے انکار کر دیا حالانکہ وہ سالے بہنوئی تھے۔ مراد اس پیر کی بیٹی کا کزن تھا، ماموں زاد بھائی۔ انکار سے دشمنی کی بنیاد پڑی۔ مراد نے ایک بار پیر سائیں کی بیٹی کو نکالنے کے لیے مسلح حملہ کیا مگر ناکام رہا۔ جن کو وہ ساتھ لے گیا تھا وہ درگاہ کے محافظوں کی فائرنگ سے مارے گئے۔ مراد بچ گیا تھا مگر اس کے باپ نے الزام لگا یا کہ اسے پیر نے خود قتل کیا۔ نہ جانے کس کو مراد کی جگہ دفن کر دیا گیا۔ مراد کچھ عرصے روپوش رہا اور پیر سائیں پر قتل کا مقدمہ ختم ہو گیا۔ مراد کی دوسری کوشش کامیاب رہی۔ میں اور پیر سائیں کی بیٹی اور ریشم ایک ساتھ نکلے۔ ریشم میرے ساتھ رہی۔ مراد اور پیر کی بیٹی روز پتہ نہ جانے کدھر گئے۔ بعد میں سنا کہ وہ ملک سے باہر چلے گئے ہیں، کسی اور نام سے۔ پھر معلوم ہوا کہ خود سکندر نے بیٹا اور بہو کو گھر میں ہی چھپا رکھا ہے۔ گھر کیا ایک قلعہ ہے جس میں پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ ایسے کب تک چل سکتا تھا۔ وہ اکلوتا بیٹا تھا۔ بلٹ پروف گاڑی میں پھرے...... کسی کے سامنے نہ آئے...... مگر کتنے دن، بالآخر اسے باپ کا سارا کاروبار سنبھالنا تھا۔ ٹھیکے دار نے تمہاری مدد سے دشمن کا نام و نشان مٹا دیا۔ جس سے خطرہ تھا اس کا والی وارث بھی کوئی نہ بچا۔ اب اس کا بیٹا محفوظ ہے۔ بے خوفی سے پھر سکتا ہے۔ دوسرا فائدہ یہ کہ بہو جس جاگیر کی وارث تھی اب اسے پوری ملے گی کیونکہ جو بہن شاید آدھے کی مالک تھی اب وہ بھی نہیں رہی۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ اس ٹھیکے دار نے کتنا فائدہ حاصل کیا۔"

خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد استاد نے سر اٹھایا۔ "اگر تم جانتے ہو تب بھی فرق کیا پڑتا ہے مجھے۔"

"تم اتنے بے بس ہو۔"

"سلیم! یہ جو طاقتور ہیں، یہ بدمعاشی کی طاقت سے ہی اس ملک کے عوام کی تقدیر کے مالک ہیں۔ خون چوس کے اپنی تجوری بھرتے ہیں پھر حکمرانوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ہم جیسے ان کی فوج ہیں۔ وہ ڈاکوؤں کو کھلا لائسنس دیتے ہیں کہ ڈاکے ڈالو، جاہو لوٹو، اغوا کرو اور تاوان وصول کر لو۔ ہمارا حصہ ہے رکھو اور ضرورت پڑے تو ہمارے حکم پر ہمارے دشمن کا نام و نشان مٹا دو۔ یہ انکار ہو گے تو قانون تمہارا انجام ہوگا، قانون کے محافظ تمہیں بچا لیں گے۔"

"مجھے معلوم ہے یہ سب...... لیکن استاد...... جس

آدمی کا تم نے اتنا بڑا کام کر دیا کہ بارہ تمہاری کوئی مدد نہیں کرے گا؟"

"کس کام میں؟"

میں نے کہا۔ "میرے ساتھ چلو اور جو مجھ سے کہا ہے اسے بھی بتا دو۔ کہہ دو کہ مجھے خالی سے آزاد کر دیں۔ میں شرافت سے زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے زندہ رہنے دیں۔"

"میرے ساتھ تو بھی مارا جائے گا سلیم۔"

"نہیں، ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ یہ تو مجھ پر چھوڑ دے۔ میں گارنٹی دیتا ہوں کہ تو محفوظ رہے گا۔ وہ خود تیری حفاظت کرے گا۔"

وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتا رہا۔ "اور میرے ساتھی؟"

"وہ خود مختار ہوں گے جسے چاہیں سردار بنا لیں۔"

"ایسا کب تک چل سکتا ہے؟"

"ویسے تو زیادہ دن نہیں مگر تجھے یا ردنا رے ساتھ ہو گا تو فکر کی کوئی بات نہیں ہوگی۔"

"تو بڑے یقین کے ساتھ ذمے داری لے رہا ہے؟"

"ہاں، میں ذمے دار ہوں۔ اب تو آخری بار بھابی سے جھوٹ بول کہ کاروباری دورہ ہے اور میرے ساتھ چل۔"

"کہاں جائیں گے ہم؟"

"پہلے رستم کے پاس۔ پھر انور سے ملیں گے۔ آخر میں تجھے دارے ...... مراد کے باپ سے۔"

وہ چپ ہو گیا جیسے فیصلہ کر رہا ہو۔ میں نے اس کی خاموشی کا مطلب رضامندی لیا۔ رات کے کھانے پر میں منتظر رہا کہ وہ بیوی سے کوئی بات کرے مگر وہ خاموش اور کچھ نروس تھا۔ اس کی بے حد حسین بیوی تاڑ گئی تھی کہ دال میں کچھ کالا ہے۔

بالآخر میں نے کہا۔ "بھابی! کل ہم چند روز کے لیے جا رہے ہیں۔"

اس کا ہاتھ رک گیا۔ "کسی کاروباری دورے پر؟"

اس نے طنز سے کہا۔ "تم نے بھی اپنے استاد کے ساتھ کاروبار میں شراکت کر لی ہے؟"

"نہیں بھابی! ملک صاحب نے بیرون ملک اپنا کاروبار ختم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اب وہ یہیں رہیں گے اور کوئی بزنس کریں گے میرے ساتھ مل کر۔"

وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتی رہی۔ "خدا کرے یہ سچ ہو۔" اور پھر اٹھ کے اندر چلی گئی۔

"ہم صبح ہوتے ہی نکل جائیں گے۔" گامارستم نے کچھ دیر بعد کہا۔

"کیوں، اس وقت ہم کون سے اہم سرکاری فریضے کی ادائیگی پر مامور ہیں۔" میں نے کہا۔ "آج کا سارا دن ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

اس نے میری بات چپ کو نوٹ کیا اور سر ہلایا۔ "یہ بھی ٹھیک ہے۔ ہم چلتے ہیں، میں گاڑی نکالتا ہوں۔"

آدھ گھنٹے بعد ہم اپنی منزل کی جانب رواں تھے۔ مجھے کوئی اندازہ نہ تھا کہ ہم ملتان سے کتنی دور اور کس سمت میں ہیں۔ جب مجھے یہاں لایا گیا تھا تو میری نظریں راستہ دیکھنے کے قابل نہ تھیں۔ چنانچہ مجھے بڑی حیرانی ہوئی جب صرف پندرہ منٹ بعد ہی ملتان شہر کے آثار نمودار ہونے لگے۔ مجھے یہاں بے مقصد گھما پھرا کے لایا گیا تھا ورنہ استاد گامارستم عرف ملک غلام محمد پرانے ملتان کے گرد و نواح کی کسی نئی بستی میں تھے۔ پانچ ہزار سال کی تاریخ رکھنے والے پاکستان کے اس قدیم ترین شہر نے اب جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ماڈرن خدوخال اختیار کر لیے تھے اور ہر طرف کراچی، لاہور یا اسلام آباد جیسی امرا کی بستیاں آباد ہو رہی تھیں۔

استاد میری ہدایات کے مطابق چلتا گیا اور اپنے گھر سے روانگی کے ٹھیک ایک گھنٹے بعد اس نے گاڑی کو اس گھر کے قریب روک دیا جہاں سے میں رستم کو بتائے بغیر نکل گیا تھا۔ گلی اتنی چوڑی ضرور تھی کہ آمنے سامنے سے آنے والی دو گاڑیاں آسانی سے گزر جائیں لیکن آگے راستہ ایک شامیانہ لگا کے بند کر دیا گیا تھا شاید پاس پڑوس میں کوئی تقریب تھی۔ شامیانے کے نیچے کرسیوں پر بس پندرہ افراد کو سوگوار بیٹھا دیکھ کے میرا ماتھا ٹھنکا۔ گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا، اندر سے ایک عورت نکلی۔ میں سیدھا اندر جانے کی کوشش میں اس سے ٹکرانے سے بچا۔ میرے خدشات کی تصدیق اگربتیوں کی چبھنے والی تیز خوشبو نے کی اور میرے قدم رک گئے کیونکہ آگے صحن میں بچھی ہوئی دری چاندنی پر محلے کی آٹھ دس خواتین تلاوت میں مصروف تھیں۔ انہوں نے نظر اٹھا کے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

اسی وقت خالہ کے کمرے سے رستم برآمد ہوئی اور مجھے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے ٹھٹکی...... پھر اس نے ایک چیخ ماری۔ "بھائی۔" اور دوڑ کے مجھ سے لپٹ گئی اور ہچکیاں لے کر رونے لگی۔ اب کوئی سوال کرنے کی ضرورت نہ رہی تھی۔ میں

نے ریشم کو تسلی دی اور عورتوں کے پیچھے سے گزر تا خالہ کے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہاں بھی دو عورتیں سپارے پڑھ رہی تھیں جو مجھے دیکھ کے باہر چلی گئیں۔ خالہ سر سے پیر تک سفید چادر اوڑھے سیدھی لیٹی ہوئی تھیں۔ میں بوجھل دل کے ساتھ ان کے بے حس و حرکت وجود کو دیکھتا رہا۔ پھر آگے بڑھ کے میں نے چادر کا کونا اٹھایا اور خالہ کے خاموش پُرسکون چہرے اور بند آنکھوں کو دیکھا۔ انہوں نے کوئی گلہ نہیں کیا لیکن خاموشی کی زبان میں بہت کچھ کہہ دیا کہ بتائے بغیر بھاگ لیے تھے اور اب آئے ہو جب میں نہیں پوچھ سکتی کہ تم نے ایسا کیوں کیا تھا۔ خیر یہ بھی غنیمت ہے کہ مٹی دینے آگئے۔

میں نے ریشم کی طرف پلٹ کے دیکھا۔ ”یہ کب ہوا؟“

اس نے روتے روتے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”مجھے بھی پتا نہیں چلا۔ رات کسی وقت۔“

یہ وقت اور موقع سوال جواب کا نہیں تھا۔ میں باہر مردوں کے درمیان جا بیٹھا۔ ان کے لیے میرا چہرہ اور میرے لیے وہ اجنبی تھے مگر پھر مجھے بینک منیجر کا چہرہ نظر آگیا جو مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ میں اٹھ کے اس کے قریب جا بیٹھا۔

”تم بیگم صاحب کے چیک لانے تھے نا؟“ اس نے کہا۔

میں نے کہا۔ ”ہاں، ایک کام سے کچھ دن کے لیے باہر گیا تھا۔ کسی نے ان کے بیٹوں کو مطلع کیا؟“

”میرا خیال ہے نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو صحیح معلوم ہوگا۔“ اس نے آخر میں بیٹھے ہوئے ڈاکٹر کی طرف اشارہ کیا جس سے میں بیگم صاحب کے لیے دیگر چیزیں لاتا تھا۔ سب ایک اخلاقی فرض نبھانے آئے تھے۔ ان کی موت پر سوگوار کون ہے؟ میں نے اپنا سوال دہرایا۔

ڈاکٹر نے تلخی سے کہا۔ ”انہوں نے منع کر دیا تھا۔“

”کب منع کر دیا تھا۔ ان کا انتقال تو اچانک ہوا؟“

”بہت پہلے کہہ دیا تھا۔ مجھ سے بھی اور شاید بینک والوں سے بھی۔“ وہ بولا۔

”مگر ان کے وہی وارث تھے۔“

”اگر تمہاری مراد اس گھر یا بینک کے اثاثوں سے ہے تو چند دن قبل ہی ان کے وکیل نے قانونی کارروائی مکمل کی تھی۔ سب اس لڑکی کو دے دیا جو ان کی بھانجی تھی۔ ان کے ساتھ تھی۔“

”اس میں تو وقت لگتا ہے۔“

ڈاکٹر نے مجھے ایسے دیکھا جیسے دنیا کا سب سے بڑا احمق میں ہوں۔ ”نہیں جناب! پیسا لگتا ہے، پیسا وقت کو بھی خرید لیتا ہے پاکستان میں...... مہینے بھر کا کام ایک ہفتے میں کرا دیتے ہیں وکیل...... اور جہاں چیلنج کرنے والا ہی نہ ہو وہاں تو ایک دن میں بھی ہو جاتا ہے سارا کام۔“

میں اٹھ کے استاد کے پاس جا بیٹھا۔ ”تم جانا چاہو تو چلے جاؤ... مجھے دو چار دن لگ جائیں گے یہاں سوم تک۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”تدفین کے بعد چلا جاؤں گا پھر آجاؤں گا۔“

”میرا خیال ہے کہ اب تمہیں آنے کی ضرورت نہیں۔ میں خود ریشم کے ساتھ آجاؤں گا۔ وہ اکیلی یہاں نہیں رہ سکتی اور میں بھی اس کے ساتھ رہوں گا تو مسئلہ پیدا ہوگا۔ اس کا سگا بھائی تو نہیں ہوں نا۔“

”میری مان تو رسم کے چکر میں بھی مت پڑ...... یہاں کس کو پروا ہے سوم، چہلم کی...... آج رات ہی تدفین نمٹا کے نکل جا۔ تجھے کون جانتا ہے۔ کہہ دینا رشتے کے ماموں ہیں۔ وہ بھی کوئی پوچھے تو۔“

تدفین ظہر کے بعد ہوئی۔ عصر تک وہ سب لوگ جو ایک بس میں گئے تھے لوٹ آئے۔ نہ جانے کس نے کھانے کا انتظام کر دیا تھا۔ کچھ لوگ کھائے بغیر جانا چاہتے تھے مگر انہیں ”مذہبی فریضے“ کے نام پر روکا گیا۔ مغرب تک شامیانہ خالی ہو چکا تھا۔ استاد نے خود کو ماموں کے طور پر متعارف کرا دیا تھا۔ کچھ لوگوں نے اس سے رسمی باتیں کیں۔ اس نے ایک ہمسائے کو کچھ رقم دی کہ بعد میں شامیانے، کرسی کا حساب کر دے۔ وہ بھانجی کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ اپنے ساتھ لے جا رہا ہے۔ اعتراض کس کو ہو سکتا تھا۔ جب اپنے ہی نہیں تھے تو غیر یوں کو کیا۔

استاد کے گھر پہنچنے تک ریشم مسلسل روتی رہی۔ وہ میری تسلی سے کچھ دیر کے لیے چپ ہو جاتی تھی۔ پھر اسے خالہ کی کوئی بات یاد آجاتی اور وہ آنسو بہانے لگتی تھی۔ وہ فوری طور پر گھر بند کر کے کسی نئے گھر میں منتقل ہونے پر بھی آمادہ نہ تھی مگر میرے سمجھانے سے سمجھ گئی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کے فیصلوں پر مجھے مکمل اختیار دے دیا تھا۔ یہ اعتماد مجبوری بھی تھی اور اس اعتماد کا نتیجہ بھی جو اسے مجھ پر تھا۔

استاد کے گھر پہنچتے ہی میں نے سکون کا سانس لیا کیونکہ بھابی نے ریشم کا چارج لے لیا تھا اور میری مشکل آسان کر دی تھی۔ رات کے کھانے کا وقت قریب تھا۔ جسمانی تھکن سے زیادہ مجھ پر جذباتی دباؤ کی تھکن تھی۔ ریشم کے جذباتی بحران نے اس گھر کا ماحول بھی سوگوار بنا دیا تھا۔ جیسے خدانخواستہ موت نے یہاں سے کسی کو اٹھا لیا ہو۔ مجھے

بھی بار بار اس گھر کا خیال آرہا تھا جو اب ویران اور تاریک تھا اور لاوارث رہ گیا تھا۔ اس کے وارث نہ جانے امریکا کے کس شہر کی پُرآسائش خواب گاہ میں سوئے پڑے تھے جہاں ابھی صبح ہونے والی تھی۔ ان کو کیسے معلوم ہوسکتا تھا کہ ان کی ماں اپنی رات کسی قبر کی ویران تاریکی میں گزارے گی۔

میں نے دیکھا کہ بھابی اپنی ہمدردی اور توجہ سے ریشم کو سنبھال چکی ہے۔ منہ دھو کر اس نے کپڑے بھی بدل لیے تھے اور بڑے اصرار کے بعد دودھ کا ایک گلاس بھابی کے ہاتھوں سے گھونٹ گھونٹ انکار اور اصرار سے ختم کیا تھا۔ اس سمجھدار عورت نے رو رو کر سکون آور یا خواب آور گولیاں بھی ڈال رکھی تھیں۔ نتیجہ یہ کہ باتیں کرتے کرتے ریشم پر غنودگی غالب آگئی۔ پھر وہ سوگئی۔ میرا کھانے کا کوئی موڈ نہ تھا مگر اسے بھی بھابی نے چیلنج سمجھ کے قبول کیا اور میں نے ان کے ساتھ بیٹھ کے تھوڑا بہت کھالیا۔ اس دوران میں خالہ کے بارے میں جتنا بتا سکتا تھا وہ بتا رہا۔

بھابی نے سخت افسوس کا اظہار کیا۔ ”زمانہ کیسے بدل گیا ہے۔ پہلے نوکری کے لیے کوئی گاؤں سے شہر جاتا تھا تو وہ پردیس جاتا تھا۔ اب سات سمندر پار کا پردیس ہے۔“

”پہلے پردیس جانے والا کسی رشتے سے لاتعلق نہیں ہوتا تھا نہ خون کے نہ زمین کے۔ اب جو گیا سو گیا۔“

”حیرت ہے کہ وہ ماں کو بھول گئے۔“

”یہ سب مجبوریوں کے سلسلے ہیں۔ وہ ماں کو بلاتے رہے مگر ماں نے وہ گھر اور گلی...... یہ شہر اور ملک چھوڑنا منظور نہ کیا۔ وہ وہاں نہیں رہ سکتی تھی۔ وہاں کی ساری رونق اور چکا چوند عالی شان سربفلک عمارتیں اور لاکھوں گاڑیوں کے ہجوم میں بھی وہ اکیلی ہی رہتی اور یہاں اپنے گھر کے اکیلے پن اور ویرانی میں زیادہ پُرسکون تھی۔ اس کے بیٹے بھی مجبور تھے کہ ان کی مجبوری جذباتی نہیں مادی تھی۔ وہ عیش و عشرت کی کامیاب زندگی کو ماں کی ضد پر کیسے قربان کرسکتے تھے۔ بس...... دونوں الگ الگ دنیاؤں میں ایک دوسرے سے دور اور لاتعلق رہ گئے۔ اجنبی ہوگئے۔ کیا پتا ان میں سے بھی کوئی ایسے ہی مرگیا ہو اور ماں کو پتا نہ ہو۔“

”یہ لڑکی اب یہیں رہے گی؟“ بھابی نے گویا فیصلہ سنایا۔

”ظاہر ہے۔“ استاد بولا۔ ”اب یہ ہماری ذمے داری ہے۔ تم جاؤ اس کے پاس۔“

میں نے دکھ سے سر ہلایا۔ ”بے چاری لڑکی...... کیا قسمت لے کر آئی تھی۔ اپنے ایک کمرے کے مکان سے چوہدریوں کی حویلی میں پہلے قیدی...... پھر بااختیار...... مالکن بننے سے پہلے پیرسائیں کے آستانہ عالیہ پر...... وہاں سے فرار ہوکے اس گھر کی پناہ میں جہاں اس کے سر پر ایک تنہا عورت نے شفقت کا ہاتھ رکھا۔ اپنی بیٹی بنالیا۔ اور آج یہاں۔“

”پریشان مت ہو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ قدرت کے ہر کام میں کوئی مصلحت ہوتی ہے جو ہم نہیں سمجھ سکتے۔ یہی دیکھ لے کہ تیرا اتنا عرصہ لاپتا رہنے کے بعد اچانک ملنا...... کوئی سوچ سکتا تھا؟“ استاد بولا۔ ”اب مجھے لگتا ہے کہ بہت کچھ بدل جائے گا۔“

”اللہ بہتر کرے گا۔ ہم کیا سوچ کے نکلے تھے اور کیا ہوا۔“

”چل باقی باتیں صبح کریں گے.... تو بھی اب سب بھول جا، سوجا۔“

بہت دیر کروٹیں بدلنے کے بعد بالآخر میں بھی سونے میں کامیاب ہوگیا۔ صبح واقعی بہت کچھ بدل گیا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ گزرے ہوئے کل کی نہیں بہت دنوں پہلے کی بات ہے۔ خالہ کا اور ہمارا ساتھ بہت تھوڑا تھا لیکن اس میں بھی کسی نادیدہ ہاتھ کی کارفرمائی نظر آتی تھی۔ جس نے ہمیں ٹھیک وقت پر وہاں پہنچا دیا جہاں ہماری ضرورت تھی۔ ہمارے پہنچتے ہی دست غیب حرکت میں آگیا۔ وہ سارے کام بہت مختصر وقت میں مکمل ہوئے جو کسی کے ذہن میں نہ تھے۔ خالہ کو جانا تھا۔ مگر جانے کا وقت آنے سے پہلے ان کو ایک لڑکی سے ملنا تھا جسے وہ بیٹی بنا کے اپنا سب کچھ سونپ دیں۔ پناہ کی تلاش کرنے والی ریشم کو قسمت نے خود وہاں پہنچایا اور پھر سب بڑی عجلت میں ہوگیا۔ خالہ بھی جانتی تھیں۔ ان کے معالج کو معلوم تھا۔ جبکہ دالوں کو اندازہ تھا کہ وہ ایک ایک دن کی مہلت پر جی رہی ہیں۔ ادھر سب کام ہوئے ادھر انہوں نے دنیا چھوڑ دی۔

صبح ریشم کچھ مضمحل تھی لیکن بھابی کی دلجوئی اور دو کچھ بھابی نے اسے بڑا حوصلہ دیا تھا۔ میں بھی اس کی طرف سے بے فکر ہوگیا تھا۔ ناشتے کے بعد استاد نے پوچھا۔ میں نے اسے ساری تفصیل من وعن سنا دی۔ اندر بیٹھا سب بھابی نے ریشم سے سنا۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ خالہ کی موت کی وجہ سے ریشم نے وہ اخبار دیکھا ہی نہیں تھا جس میں اس کی تصویر تھی۔ وہ گھر میں کہیں پڑا ہوگا اب۔ مجھے اس وقت تک صبر سے انتظار کرنا تھا جب تک وہ بالکل نارمل نہ ہو جائے

اور یہ بات میں خود اسے بتا سکوں۔ ایک کام یہ بھی تھا کہ میں ریشم کو خالہ کے قانونی وارث کی حیثیت حاصل کرنے میں اس کی مدد کروں۔ پہلے بینک اکاؤنٹ پر اس کا حق ملکیت تسلیم کراؤں۔ وہ لڑکی جس نے کبھی کسی بینک میں قدم نہیں رکھا تھا جس نے چیک بک کا نام نہیں سنا تھا، بینک بیلنس کا پتا نہیں تھا اسے اپنا اکاؤنٹ آپریٹ کرنا تھا اور ضرورت پڑے تو اپنی پراپرٹی کا ڈسپوزل کرنا تھا یا اس کو کرائے پر اٹھانا تھا۔

یہاں بھی میں نے اخبار کا چھپا دینا بہتر سمجھا۔ اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ کسی نہ کسی صورت اس نے ریشم کو لاوارث ہو کے اس بے رحم دنیا کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا تھا۔ اس جیسی کوئی حسین اور جوان لڑکی دنیا کے ہاتھ لگ جائے تو وہ اس پر بھوکے بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑنے میں پہلے میں، میرے بعد انور، پھر مرحوم خالہ اور اب استاد کی بیوی نے ریشم کو اپنی حفاظت میں لے لیا تھا۔ میں نے اسے بھائی کا پیار دیا تھا تو انور نے اپنی محبت، خالہ نے ایک گھر اور زندہ رہنے کے وسائل فراہم کر دیے تھے اور یہاں بڑی بہن جیسی بھابی کے ساتھ وہ محفوظ تھی۔ بدقسمتی کے سائے اس کا تعاقب کرتے رہے تھے۔ قسمت اس کو بچاتی آئی تھی۔

استاد کے مشورے سے میں نے فی الحال اس اخبار کو سامنے سے ہٹا دیا جس میں انور کی لوٹ آنے کی جذباتی اپیل شائع ہوئی تھی۔ اس کے لیے چند دن انتظار بھی کیا جا سکتا تھا۔ جب ریشم کا ذہن اس صدمے سے کچھ سنبھل جائے۔ وہ اپنے ساتھ کچھ بھی نہیں لا سکی تھی لیکن اس کی فکر کرنے والی بھابی تھی۔ دوپہر سے کچھ پہلے میں نے اور استاد نے اس کے گھر اور بینک والے ان اثاثوں کا جائزہ لینا ضروری سمجھا جو اب ریشم کی ملکیت ہو گئے تھے۔ چند محلے دار اب مجھے اور استاد کو ریشم کے رشتے داروں کی حیثیت سے جان گئے تھے۔ انہوں نے یہ بھی تسلیم کر لیا تھا کہ خالہ اکیلی نہیں اسی لیے ہم ان کے ساتھ قیام پذیر تھے۔ کسی کو اعتراض نہ تھا کہ جیتے نہیں آئے تو انہوں نے سب کچھ ریشم کے نام کیوں لکھ دیا تھا۔ سب ان کے بیٹوں ہی کو برا کہہ رہے تھے۔ استاد نے ایک پڑوسی کو اپنے گھر کا پتا اور فون نمبر بھی دیا کہ ضرورت محسوس ہو تو رابطہ کر لیں۔ یہ سب کے اطمینان کے لیے کافی تھا۔

میں نے استاد کے ساتھ گھوم پھر کے گھر کا جائزہ لیا اور اس کی مارکیٹ ویلیو کا اندازہ کیا۔ اس کی فوری ضرورت

نہیں تھی لیکن استاد کو مجھ سے اتفاق تھا کہ یہاں رہائش اختیار کرنا کسی کے حق میں نہیں۔ کرائے پر اٹھانے میں بھی فائدہ کم تھا۔ کسی قانونی معاملے کے کھڑے ہونے کا امکان زیادہ تھا۔ چار چھ ماہ بعد جب خالہ کا نام بھی گم کیا جا چکا ہو گھر کو خاموشی سے ٹھکانے لگا دیا جائے۔ یہ مجھے ریشم نے بتا رہا تھا کہ خالہ نے بینک میں اس کا اکاؤنٹ کھلوایا تھا اس کے لیے منیجر خود گھر آیا تھا۔ ریشم نے صرف فارم پر کہا تھا اور دستخط کر رہے تھے۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ بینک منیجر مجھے جانتا تھا چنانچہ مجھے ریشم کا بینک بیلنس معلوم کرنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوا۔ ہر اعداد و شمار سامنے آئے اس نے مجھے دم بخود کر دیا۔ خالہ نے پہلے سے دس لاکھ ریشم کو ٹرانسفر کیے تھے۔ خود ان کے اکاؤنٹ میں برائے نام رقم رہ گئی تھی۔

یہ سب نصیب کے وہ کھیل تھے جن کا میں بھی شاہد تھا۔ کہاں وہ لاابالی...... شوخ اور زمانے کی نظروں سے بےخبر لڑکی جس نے مجھے زندگی سے بچایا تھا اور دن رات کی تیمارداری سے ایک نئی زندگی دی تھی۔ اس کے باپ کے قتل سے اب تک کے تمام واقعات میری نظر میں تھے۔ زمانے کا گرم سرد جھیل کر اور حالات کے نشیب و فراز سے گزر کے وہ لڑکی اب کتنی باہمت اور سمجھ دار ہو گئی تھی۔ اسے اکبر نے اغوا کیا۔ شاہجہ نے زبردستی کرنا چاہا۔ انور نے محبت کا فریب دیا۔ پیر صاحب نے اپنے حرم میں ڈالنا چاہا اور کوئی دست غیب اسے بچاتا رہا۔ ایک پکے گھر اور تھوڑی سی زمین کی مالک وہ اکیلی لڑکی ہر طرف سے شکاریوں میں گھر گئی تھی۔ لیکن حالات سے لڑتی رہی تھی اور آج گاؤں سے شہر پہنچ کے صاحب جائداد ہو گئی تھی۔ لکھ پتی بن گئی تھی۔ کسی نوازش یا کوشش کے بغیر۔ اس میں مقابلے کی طاقت کہاں تھی۔ اس کے دشمن خود ہی نیست و نابود ہو گئے تھے۔

گھر کے اسباب کی نہ قیمت تھی نہ ضرورت...... ہم نے اسے ویسا چھوڑا اور شام ہونے تک واپس آئے تو ریشم اور کلثوم لان میں بیٹھی چائے پی چکی تھیں اور اپنی باتوں میں مگن تھیں۔ مجھے اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ ریشم اسے اپنی زندگی کی کہانی سنا رہی ہو گی۔ کلثوم کو اعتماد حاصل کرنا آتا تھا اور اب کچھ چھپانے یا غلط بتانے کی ضرورت بھی نہ رہی تھی۔ رات تک کلثوم اپنے سارے پلان بنا چکی تھی جو وہ میرے بارے ریشم کے بارے میں رکھتی تھی۔ اس رات بہت دن بعد میں سکون کی نیند سویا تھا۔ شاید دماغ پر سے تفکرات کا بوجھ ہٹ جانے کا نتیجہ تھا کہ راکھ میں دبی چنگاری کی طرح جو ہوا

لگنے ہی شعلہ بن جائے نورین کی یا وقت اشکور سے تار بلب
مدفن سے نکل کے وہ خواب بن گئی جو پہلے بھی حقیقت کا
روپ بن کے میری آنکھوں میں اترا تھا۔

مجھے اچانک احساس ہوا کہ باہر ہوا تیز ہے اور
درختوں میں سنسناتی کسی کھلے دریچے سے ٹکرا رہی ہے۔ یہ
کسی کھڑکی کے پٹ کے ٹکرانے کی مسلسل آواز تھی جس نے
مجھے بیدار کیا۔ میں نے پردے ہٹا کے دیکھا تو ہر کھڑکی بند
تھی۔ سب کی کنڈی مضبوطی سے لگی ہوئی تھی۔ البتہ شیشوں پہ
باہر کوندنے والی بجلی کی چمک بارش کا امکان ظاہر کر رہی تھی۔
سوکھے پتے اڑ کر کھڑکی کے شیشوں پر لگ رہے تھے۔ میں
دوبارہ سو گیا اور پھر کسی آہٹ پر جاگا۔ کسی نے دروازہ کھولا
تھا اور بند۔ چرچرایا تھا۔ شاید کنڈی کھلی رہ گئی تھی اور ہوا کے
زور سے ایک پٹ ہلا ہوگا۔ میں نے سوچا اور بے فکر ہو کے
سونے کی کوشش کی۔ دروازہ کھلا رہے تو کیا...... مجھے کس کا
ڈر یا کون سی پرائیویسی کی ضرورت ہے۔

جو بات نئی تھی وہ مکمل تاریکی تھی۔ پہلے گھر کے باہر کی
لائٹس کا اجالا شیشوں پہ محسوس ہوتا تھا۔ مجھے یاد تھا کہ سونے
وقت عادت کے مطابق میں نے نائٹ لیمپ آن کر دیا تھا۔
اب وہ بھی نہیں جل رہا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کے بیڈ سائڈ
پر رکھے ٹیبل لیمپ کو جلانے کی کوشش کی مگر وہ روشن نہ ہوا۔
شاید تیز ہوا یا بارش کی وجہ سے بجلی چلی گئی تھی۔ میں نے سوچا
مگر اسی وقت دروازہ پھر چرچرا کے کھلا۔ یوں جیسے کسی نے
اسے دھکیلا ہو اور پھر خود ہی بند ہو گیا۔ کمرے کی مکمل تاریکی
اور خاموشی میں ایک خوشبو نے مجھ پر یلغار کی تو میں ایک دم
اٹھ بیٹھا۔

"کون؟" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ سرگوشی
میں پوچھا۔ "نورین!"

میرے کانوں نے ایک سسکی سنی۔ "تمہیں ابھی تک
یاد ہے میرا نام۔" اس آواز نے سرگوشی کی جسے میں بھول
نہیں سکتا تھا۔

"میں...... میں بھول سکتا ہوں تمہیں......؟" میں
ہکلایا۔

"مت جھوٹ بولو...... جھوٹ کی کوئی حد بھی ہوتی
ہے۔ آگے مت آنا...... ورنہ میں چلی جاؤں گی۔"

میں رک گیا۔ "میری بات سنے بغیر تم کیسے جا سکتی
ہو۔"

"کیا رہ گیا ہے اب کہنے سننے کو۔ باتیں کتنی کرتے
تھے تم...... دھوکے باز آدمی...... اور کتنی آسانی سے تم نے

"تو...... تو کیا تم...... میرا مطلب ہے...... آخر تم
کہاں ہو؟"

"تم تلاش کر سکتے تھے مجھے...... لیکن سچ بتاؤ تم نے
کوشش کی؟ نہیں کی نا...... تم دنیاداری کے جھمیلوں میں پڑ
گئے۔ ان سب کے معاملات تمہارے لیے زیادہ اہم ہو
گئے تھے۔ چوہدری انور، نجم اور شاہینہ۔"

"تم جانتی ہو...... کیسے جانتی ہو ان سب کو؟"

"میں تمہارے ساتھ تھی۔ ہر جگہ...... سب دیکھ رہی
تھی۔ تمہیں یاد بھی دلاتی رہی.... وہ سب وعدے جو تم
نے مجھ سے کیے تھے۔ یہ میرے لیے آسان نہ تھا مگر میں
آتی رہی۔ خود آ کے تمہیں بتاتی رہی کہ میں تمہارا انتظار
کر رہی ہوں۔"

میں دم بخود اسے دیکھتا رہا۔ وہ بالکل ایک روح تھی۔
سر تا پا ایک سفید غبار...... بادلوں کے بنے ملبوس میں نورینا کا
فرشتوں جیسا پیکر...... جیسے ایک خیالی وجود...... لیکن اس میں
ذرا بھی شک کی بات نہ تھی کہ میں نورینا کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا
وہی حسن بے مثال، وہی سراپا، وہی انداز رعنائی۔

"تم نے مان لیا تھا کہ میں ڈوب کے مر گئی۔"

میں چونکا۔ "نہیں...... یہ میں نے کبھی نہیں مانا...... مگر
میں کیا کرتا...... کہاں جاتا تمہیں تلاش کرنے؟"

"کہیں جانے کی ضرورت نہیں تھی تمہیں...... میں تو
تمہارے سامنے بھی آئی تھی۔"

میں نے بے وقوفوں کی طرح کہا۔ "میرے
سامنے...... کب؟"

"کیا نام بدلنے سے شناخت بدل سکتی ہے؟ تم اپنا
نام بدلتے رہے مگر میرے لیے وہی ہو اور تمہاری حقیقت کیا
نام کے ساتھ بدلی۔ فریدالدین...... ملک سلیم اختر...... یا
ندیم اختر راجا۔"

میں اچھل پڑا۔ "یہ...... تم کیسے جانتی ہو؟"

"جو سب کو معلوم ہے مجھے بھی معلوم ہے۔ مطلب اور
نام بدلنے کے باوجود میرے لیے تو وہی تھے۔ میں ہر روپ
میں تمہیں پہچان لوں گی۔ یہ نظر کی نہیں یہ دل کی بات ہے۔
دل گواہی دیتا ہے لیکن تمہاری نظر نے دیکھا...... دل نے
نہیں مانا۔"

"میں نے دیکھا؟ کیا دیکھا...... کس کو دیکھا؟"

"فاطمہ کو...... جو ہو بہو میری طرح تھی۔ تمہیں نظر
آیا...... یقین نہیں آیا۔"

میرے دل ... وہ ...... وہ تم تھیں؟''

''کیوں؟ کیا تم نے دیکھا نہیں تھا؟ مانا نہیں تھا...... مجھے تلاش نہیں کیا تھا؟''

میں نے کہا۔ ''مجھے ایسا ہی لگا تھا۔''

''لیکن تمہارا یقین ادھورا تھا۔ اس میں دل کی گواہی شامل نہیں تھی اور سب کچھ معلوم ہو گیا تب بھی فرق کیا پڑا۔ تم نے مان لیا کہ وہ نور دین نہیں فاطمہ ہی تھی۔''

''یہ غلط ہے۔ میں فاطمہ کی تلاش میں اس کے گھر تک پہنچ گیا تھا۔''

''وہاں تمہاری تلاش ختم ہو گئی؟'' وہ تلخی سے بولی۔ ''کیونکہ تمہارا وہ عشق باقی نہیں رہا تھا جو تمہیں آگے لے جاتا۔ وقت سب کچھ بھلا دیتا ہے۔ اس نے نور دین کی یاد کو بھی بھلا دیا۔ پھر وہ دیوانگی کہاں سے آتی جو تمہاری تلاش کو آگے لے جاتی۔ چلو گئی تو گئی۔ دنیا سے گئی یا دل سے گئی۔ ایک ہی بات ہے۔ تم اپنی زندگی میں مصروف ہو گئے۔'' اس نے سسکی لی۔

''دیکھو نور دین...... رو کیوں رہی ہو؟ میں مانتا ہوں کہ فاطمہ کو تلاش کرنے میں دیر ہو گئی...... اسے تم میری کوتاہی سمجھ لو۔ میں ذاتی دوسرے معاملات میں الجھ گیا تھا لیکن مجبوری تھی۔ یہ نہ کہو کہ میں فاطمہ کو بھول گیا تھا۔ اب میں فیصلہ کر چکا تھا کہ مجھے فاطمہ کو تلاش کرنے کے سوا دوسرا کوئی کام نہیں کرنا۔ لیکن تم میرا کام آسان تو کر سکتی ہو۔ مجھے بتا سکتی ہو کہ کہاں ہو گی؟''

''میں نہیں بتا سکتی۔''

''کیوں...... ایسی کون سی مجبوری ہے؟ اور اب تم آئی ہو تو جانے کی کیا ضرورت ہے۔'' میں لپک کے اٹھا اور وہ ایک دم پیچھے ہٹی۔ ''میں تو تمہیں یاد دلانے آئی تھی۔''

''نہیں، اب میں تمہیں جانے دوں گا تمہیں۔'' میں نے ایک دم اسے اپنی بانہوں کے حصار میں لینے کی کوشش کی۔

نتیجہ ایک بار پھر وہی نکلا جو پہلے نکل چکا تھا۔ میں بند دروازے سے ٹکرایا اور نیچے گر گیا۔ میرے ماتھے پر چوٹ آئی تھی۔ باہر بجلی چمکی اور بادل زور سے گرجا۔ اس میں دروازے سے میرے تصادم کی آواز دب گئی۔ میں سر سہلاتا اٹھا اور تاریکی میں واپس اپنے بستر پر آ کے لیٹ گیا۔ میرا دماغ خراب ہو گیا تھا۔ میں خواب دیکھتا تھا اور اسے حقیقت مان لیتا تھا۔ نیند میں چلنے والوں کی طرح......

میرے اپنے خیالات نور دین کے اور میرے سوالی جواب بن جاتے تھے۔ خوشبو میرے دل میں بسی ہوئی تھی۔ آج کل میں ذہنی طور پر اس کی تلاش کے پروگرام کو آخری شکل دے رہا تھا۔ یہ اندر کا وہ بار تھا جو فریب خیال سے فریب نظر بن گیا تھا۔

کچھ دیر میں صبح ہو گئی۔ بادلوں میں چمک اور گرج کی شدت کم ہوئی اور پھر ختم ہو گئی۔ وقت وقت صبح کا اجالا نمودار ہوا۔ روشنی سے مجھے اندازہ ہوا کہ شاید بادل بھی چھٹ رہے ہیں۔ غنودگی دور کرنے کے لیے میں نے ہاتھ منہ دھویا اور باہر نکل آیا۔ پھر اندر گیا۔ کچن میں ضروری سامان تلاش کر کے اپنے لیے کافی بنائی اور لان میں پڑی کرسی پر بیٹھ کے آسمان کو...... دھلے ہوئے درختوں کو...... جھلکتے سبزے کو...... ماحول میں رچی ہوئی خوشبو کو اور سکون کو محسوس کرتا رہا اور میرے خیالوں میں نور دین کا چہرہ بادلوں کے غبار سے جھانکتے سورج کی طرح دمکتا رہا۔ اب ایک خیال نے مصمم ارادے کی صورت اختیار کر لی تھی۔ مجھے فاطمہ کی تلاش میں جانا تھا اور آج ہی جانا تھا۔

کلثوم بھابی نے دروازے کی اوٹ سے پوچھا۔ ''یہاں لاؤں ناشتا یا اندر آؤ گے؟''

میں اٹھ کے اندر چلا گیا۔ ''ملک صاحب سوئے پڑے ہیں ابھی؟''

وہ میرے سامنے بیٹھ گئی۔ ''غسل خانے میں ہیں۔ یہ ماتھے پر چوٹ کیسی ہے؟''

میں نے ہاتھ لگا کے خفت سے کہا۔ ''بند دروازے سے ٹکرا گیا تھا۔''

وہ مسکرائی۔ ''کیوں کیا نیند میں چلنے کی عادت ہے؟''

میں نے انکار میں سر ہلایا۔ ''اب تو بہت کم ہو گئی ہے۔ وشم کیسی ہے؟''

''بالکل ٹھیک۔'' وہ بولی اور اس کے ساتھ ہی دو مختلف سمتوں سے ریشم اور استاد نمودار ہوئے۔ وشم واقعی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اس نے نئے کپڑے پہن رکھے تھے جو لگتا تھا کہ کسی درزی نے اس کے لیے ہی سیے ہوں گے۔

میرے دیکھنے پر وشم نے کہا۔ ''یہ کپڑے بھابی کے ہیں۔''

''مگر...... تمہارے لگتے ہیں۔'' میں نے ان دونوں کو دیکھا۔

''تھوڑا فرق تھا۔ وہ میں نے دور کر دیا۔'' کلثوم نے اعتراف کیا۔ ''یہ چھوٹا موٹا کام میں خود ہی مشین پر کر لیتی ہوں۔''

''پوری ٹیلر ماسٹر ہے۔ میں نے کہا کہ آنکھیں پھوڑنے کی ضرورت کیا ہے۔ لنڈے پر ٹیلر بھوکے مرجائیں اگر اس کی طرح سب اپنے کپڑے سینے لگیں۔'' استاد نے کہا۔

ناشتے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ ریشم کا موڈ اور طبیعت دونوں بہتر ہیں تو میں نے اپنی گزشتہ روز کی کارگزاری اسے بتا دی۔ ''جب بینک میں اکاؤنٹ کھولا تھا تو چیک بک بھی ملی ہوگی؟''

''ہاں، ہے میرے پاس...... دستخط بھی کیے تھے۔ خالہ نے پر بیلنس کرائی...... تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''کبھی ضرورت پڑ سکتی ہے بینک میں سے رقم نکلوانے کی۔ تمہیں معلوم ہے اکاؤنٹ میں کتنی رقم ہے؟''

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''کتنی ہے؟''

''دس لاکھ۔'' استاد نے کہا تو پل بھر کے لیے خاموشی ہوگئی۔ ریشم مجھے بے یقینی سے دیکھتی رہی۔

''دس لاکھ؟'' وہ بولی۔ ''ایک لاکھ زیادہ ہی تھے۔ ہمارا نوے لاکھ کا نقصان ہوا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''وہ میرا نقصان ہوا تھا۔ یہ تمہارے پیسے تھے۔''

اس کی آنکھوں میں اداسی اور شکایت اتر آئی۔ ''جب کل فرق نہیں تھا تو آج میرے تیرے کی بات کیوں کر رہے ہو؟''

''کیسی دکھ کی بات ہے۔ بیٹوں کو پتا ہی نہیں کہ ماں مر گئی۔'' استاد نے کہا۔

اس ڈر سے کہ ریشم کی اداسی کا دورہ آنسوؤں میں نہ ڈھل جائے میں نے فوراً موضوع بدلا...... ''ہم نے گھر کو لاک کر دیا ہے۔ ابھی ضرورت نہیں ہے۔''

''ہاں، اب یہاں سے تم وہاں جاؤ گی سیدھی......؟'' کلثوم نے کہا۔

''کہاں؟'' ریشم نے بھولپن میں پوچھا۔

''جہاں سب لڑکیاں جاتی ہیں، اپنے پیا کے گھر اور کہاں؟'' کلثوم بولی۔

موقع دیکھ کر میں نے بات کو آگے بڑھایا۔ ''ایک بات بتاؤ، اگر آج انور جائے......''

وہ چلائی۔ ''مت لیں اس کا نام میرے سامنے۔''

میں نے پیچھے سینٹر ٹیبل کے نچلے شیلف پر رکھا ہوا اخبار اٹھایا اور ریشم کے سامنے پھیلا دیا۔ اس نے اپنی تصویر کو دیکھا اور پھر اس کے نیچے لکھی تحریر کو پڑھا۔ شاید بار بار پڑھا۔

''اس نے بلایا ہے تمہیں۔'' میں نے کہا۔

''اخبار میں اشتہار دے کر؟'' ریشم کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

میں نے کہا۔ ''اس کو تمہارا پتا معلوم نہیں تھا اور تمہارا نام تو نہیں لکھا ہے اس نے؟''

''پھر؟ تم نے کیوں فرض کر لیا کہ یہ میں ہوں؟ کوئی اور نہیں ہو سکتی مجھ سے ملتی جلتی شکل والی؟''

''اس نے تمہارا نام رسوائی کے خیال سے نہیں لکھا ریشم۔''

''رسوائی کے خیال سے اس نے اپنا نام نہیں لکھا۔'' وہ اٹھی اور اخبار جھٹک کے نکل گئی۔

کمار ستم مسکرایا۔ ''ٹھیک ہے ٹھیک ہے...... اس کا غصہ اور اس کی ناراضی سب جائز ہے۔''

کلثوم نے شوہر کی تائید میں سر ہلایا۔ ''آخر اس کی بھی تو انا ہے۔ مگر تم فکر مت کرو، وہاں جانے کی تکرار اور کو خود آنا ہوگا۔''

''وہ آجائے گا۔ میں ریشم کو تمہارے سپرد کر کے جا رہا ہوں۔''

''جا رہے ہو! کہاں؟'' وہ چونکی۔

''ہمیشہ کے لیے نہیں۔ تمہارے شوہر کو میں ساتھ لے جا رہا ہوں۔ یہ آجائے گا کل تک...... مجھے چند دن لگ جائیں گے شاید۔''

''یہ مجنوں کا گھوڑا جا رہا ہے اپنی لیلیٰ کو تلاش کرنے۔'' استاد بولا۔

''کیا اس کا کوئی سراغ ملا ہے؟''

''سراغ تو نکالنا پڑتا ہے بھابی...... اور کہتے ہیں تلاش سے خدا بھی مل جاتا ہے۔''

اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''اچھا، تم بتانا نہیں چاہتے تو تمہاری مرضی...... خدا تمہیں کامیاب کرے، اگر وہ مل جائے تو اسے لے کر کسی اور طرف مت نکل جانا سراغ رساں عاشق۔''

''یہ میرا وعدہ ہے۔ لوٹ کے یہیں آؤں گا۔''

''کب؟'' اس نے برتن سمیٹتے ہوئے پوچھا۔

''کب کا کچھ نہیں کہہ سکتا۔ جب بھی وہ ملی۔ دعا کرو جلدی مل جائے۔ ہاں تمہارا شوہر واپس کر دوں گا ایک دو

دن میں۔"

ایک بار پھر میں رستم کا کا کے ساتھ اسی منزل کی طرف گامزن ہوا جسے میں پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ استاد تمام راستوں سے واقف تھا اور اس سفر کے لیے اس نے کار نہیں جیپ ساتھ رکھی تھی۔ روانہ ہونے سے پہلے اس نے سیٹ کے نیچے سے ریوالور نکال کر دیکھا اور پھر وہیں رکھ دیا۔

"استاد اس کی کیا ضرورت ہے؟"

"ضرورت بتا کے نہیں آتی پتر۔" وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ "اور اب تو عادت سی ہو گئی ہے۔ گن نہ لوں ساتھ تو ایسے لگے گا جیسے جوتے پہنے بغیر چل پڑا ہوں۔ تیری سیٹ کے نیچے بھی ہے ایسا ہی ریوالور...... چلانا آتا ہے؟"

"کیسی بات کرتے ہو استاد...... تمہاری شاگردی کی ہے۔" میں نے کہا۔ "تجلی کافی ہے۔"

ہم باہر آ گئے۔ جیپ واپسی کے راستے پر دوڑنے لگی۔ "تیرا کیا خیال ہے وہ مان جائے گا؟"

"تم انور کی بات کر رہے ہو؟ وہ مر کے بال آئے گا۔" میں نے کہا۔ "اب کون رہ گیا ہے دنیا میں اس کا۔"

"اب ان جاگیرداروں کی ناک اور شملہ نیچا نہیں ہوتا۔"

"انور کو بھی جانتا ہوں میں...... اور رستم کو بھی۔ انور کے لیے بھی اسے منانا مشکل ہوگا لیکن ردِ شاہانو پھر مشکل ہے۔ اس کی انا ایک زخم خوردہ عورت کی انا سے بڑھ کے نہیں ہو سکتی۔ اسے آنا پڑے گا۔ میں بھی اس معاملے میں رستم کی طرف ہوں۔ وہ اشتہار دیکھے اور پہنچ جائے کہ حضور میں حاضر ہوں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ نہیں ہونا چاہیے۔"

استاد کو کچے راستوں کا زیادہ علم تھا جو شارٹ کٹ بھی تھے اور محفوظ بھی۔ لیکن نہ جانے کہاں کوئی موڑ غلط ہو گیا کہ ایک پل آ گیا۔ اسے عبور کر کے وہ نہر کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ غلطی کا اندازہ اس وقت ہوا جب ہم دوسری طرف سے تباہ شدہ درگاہ پر جا نکلے۔ وہاں سے واپس پلٹ جانا مشکل نہ تھا لیکن دن کے اجالے میں اس درگاہ کے مٹے ہوئے آثار کو دیکھنے کی خواہش غالب آ گئی۔ میں نے استاد سے جیپ کو درختوں کی اوٹ میں روکنے کے لیے کہا اور خود اتر گیا۔ استاد نے آگے جانے میں رسک سمجھا۔ اس واردات کو ابھی دن ہی کتنے ہوئے تھے۔ پیر صاحب کے مریدوں سے زیادہ اسے ڈر تھا کہ پولیس نہ پہچان لے جس کے ساتھ استاد کے پرانے کاروباری مراسم تھے۔

خطرہ مجھے بھی تھا لیکن پولیس سے نہیں۔ درگاہ کے محافظ اور مرید مجھے شاہ جی کے ساتھ دیکھ چکے تھے اور وہ اندر کے آدمی تھے جو میرے تعلق کی نوعیت کو بھی سمجھتے ہوں گے۔ میں پیر صاحب کا خاص آدمی تھا۔ اس تخریب کاری میں گھر کے کسی فرد کا ڈاکوؤں سے کیا تعلق...... ہاں یہ ہو سکتا تھا کہ پولیس مجھ سے کچھ سوال جواب کرے۔ ادب اور احترام کے ساتھ...... یا مرید کہیں کہ میں مرشد کی جگہ سنبھالوں۔ درگاہ کا کیا ہے پھر بن جائے گی۔

تجسس نے مجھے بہت آگے پہنچا دیا۔ جہاں درگاہ کی شاندار عمارت کھڑی تھی وہاں اب ملبے کا ڈھیر تھا۔ سو کے قریب عقیدت مند پیر صاحب کی شہادت پر دکھی کھڑے زانجہ خوانی کر رہے تھے۔ پولیس محض رسمی کارروائی کے لیے موجود تھی اور انہوں نے ایک عارضی خیمہ لگا رکھا تھا۔ میں آگے بڑھا اور چبوترے پر پہنچا تو مجھے درمیان میں ایک قبر نظر آئی۔ اس کے چاروں طرف فرش میں بانس گاڑ کے احاطہ سا بنا دیا گیا تھا اور ترپال کا شامیانہ لگا دیا گیا تھا۔ وسط میں چکل توڑ کے پیر صاحب کی قبر بنائی گئی تھی کیونکہ مرکزی عمارت منہدم ہو چکی تھی جس کے نیچے مزار شریف کی جگہ مخصوص تھی۔ قبر کے اوپر رنگین چادروں اور پھولوں کے ڈھیر تھے اور سرہانے کی طرف جلائی جانے والی اگربتیوں کا دھواں اٹھ رہا تھا۔ قبر کے چاروں طرف عقیدت مند چٹائیوں پر حلقہ بنائے بیٹھے تھے اور پیر صاحب کے ایصالِ ثواب کے لیے قرآن خوانی میں مصروف تھے۔

مجھے افسوس ہوا تو ان بے علم اور بے عمل لوگوں پر جو حقیقت سے بے خبر تھے کہ ان کا پیر کتنا بڑا فراڈ تھا۔ کس طرح ان کا اور ان کے گھروں کی عزت کو لوٹتا تھا۔

میں پلٹنے ہی والا تھا کہ ایک مرید نے مجھے دیکھ لیا اور میری طرف لپکا۔ "سرکار! آپ کہاں تھے؟ دیکھیے ہم پر کیا قیامت گزر گئی۔ ہم برباد ہو گئے۔ یتیم ہو گئے۔" اس نے جھک کر میرے قدم پکڑ لیے۔

"میں نے بڑی مشکل سے پیر چھڑائے۔ "دیکھو، مجھے سب معلوم ہے، میں اس وقت گھر میں ہی تھا۔"

وہ بے وقوفوں کی طرح میری صورت دیکھنے لگا۔

"حضور! گھر میں تھے۔"

"ہاں، پیر صاحب نے حکم دیا کہ نکل جاؤ جان بچا کے۔ دشمنوں سے ہم نمٹ لیں گے۔ ان پر بجلی گرے گی۔ سب جل کے خاکستر ہو جائیں گے۔ انہوں نے کہا کہ خواتین کو محفوظ مقام پر لے جاؤ۔ لیکن افسوس...... بے رحم دشمنوں نے رعایت نہ کی۔"

اس دوران دو مرید اور آگئے اور انہوں نے بھی قدم بوسی کی سعادت حاصل کی۔ ''سرکار! وہ ڈاکو تھے۔ سب لوٹ کر لے گئے۔ لیکن بدبخت ان کو بھی شہید کر گئے۔ ان بدبختوں پر اللہ کا قہر نازل ہوگا۔''

دوسرا بولا۔ ''اب آپ آگئے ہیں تو مسند سنبھالیں۔ ان کے جانشین آپ ہی ہیں ہم جانتے ہیں۔''

میں بڑی مشکل میں پھنس گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ پیر سائیں کے گروہ میں بارہ ڈاکو تھے جو ان کے نائب کہلاتے تھے۔ مجھے کوئی اندازہ نہ تھا کہ بارہ میں سے کتنے جان بچانے میں کامیاب ہوئے تھے۔ چار میرے گرد آگئے تھے اور اچانک مجھے احساس ہوا کہ وہ مجھ سے درخواست نہیں کر رہے ہیں مجبور کر رہے ہیں کہ میں سجادہ نشینی قبول کروں۔ انہیں اپنا کاروبار جاری رکھنے کے لیے پیر کے بعد کسی ''پیرزادے'' کی ضرورت تھی۔ جیسے کمپنی کے چیئرمین یا ایم ڈی کے بعد مالک اور وارث اسی کا بیٹا ہوتا ہے۔ اس کی قانونی اور اخلاقی پوزیشن مضبوط ہوتی ہے۔ پیروں میں بھی گدی نشینی اسی طرح چلتی ہے جیسے بادشاہت میں جانشینی۔ پیر سائیں کا ولی عہد تو بہت پہلے ہی غائب ہوگیا تھا یا بھاگ گیا تھا۔ داماد بیٹے کی طرح ہوتا ہے۔ اکبر زندہ رہتا تو اس کاروبار کو دن دوگنی رات چوگنی ترقی دیتا کیونکہ وہ اسی قماش کا آدمی تھا۔ انور کا مزاج مختلف تھا۔ پیر سائیں کی ایک بیٹی بھاگ گئی تھی اور دوسری نے مجھے منتخب کرلیا تھا۔ اس کی منظوری پیر سائیں بھی دے چکے تھے۔ یہ اندر کی باتیں باہر والوں تک پہنچانے والے بہت تھے۔ بارہ نائب تو ایک طرح سے کابینہ کے ارکان تھے۔ وہ جانتے تھے کہ پیر سائیں نے مجھے اپنا وارث بنالیا ہے یا بنانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

میں نے کہا۔ ''اب بارہ میں سے کتنے باقی ہیں؟''

''ہم چار۔'' ان میں سب سے سینئر سب سے خطرناک اور عیار نظر آنے والے نے کہا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ ''یہ گدی تم کیوں نہیں سنبھال سکتے؟''

''سنبھال سکتا ہوں۔ لیکن آپ موروثی گدی نشین ہو۔''

''میں ان کا بیٹا نہیں ہوں۔''

وہ اپنی بات پر قائم رہا۔ ''داماد بھی بیٹا ہی ہوتا ہے۔ تم خاندانی ہو۔''

''بالکل نہیں۔ میری دور کی رشتے داری بھی نہیں۔ میں تو یہاں کا رہنے والا بھی نہیں۔'' میں نے انکار کی صورت نکالنے کے لیے کہا۔

''یہ کسی کو معلوم نہیں اور معلوم ہوگا بھی نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا۔''

وہ بولتا رہا۔ ''تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ سب کام پہلے کی طرح چلتا رہے گا۔ اگر ہم میں سے کسی نے گدی پر قبضہ کیا تو لوگوں کی جذباتی عقیدت نہیں ہوگی۔ یہ روحانی جانشینی ہوتی ہے۔''

اب تک مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ میں انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ وہ زبردستی پر آمادہ نظر آتے تھے۔ میں ان چاروں کو چار منٹ میں چت کرکے جاسکتا تھا لیکن سرِعام یہ تماشا مزید مسائل پیدا کرتا۔ رضامندی کی صورت میں وہ فوری طور پر مجھے ساتھ لے جاکر میری تقرری کا اعلان کردیتے کہ اب میں پیر ہوں۔ پھر نکلنا مشکل ہوجاتا۔ یہ صورتِ حال میرے خیال میں ہی نہ تھی جو پیدا ہوگئی تھی۔ میں استاد سے کہہ کے آیا تھا کہ ابھی آتا ہوں اور وہ کچھ فاصلے پر جیپ میں میری واپسی کا منتظر تھا۔ آخر وہ کتنی دیر انتظار کرے گا۔

''آپ چل کے غم زدہ عقیدت مندوں سے خطاب فرمائیں۔'' اس نے گویا حکم دیا۔

''ابھی؟'' میں دم بخود رہ گیا۔ ''میں اس کے لیے تیار نہیں ہوں۔''

''آپ پڑھے لکھے آدمی ہو۔ جانتے ہو کہ ایسے موقعے پر کیا کہنا چاہیے۔ یہ سب آپ سے زیادہ ذہین اور تعلیم یافتہ لوگ نہیں ہیں۔ ان کو تسلی دینا کیا مشکل ہے کہ وہ مایوس نہ ہوں۔ ان کی روحانی رہنمائی کی ذمے داری اب آپ نے قبول کرلی ہے۔''

ابھی ان کی بات ماننے بغیر چارہ نہ تھا۔ میں چاہتا تھا کہ کسی صورت استاد گامارستم کو میری گرفتاری کا علم ہو جائے۔ ابھی وہ چلا جائے۔ میں خود بعد میں نکل آؤں گا ورنہ وہ بھی ان چار بچ جانے والے بدمعاشوں کی ایسی تیسی کرنے آسکتا ہے۔

ایک مرید میرے دائیں جانب آگیا۔ دوسرا بائیں جانب...... وہ میرے پیچھے چلنے لگے۔ ان میں جو سینئر تھا وہ مجھے چپکے چپکے ہدایات دیتا رہا۔ ''ہاتھ اٹھاؤ...... لوگ تمہیں سلام کر رہے ہیں... مسکراؤ...... شفقت سے ان کو تسلی دو۔ ابھی دستار بندی نہیں ہوئی ہے۔ اس کا اعلان میں کروں گا کہ آج بعد نمازِ جمعہ ہوگی۔ امام کے بعد خطبہ ختم ہو گئے۔ پیر سائیں کی

خلعت پہن کے۔ چلتے رہو۔“

مجھے اپنے یرغمال بنائے جانے پر سخت غصہ تھا اور میں اندر ہی اندر آتش فشاں کی طرح کھول رہا تھا لیکن تحمل سے کام لینے پر مجبور تھا۔ مجھے یہ اندیشہ بھی تھا کہ وہ سب مسلح تھے۔ میرے گرد اب دو سو سے زیادہ عقیدت مند تھے۔ ان میں مجھے پولیس کے وہ لوگ بھی نظر آئے جو تفتیش یا حفاظت پر مامور تھے۔ وہ مجھے یوں دیکھ رہے تھے جیسے میں آسمان سے اترنے والی مخلوق ہوں۔ میرے گرد روحانی تقدس کا ہالہ ہے اور پیر بن کے میں ان سب سے برتر ہو گیا ہوں۔ میں نے وہی کیا جو مجبوری کے اس رول کا تقاضا تھا۔

اچانک ایک پولیس مین آگے بڑھا اور اس نے میرے پیروں کو ہاتھ لگایا۔ بے اختیار میرے قدم پیچھے ہٹے مگر پیچھے سے آواز آئی۔ ”اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کے دعا دو۔“

میں نے ایسا ہی کیا۔ ”اللہ بامراد کرے۔“

وہ ہٹ گیا لیکن اس کے بعد میری پیش قدمی مشکل ہو گئی۔ لوگ فرطِ عقیدت سے میرے ہاتھ چوم رہے تھے۔ پیروں کو ہاتھ لگا کے آنکھوں سے لگا رہے تھے۔ یا میرے خدا...... میں تیرا گنہگار بندہ...... کسی لائق نہیں لیکن میں مجبور ہوں۔ میں نے دل ہی دل میں اپنی بے بسی کا اعتراف کیا اور کسی نہ کسی صورت قبر کے سرہانے کی طرف پہنچ گیا۔

میرے دماغ پر اس تار کے خیال کی پریشانی مسلط تھی کہ وہ بالآخر آئے گا۔ خواہ چھپ کر آئے۔ یہ سب دیکھ کے وہ کیا سمجھے گا؟ یہی کہ میں نے اسے چکر دیا۔ ادھر آیا تو چند منٹ کا کہہ کے گیا اور یہاں گدی نشینی کے مکروہ کھیل کا حصہ بن گیا؟ اس فراڈ میں شامل ہو گیا جس سے نفرت کا اظہار کرتا تھا؟ اسے کیا معلوم کہ میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں۔ گن پوائنٹ پر یہ پیری کا تاج میرے سر پہ سجایا گیا ہے۔

میں نے خیالات کو مجتمع کیا اور اس مجمع سے مخاطب ہوا جو آنکھیں اور منہ کھولے بیوقوفوں کی طرح مجھے دیکھ رہا تھا۔ بے چارے ان پڑھ، سادہ، غریب اور احمق بحر و میوں کے مارے۔ خواہشوں کے اسیر...... اپنے جیسے ایک آدمی سے امید باندھ لیتے ہیں کہ نذرانے لے کر وہ ان کے سارے دنیاوی مسائل حل کر دے گا۔ ہر خواہش پوری کرا دے گا۔ اولاد و رزق سے لے کر ساس یا بہو کی اچانک موت تک...... بے روزگاری سے مرض الموت تک...... سب کے علاج کا ٹھیکا اس نے خدا سے لے لیا ہے۔ (نعوذ باللہ)

الفاظ غائب ہو گئے تھے۔ ذہن خالی تھا اور زبان پہ جیسے تالے پڑ گئے تھے۔ ایک طرف عقیدت مند اور دوسری طرف مجھ پر سجادہ نشینی تھوپنے والے کھلی آنکھوں سے مجھے گھور رہے تھے۔ یا اللہ میری مشکل آسان کر۔ میرے دل نے دعا کی اور وہ قبول ہو گئی۔ میں نے کسی کہنہ سال کہنہ مشق مقرر کی طرح بولنا شروع کر دیا۔ مجمع یقیناً متاثر ہوا تھا۔ خاموشی میں ان کے سر عقیدت سے جھک گئے تھے۔ میری زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ جیسے الہامی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔

پھر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ میں نے مجمع سے بہت پیچھے ایک ادھوری دیوار کے عقب سے استاد گاما رستم کا رخ روشن طلوع ہوتا دیکھا۔ وہ مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے میں انسان کا بچہ نہیں رہا۔ تراس کے ساتھ آیا تھا۔ میرے سینگ نکل آئے ہیں یا پر...... جیسے فرشتوں کے...... یہ سارا منظر اس کے لیے ناقابلِ تصور تھا۔ اس نے ٹھوڑی ہلا کے سوال کیا۔

”اب یہ کیا ڈراما ہے؟“

سوال سمجھنا آسان تھا۔ جواب دینا مشکل کہ یار میں یہ اداکاری مجبوری میں کر رہا ہوں۔ پھر بھی میں نے اسے دیکھا اور اپنی آنکھوں سے پیغام دیا مگر اتنے فاصلے سے وہ اس پیغام کو کیسے پڑھتا۔ ہمت کر کے میں نے ہاتھوں کی حرکت سے کچھ وضاحت کی کہ یہ سب مجھ سے گن پوائنٹ پر کرایا جا رہا ہے، میں چاروں طرف سے محصور ہوں۔ اس کا سر غائب ہو گیا۔ معلوم نہیں اس نے کیا سمجھا کیا نہیں سمجھا۔ ایک خیال مجھے ضرور آیا کہ میں جب چاہوں گا کے دونوں اور سارے مریدوں کے سر کے اوپر سے چھلانگ لگا کے بھاگ جاؤں، کون کرے گا میرا تعاقب؟ مرید؟ پولیس یا گارڈز؟ اور میں جیپ تک پہنچ پاؤں گا یا اس سے بہت پہلے اللہ میاں کے پاس پہنچ جاؤں گا۔

میں نے خطاب ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ وقت ضائع کرنے کا کیا فائدہ۔ اگلا قدم اس کے بعد ہی اٹھایا جا سکتا تھا۔ اب مجھے ایک تخت پر بٹھا دیا گیا۔ یا میرے مولا! یہ کیا کا سیدنا تحسیر چل رہا ہے۔ موت کے فرشتے تخت کے آس پاس کھڑے ہو گئے۔ تخت پر ایک قالین بچھا ہوا تھا اور گاؤ تکیہ پہلے سے موجود تھا۔ میرے سامنے ایک طشت لایا گیا جس پر سنہرے حروف میں منقش آیاتِ قرآنی والا سیاہ غلاف تھا اور درمیان میں کوئی چیز ابھری ہوئی تھی۔ لگتا تھا کہ مرشد یا زیور...... اس کمینے...... نے کچھ پڑھتے ہوئے طشت کا غلاف ہٹایا اور لوگوں نے بہ آواز بلند نعرے لگائے۔ غلاف کے نیچے وہ سبز سی کی سنہری پگڑی تھی جو یقیناً سونے کے تاروں سے بنی گئی تھی اور اس کا رنگ سبز تھا۔ میری گدی نشینی کا مقدس ڈراما شروع ہو چکا تھا۔

اب سے آدھا گھنٹا پہلے میں اس سین کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا جو پیشِ نظر تھا اور میں اس کا حصہ بننے پر مجبور تھا۔ اپنی بے بسی کے خیال پر مجھے رونا بھی آرہا تھا اور ہنسی بھی۔ پریشانی یہ بھی تھی کہ فوری طور پر اس ڈرامے کا انجام نظر نہ آتا تھا۔ جب مریدوں نے باری باری اٹھ کے میرے ہاتھ چومنا اور میرے سامنے خالی نشست میں نذرانے ڈالنا شروع کیے تو میں نے بےحساب لگایا کہ ایک مریدنی منت کے ریٹ پر یہ کھیل کم از کم چار گھنٹے جاری رہنے والا تھا۔ استاد کا چہرہ پھر دیوار کی اوٹ سے نمودار نہیں ہوا تھا۔ کیا وہ چلا گیا ہوگا کہ وہ کسی امید پر انتظار کرسکتا تھا۔ اس کے خیال میں تو میں پیر کا جانشین پیر بن گیا تھا۔ وہ درِ نجم کو جا کے کیا بتائے گا کہ تمہارا بھائی کتنا مکار ہے۔ ایک کے بعد دوسرا تیسرا نام تو خیر مجبوری تھی مگر وہ نوربن کی تلاش نکلا اور دام سے ملنے کا ڈراما کر کے نکلا اور مجھے چکر دے کر پیر کی گدی پر جا بیٹھا۔ میں نے خود اسے ایک روحانی تقریر کرنے...... لوگوں کو ہاتھ پیر چومنے کی اجازت دینے، پیری کا تاج پہنے اور نذرانے وصول کرتے دیکھا۔ وہ تم سے بھی جھوٹ بولتا رہا اور مجھ سے بھی بکواس کرتا رہا۔ وہ طے کرچکا تھا کہ پیر صاحب کا گدی نشین بنے گا۔

میں نے فی الحال ہتھیار ڈال رہے تھے۔ جب وقت اور موقع ملے گا تو میں ان سب کی ہڈی پسلی ایک کر کے جو مجھے یہاں گھیر لائے ہیں بھاگ جاؤں گا۔ اس درمیان میں استاد، اس کی بیوی اور درِ نجم مجھے کوسیں، گالیاں دیں، جب میں بقلم خود پہنچ کے اس زور زبردستی اور بدمعاشی کی روداد سناؤں گا تو وہ ضرور مجھے معاف کردیں گے۔ پھر اچانک نمودار ہونے والے استاد کے چہرے نے مجھے چونکا دیا۔ اس نے خدا حافظ کہنے کے انداز میں ہاتھ ہلایا اور غائب ہو گیا۔ میرا دل بیٹھ گیا۔ بالآخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ کاش استاد کے پاس جیب نہیں کوئی ٹینک ہوتا تو وہ گولہ باری کرتا آتا اور کشتوں کے پشتے لگا دیتا۔

مرید بیعت کر رہے تھے۔ وی کنگ از ڈیڈ۔ لونگ لو دی کنگ...... نئے بادشاہ کو سلام کرو۔ اب تمہارے مقدر کے مسائل کا نسخہ اس کے پاس ہے۔ جسم پر تھکن، بھوک، پیاس، غرض سب غالب تھے۔ میں نے مرغے کو اشارے سے قریب آنے کا کہا۔ "مجھے کتنا وقت لگے گا؟"

اس نے میرے کان میں کہا۔ "آپ نماز ظہر کے بہانے اٹھ جائیں۔"

"ہاں، بھوک اور پیاس سے میرا برا حال ہے۔"

مؤذن مرحبا بروقت بولا۔ اذان قریب کی کسی مسجد سے ہوئی تھی کیونکہ درگاہ شریف کے بھونپو تو شہید کیے جاچکے تھے۔ میرے وزیراعظم نے اعلان کیا۔ "باقی لوگ بعد نماز بیعت کریں گے اور نذرانے دیں گے۔" یہ مجھے اندازہ تھا کہ نذرانے کے بغیر بیعت نہیں۔ طشت میں ہر مالیت کے نوٹ تھے۔ سونے، چاندی کی انگوٹھیاں، بالیاں، چوڑیاں سب ڈھیر ہوگئے تھے۔ ان پر ریشمی خوان پوش ڈال دیا گیا، میں اٹھ کر کھڑا ہوا۔ ان چاروں نے پھر مجھے حصار میں لے لیا۔ انہوں نے مرکزی حصے میں اترنے والے زینے کا دوسرا راستہ نکال لیا تھا، لمبا ہٹا کے۔ مجھے یہ خانہ سلامت تھا۔ یہاں میں نے دو بار اچھا وقت نہیں گزارا تھا۔ جن بھوت اتارنے کے سارے بھیانک مناظر، دیوانگی، ہسٹریا اور خوف میں جکڑا مریض عورتوں کے ساتھ ہونے والے انسانیت سوز مظالم کے تصور نے مجھے بے چین کردیا۔ جن اتارنے والوں نے کس کس ظالمانہ طریقے سے یہ عمل کیا تھا اور انہی کے درمیان میں نے نوربن کو فاطمہ کے روپ میں دیکھا تھا۔ میں تیسری بار یہاں آیا تھا۔ خوار ایک مختلف انداز میں گیا۔

مجھے ایک کمرے میں لے جایا گیا جہاں فرش پر دبیز قالین تھا اور دیواروں کے ساتھ تکیے لگے تھے۔ "یہاں تو سب نیا ہوگیا۔ سب کیسے بنے گا؟"

"بن جائے گا انشاء اللہ" وہ بولا۔ "کھانا ایک مرید پولیس افسر بھیج رہا ہے۔"

"کوئی اچھے ریسٹورنٹ والا ہمارا مرید نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

خلیفہ مسکرایا۔ "وہ پولیس افسر کا مرید ہے۔"

"ڈاکو یہاں سے کیا کچھ لے گئے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"سب کچھ۔"

"سب کچھ کتنا ہوتا ہے...... کتنا سونا...... کتنا نقد؟" میں نے سچ مچ کے گدی نشین کی طرح سوال کیا۔

چالاک مرید جواب گول کرگیا۔ "اس کا تو مجھے علم نہیں...... مرحوم پیر صاحب سب وصول کرتے تھے۔"

"مرید کتنے ہیں، اندازے سے بتاؤ اور نذرانوں کی آمدنی؟"

"تمہیں سب معلوم ہوجائے گا۔ جلدی کیا ہے؟" وہ آپ سے تم پر آگیا۔ اس کا قبل زوال...... اس کے تیور اور جارحانہ لہجہ سب یہ ظاہر کرتے تھے کہ وہ خود کو بہت بڑا

بدمعاش سمجھتا ہے اور شاید وہ تھا۔ اس کے تین ساتھی بالکل خشم کے غلام تھے۔ اب جو ہو سو ہو کے مصداق میں اس صورتِ حال کا حصہ بن چکا تھا۔ استاد کا مار خشم یقیناً واپس چلا گیا تھا اور میں جس جہنم سے نکلا تھا اس کا پھر اسیر تھا۔ بدلا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے۔ اب پیر سائیں زمین کے دو گز ٹکڑے میں سنوں مٹی کے نیچے دفن تھا جس پر وہ بڑے طمطراق سے حکومت کرتا تھا۔ اس کی بے زبان بیوی محض اس لیے ماری گئی کہ وہ پیر اس کا شوہر تھا۔ شاہینہ نے اس ماحول سے جو سیکھا تھا وہ اس کے کام نہ آیا۔ اب میں اس خونی کھیل کا ایک کردار...... اپنی مرضی کے خلاف مجبور وہ کردار تھا جو میں کرنا نہیں چاہتا تھا۔

یہ زبردستی کیسے چل سکتی تھی اور کتنے دن وہ گن پوائنٹ پر مجھے پیر بنا کے رکھ سکتے تھے۔ یہ چار مرید اپنی بدمعاشی کے زعم میں خودکشی کا سامان کر چکے تھے اور مجھے معلوم تھا کہ وہ وقت بہت دور نہیں ہے۔ ابھی ان کی خود فریبی کو برقرار رکھنا ضروری تھا کہ وہ مجھے اپنی اطاعت پر مجبور کر چکے ہیں اور میں گدی نشینی کے منافع بخش بزنس میں ان کے ساتھ مل گیا ہوں۔ کھانا بہت مرغن اور پرتکلف تھا۔ سہ پہر کے بعد پھر بیعت اور نذرانوں کا سلسلہ شروع ہوا جو مغرب تک جاری رہا۔ اس روز کی آمدنی بھی ہزاروں میں تھی۔ مرید خاص نے مجھے بتایا کہ درگاہ کی نئی عمارت زیادہ سے زیادہ تین ماہ میں مکمل ہو جائے گی اور پہلے سے زیادہ شاندار ہو گی۔ اصلی پیر سائیں کو ان کے لیے مخصوص جگہ پر منتقل کرنا ضروری نہیں۔ باہر بھی ان کا شاندار مقبرہ بن جائے گا۔ میں یہ ساری بکواس سنتا رہا اور موقعے کا منتظر رہا۔ میں جلدی میں اپنا کام خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔

رات کو میں نے پھر مرغن کھانا کھایا تو میری طبیعت بوجھل ہو گئی۔ میں اس کا عادی نہیں تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ فی الحال یہی میری خواب گاہ اور قیام گاہ سب کچھ ہو گی۔ رات تک انہوں نے اپنا دفاعی نظام بہتر بنا لیا۔ شاید ان کو میری نیت پر شک تھا۔ انہوں نے میرے ''حجرے'' کے باہر پوزیشن سنبھال لی۔ ایک عین دروازے سے چند قدم دور کھڑا رہا۔ دوسرا زینے کے آغاز پر...... اور تیسرا شاید اوپر جہاں سے راستہ اترتا تھا۔ سینئر مرید کھانے کے بعد غائب ہو گیا۔ میں نے گھڑی دیکھی تو رات کے نو بجے تھے۔ استاد کا مار خشم...... اس کی بیوی کلثوم اور ریشم سب کھانے کی میز پر ہوں گے اور مجھے برا بھلا کہہ رہے ہوں گے۔ ابھی تک سینئر مرید مجھ سے دور دور تھا۔ میں طے کر چکا تھا کہ جب بھی موقع ملا اسے قابو کر کے یہ حال بتاؤں گا اور نکل جاؤں گا۔

لیکن وہ سب نہ ہوا جو میں نے سوچا تھا۔ اس سے پہلے ہی حالات نے جیسے یوٹرن لیا۔ اچانک باہر ایک فائر ہوا۔ پھر دوسرا۔ کوئی چلایا اور اس کے چلانے میں موت کا کرب تھا۔ یکے بعد دیگرے کئی فائر ہوئے اور اچانک میں نے استاد کو دیکھا لیکن وہ مرید خاص کے پیچھے تھا۔ استاد کے ایک دھکے سے وہ میرے سامنے منہ کے بل آ کے گرا۔ استاد نے پیچھے سے آ کے اسے کئی بار بوٹ کی ٹھوکر ماری۔ وہ پسلیاں دبا کر ہائے ہائے کرتا لوٹنیں لگاتا رہا۔

میں کھڑا ہو گیا۔ ''استاد! تم...... یہاں کیسے؟''

وہ مسکرایا۔ ''میں تمہیں لے جانے کے لیے آیا ہوں۔ نذرانہ پیش کرنے کے لیے نہیں۔''

''اس کے باقی ساتھی کہاں ہیں؟''

''دو مارے گئے، ایک بھاگ گیا۔ اس کا کیا کروں؟'' استاد نے خطرناک نظر آنے والے ریوالور کا رخ فرش پر پڑے مرید کی طرف کیا۔

''خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔''

استاد ہنسا۔ ''خدا کے لیے؟ نہیں...... تجھے چھوڑ دیا تو خدا کے نام پر ہی تو پھر ان کو لوٹے گا۔''

''نہیں، میں سب چھوڑ دوں گا۔'' اس نے استاد کے پیر پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

استاد پیچھے ہو گیا۔ ''یہ تو ایسا ہی ہے جیسے سانپ کہے میں ڈسنا چھوڑ دوں گا۔''

میں نے کہا۔ ''اگر تو اعتراف کر لے کہ لوٹ مار میں کتنا مال سمیٹا؟ کتنی عورتوں کی عزت لوٹی......''

''میں مجبور تھا۔ جو کیا پیر سائیں کے حکم پر کیا۔'' وہ گڑگڑایا۔

استاد نے غرا کے کہا۔ ''یہ نہیں پوچھا تھا تجھ سے۔''

وہ رونے لگا۔ ''لاکھوں...... کروڑوں...... حساب مجھے پتا نہیں۔ پیر سائیں سب کو حصہ دیتے تھے۔''

میں نے کہا۔ ''اور ان عصمتوں کا کیا حساب ہے جو تم سب نے مل کے لوٹیں؟''

''بہت...... درجنوں...... سیکڑوں ہوں گی۔ مجھے یاد نہیں۔'' وہ دھاڑیں مار مار کے رونے لگا۔

استاد نے کہا۔ ''اس اعتراف جرم کے بعد تیرے لیے سزائے موت بہت کم ہے اور یہ میں ان کی طرف سے دوں گا جو مجبور تھے۔ آج بھی مجبور ہیں۔ کسی انصاف کی عدالت میں فریاد نہیں کر سکتے۔'' پھر پے در پے تین فائر

ہوئے۔ ایک گولی نے سر میں سوراخ کیا۔ وہ اچھلا اور خون کی ایک دھار پھوٹی۔ دوسرا فائر دل پر ہوا۔ میرا خیال ہے اس وقت وہ مر چکا تھا جب استاد نے اس کی ٹانگوں کے درمیان تیسرا فائر کیا۔ میں دہشت زدہ کھڑا رہا۔ اس طرح سزائے موت دینے کے انداز میں کسی کو ٹھنڈے دماغ سے گولی چلاتے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ ایک عبرتناک انجام تھا۔ خدا کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ وہ کوئی عدالت کا جج نہ تھا، ایک ڈاکو تھا جسے خدا نے انصاف کے لیے بھیجا۔ وہ ظالم کی رسی دراز کرتا ہے مگر ایک حد تک۔

استاد نے مجھے کھینچا اور ہم باہر نکل آئے۔ جیپ کچھ فاصلے پر اندھیرے میں موجود تھی۔ استاد کے ساتھ صرف دو معاون آئے تھے۔ ایک نے ڈرائیونگ سنبھال لی۔ دوسرا اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ گھر پہنچنے کے بعد کلثوم نے تو صرف اتنا کہا کہ ”شکر ہے خدا کا...... تم ٹھیک ہو۔“ مگر ریشم مجھ سے لپٹ کر ہچکیوں سے رونے لگی۔ استاد نے اسے ڈانٹ ڈپٹ کے الگ کیا اور سب کو سونے کے لیے بھیج دیا۔ ”صبح بات کریں گے۔“ اس نے کہا۔ مجھے اس کے اعصاب پر رشک آیا۔ اس پیشے نے اسے سفاک اور بے رحم بنا دیا تھا مگر دشمنوں کے لیے۔ جیسے اس نے مرید کو شوٹ کر دیا تھا میں نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اس کے مرنے کا کوئی افسوس نہیں تھا، حیران تھا کہ استاد میری مدد کے لیے کیسے پہنچ گیا۔ میں تو اس کے برعکس سوچ رہا تھا کہ وہ سب میری وجہ سے پریشان ہوں گے۔

حالات کا دھارا تیزی سے ایک نئی سمت میں بہہ رہا تھا۔ مجھے اندازہ کرنا مشکل تھا کہ آنے والا دن کس انقلاب کی خبر لائے گا۔ صبح موقع پاتے ہی میں نے اس سے پوچھا۔

”استاد! تم کو غصہ نہیں تھا مجھ پر؟“

”غصہ؟ کس بات پر؟“

”میں تھوڑی دیر کے لیے گیا تھا اور وہاں گدی پر بیٹھ گیا تھا؟“

وہ ہنسنے لگا۔ ”بے وقوف ہے تو۔ اسی بات نے تو مجھے شک میں مبتلا کیا تھا۔ تجھے گدی سنبھالنا ہوتی تو یہ بات بھی تو مجھ سے کیوں چھپاتا۔ میرا مشورہ مانگتا کہ ایسا کرنا چاہتا ہوں میں...... لیکن دوسری اس سے بھی بڑی بات یہ تھی کہ تو میرے ساتھ درگاہ جانے کے ارادے سے نہیں نکلا تھا نہ وہ رہا دارستہ تھا۔ ہم تو بھٹک کے وہاں پہنچ گئے تھے ورنہ چودھریوں کی حویلی جاتے...... تو نے ایسا سوچا تھا اور نہ تیرا کوئی ارادہ تھا درگاہ کی گدی پر بیٹھنے کا...... میں کیا جانتا نہیں کہ تیرے خیالات کیا ہیں؟ پھر میں کیسے فرض کر لیتا کہ تو بھی ایسا چاہتا تھا۔ تو پھنس گیا تھا۔ زبردستی کرنے والوں کو بھی میں نے دیکھ لیا تھا اور پہچان لیا تھا۔ بس مجھے رات کا انتظار تھا۔“

”یہ بات واقعی میری کھوپڑی میں نہیں آئی تھی۔“ میں نے رقت سے کہا۔ پھر چونکہ سب ہی تفصیل جاننے کے خواہش مند تھے۔ میں نے درگاہ میں ہونے والی زبردستی کے بارے میں مفصل بتا دیا۔

ایک گھنٹے بعد استاد نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی۔

”کیا خیال ہے چلیں؟“

میں نے حیرانی سے کہا۔ ”کہاں چلیں؟“

اس نے مجھے یوں دیکھا جیسے مجھ سے اس احمقانہ سوال کی توقع نہ تھی۔ ”وہیں جہاں کل جانا تھا مگر جا نہیں سکے تھے۔“

استاد کا رویہ بے حد غیر جذباتی اور وحشت تھا۔ کچھ دیر بعد ہم پھر اسی منزل کی جانب رواں دواں تھے جہاں راہ سے بھٹک جانے کے باعث نہ پہنچ پائے تھے۔ گھر سے باہر آتے ہی میں نے استاد سے پوچھا۔ ”ریشم نے اور کچھ کہا؟“

”ہاں، وہی جو تیرے سامنے کہا تھا۔“

”تم نے یا بھائی نے اسے سمجھایا نہیں؟“

”وہ سمجھنا ہی نہیں چاہتی اور مجھے اس سے اتفاق ہے۔“

”یعنی تم بھی چاہتے ہو کہ یہ کشتی پار نہ لگے۔“ میں نے کہا۔

”اسے کشتی کے اندر سے ملاح...... اس کی جگہ خود کو رکھ کے دیکھ۔ وہ کہتی ہے میں کیسے مان لوں کہ قصور میری ہے اور انور نے مجھے واپس بلانے کے لیے شائع کرائی ہے۔ اس نے تو اپنا نام بھی لکھنا گوارا نہیں کیا۔ یہ انور ہے تو وہ خود کو کیوں چھپا رہا ہے؟ اس لیے کہ میرے جیسی کم ذات اور لاوارث لڑکی سے درخواست کرتے ہوئے اس کی ناک نیچی ہوتی تھی؟ ایک جاگیردار کی ناک ہی تو سب کچھ ہوتی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”یہ تو تیری ٹھیک کہا اس نے۔“

”اس نے مجھ سے کہا کہ بھائی صاحب! اگر میں سلیم کی اور آپ کی بات مان لوں...... اور انور صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کے کہوں کہ چودھری صاحب! کنیز کے لیے کیا حکم ہے؟ اور وہ انکار کر دے کہ میں نے تو کوئی ایسا اشتہار نہیں دیا تھا۔ اس عورت کی اور تمہاری صورت میں

مشابہت ہے۔ میں دیکھ سکتی ہوں لیکن یہ کوئی اور ہے۔ بتائیں پھر میری کیا عزت رہ جائے گی؟"

میں نے خفت سے کہا۔ "یہ بات بھی میرے ذہن میں نہیں آئی تھی۔"

"ہاں، تو ایک لڑکی نہیں ہے نا...... ایک ٹھکرائی ہوئی لڑکی جس کی انا کا شیشہ چکنا چور ہوا تھا۔"

"یہ تم نے بڑی فلسفیانہ بات کی۔ مگر حل بتاؤ اس مسئلے کا؟"

"حل بہت آسان ہے۔ ریشم نے کہا تھا لیکن یہ ضروری ہے کہ وہ خود آئے۔ ریشم کیوں دوڑی جائے...... صرف ایک مفروضے پر کہ تصویر اس کی ہے اور بلانے والا انور ہے۔"

"مگر وہ کہاں آتا؟ ریشم لاپتا تھی؟"

"وہ تم تک تو پہنچ سکتا تھا اپنا...... کیا اس کی بے عزتی ہو جاتی...... ریشم بالکل ٹھیک کہتی ہے۔"

میں نے سر ہلایا۔ "چلو اب یہ بات انور کو سمجھا دیتے ہیں اور سمجھانے کی کیا ضرورت ہے۔ دوسرے کے ٹل آئے گا۔ اس نے مجھ سے بہت پوچھا تھا کہ ریشم کہاں ہے؟ میں نے نہیں بتایا۔"

ایک بار پھر میں نے حویلی میں قدم رکھا تو سب کچھ بدلا ہوا تھا۔ گیٹ پر ایستادہ گارڈ پرانا تھا۔ اس نے پہچان کے مجھے سلام کیا۔ اندر کا سناٹا آسیب زدہ لگتا تھا۔ سارے کمروں کے دروازے بند تھے۔ برآمدے سنسان تھے۔ چودھری صاحب کا آئی سی یو جیسا کمرا بند تھا۔ شاہینہ کا کمرا بند تھا۔ وہ کمرا بند تھا جس میں میرا قیام تھا۔ برآمدے میں نظر آنے والے گارڈ اور خادم سب غائب تھے۔ حویلی میں انور کے علاوہ اس کی بیوہ ماں اپنے کمرے میں ہوگی جہاں وہ تنہا زندگی کے آخری ایام کسی سزائے موت کے منتظر قیدی کی طرح کاٹ رہی تھی۔ انور کے کمرے کا دروازہ بھی بند تھا۔ میں نے اس پر آہستہ سے دستک دی اور اندر داخل ہو گیا۔

کمرے میں اندھیرا تھا لیکن مجھے وسط میں کھڑے انور کا ہیولا نظر آ گیا۔ "انور!" میں نے کہا۔ "اندھیرا کیوں ہے کمرے میں؟" اور ہاتھ بڑھا کے لائٹ جلا دی۔ انور کو دیکھتے ہی میرے ذہن کو الیکٹرک شاک لگا۔ میرے سامنے بکھرے بالوں اور وحشت زدہ آنکھوں والا ایک شخص کھڑا تھا۔ اس نے بوکیوں والا سبز رنگ کا ڈھیلا ڈھالا چغا پہن رکھا تھا۔ اس کی شیو نے بڑھتے بڑھتے داڑھی کی شکل اختیار کر لی تھی اور وہ ساکت و صامت کھڑا مجھے پلک جھپکائے

بغیر دیکھ رہا تھا۔

"انور! یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تو نے اپنی؟" میں نے کہا۔

"تو پھر آ گیا؟" وہ چلایا۔ "کیوں آیا ہے یہاں؟ دفع ہو جا...... شکل گم کر اپنی۔" اس نے مجھے گالیاں دیں۔ استاد کے لیے بھی یہ منظر غیر متوقع تھا۔ وہ باہر نکل گیا تو میں نے دروازہ بند کر دیا۔ "بکواس بند کر اپنی ورنہ اتنا ماروں گا کہ ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "یہ کیا ڈراما ہے؟"

وہ میرے تیور دیکھ کے ڈر گیا۔ "مجھے مت مار نا، میں تو ویسے ہی مرنے والا ہوں۔ پتا نہیں مجھے موت کیوں نہیں آتی اور سب تو مر گئے آسانی سے۔"

میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "بیٹھ جا...... میں بات کرنے آیا ہوں تجھ سے۔"

وہ بیڈ پر پاؤں لٹکا کے بیٹھ گیا۔ "کیا رہ گیا ہے اب بات کرنے کو...... اور کون ہے مجھ سے بات کرنے والا...... سب چھوڑ گئے مجھے...... ابا جی، بھائی اکبر، بھابی شاہینہ...... وہ جو میری نئی نئی بیوی تھی...... روز بینہ سلطانی، میرے تایا اور تائی، ریشم اور نو...... حویلی خالی ہو گئی۔ اجڑ گئی، کل ماں بھی دھمکی دے رہی تھی، دعا مانگ رہی تھی کہ اللہ مجھے اٹھا لے۔"

میں نے نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "تو اکیلا نہیں ہے انور۔"

"میں اکیلا ہوں۔" وہ چلایا۔ "کوئی نہیں ہے میرا...... سب کو گنوا دیا میں نے۔ میرا کچھ نہیں ہے۔ ان دیواروں کے سوا...... اور اس مال کے سوا جو ہم نے...... میرے آباؤ اجداد نے لوگوں کا خون چوس کے اکٹھا کیا۔ اس زمین کے سوا جو ہمیں گوروں نے غداری کے انعام میں دی۔ بس دو گز زمین ملے گی مجھے بھی بالآخر...... ماں سے کہو جلدی مر جائے۔"

میں نے بڑے دکھ سے کہا۔ "کیوں کرتا ہے ایسی باتیں انور! سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔ "ہاں، سب ٹھیک کر لیا ہے میں نے جو غلط تھا۔ میں نے سب زمین تقسیم کر دی ہے۔"

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ "زمین تقسیم کر دی ہے...... کس میں؟"

"انہی میں...... جو ہل چلاتے تھے۔ فصل بوتے تھے اور کاٹتے تھے۔ پٹواری میرا حکم نہیں مانتا تھا۔ میں نے کہا کہ غلام زادے جو میں کہہ رہا ہوں وہی کر۔ ورنہ میں تجھے

تیرے خاندان سمیت زمین میں زندہ گاڑ دوں گا۔ وہ ڈر گیا اور اس نے ویسا ہی کیا جیسا میں نے اس سے کہا۔ ساری زمین اللہ کی ہے۔"

میں نے انور پر نگاہ رکھی اور باہر کھڑے استاد کو اندر بلالیا۔ "تم دیکھو اسے...... یہ باہر نہ جانے پائے۔ میں ماں جی سے مل کے آتا ہوں۔"

استاد نے سر ہلایا اور دروازے کا راستہ روک کے کھڑا ہوگیا۔ میں باہر نکل کے بڑی چودھرائن کے کمرے میں گیا۔ وہ سر تا پا سفید لباس میں جانماز پر تسبیح لیے بیٹھی تھیں۔ "تو...... ؟ تو کہاں سے آ گیا سلیم؟ اور کیا کرنے آیا ہے اب یہاں؟"

میں نے کہا۔ "مجھے بہت دکھ ہوا ابھی انور کی حالت دیکھ کے۔" اور ان کے سامنے بیٹھ گیا۔

"پتا نہیں میں کیوں زندہ ہوں یہ سب دیکھنے کے لیے؟" ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ "سب چلے گئے۔ سب چھوڑ گئے۔ سب مر گئے۔ کچھ نہیں بچا۔ معلوم نہیں کس گناہ کی سزا دی ہے مجھے خدا نے۔ سوچا تھا اکبر کے بچے ہوں گے۔ پھر انور کے...... یہ گھر ان کی ہنسی، چیخ پکار، شرارتوں اور معصوم باتوں سے بھر جائے گا۔ وہ ہمیں دادا، دادی پکارتے ہمارے پیچھے پھریں گے اور ہم انہیں گود میں اٹھائیں گے۔ روتے جھگڑتے بچوں کو...... وہ باغ میں کھیلیں گے۔ میں خدا سے دعا مانگوں گی کہ وہ بڑے ہوں۔ میں ان کی شادیاں بھی دیکھوں، پھر ان کے بچے...... خدا کو یہ بات اچھی نہیں لگی شاید...... سب کچھ چھین لیا۔ اکیلا چھوڑ دیا مجھے اور اس بد بودار گھر میں۔"

میں نے کہا۔ "دیکھیے اب میں آگیا ہوں۔"

"کیوں؟ اب کیوں آیا ہے۔ جب مرحوم چودھری صاحب نے روکا تھا تو بھاگ گیا تھا۔ ہم نے اپنا لیا تھا تجھے...... مگر تو نے ہمیں نہیں اپنایا...... بڑے ہم بنتے ہیں کہ کسی کو عزت نہیں دیتے...... جس کو عزت دی، بڑی جیسی...... اس نے ہمیں چھوڑ دیا۔"

میں نے کہا۔ "آپ دیکھیں گی سب ویسا ہی ہوگا۔"

"اب خاک ہوگا۔ ساری زمین اس نے بانٹ دی۔ فقیر ہوگیا ہے...... جوگی بن گیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "آپ تھوڑا سا انتظار کریں۔ انور بھی ٹھیک ہو جائے گا۔ میں دیکھتا ہوں کہ زمین کا ٹرانسفر رک جائے۔ ورنہ حویلی تو ہے اور آپ کو زمین سے کیا۔ انور شادی کرے گا۔ اس کے بچے ہوں گے۔"

"بکواس مت کر...... چلا جا یہاں سے...... پاگل بنانے آیا ہے۔ کس سے شادی کرے گا وہ؟"

"ریشم سے...... ریشم آگئی ہے۔ مجھے معلوم ہے اس کی حالت کو وہی سنبھال سکتی ہے۔"

"ریشم؟" وہ چونک کے بولیں۔ "تو جھوٹ بول رہا ہے۔"

"یہ سچ ہے۔ انور اسے خود لائے گا۔ آپ خود اس کا سہرا سجائیں گی۔ ان کے بچوں کو کھلائیں گی۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ حوصلہ رکھیں۔ انور کو آپ کی ضرورت ہے۔"

میں لوٹ کے انور کے پاس آیا تو اس نے بدلے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ "ملک! تجھے معلوم ہے ریشم کہاں ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "نہیں، لیکن اسے تلاش کیا جا سکتا ہے۔"

وہ جیسے اپنے آپ سے بولا۔ "بہت کوشش کی میں نے...... اخبار میں اشتہار بھی دیا۔"

میں نے کہا۔ "پھر؟"

"پھر کیا...... وہ نہیں ملی۔ تمہارا یہ دوست کہتا ہے کہ اس لڑکی کو وہ کہیں دیکھ چکا ہے۔" اس نے پرانا اخبار میری نظر کے سامنے لہرا دیا۔

میں نے اس سے اخبار لے لیا اور یوں غور سے دیکھا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ "یہ کسی تو اسی کی تصویر ہے۔"

"یہ ریشم ہے۔" اس نے اخبار مجھ سے چھین لیا۔ "میں نے بنائی ہے اس کی تصویر۔"

یہ میرے لیے بھی انکشاف تھا۔ "تم نے؟ مصوری بھی کرتے ہو تم؟"

"آؤ میرے ساتھ...... میں تم کو دکھاؤں۔" اس نے ایک دم دروازے کا رخ کیا۔

میں اور استاد اس کے پیچھے گئے۔ اس نے ایک کمرا کھولا اور لائٹ جلائی۔

میں چونک پڑا اور دیکھا کہ کمرے میں ہر طرف ریشم کی ایک درجن سے زائد تصاویر لگی ہوئی تھیں۔ یہ سب ریشم کے جیتے جاگتے عکس تھے۔ ہر رنگ میں اور ہر انداز میں...... اس کا مبتسم چہرہ...... حیا سے گلنار چہرہ۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی اداسی والا چہرہ۔ ریشم دروازے کی دہلیز کے فریم میں...... ریشم درخت کے نیچے سوچ میں گم...... ریشم دریچے سے جھانکتی ہوئی...... اس کا چہرہ زلفوں کے ہالے میں چاندنی کی طرح روشن...... مصوری کی مجھے کوئی سدھ بدھ نہ تھی

لیکن مجھے ان تصویروں میں جذبات کے سارے رنگ نظر آئے جن کو انور نے خاصی مہارت سے کینوس پر اتارا تھا۔ ہر انداز حسن میں وہ ریشم ہی تھی۔ درمیان میں ایک ایزل پر اس کی ادھوری تصویر چڑھی ہوئی تھی جو نامکمل تھی۔ ہر طرف رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ برش پڑے تھے۔ کمرے کا باقی ساز و سامان پس منظر میں چلا گیا تھا۔

میں نے کہا۔ ”تم تو بڑے باکمال مصور ہو...... کبھی بتایا نہیں۔“

”سیکھے ہیں دو رخوں کے لیے ہم مصوری...... اب وہ نہیں تو اس کا تصور ہے۔ خیال میں وہ سامنے آجاتی ہے تو میں برش اٹھا لیتا ہوں۔“

”جب وہ تمہارے پاس تھی تو تم نے قدر نہ کی۔“

”ہاں، میں اس کا مجرم اور گنہگار ہوں۔ بس وہ ایک بار آجائے اور مجھے معاف کر دے۔“

”فرض کرو وہ آجائے، پھر کیا ہوگا؟“

”وہ سب خواب جو اس نے میرے ساتھ دیکھے تھے، سچ ہو جائیں گے...... مگر......“ وہ چپ ہو گیا۔

”تم اتنے ہی ریشم کی محبت میں دیوانے ہو تو اس تصویر کے ساتھ اپنا نام کیوں نہیں دیا؟“

”اگر وہ دیکھ لیتی تو جان لیتی کہ یہ میں ہوں...... مگر اس نے اخبار کہاں دیکھا ہوگا؟“

میں نے کہا۔ ”بفرض محال...... وہ دیکھتی تو اپنی تصویر کو کسی اور کی بھی سمجھ سکتی تھی؟“

وہ ہنسا۔ ”اس جیسی لڑکی اور کہاں؟“

”نام اس لیے نہیں دیا تم نے...... کہ تمہارا غرور نہ ٹوٹے...... ایک جواگر وار کا غرور۔“

”نہیں۔“ وہ چلایا۔ ”ایسا نہیں ہے۔ میں نے سوچا کہ اس کی رسوائی نہ ہو۔ وہ آجاتی تو میں اس کے قدموں میں سر رکھ کے اپنے گناہ کی معافی طلب کرتا۔“

میں نے اس کے کندھے پر دوستانہ انداز میں ہاتھ رکھا۔ ”مجھے دیکھو ابھی تک مایوس نہیں ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ نورین ایک دن ضرور ملے گی۔ مگر وہ خود تو نہیں آئے گی نا مجھے تلاش کرنی۔ یہ کام تو مجھے ہی کرنا ہے۔ ریشم بھی مل جائے گی۔“

”ریشم مل جائے گی؟“ وہ بے خیالی میں بولا۔

”ہاں، ضرور ملے گی۔ میرا دل کہتا ہے۔ ہم اسے تلاش کرلیں گے۔ سب مجھ سے کہتے تھے کہ نورین زرب کے مر گئی مگر میں نے کسی کی بات نہیں سنی۔ تم اتنی جلدی مایوس کیوں ہوتے ہو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ ہم مل کے اسے تلاش کریں گے اور وہ ملے گی ضرور ملے گی لیکن تم خود کو تو سنبھالو پہلے...... یہ میرے دوست ہیں، ملک غلام محمد...... ان کے بڑے تعلقات ہیں پولیس میں بھی...... پولیس کے لیے سراغ لگانا مشکل نہیں ہوگا۔“

اس نے استاد کی طرف دیکھا۔ ”ملک صاحب! ریشم کا پتا چلا سکتے ہو تم؟“

انور کو کسی صورت دیوانہ قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ بس اس کے ذہن پر پے در پے ہونے والے حادثات کا اثر تھا اور کچھ احساس جرم کا جو سب کچھ پانے کی خواہش میں سب گنوا بیٹھنے کا ردعمل تھا۔ اب مجھے یقین ہو چلا تھا کہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا صرف ریشم ثابت ہو سکتی تھی۔

استاد نے اشارے سے مجھے باہر بلایا۔ ”میرا خیال ہے کہ تو انور کے پاس رک۔“

”کیوں، تم کہاں جا رہے ہو؟“

”مجھے واپس جا کے ریشم سے بات کرنی ہے۔ اس کے پاس تو ٹھہر...... انور کو تیری ضرورت ہے۔“ وہ بولا۔

”ریشم مان جائے گی۔“ میں نے یقین سے کہا۔

”ہاں، لیکن اسے یقین آجائے گا جیسے تو اٹھ کے آگیا۔ وہ مان جائے تو پھر کلثوم سب کر لے گی۔“ وہ مسکرایا۔

”کلثوم...... وہ بات کرے گی مگر تجھے جلدی کیوں ہے؟“

”اب لڑکی والوں کی طرف سے اور کون ہے۔ منگنی اور شادی کی رسمیں اور پھر رخصتی...... عورتوں کو شغل چاہیے...... اور پھر تو ہے ما لڑکے کی ماں۔“ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا لیکن اپنا جانا شام تک موخر کر دیا۔

وقتی طور پر میرے سامنے ایک اور چیلنج آگیا تھا۔ اگر انور کو یقین آجائے کہ ریشم مل جائے گی اور اسے قبول بھی کر لے گی تو وہ پہلے جیسا نارمل ہو جائے گا۔ میں نے سارا دن مغز کھپایا اور ایک پوائنٹ پر اس سے اتفاق رائے حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ میں نے کہا کہ اگر تلاش ہے یا اس اشتہار کے بعد ریشم مل تو کیا اس انور کو قبول کر لے گی جو ایک نیم دیوانہ مجذوب صفت بے ہنگم آدمی ہے۔ اس کے ذہن میں تو انور کا کچھ اور ہی تصور ہوگا۔ انور کو اسے واپس بلانے کی اپیل شائع کرانے کے بعد خود کو ریشم کے استقبال کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ میری بات اثر کر گئی اور انور نے اپنی وضع قطع بدل لی۔ یہ بالکل بچوں جیسا رویہ تھا۔ وہ اڑ

جاتا تو میری ہر دلیل رائگاں جاتی۔ بس دماغ میں اتر گئی میری بات تو شام تک درجنوں کے بجائے انسان کا بچہ بن گیا۔

میں نے ماں جی کو بھی حوصلہ دیا کہ آزمائش کا سخت زمانہ گزر گیا اور اب انشاءاللہ اچھے دن آئیں گے۔ انور کی ظاہری حالت میں رونما ہونے والی تبدیلی نے ان کو قائل کیا کہ حالات کو ٹھیک کرنے کی میں جو کوشش کر رہا ہوں وہ موثر ثابت ہو رہی ہے۔ خدا کے بعد ان کا بھروسا مجھ پر تھا۔ انہوں نے آنسوؤں اور مسکراہٹوں کے ساتھ مجھے دل سے نکلنے والی دعائیں دیں جن کی مجھے بھی بڑی ضرورت تھی اور زندگی میں پہلے کبھی کسی نے مجھے ایسی دعاؤں کی بنا نہیں دی تھی۔ میرے کہنے پر انور نے پٹواری کو طلب کیا۔

پٹواری ایک جہاندیدہ سفید ریش لیکن تجربہ کار اور عیار شخص تھا۔ ”تم انتقالِ اراضی کی فائل لائے ہو اپنے ساتھ۔“ انور کے بجائے میں نے سوال کیا۔

اس نے ناگواری سے میری طرف اور پھر انور کو دیکھا۔ ”جی نہیں۔“

”لیکن انور صاحب نے تو اس کا حکم دیا تھا۔“

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا۔ ”آپ ٹھیک کہتے ہو۔ زندگی بھر ہم نے ان کا نمک کھایا ہے۔ حکم مانا ہے۔ کبھی حکم عدولی کا نہیں سوچا۔ لیکن اس بار......“ اس نے کاغذات کا ایک پلندا میرے سامنے رکھ دیا۔ ”اس بار ایسا نہیں ہوا۔“

انور نے فائل دیکھ کر ایک طرف رکھ دی۔

”کیوں؟“

”آپ جانتے ہیں حضور...... سب جانتے ہیں۔ ہم نے زمینوں کے ریکارڈ میں وہی لکھا جو آپ نے چاہا۔ آپ سے پہلے آپ کے بڑوں نے کہا۔ کسی کی ایک انچ زمین پر کسی کا قبضہ نہیں ہو سکتا جب تک پٹواری نہ چاہے۔ اور ایک ایک انچ کی قیمت کیا ہوتی ہے آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ آپ کی ساری زمین انہیں مل جاتی جو اسے کاشت کرتے آئے تھے، جو غلام تھے وہ آقا ہو جاتے اور میں ان سے قسمت کی اس لاٹری کی فیس وصول کر لیتا۔“

”پھر تم نے ایسا کیوں نہیں کیا آخر؟“

وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ ”کیونکہ...... کیونکہ میں نے محسوس کیا کہ یہ حکم جاری کرتے وقت آپ اپنے حواس میں نہیں تھے۔ ہم نے آپ کا اور اس سے پہلے آپ کے بزرگوں کا نمک کھایا تھا۔ یہ نمک حرامی ہوتی۔ شراب کا نشہ ہو یا دیوانگی کا دورہ...... انسان کا دماغ جو فیصلہ کرتا ہے جو حکم دیتا ہے اس پر عمل نہیں کرنا چاہیے۔ یہی سیکھا ہے ہم نے بڑے چودھری صاحب اور اس سے پہلے آپ کے دادا سے...... ان سب سے جو وفاداری کے ایک رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔“

”یعنی تم نے زمین کسی کو نہیں دی۔ ابھی تک انور ہی اس کا مالک ہے؟“

پٹواری نے کہا۔ ”آپ دیکھ سکتے ہیں۔ میں نے بڑی بیگم صاحب کو بتایا کہ چھوٹے چودھری صاحب نے یہ حکم دیا ہے۔ اب میں کیا کروں۔ انہوں نے کہا کہ جو تمہاری عقل کہے اور ضمیر کا فیصلہ ہو وہ کرو۔“

”بڑی چودھرائن نے روک دیا تھا تمہیں...... یہی کہہ رہے ہو تم؟“ انور بولا۔

پٹواری نے انکار میں سر ہلایا۔ ”میں نے کوئی غلطی کی؟“

انور نے فائل اسے تھما دی۔ ”نہیں، نیک نیتی شامل ہو تو وہ غلطی نہیں ہوتی۔ لیکن اب میں بتا کر ہوش و حواس میں تمہیں حکم دے رہا ہوں۔ جو میں نے کہا تھا اس پر عمل کرو۔“

”جی...... ؟“ وہ کچھ پریشان ہوا۔

”جی۔“ انور نے کہا۔ ”اب تم جا سکتے ہو۔“

پٹواری نے میری طرف اور پھر استاد کی طرف دیکھا۔ ہم خاموش رہے۔ پٹواری نے بے دلی سے فائل بغل میں دبائی اور سلام کر کے نکل گیا۔ میں نے کہا۔ ”انور! تجھے یقین ہے کہ تو نے ٹھیک کیا؟“

”ہاں، غلط وہ تھا جو میں نے درمیان میں کیا۔“ وہ بولا۔

”تو نے اپنے لیے کچھ نہیں رکھا؟ ماں جی ناراض ہوں گی۔“

”انہیں میں منا لوں گا۔ اب بھی بہت کچھ ہے ہمارے پاس...... نقد بہت ہے۔ ایک باغ اور یہ حویلی ہے۔ بس ایک چیز نہیں۔“

”وہ کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”صدیوں کی حاکمیت...... تو حاکمیت صرف اللہ کے لیے ہے۔ اب میں اور میرے مزارعے...... مزارعے بھی کہیں کہلانے والے جن کی نسلوں کے خون میں غلامی رچ بس گئی تھی۔ اب سب برابر ہیں۔ زندگی ان کی بدلی ہے میری نہیں۔“

میں نے ایک طویل خاموشی کے بعد کہا۔ ”اچھا مجھی

تیری مرضی۔"

"اس سے میری روح کو بڑا سکون ملا ہے ملک۔ میں بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا ہوں خود کو..... جب میں آیا تھا ولایت سے اور میں نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا تو یہ میرا جرم بن گیا تھا۔ ولی عہد میں تھا۔ مجھے اس اعزاز سے محروم کر کے قید میں ڈال دیا گیا تھا۔ تو سب جانتا ہے۔ اس کے بعد جو میں نے کیا، سب مجھ سے زمین نے کرایا۔ زمین کی محبت آدمی کو شیطان بنا سکتی ہے ملک۔"

میں اس سے کیسے اختلاف کرتا اور کیوں کرتا۔ جو اس نے کہا وہ اس کے اندر کی آواز تھی جو دب گئی تھی۔ یہ میرے لیے بڑے اطمینان کی بات تھی کیونکہ یہ انقلاب یا کایا کلپ ٹھیک خبر تھی کہ صبح کا بھولا شام کو لوٹ آیا ہے۔ اس سے انور کا اعتبار قائم ہو گیا تھا کہ اب اس کے اندر کا وڈیرا، جاگیردار جو کسی بدروح کی طرح اس پر غالب تھا باقی نہیں رہا اور انسان جیت گیا ہے۔ اب ریشم سے اس کی محبت محفوظ ہو گئی تھی۔ اس میں کہیں ہوس، منافقت اور دوغلاپن نہیں رہا تھا۔ آج ریشم کو وہ صرف ریشم سے محبت کی وجہ سے حاصل کرنا چاہتا تھا اور اس خدشے کو ذہن سے خارج کیا جا سکتا تھا کہ کل کو وہ پھر بدل گیا تو کیا ہوگا۔

استاد نے جاتے جاتے کہا۔ "میں کل آؤں گا، ریشم سے بات کرنے کے بعد۔"

"مجھے یقین ہے کہ تم اور بھابی یہ کام بہتر طور پر کر سکتے ہو۔"

اس رات جیسے حویلی میں زندگی لوٹ آئی۔ انور نے باڈی گارڈ سب کو طلب کیا اور انہیں چوکس کر دیا۔ وہ سب الرٹ ہو گئے۔ کچھ میری وجہ سے جس نے صورت حال کو خراب سے خراب تر ہونے سے پہلے سنبھال لیا تھا۔ مگر زیادہ انور کی وجہ سے..... رات کو ہم نے کھانا ماں جی کے پاس بیٹھ کر کھایا۔

میں نے کہا۔ "انور نے سب زمین تقسیم کر دی ہے۔"

"میں نے پٹواری کو روک دیا تھا۔" وہ بولیں۔

"پٹواری نے بتایا تھا۔ ابھی تک اس نے کارروائی شروع بھی نہیں کی تھی مگر آج انور نے اسے پھر کہا کہ جیسا کہا گیا ہے کرے۔" میں نے بتایا۔

انہوں نے ایک گہری سانس لی۔ "چلو اچھا کیا۔ بڑی خرابی ہے زمین کی محبت بھی۔ ساری عمر بھگتا ہے میں نے اور دیکھا ہے۔"

"انور تعلیم یافتہ ہے گزارہ کر لے گا۔"

وہ مسکرائیں۔ "بیٹا! گزارہ تو تعلیم کے بغیر بھی ہو جاتا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب بھی ہم محتاج نہیں۔ میں نے تو زمین کی محبت میں سب کچھ لٹتا دیکھا ہے۔ اس گاؤں میں ہمارے نوکر چاکر..... مزارع اور دوسرے لوگ ہیں۔ باپ کے گھر میں ساتھ رہتے ہیں۔ کوئی بٹوارے کی بات نہیں کرتا۔ ان کے کیا گھر ہیں۔ ہمارے نوکروں کے کوارٹر جیسے۔ کچے کوٹھے..... سب مل کے رہتے ہیں۔ یہاں اللہ بخشے چوہدری صاحب کو..... وہ نہیں چاہتے تھے کہ باپ کی زمین تقسیم ہو دونوں بھائیوں میں..... لیکن وہ نہیں مانا جو چور بن گیا تھا۔ اب بتاؤ کون ہے اس کا وارث..... ایک لڑکا تھا جو ایسا گیا کہ لوٹ کے نہیں آیا۔ معلوم نہیں زندہ ہے کہ مر گیا۔ بڑی بیٹی بیوہ ہو گئی اور ماری گئی۔ چھوٹی باپ کے منہ پر کالک مل کے نکل گئی۔ کوئی نہیں بچا۔ یہ گھر بھی تباہ ہو جاتا اللہ نے تجھے بھیج دیا۔"

میں چونکا۔ "ایسا نہ کہیں۔"

"کیوں نہ کہوں۔ ایک دن میں تو نے مجھے میرا بیٹا واپس دلا دیا۔"

اس رات انور وہی باتیں کرتا رہا جو دونوں گھروں کی تباہی کا سبب بنی تھیں۔ "یہ سب کچھ بہت دیر سے ہوا ملک..... پہلے بھائی نے مجھے زنجیروں سے باندھ کے قید میں ڈالا۔ زمین کی وجہ سے۔ پھر یہی میں نے اس کے ساتھ کیا۔ اس زمین نے ہمیں لالچی، ہوس پرست، ظالم اور کرپٹ بنایا..... آج میں پُرسکون ہوں۔"

میں نے کہا۔ "انور! ایک بات پوچھوں۔"

وہ ہنسا۔ "اجازت لے گا مجھ سے؟"

"فرض کر..... یہ ممکن بالکل نہیں ہے۔ مجھے نور دین کے ملنے کا اتنا یقین نہیں مگر ریشم زندہ ہے۔ وہ ملے گی اور ہو سکتا ہے واپس آ جائے..... تو نے کیا سوچا ہے؟"

"وہ آ جائے اور مجھے معاف بھی کر دے۔ پھر ہم شادی کر لیں گے۔ یہاں سے چلے جائیں گے۔"

"کہاں چلے جاؤ گے؟"

"کہیں بھی، دنیا بہت بڑی ہے اور بڑی خوب صورت ہے۔ میں نے سب گھوم پھر کے دیکھا ہے۔ گاؤں تو ایک کنواں ہے جس میں ہم سب مینڈک تھے۔ پیرس مجھے سب سے اچھا لگا۔ پُرسکون، پُرامن، خوب صورت۔"

میں نے کہا۔ "تو سارے رشتے ختم کر کے جائے گا؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "بندہ گاؤں سے شہر جائے تو

WWW.PAKSOCIETY.COM

کبار شتے توڑ کے جاتا ہے۔ مگر یہ تو خواب ہے ابھی۔

''جیر سائیں کی جاگیر لاوارث ہے ابھی۔ لیکن ایک وارث زندہ ہے۔''

''تو روز بینہ کی بات کر رہا ہے؟'' انور بولا۔ ''وہ تو چلی گئی سب چھوڑ چھاڑ کے مرار کے ساتھ۔''

''میں نے کچھ اور سنا ہے۔ باپ نے بیٹے کو چھپا رکھا ہے۔''

''یہ میں نے بھی سنا ہے۔''

''ہم معلوم کر سکتے ہیں۔ تو مل سکتا ہے اس سے۔''

''مگر مجھے کیا ضرورت ہے؟'' وہ بولا۔ ''چل سو جا...... مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اب خطرے کی بات نہیں رہی۔ روز بینہ آ کے اپنی جاگیر کو سنبھال سکتی ہے۔ وہ اکیلی وارث ہے اور اب اس کے ساتھ شوہر بھی ہے اور ماموں سسر بھی۔''

انور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ''شاید روز بینہ کا نام سننا بھی اس کو گوارا نہیں تھا۔ بڑے قانونی چکروں سے روز بینہ کو انور کی بیوی ثابت کیا گیا تھا۔ گزشتہ تاریخ میں نکاح نامہ ایک مولوی سے گن پوائنٹ پر بنوایا گیا تھا اور پھر اسے بھی مار دیا گیا تھا۔ پہلے نکاح نامہ پُراسرار طور پر غائب ہوا تھا پھر روز بینہ نے صاف انکار کر دیا تھا کہ اس کا انور سے کوئی نکاح نہیں ہوا۔ یہ سب آج انور کے لیے باعثِ شرمندگی اور آزار تھا۔

میں نے بھی اس موضوع پر مزید بات نہیں کی۔ دوسرے دن ناشتا کرتے ہوئے انور نے سوال کیا۔ ''یہ جو تیرے ساتھ آیا تھا جسے تو استاد کہہ رہا تھا۔ کون ہے؟''

میں نے کہا۔ ''ایک دوست۔''

''دوست کو استاد کون کہتا ہے؟'' وہ بولا۔

''وہ میرا محسن بھی ہے۔ اسی نے مجھے جیل سے نکالا تھا ورنہ میں لٹک جاتا۔''

''یعنی وہ بھی تیری طرح مفرور ہے۔ ابھی تک پکڑا نہیں گیا؟''

''ہاں، کچھ ایسا ہی ہے۔ قسمت نے ساتھ دیا ورنہ کچھ نہ ہوتا۔ ہمارے ڈھانچے کسی نامعلوم قبر میں پڑے ہوتے۔ اب تو بات بھی اتنی پرانی ہو گئی ہے کسی کو یاد بھی نہیں۔ اب وہ ملک غلام محمد ہے۔''

انور نے اپنی کرید جاری رکھی۔ ''درمیان میں اس سے رابطہ تھا تیرا؟''

نہیں، ابھی کچھ دن پہلے اتفاقاً ملاقات ہو گئی۔''

میں نے کہا۔ ''تو کیوں پوچھ رہا ہے؟''

''ایسے ہی۔ وہ تیرے ساتھ یہاں کیوں آیا تھا؟''

میں نے کہا۔ ''آج کل میں اسی کے گھر میں ہوں۔ اس نے کہا ہے کہ نوورین کی تلاش میں میری مدد کرے گا۔''

''اس نے ریشم کو لانے کی بات بھی کی تھی۔ اس نے کیا گمشدہ افراد کی بازیابی کا ٹھیکا لے رکھا ہے؟''

میں نے چڑ کے کہا۔ ''اگر تو نہیں چاہتا تو اس سے کہہ دینا۔''

''یہ بات نہیں۔ بس مجھے یہ بات کچھ پُراسراری لگی۔ کیا وہ خفیہ پولیس میں ہے یا مخبر ہے؟''

''ہو گی ایسی ہی کوئی بات۔ میں نے پوچھا نہیں۔ لیکن آدمی اثر و رسوخ والا ہے...... اور......''

میری بات مکمل ہونے سے پہلے دو گاڑیاں اندر آ کے ٹھہر گئیں۔ ایک وہی جیپ تھی جس میں گزشتہ روز میں استاد کے ساتھ آیا تھا۔ دوسری کار تھی جس کو ڈرائیور چلا کے لا یا تھا۔ اس میں سے کلثوم اتری تو میں ان کے الگ الگ آنے کا مقصد سمجھ گیا۔ کلثوم بڑی دلچسپی سے حویلی کا جائزہ لے رہی تھی۔

''یہ عورت کون ہے؟'' انور میرے ساتھ ہی اٹھا۔

میں نے کہا۔ ''استاد کی بیوی...... اسے میں بھابی کہتا ہوں۔''

استقبال کے لیے آگے جاتے ہوئے انور زیرِ لب بولا۔ ''یہاں کیوں آ گئی ہے؟''

میں نے کہا۔ ''مجھے نہیں معلوم...... اسی سے پوچھ لینا۔''

میں نے رسمی انداز میں تعارف کرایا حالانکہ وہ سب ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے تھے پھر ہم سب اس کمرے میں بیٹھ گئے جو کبھی میرا تھا۔ کلثوم آج تیاری سے نکلی تھی تو بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔

''کلثوم جانتی ہے ریشم کے بارے میں۔'' استاد نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

انور یوں چونکا جیسے استاد نے ہوائی فائر کر دیا ہو۔ اس کی نظر سوالیہ انداز میں کلثوم کی طرف گھوم گئی۔ ''کیسے جانتی ہیں۔ وہ کہاں ہے...... ساتھ کیوں نہیں آئی؟''

استاد مسکرایا۔ ''تم کو سارے سوالوں کے جواب کلثوم دے گی۔''

''لیکن پہلے میں ماں جی کو سلام کر لوں۔'' اس نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

کہا۔

انور مزید حیران ہوا۔ ''آپ کو...... ملک سلیم نے بتایا ہوگا۔ لیکن اس نے آج سے پہلے مجھے نہ ملک صاحب کے بارے میں کچھ بتایا تھا نہ آپ کے بارے میں۔''

کلثوم نے سوال کو گول کردیا اور کھڑی ہوگئی۔ ''مجھے ماں جی کے پاس لے چلیں۔''

انور کو اگر دال میں کالا نظر آرہا تھا تو غلط نہ تھا۔ وہ ذہین آدمی تھا اور سمجھ رہا تھا کہ میرا آنا اور پھر استاد کے ساتھ کلثوم کا آنا بے سبب نہیں تھا اور ہم دانستہ اس سے حقائق کو چھپا رہے تھے۔ وہ کلثوم کو ماں جی کے کمرے میں لے گیا۔

استاد نے کہا۔ ''میں نے کلثوم پر سب چھوڑ دیا ہے۔ وہ ریشم کے معاملے میں انور سے معاملات طے کرلے گی۔''

''کیسے معاملات؟ وہ بتا دے گی کہ ریشم کہاں ہے؟''

''اسے اتنا بے وقوف مت سمجھو۔ اس نے مجھے نکیل ڈال رکھی ہے۔ میں نے اسے ساری چویشن سمجھا دی ہے۔ وہ ہر شرط منوالے گی ریشم کا پتا پھر بھی نہیں بتائے گی۔''

انور پھر ہمارے سامنے آبیٹھا۔ ''اب آپ بتا سکتے ہیں۔''

استاد نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''بتا سکتا ہوں مگر مجھے کلثوم کی طرف سے اجازت نہیں۔''

انور نے خفگی سے کہا۔ ''آپ اتنے جورو کے غلام نظر تو نہیں آتے۔''

''یہ نظر کا دھوکا ہے چوہدری صاحب۔ ایک محفل سماع کسی مشہور پیر کی درگاہ پر ہو رہی تھی۔ میں آگے بیٹھا تھا۔ پیر کا نام میں نہیں لے سکتا۔ آگے لمبی لمبی داڑھیوں والے کچھ بزرگ بیٹھے جھوم رہے تھے۔ قوال اچھے تھے اور محفل پر جادو کرنا جانتے تھے۔ مجھے بھی حال آگیا بعد میں آس پاس بیٹھے لوگوں نے بڑی عقیدت سے پوچھا۔ ''آپ کس کے مرید ہیں؟'' اس وقت باہر لنگر تقسیم ہو رہا تھا اور خاص مہمانوں کے لیے کھانا لگایا جا رہا تھا۔ میں نے رازداری سے ایک کے کان میں کہا۔ ''میں زن مرید ہوں۔'' میرا خیال تھا کہ سوال کرنے والے صاحب ناراض ہوں گے مگر انہوں نے بھی آہستہ سے کہا۔ ''میں بھی...... اور یہ سب بھی۔''

انور ہنسا۔ ''اچھا لطیفہ ہے۔''

''لطیفہ نہیں، سچ ہے۔'' استاد بولا اور میری طرف دیکھا۔ ''تو چل میرے ساتھ...... ایک کام ہے۔ کلثوم ابھی رکے گی بعد میں ذرا انور کے ساتھ چلی جائے گی۔''

انور شک میں مبتلا تھا مگر اس کے سوال کرنے سے پہلے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ''ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ کھانے کے لیے نہیں رک سکتے مگر چائے تو پی کر جانا ہی پڑے گا آپ کو۔''

استاد نے بڑی صفائی سے کہا۔ ''مجھے پہلے ہی دیر ہوگئی ہے لیکن میرا وعدہ...... واپسی میں کھانا کھاؤں گا آپ کے ساتھ......'' اور انور کی طرف دیکھے بغیر چل پڑا۔ میں جیپ میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

''کیا ریشم مان گئی ہے؟'' میں نے باہر آکے پوچھا۔

اس نے مجھے حیرانی سے دیکھا۔ ''یہ کیسا سوال ہے؟ وہ محبت کرتی ہے انور سے...... پھر بھی پہلے اس نے بڑی ناراضی دکھائی۔ پھر میں نے بڑے جذباتی انداز میں خوب نمک مرچ لگا کے بتایا کہ اس کے فراق میں انور کی کیا حالت ہے۔ کچھ حقیقت تھی۔ باقی افسانہ...... میں نے کہا کہ وہ فقیر جوگی بن کے نکل جائے گا کسی دن ریشم ریشم پکارتا۔ ایک ماں رو گئی ہے وہ مرجائے گی رو رو کر...... پہلے تو اسے یقین نہ آیا کہ انور نے اپنا سب کچھ غریبوں میں تقسیم کردیا ہے۔ میں نے کہا کہ سوکھ کے کانٹا ہوگیا ہے۔ نہ نہاتا دھوتا ہے نہ کچھ کھاتا ہے۔ بس ریشم کا حال خراب ہوگیا۔ رونے لگی۔ کلثوم نے کہا کہ اب تم ہی اسے بچا سکتی ہو۔ وہ تو چل پڑتی ہمارے ساتھ مگر کلثوم نے روکا کہ ایسے نہیں۔ وہ آئے گا تمہارا ہاتھ مانگنے اور میں تم کو رخصت کروں گی چھوٹی بہن کی طرح...... لیکن پہلے اس سے کچھ باتیں منوانا ہیں۔ ایک تو یہ کہ جب زمین چھوڑ دی تو گاؤں بھی چھوڑ دے۔''

''ابھی حویلی ہے...... باغ ہے۔''

''وہ ریشم کے اس گھر میں رہے جو ملتان میں بند پڑا ہے۔ اب ان دونوں کو وہاں رہنے کی کیا ضرورت ہے جہاں ہر طرف ماضی کے آسیب ہیں۔ ایک نئی زندگی نئی جگہ شروع کریں۔ انور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ ذرائع بھی ہیں جب تک ماں کا ساتھ ہے یہاں رہیں۔ پھر کامیابی کے نئے سفر کے لیے دنیا بڑی ہے۔ لاہور، کراچی سے لندن تک۔''

میں قائل ہوگیا۔ ''یہ تم نے ٹھیک کہا۔ وہ حویلی بھی بیچ دے اور باغ بھی۔ چاہے تو کسی کو ٹھیکے پر دے جائے۔ مگر اس صدیوں پرانے یادوں کے قبرستان کو چھوڑ دے۔''

''ہم ٹھیکے دار سکندر شاہ کی طرف جا رہے ہیں۔'' وہ کچھ دیر بعد بولا۔

''اس کا مطلب ہے...... تو نے فیصلہ کرلیا ہے۔''

''میں تو بہت پہلے کرلیا۔ کمیل بھی تو مجھے چھوڑ دے تو

میری وکالت کرتا۔"

"میں؟ میری کیا حیثیت استاد..... لیکن میں بات کرنے سے نہیں ڈرتا۔"

پونے گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد میں نے خاردار تاروں کی ایک باڑھ دیکھی جو دس فٹ سے زیادہ بلند تھی اور اس کو بار خانے کی صورت میں بنایا گیا تھا۔ اسے کاٹے بغیر کسی کا اندر گھسنا تو کجا سر ڈالنا بھی مشکل تھا۔ باڑھ کی سپورٹ کے لیے ہر دس فٹ کے فاصلے پر سیمنٹ کے چوکور مضبوط پول تھے۔ ہر پول پر سرخ لائٹ تھی۔ ایک کھمبے کی لائٹ کا رخ مغرب کی طرف تھا تو دوسرے کا مشرق اور اسی طرح اگلی دو لائٹس کا شمال اور جنوب کی طرف۔ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ رات کو اس باڑھ کے دونوں طرف کتنی روشنی پھیل جاتی ہو گی۔ اس میں ناممکن تھا کہ کوئی چھپ کر قریب آسکے۔

آبادی میں داخل ہونے کا ایک ہی راستہ تھا جہاں دس فٹ اونچی سیمنٹ کی دیوار میں بھاری فولادی گیٹ نصب تھے۔ اندر اور باہر یونیفارم والے مسلح گارڈ چوکس کھڑے تھے۔ استاد نے جیپ کو موڑ کے کھڑا کر لیا۔ وہ گارڈز نے جیپ کی ایسے تلاشی لی کہ اسلحہ کیا ایک سوئی بھی ہوتی تو وہ دیکھ لیتے۔ وہ استاد گارسم کو جانتے تھے لیکن رعایت اس کے لیے بھی نہیں تھی۔ مشکل مسئلہ میرا تھا۔ گارڈ اندر گئے اور واپس نہیں آئے۔

استاد بولا۔"وہ تمہارے بارے میں سکندر کو بتا رہے ہیں گے۔ وہ کلوز سرکٹ کیمرے پر تمہاری صورت دیکھے گا تو اجازت ملے گی۔"

"جتنا بڑا آدمی ہوتا ہے اتنے ہی بڑے خطرات بھی ہوتے ہیں۔"

بند دروازہ کسی آواز کے بغیر کھل گیا۔ اس کا ایک پٹ دائیں طرف دیوار میں چلا گیا۔ دوسرا بائیں طرف۔ یہ کلیئرنس کا سگنل تھا۔ جیپ آگے بڑھی۔ یہ دو رویہ سرسبز سڑک تھی جس پر درمیانی جگہ میں پھول تھے اور سرو کے درخت تھے جو ابھی قد نکال رہے تھے۔ دائیں بائیں سڑکیں اور گلیاں تھیں جن پر دونوں جانب گھر تھے۔ ایک فرلانگ کے بعد مجھے بڑا سا چوراہا آیا جس کے چاروں طرف دائرے میں مارکیٹ تھی اور یہاں بنیادی ضرورت کی سب چیزیں بھی دستیاب تھیں۔ آگے ایک اسکول اور پھر اسپتال آیا۔ سکندر نے اس سیٹلائٹ ٹاؤن کی اچھی پلاننگ کی تھی۔

آگے جو چوراہا سا آیا اس پر سڑک ایک دائرے میں گھوم کے جاتی تھی۔ دائرہ دس فٹ بلند سیمنٹ اور کنکریٹ کی دیوار سے بنا تھا اور اس پر بھی حفاظتی نظام سخت تھا۔ یہ سکندر شاہ کا گھر تھا۔ جہاں گیٹ خودبخود کھل گیا جو کلیئرنس ہمیں پہلے گیٹ پر ملی تھی وہ کافی تھی۔

گھر کے صدر دروازے سے بائیں جانب گاڑیاں کھڑی کرنے کی جگہ تھی جہاں اس وقت بھی چار گاڑیاں موجود تھیں۔ ایک سیاہ رنگ کی نئی مرسیڈیز، ایک سفید چیروکی، ایک ڈبل کیبن ہائی لکس اور ایک چھوٹی سی مہران جو ان دیوہیکل گاڑیوں کے ساتھ اور بھی چھوٹی لگ رہی تھی۔

ہم اس کے بلند و بالا دروازے کی طرف بڑھے تھے کہ اندر سے وہ نکل آیا۔ میں نے اسے پہلے کبھی دیکھا نہیں تھا۔ وہ چھ فٹ کا صحت مند گورا چٹا اور خوش پوش آدمی تھا۔ بے داغ سفید شرٹ کریم کلر کی پتلون اور پالش سے چمکتے جوتوں میں وہ کوئی اسپورٹس مین لگتا تھا۔

اس نے مسکراتے ہوئے آگے بڑھ کر ہم دونوں کا استقبال کیا اور ہمیں اپنے ساتھ وسیع گول کمرے میں لے گیا جو اس کا ڈرائنگ روم تھا۔

استاد نے میرا تعارف کرایا تو وہ بولا۔"یار! یہ تو اپنا ہی بندہ ہے۔ گھر کا آدمی ہے۔ سناؤ، چودھری انور کا کیا حال ہے۔ سنا ہے پاگل ہو گیا ہے۔ ساری زمین مزارعوں میں بانٹ دی؟"

"جی ایسا ہی ہے۔ اگر آپ اسے پاگل پن سمجھتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے۔ اسی زمین کے لیے تو بھائی نے بھائی کا گلا کاٹا۔ گھر کے اندر فساد تھا۔ مجھے تو دکھ ہے کہ زمین کی محبت سب کو کھا گئی۔ کوئی بھی نہیں بچا۔ نہ عزت رہی نہ برکت...... اب انور کیا کرے گا؟"

"وہی جو اس کا دل چاہے گا۔"

"تم تو اس کے دستِ راست تھے۔ تمہیں معلوم ہوگا۔"

میں نے کہا۔"انور نے کچھ بتایا نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہاں نہ رہے۔"

"ہاں، ساری عمر تو اس نے باہر جھکتے گزار دی۔ نہ ماں باپ کا خیال نہ کسی رشتے کا۔ پڑھ لکھ کے کیا ملا؟"

میں نے کہا۔"یہاں رہ کے کسی کو کیا ملا؟"

"تم اس فراڈ پیر کی بات کر رہے ہو۔ اسے تو دنیا میں ہی اپنے اعمال کی سزا مل گئی۔"

"اس کی عزت کرنے والے مرید اسے پوجتے ہیں۔"

وہ ہنسا۔ "بے وقوف لوگ ہی زیادہ جیتے ہیں دنیا میں ملک حلیم! انہیں وہ لوٹتا رہا۔ آخر کس لیے؟ کیا مقصد تھا اس کا سوائے مال بٹورنے کے۔ کتنا مال ملا اسے؟ اس سے کہیں زیادہ بدنامی اس کے حصے میں آئی۔ تم تو سب جانتے ہو کہ بڑا دادا مار کیسا تھا۔ پھر بیٹی نے کیا کیا۔ ایک بیٹا پہلے ہی باپ کی شکل پر لعنت بھیج کر چلا گیا تھا۔ مجھے تو پل پل کی خبر ہے۔ انور نے ایک بیٹی کو ٹھکرایا...... دوسرے نے شادی کی تو وہ قتل ہو گیا۔"

میں نے بیزارگی سے پوچھا۔ "آپ کو ضرور معلوم ہوگا کہ اسے کس نے قتل کیا تھا۔"

"انہی میں سے کسی نے...... جن کی بہوؤں اور بیٹیوں کو اس نے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا۔ مجھے تو پتا چلا تھا کہ اس نے تمہیں بھی پھانسا تھا۔ اس بدنصیب بیٹی کے لیے...... اور لالچ دیا تھا جانشینی کا...... اور خود اسے اغوا کر کے لے گیا تھا، انور جس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ کیا نام تھا اس غریب مزارع کی بیٹی کا...... ریشم۔"

میں نے کہا۔ "آپ سب جانتے ہیں۔"

"مگر جتنا تم جانتے ہو اس سے زیادہ نہیں۔" وہ بے دلی سے بولا۔

میں نے کہا۔ "شاہ جی! آپ کا بہت قریبی رشتہ تھا۔ پیر صاحب تو آپ کے بہنوئی تھے۔ آپ شاہینہ کے اور روزینہ کے ماموں تھے۔ اور میں...... میں کیا اور میری اوقات کیا۔ چند جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے مجھے آئے ہوئے۔"

اس نے ایک گہری سانس لے کر غصے کو خارج کیا اور مسکرانے لگا۔ "تم اچھے آدمی ہو۔ انور یا اس کا باپ یا پیر...... سب بے وقوف نہیں تھے جنہوں نے تم پر اتنا اعتبار کیا۔ حالانکہ تم باہر کے آدمی تھے جس کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا تھا۔"

"آپ ضرور جانتے ہوں گے۔" میں نے کہا۔

وہ مجھے گھورتا رہا۔ "میں نے معلوم کرنے کی کوشش ضرور کی تھی۔ لیکن پتا نہیں چلا کہ کون ہو تم اور کہاں سے نازل ہوئے۔ تمہارے ماضی کا کوئی سراغ نہیں ملا مجھے۔ مجھے شک ہے کہ تم وہ نہیں ہو جو نظر آتے ہو۔"

"پھر بھی میں آپ کی نظر میں اچھا آدمی ہوں۔"

وہ مسکرایا۔ "یہ تمہاری کارکردگی نے ثابت کیا۔ انور کا باپ بھی تم پر بہت اعتبار کرنے لگا تھا۔ حالانکہ وہ ذات برادری کے معاملے میں سخت متعصب تھا۔ تمہاری کوشش سے وہ مان بھی گیا۔"

"زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔"

وہ بولتا رہا۔ "انور بھی تمہارے مشورے کے بغیر ایک قدم نہیں اٹھاتا تھا۔ کوئی تو بات ہے نا کہ اس فراڈ پیر نے بیٹی کے سامنے سر جھکا رہا۔ کوئی اور ہوتا تو اسے وہ پتھر کی طرح مسل دیتا۔ لیکن وہ بھی مجبور تھا کسی کو اپنا جانشین بنانے پر۔"

میں نے کہا۔ "جانشین تو میں آج بھی بن سکتا ہوں۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں، تم نہیں بن سکتے تھے۔"

میں نے کہا۔ "آپ ملک غلام محمد سے پوچھ لیں۔"

استاد جو اب تک چپ بیٹھا ساری گفتگو سن رہا تھا، چونکا۔ "میں...... مجھے تو کچھ نہیں معلوم۔"

سکندر پر ہلکے سے نشے کا اثر تھا۔ اس نے ایک قہقہہ لگایا۔ "ہاں، تمہیں کچھ نہیں معلوم۔" وہ اٹھ کے پیچھے گلاس ٹاپ کاؤنٹر تک گیا۔ اپنے لیے شراب کا ایک جام بھرا اور پھر وہیں آ کے بیٹھ گیا۔

"ملک غلام محمد عرف گاما رستم...... بہت شریف آدمی ہے۔ یہ کچھ نہیں جانتا۔" وہ پھر ہنسا۔

میں نے ہمت کر کے سوال کیا۔ "آخر کون تھا مجھے روکنے والا...... اگر میں سجادہ نشین بن جاتا...... اپنی مرضی سے۔"

اس نے سینے پر زور سے ہاتھ مارا۔ "سکندر شاہ...... میں تمہیں ایسا نہ کرنے دیتا۔"

"آپ مجھے بھی مروا دیتے؟"

وہ مجھے دیکھتا رہا۔ "ہاں، تم کیا چیز ہو آخر...... عالیہ پہاڑ...... کہ تمہارا وجود مٹا نہیں سکتا کوئی...... بس یہ میں نے نہیں چاہا۔ پوچھو کیوں نہیں چاہا؟"

میں نے مجبوراً یہ الفاظ دہرائے۔ "کیوں نہیں چاہا؟"

اس نے گلاس خالی کر کے دھڑ سے میز پر رکھا اور ایک گہری سانس لی۔ "آپ بہت مجبور ہوتے ہیں۔ بیٹیوں کے باپ سب سے زیادہ...... پھر اکلوتے بیٹے کے باپ...... اور اکلوتی بہن کے بھائی...... میں ہر طرف سے زنجیروں میں جکڑا ہوا آدمی ہوں۔ دنیا مجھے بہت بڑا آدمی سمجھتی ہے۔ روٹھی ہے مجھ سے مگر میں کیا کروں۔ مراد کی کیسے نہ مانوں۔ ان کی ماں روز روز کے منہ بنا گئی ہے اور شاہینہ، روزینہ کی ماں...... میری اکلوتی چھوٹی بہن...... اس کے سامنے میں بے بس ہوں۔"

''میرا ان معاملات سے کیا تعلق شاہ جی؟''

''ہے...... تمہارا تعلق۔ مراد کو ساری دنیا میں ایک ہی لڑکی پسند تھی اور وہ تھی میری بہن کی بیٹی...... میں کیسے انکار کرتا۔ میں نے تو بڑی شرافت سے پیغام دیا تھا۔ ہاتھ جوڑے تھے اس کے آگے۔'' سکندر شاہ نے درمیان میں ایک بھاری بھرکم گالی فٹ کی۔ ''مگر اس وقت وہ پیر خود کو آسمانی مخلوق سمجھتا تھا۔ اس نے مجھے ذلیل کر کے انکار کر دیا۔ ایک بار نہیں دو بار نہیں...... تین بار۔''

''ہے تو یہ آپ کا خاندانی معاملہ...... مگر اس نے کیوں انکار کیا؟''

''کیونکہ...... اولاد سے زیادہ وہ زمین سے پیار کرتا تھا۔ اکبر بانو اس کے اپنے حصے۔ تم نے دیکھا انہوں نے اپنوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ بھائی نے بھائی کو قید میں ڈالا اور مار ڈالا۔ یہ ہے خون کا رشتہ؟ لیکن اس نے مجھے دھتکار دیا۔''

دو ملازم چائے کی پیالیاں لائے اور درمیان میں چھوڑ کر چلے گئے۔

''چائے پیو۔ دراصل تم اچانک کہیں چلے گئے تھے۔ ورنہ میں تمہیں بلاتا۔'' وہ کچھ دیر بعد بولا۔ ''ملک غلام محمد نے کہا کہ وہ اپنے ساتھ تمہیں بھی لائے گا تو میں بڑا حیران ہوا اور خوش بھی ہوا۔ میں نے پوچھا کہ تم اسے کیسے جانتے ہو؟''

میں نے استاد کی طرف دیکھا۔ ''اور ملک صاحب نے بتا دیا۔''

اس نے اقرار میں گردن ہلائی۔ ''اعتبار کرنا ضروری ہوتا ہے۔ آج نہیں تو کل مجھے معلوم ہو جاتا۔ پھر مجھے شکایت ہوتی کہ مجھے دھوکے میں رکھا گیا۔ فکر مت کرو، اب تم پہلے سے زیادہ محفوظ ہو۔ ان چودھریوں کو اب کون پوچھتا ہے۔ گاؤں میں بھی منہ دیکھے کی عزت تھی۔ منہ پر کوئی کچھ نہ کہے مگر ڈرتا کون تھا ان سے۔ سوائے ایک الو کے پٹھے سکندر شاہ کے...... میری بہن نے کہا کہ سکندر، وہ جو چودھریوں کی حویلی میں ملک سلیم ہے نا...... اس کا مجھے بڑا اسرار ہے۔ اس کا خیال تھا کہ تم دونوں بھائیوں میں صلح کرا دو گے۔ شاہینہ کا شوہر اسے مل جائے گا۔ زمین دونوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ نہر کے ادھر ایک بھائی...... نہر کے دوسری طرف دوسرا بھائی...... ایک بہن ادھر...... دوسری ادھر...... بہت اچھا تھا یہ فارمولا...... پھر کوئی جھگڑا نہ رہتا۔ کوئی مسئلہ ہی نہ ہوتا...... مگر......''

میں نے مجبوراً اعتراف کیا۔ ''مگر کیا؟''

''مراد آ گیا بیچ میں...... اس نے مجھے مجبور کیا۔ ذلیل کیا اس پیر کے سامنے...... بہن کا رشتہ درمیان میں نہ ہوتا تو اسے اتنی مہلت بھی نہ ملتی۔ بہن کے ساتھ اس کی بڑی بیٹی اور چھوٹی بیٹی کو تم پر بھروسا تھا۔ اور سچ مانو تو میں احسان مند ہوں تمہارا۔''

میں چونکا۔ ''احسان مند؟''

''ہاں، وزیرہ کو تم نے ہی اس کی قید سے رہائی دلائی۔ جان کا خطرہ مول لے کر...... مراد کو وزیرہ مل گئی۔ مجھے میرا اعتبار واپس مل گیا۔ صرف تمہاری مدد کی وجہ سے۔''

''میں نے تو خود کو بچایا تھا یار ریشم کو۔''

''اب کوئی خطرہ نہیں۔ کوئی فکر کی بات نہیں، کسی کے لیے...... میں نے اس شیطان کو مار دیا۔''

میں نے ہمت کر کے کہا۔ ''اور اپنی بہن کو بھی...... اس کی بیٹی کو بھی۔''

اس نے خالی گلاس دیوار پر دے مارا۔ ''بکواس...... بکواس کرتے ہو میرے سامنے...... یہ نہ ہو میں تمہیں گولی مار دوں...... اپنے محسن کو...... اور پھر پچھتاؤں...... وہ ہوس کا مارا بڈھا شیطان...... اس نے میری بہن کو قتل کرنے کا حکم جاری کر دیا تھا اور وہ مر چکی تھی پہلے ہی۔''

میں بھونچکا رہ گیا۔ ''مر چکی تھی...... کیسے اور آخر کیوں؟''

اس نے اداسی سے سر جھکا لیا۔ جب وہ بولا تو اس کی آواز میں رقت تھی۔ ''اس کا پیغام ملا تھا مجھے...... بھائی مجھے بچا لو، لیکن میں الو کا پٹھا...... خود کر پانے جان مجھے دالا...... اس بہن کو نہ بچا سکا جو میری ماں کی طرح تھی۔''

میں اس خوفناک انکشاف پر سن بیٹھا رہا۔ ''اس نے ایسا کیوں کیا آخر؟''

''یہ کیسا بے وقوفی کا سوال ہے...... کون عورت سوکن برداشت کرتی ہے۔ وہ ریشم سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ یہ تو اچھی طرح جانتے ہو تم بھی۔''

''لیکن...... ریشم بھی گئی تھی۔''

''پھر اسے ریشم کا پتا کس نے دیا؟'' وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

میں اچھل پڑا۔ ''اسے معلوم ہو گیا تھا۔''

''ہاں، وہ اس کے چلے جانے یا حال کی خبر رکھتے ہیں۔ مجھے تم پر شک تھا۔ لیکن میری بہن نے کہا کہ اسے کچھ معلوم

نہیں تھا..... تم نے سب سے جھوٹ بولا تھا کہ وہ مراد کے ساتھ چلی گئی تھی۔''

میں نے سر ہلایا۔ ''ہاں، یہی کہا تھا میں نے۔''

''مگر اس کو پتا چل گیا تھا اور اس نے کہا کہ اب دیکھتا ہوں تو ریشم کو کیسے بچاتی ہے۔''

''اسے شک تھا کہ پہلے ریشم کو اس کی بیوی نے فرار ہونے میں مدد دی تھی۔''

''مدد وہ کیا کرتی۔ مگر اسے معلوم تھا۔ اس نے روز بینہ کو دعا دی کہ جاؤ خدا تمہیں خوش اور آباد رکھے۔ میرا بھائی تمہارے لیے باپ کی جگہ ہے۔ اس نے شوہر کو بھی کہا تھا کہ مجھے کچھ ہوا تو میرا بھائی تمہیں بھی نہیں چھوڑے گا۔ وہ دھمکی دے چکی تھی کہ وہ دوسری شادی کرے گا تو وہ خودکشی کرلے گی۔ اب شوہر نے بتایا کہ اسے ریشم مل گئی ہے اور میری بیوی بننا اس کے مقدر میں لکھا ہے۔ کوئی تقدیر سے کیسے لڑ سکتا ہے۔ اس پر میری بہن نے پھر دھمکی دی کہ وہ اپنی جان دے دے گی اور شوہر نے کہا کہ میں خود تیرا کام تمام کرتا ہوں۔''

''تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟''

''مجھے بہن نے خود بتایا پھر مجھے اس کا بندوبست کرنا پڑا۔ وہ کمینہ بچ اسی لیے زندہ تھا کہ میں اپنی بہن کا سہاگ اجاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ میری بہن کا شوہر تھا وہ اس لیے زندگی اسے خیرات میں ملی۔ اب اس کے سوا چارہ نہ تھا لیکن مجھے دیر ہوگئی۔ وہ بیوی کو گلا گھونٹ کے ہلاک کرچکا تھا۔''

استاد اچانک بولا۔ ''ہاں، میں اسے نکال لاتا مگر وہ سو رہی تھی اور جب میں نے اسے جگانا چاہا تو پتا چلا کہ وہ مر چکی ہے۔ میں نے یہ بات شاہ جی کو بتادی۔''

''شاہ جی بھی ساتھ تھے؟''

''باہر موجود تھے پھر انہوں نے حکم دیا کہ سب تباہ کر دو، کسی کو مت چھوڑو۔''

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا جس میں واقعات کی ترتیب نے مجھے پھر قائل کردیا کہ مارنے والے سے بچانے والے کا ہاتھ زبردست نہ ہوتا تو ریشم کو کون بچاتا۔ مجھے یا اس کو معلوم تک نہ تھا کہ پیر سائیں ہمارا سراغ لگا چکے ہیں۔ شاید ریشم بروقت نکل گئی۔ جب پیر سائیں کی درگاہ پر ڈاکوؤں نے یلغار کی تو میں کہاں تھا؟ شاید انہی دنوں میں ریشم کا سراغ ملا ہوگا مگر اب وہ محفوظ تھی۔

''ایسا نہیں کہ میں بہن کے سکھ کا دشمن تھا۔ نہیں، میں تو چاہتا تھا کہ وہ میرے ساتھ کاروبار کرے۔ اپنی زمین بھی ایک نئی کالونی بنانے کے لیے میرے حوالے کردے۔''

سکندر شاہ نے کچھ دیر بعد خود ہی بولنا شروع کردیا۔ ''اور تم دیکھ لو۔ یہ کالونی جس سے تم گزر کر آئے ہو، یہ ملتان کے مضافات میں آگئی ہے۔ ہر بڑا شہر ایسے ہی پھیل رہا ہے۔ کراچی، لاہور، راولپنڈی، ملتان کیا کم ہے مگر اس نے میری بات نہ مانی اور اور کے دھندے میں پڑ گیا۔''

ایک اور وقفے کے بعد میں نے کہا۔ ''اب وہ کالونی بنے گی؟''

''ہاں، تم کیا سمجھتے ہو وہاں ڈاکوؤں کا ایک نیٹ ورک شروع ہوگا؟ اب تو مرید بھی کوئی نہیں۔ سارے جرائم پیشہ بدمعاشوں کا گروہ..... اب روز بینہ اس کی وارث اور مالک ہے۔ بھول نہیں وہ میری بیٹی ہے۔ ہمیشہ سے تھی اور رہے گی۔''

''اور اس کی بڑی بہن شاہینہ؟ وہ تمہاری بیٹی نہیں تھی؟''

''تھی..... کیوں نہیں تھی۔'' وہ بولا۔

''پھر اس کو سزائے موت دینا کیوں ضروری سمجھا گیا؟''

''وہ تمہارے ساتھ فرار ہونے ہوتے ماری گئی۔ کسی کی گولی کا نشانہ بن گئی۔ اگر وہ باہر نہ نکلتی، کمرے میں بیٹھی رہتی تو بحفاظت نکال کے لے آتے یہ لوگ..... اس کا مجھے بھی افسوس ہے۔ ریشم کہاں ہے اب؟''

میں اس غیر متوقع سوال کے لیے تیار نہ تھا۔ مگر مجھ سے پہلے استاد بولا۔ ''وہ میرے گھر میں ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اب بات سامنے آگئی ہے تو یہ بتانے میں بھی حرج کوئی نہیں کہ اللہ نے چاہا تو انور کی شادی ریشم سے ہوگی۔''

''اس کنگلے سے؟ اب کیا رہا ہے اس کے پاس جب زمین ساری تقسیم کردی؟'' سکندر شاہ بولا۔

''شاہ جی! کیا آدمی کا مقدر صرف انہی چیزوں سے مشروط ہے۔ زمین، دولت، جائیداد..... آپ اتنا کچھ جانتے ہیں تو یہ بھی جانتے ہوں گے کہ انور نے سات سال باہر رہ کے ایک ڈگری حاصل کی تھی اور وہ تعمیرات کی ڈگری تھی۔ آرکیٹیکٹ ہے وہ۔ آپ سے زیادہ اس کی ضرورت کس کو ہوسکتی ہے۔''

سکندر شاہ کی آنکھیں مجھ پر ٹھہر گئیں۔ ''یہ تو مجھے یاد ہی نہیں آیا۔ وہ میرا پارٹنر بھی ہوسکتا ہے اور چیف ٹاؤن پلانر

بھی۔ بہت اچھا اور بروقت یاد دلایا تم نے۔ تم اس سے بات کرو۔"

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "سوری شاہ جی! اب آپ کا کام ہے۔"

"مگر وہ تمہاری مانتا ہے اس کے علاوہ..... میں تم کو بھی اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔"

میں پھر بھونچکا ہو گیا۔ "اپنے ساتھ..... کس حیثیت میں؟"

"مشیر، معاون خاص اور اگر تم چاہو تو پارٹنر شپ..... دس فیصد تک۔"

"شاہ جی، آپ کاروباری فیصلے بھی سوچے سمجھے بغیر کرتے ہیں اسی طرح..... عجلت میں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ عجلت کا فیصلہ کیسے ہوا؟ انور کی پروفیشنل کوالی فکیشن ہے اور وہ بھی فیملی ممبر ہے..... فیملی کو ترجیح حاصل کیوں نہ ہو، کسی باہر کے آدمی پر..... اور انور اپنی پیشہ ورانہ مہارت اور تعلیمی قابلیت کو استعمال کرنا چاہے تو پھر اسے کہیں اور جانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"آپ اسے قائل کریں شاہ جی..... اپنی زندگی کے فیصلے وہ خود کر سکتا ہے۔ رہی میری بات تو کس بنیاد پر آپ میرا انتخاب کر سکتے ہیں۔ نہ میں رشتے دار نہ کوالی فائڈ؟"

"تمہاری پہلی بات پر میں اکبر کا حوالہ دوں گا۔ خونی رشتے کے باوجود میرے لیے اس سے تعلق میں فخر کی کوئی بات نہیں، شرم کی ضرور ہے۔ تمہارے ساتھ خونی رشتہ نہ سہی..... عملاً تم اس فیملی میں ہو۔ سب کا اعتماد جیت کے تم نے اپنے لیے چودھریوں کے خاندان میں جگہ بنالی تھی جو حسب نسب کے معاملے میں سخت جاہل اور متعصب ہیں۔ ان کے دو گھروں کے سب افراد نے تمہیں قبول کرلیا تھا۔"

استاد گامارستم مجھ سے زیادہ حیران پریشان بیٹھا تھا۔ ہم کیا بات کرنے آئے تھے اور یہاں کیا بات ہو رہی تھی۔ پرانا تعلق ہونے کے باوجود آج تک استاد گامارستم کو اس گھر میں وہ عزت نہیں ملی تھی جو مجھے بن مانگے مل رہی تھی۔

"آپ کی مہربانی ہے شاہ جی..... لیکن میں ابھی کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔"

"تمہیں سوچنے کے لیے وقت چاہیے؟ کوئی حرج نہیں۔"

"اب آپ کی اجازت ہو تو میں کچھ کہوں۔ اگر میری حیثیت کو آپ بھی ایک فیملی ممبر کے برابر تسلیم کرتے ہیں تو؟"

"بولو..... ضرور بولو..... میرا خیال ہے کہ تم ناحق کی بات نہیں کرو گے۔"

میں نے کہا۔ "آپ کے بارے میں میری رائے آج وہ نہیں جو کل تک تھی۔ میں سمجھتا ہوں آپ نے پیر جی کو اپنے بزنس میں شریک بنانے کی جو فراخدلی دکھائی تھی وہ بھی ٹھیک تھی اور وہ قبول کر لیتا تو اس پیری مریدی کے شیطانی کھیل میں نہ پڑتا۔ آپ کا اس کی بیٹی کے لیے رشتہ مانگنا ایک بہت اچھا قدم تھا جس میں سب کی بہتری تھی۔ اگر پھر انکار نہ ہوتا تو وہ سب خرابی نہ آتی جو اس خاندان پر عذاب کی صورت میں آئی۔ لیکن انکار کرنے والوں سے آپ نے جو انتقام لیا، وہ بہت سخت تھا۔"

اس کا چہرہ متغیر ہوا۔ "تم انتقام کیا ہوتا ہے؟ وہ میرے جذبات کا آتش فشاں تھا جس کو میری عقل کنٹرول نہیں کر سکی تھی۔ میں کوئی ولی نہیں ہوں۔ عام آدمی ہوں۔"

میرا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ "نہیں شاہ جی، آپ عام آدمی نہیں ہیں اب..... آپ کے پاس دولت کی طاقت بھی ہے، اثر و رسوخ کی طاقت بھی..... آپ کے مراسم حاکموں سے لے کر ڈاکوؤں تک سب سے ہیں۔"

"بند کرو اپنی یہ بکواس..... برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔" وہ دہاڑ کے بولا۔

"لیکن سچ کی کوئی حد نہیں ہوتی شاہ جی۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "اور میں برداشت کی حد سے بڑھنا نہیں چاہتا ورنہ کہنے کو ابھی بہت کچھ تھا۔"

اس نے ایک گہری سانس لے کر مجھے اشارہ کیا۔ "بیٹھ جاؤ، وہ بھی کہہ دو جو رہ گیا۔"

میں بیٹھ گیا۔ "آپ نے اپنا دامن صاف کر لیا۔ آپ کے بیٹے کو بھی من کی مراد مل گئی۔ لیکن اس کو آپ نے کیا بتایا..... بابا کہیں گے جس کا سارا خاندان ختم ہو گیا۔ آپ کی اور بیٹے کی فتح ہوئی۔ ایک لڑکی نے اپنے ماں باپ اور اپنی بہن کو گنوا کے کیا پایا؟ کیا اسے معلوم ہے؟"

"اسے نہیں معلوم۔" شاہ جی شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ "کیونکہ وہ یہاں نہیں ہے۔"

"آپ نے اسے گھر میں چھپا رکھا ہے۔ یہ بات مشہور ہے۔ اس سے پہلے آپ نے زندہ بیٹے کو مقتول بنا کے پیر کے خلاف قتل کا مقدمہ درج کرایا تھا۔"

"ہاں اور میرے اختیار میں ہوتا تو اسے پھانسی کے تختے پر پہنچا دیتا۔ اس نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی میرے بیٹے کی جان لینے میں۔" وہ بے بسی سے بولا۔

''آپ کا بیٹا خود مرنے گیا تھا۔ میں وہیں تھا شاہ جی...... خدانخواستہ کوئی آپ کی بیٹی کو بھگا لے جانا چاہے تو آپ کیا کریں گے؟ دروازے کھول دیں گے اس کے لیے؟''

''وہ پاگل ہو رہا تھا روزینہ کے لیے۔ مجھے بتائے بغیر اس نے اتنا بڑا قدم اٹھایا۔ اپنی جان پر کھیل کے روزینہ کو حاصل کرنے کی کوشش کی۔ پھر جو ہوا سو ہوا...... اب وہ امریکا میں ہیں۔ میری قید میں نہیں ہیں۔ وہ اپنی موج پر ہیں...... انہیں یہاں کے معاملات کی کوئی خبر نہیں۔''

''آپ اس سے کیسے چھپائیں گے یہ بات...... جو سب جانتے ہیں؟''

''تم اس کی فکر مت کرو۔ میں سنبھال لوں گا، بھگت لوں گا۔ تم اپنی بات کرو، تم میرے ساتھ ہو یا نہیں؟''

میں نے دوٹوک کہا۔ ''نہیں، میں کسی وڈیرا شاہی کے ساتھ نہیں ہوں۔''

''تم مجھے وڈیرا کیسے کہہ سکتے ہو؟ میں بزنس کرتا ہوں۔'' وہ جھنجلا کے بولا۔

''وڈیرے صرف زمیندار ہی نہیں ہوتے۔ ایک ہوتے ہیں مذہبی وڈیرے، دوسرے سیاسی وڈیرے۔ مذہبی وڈیرے میں نے سندھ میں دیکھے ہیں جو نہیں جانتے کہ ان کی زمینوں کی حد کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں ختم ہوتی ہے۔ ان کے شوگر مل، رائس مل اور ٹیکسٹائل مل ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی روحانی ٹھیکے داری ہے۔ وہ ڈاکو پالتے ہیں اور رہا یا میں میرے جیسے باغی ہوں تو ان پر طاقت کی دہشت قائم رکھتے ہیں۔''

''میں ایسا کوئی کام نہیں کرتا۔''

''آپ سیاسی وڈیرے ہیں۔ اثر و رسوخ کی طاقت والے، ماتحتوں کے محافظ، پولیس آپ کی غلام ہے اور قانون آپ کے قدموں کی دھول...... اس کی طرف دیکھیے۔'' میں نے استاد گامار ستم کی طرف اشارہ کیا۔

استاد نروس تھا اور خوف زدہ...... میری بات پر وہ چونکا۔

شاہ جی نے استاد کو دیکھا۔ ''مجھے معلوم ہے یہ ملک غلام محمد نہیں گامار ستم ہے۔''

''یہ جو آپ کے سامنے چوہا بنا بیٹھا ہے، اس کے نام کی دہشت سے سارے علاقے ہیں...... لیکن یہاں آپ کے سامنے اس کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی ہے۔''

''سنیم! تو بہت بول رہا ہے۔'' استاد نے برہمی سے کہا۔

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''یہاں میں اس کے ساتھ اپنی بات کرنے نہیں آیا تھا۔ نہ مجھے خیال آسکتا تھا کہ یہاں مجھے دس فیصد پارٹنرشپ کی آفر ہوگی۔ میرا استقبال فیملی ممبر کی طرح ہوگا۔ میں تو دشمن کے کیمپ کا آدمی تھا۔ آپ سے کچھ عرض کرنے آیا تھا۔ یہ آدمی۔'' میں نے استاد کی طرف انگلی اٹھائی۔

''اگر تم اس کے وکیل ہو تو تم بتا دو۔''

''یہ اب آپ کی غلامی سے نجات چاہتا ہے۔ ڈرتا ہے کہ آپ سے کیسے کہے...... کہیں اس کی یہ خواہش بغاوت کے زمرے میں نہ آ جائے۔''

خاموشی کے ایک مختصر وقفے میں شاہ جی اسے گھورتا رہا۔ ''کیا یہ ٹھیک کہہ رہا ہے؟''

استاد گامار ستم نے اقرار میں سر ہلا کے بڑی جرأت مندی کا ثبوت دیا۔

''لیکن کیوں......؟''

میں نے کہا۔ ''غلامی کس کو اچھی لگتی ہے شاہ جی؟ اور کسی عام آدمی کی طرح باعزت، محفوظ اور پرسکون زندگی کون گزارنا نہیں چاہتا۔ جس میں نہ حکم عدولی کی سزا کا خوف ہو اور نہ فرض ادا کرتے ہوئے کسی گولی کا نشانہ بن کے مارے جانے کا...... اس نے شادی کر لی ہے۔ ایک بڑی گھریلو قسم کی عورت سے۔ جو ایسی ہی بیوی ہے جیسی آپ کی ہوگی۔ پیر صاحب کی بیٹی اور چودھری کی بیوی۔ اب یہ اپنا گھر بسا کے بیوی بچوں کی خوشی پانا چاہتا ہے۔ وہ دے کے بھی اور لے کے بھی...... کیا آپ اس کی خواہش پوری کرنے میں کوئی مدد کریں گے؟''

ایک اور زیادہ طویل اعصاب شکن خاموشی کا وقفہ آیا۔ ''تم کیا کرو گے استاد گامار ستم؟''

استاد نے سر اٹھایا۔ ''کچھ نہیں شاہ جی، میں اب کچھ نہیں کروں گا۔ بس جیوں گا اپنی خوشی کے لیے۔ بہت کچھ کر چکا میں...... مجھے اور کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔''

اچانک شاہ جی کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''ٹھیک ہے ملک غلام محمد...... تم کو عزت اور شرافت کا دورہ پڑا ہے تو مجھے کیا۔ میری طرف سے تم پر کوئی دباؤ نہیں۔ جہاں چاہو جاؤ، جیسے چاہو رہو...... تم محفوظ رہو گے۔''

''شکریہ شاہ جی۔'' استاد سے پہلے میں نے کہا۔

''اب یہ ہو سکتا ہے کہ کسی دن میں خود آپ کے پاس آ جاؤں...... کسی دشمنی شرط کے بغیر۔''

"ابھی کیوں نہیں؟" وہ بولا۔

"ابھی کچھ کام باقی ہیں۔ کچھ حساب برابر کرنے ہیں، کچھ قرض چکانے ہیں۔"

استاد اچانک بولا۔ "یہ تو گول مول بات کر رہا ہے۔ میں بتاتا ہوں شاہ جی...... ایک تو لڑکی ہے کوئی جس کے عشق میں یہ دیوانہ ہے۔ دوسرا اس کا ایک دشمن ہے۔ اس کے انتقام کی خواہش میں یہ زیادہ دیوانہ ہے۔"

شاہ جی مجھے دیکھتا رہا۔ "پیار اور نفرت میں تم بھی میرے جیسے ہو۔ مجھے اندازہ نہیں ہوا۔ مجھے بتاؤ گے نہیں؟"

"آپ کچھ نہیں کر سکتے شاہ جی......" میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "یہ ذاتی معاملہ ہے۔ ہم اب چلتے ہیں۔"

"ایسے کیسے چلتے ہیں۔ تم نے سنا نہیں، آنا اپنی مرضی سے ہوتا ہے جانا میزبان کی مرضی سے۔ یہاں تو آنا بھی مرضی سے نہیں ہوتا، جانے کا کیا سوال۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی گھڑی دیکھی۔ "کھانا لگ گیا ہوگا۔"

ایک گھنٹے بعد جب ہم رخصت ہوئے تو جیسے دنیا بدل گئی تھی۔ زمین وہ نہیں رہی تھی، آسمان کا رنگ، ہوا کی مہک سب کچھ بدل گیا تھا۔ شاہ جی ہمیں رخصت کرنے دروازے تک ہی نہیں گاڑی تک آیا۔ زندگی اچانک کتنی مہربان ہو جاتی ہے کبھی کہ یقین کرنا مشکل ہوتا ہے۔ باہر آتے ہی استاد نے جیپ روک لی۔ "یہ سب تیری وجہ سے ہوا سلیم...... آج سے میں اپنی زندگی کا خود مالک ہوں۔ جو میں نہ کر سکا تھا تو نے کر دکھایا۔"

"ایسا نہیں ہے استاد۔ بس ہر وقت کے لیے ایک کام ہے اور ہر کام کے لیے ایک وقت...... مجھے کیا معلوم تھا کہ نتیجہ کیا نکلے گا۔"

شام کے سائے ڈھلنے لگے تھے جب ہم پھر انور کی حویلی میں پہنچے۔ کلثوم بہت خفا ہوئی۔ "کہاں نکل گئے تھے دونوں؟"

میں نے کہا۔ "ہم تو سمجھ رہے تھے کہ جلدی آگئے، انور کہاں ہے؟"

"ہوگا کہیں اندر۔" وہ ناراضی سے بولی۔ "میں نے وقت ضائع کیا اپنا یہاں آ کے۔"

"کیا وہ نہیں مانا؟" میں نے کہا۔

میرا خیال تھا کہ انور اپنی حویلی کے اندر ہی کہیں ہوگا۔ کچھ دیر انتظار کے بعد میں نے ماں جی سے پوچھا تو انہوں نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔ کلثوم بھابی کا خراب موڈ ظاہر کرتا تھا کہ اس کا مشن ناکام رہا لیکن اس نے وہاں کوئی تفصیل نہیں بتائی۔ اگر وہ بغیر بتائے کہیں چلا گیا تھا تو یہ بڑی بداخلاقی کی بات تھی۔ ہم نے کچھ دیر انتظار کیا اور پھر روانہ ہوگئے۔

"آخر کچھ تو بتاؤ...... کیا اس نے انکار کر دیا؟" استاد نے راستے میں سوال کیا۔

"پہلے تم بتاؤ کہ تم گئے کہاں رہے۔ مجھے یہاں اکیلا چھوڑ گئے؟" وہ خفگی سے بولی۔

میں نے کہا۔ "سوری بھابی، کام تو مشکل سے آدھے گھنٹے کا تھا۔ دیر لگ گئی۔"

"اور ہمارا خیال تھا کہ تمہیں بھی معاملات طے کرنے میں وقت لگے گا۔"

"وہ تو کہتے ہیں ناکہ رسی جل گئی بل نہ گیا۔ انور کا یہی حال ہے۔" کلثوم بولی۔

"یعنی واقعی اس نے انکار کر دیا۔"

"انکار ہی سمجھو۔ ریشم کا ایکشن ٹھیک تھا۔ اس نے ریشم کی تصویر پر بڑی دل سے معافی بھی مانگ لی مگر اپنا نام دینے میں بے غیرتی محسوس کی۔ اس کے عشق کی راہ میں انا حائل ہے۔"

"اب کیا کہتا ہے وہ؟"

"وہی جو نہیں ہو سکتا۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے معافی مانگ لی۔ سب نے دیکھ لیا۔ تم نے بھی مان لیا مگر بال اب اس کے کورٹ میں ہے۔ آنا نہ آنا اس کی مرضی۔"

"الو کا پٹھا...... مرضی کا بچہ۔" استاد نے برہمی سے کہا۔ "ریشم کی بات غلط نہیں تھی۔ صرف تصویر کی مناسبت پر وہ کیسے مان لے کہ اسے مخاطب کیا گیا ہے اور مخاطب کرنے والا انور ہے۔"

میں نے کہا۔ "اگر اب اسے پتا چلا ہے کہ ریشم کہاں ہے تو اسے جانا چاہیے۔ اگر اس کا عشق اتنا ہی سچا ہے۔"

"یہ تو مرد عورت کی فطرت ہے یا روایت ہے۔ محبت کا اظہار بھی مرد کرتا ہے۔ خواہ دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی۔ یہ عشق کا پروٹوکول ہے۔ پروپوز بھی مرد ہی کرتا ہے۔" میں نے کہا۔ "پیغام لے کر بھی لڑکے والے جاتے ہیں۔"

"ریشم کی بھی عزت ہے، انا ہے وہ کیسے جا کے کہہ دے کہ لو میں آگئی تم سے شادی کرنے۔" کلثوم بولی۔

مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ انور کا دماغ ٹھکانے آگیا۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔

”ایسے کب تک چل سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کچھ دن اور گزرنے دو۔ دماغ خود ہی درست ہو جائے گا۔“

باقی راستہ ہم نے خاموشی سے طے کیا۔ ریشم کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں چنانچہ اس کا انتظار اور بے قراری جائز تھی۔ ہم سب نے بڑی کوشش سے اپنے چہرے سے دل کی بات ظاہر نہ ہونے دی۔ وہ بھی ٹی وی کے سامنے بیٹھی بظاہر پروگرام دیکھتی رہی لیکن اس کے چہرے پر دو آنکھیں سوالیہ نشان بنی رہیں۔

میں سکندر شاہ سے زیادہ مایوس نہیں ہوا تھا۔ اس نے مجھے ایک اچھے اور قابل عمل مستقبل کی اچھی تصویر ضرور دکھا دی تھی۔ انور اور سکندر شاہ کا اشتراک فائدہ مند ثابت ہو سکتا تھا اور اس میں میرے لیے گنجائش بھی نکلتی تھی لیکن سب سے زیادہ خوش اور مطمئن تو استاد تھا جو بجا طور پر یہ محسوس کرتا تھا کہ اس کے پیروں کی زنجیریں کٹ گئی ہیں اور ایک باعزت پرسکون مستقبل والی زندگی کے خواب کی تعبیر اب اس کے اختیار میں ہے۔ نہ اس کے ضمیر پر کوئی بوجھ ہوگا اور نہ اس کے دل میں کوئی خوف۔

کھانے کی میز پر اس نے بڑی ہوشیاری سے ماحول کے بوجھل پن کو دور کر دیا۔ ”بیگم صاحبہ!“

کلثوم اس انداز تخاطب پر حیران ہوئی۔ ”جی سرتاج من سلامت۔“

استاد ہنس پڑا۔ ”یار ایک بات بتاؤ...... تمہیں کون سی جگہ پسند ہے؟“

”مجھے یہاں کوئی بے آرامی یا پریشانی نہیں۔ اللہ کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔ بہت سکون سے عیاشی کی زندگی گزار رہے ہیں ہم ورنہ......“

”بس بس...... فلسفہ رہنے دو صبر و قناعت کا۔ میرا مطلب تھا کہ اگر تمہیں اس ملک کے علاوہ کہیں اور جا کے رہنا ہو۔“

”یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ مجھے تو پاکستان سے اچھا کوئی ملک نہیں لگتا کہ میں وہاں جا کے رہوں۔“

”لندن، پیرس، نیویارک تمہیں کچھ پسند نہیں؟“

”تم رہنے کی بات کر رہے تھے۔ دیکھنا تو میں سب چاہتی ہوں۔ قاہرہ، استنبول، ملائیشیا...... ان کے علاوہ جو نام تم نے لیے۔ مگر اپنا گھر یا ملک کون چھوڑ سکتا ہے۔ میں نے تو مری اور کاغان، سوات تک نہیں دیکھے۔“

”چلو یوں کرتے ہیں مری سے شروع کرتے ہیں۔ سوات، کاغان گھوم کے دوسرا انٹرنیشنل راؤنڈ شروع کریں گے۔ بس تم نام لکھتی جاؤ۔ بکنگ اور سارا انتظام میرا۔ جب کبھی گھر یاد آ رہا ہے واپس آ جائیں گے پھر نکل جائیں گے کسی اور طرف...... ایک لسٹ بنا لو۔“

وہ حیرانی سے سنتی رہی۔ ”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

وہ ہنس پڑا۔ ”صاف پوچھو کہ دماغ پر نشے کا اثر تو نہیں ہے۔ مگر ایسی کوئی بات نہیں۔“

”پھر کیا بات ہے؟ آپ کا بزنس ہے۔“

”بزنس گیا بھاڑ میں...... بہت کما لیا۔ اتنا کہ ساری عمر خرچ کرتے رہیں تو کم نہ پڑے۔“

”ایسے تو قارون کا خزانہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔“ وہ ہنسی۔

”ارے جب بھی ختم ہوگا تو بیٹھ جائیں گے سڑک کے کنارے کشکول لے کر۔ ابھی بتاؤ...... دراصل میں خود بہت تھک گیا ہوں۔ اکتا گیا ہوں کام سے۔ چلو اسلام آباد میں سیٹل ہوتے ہیں۔ خوب صورت شہر ہے اور چاروں طرف سے خوب صورتی میں گھرا ہوا ہے۔ ایسے مت دیکھو مجھے...... بس میں نے یہاں سے جانے کا طے کر لیا ہے۔ بعد کی بعد میں سوچیں گے۔“

میں اندر کے سکون اور خوشی کی وہ روشنی دیکھ سکتا تھا جو اس کے محفوظ مستقبل کے تصور سے کلثوم کے چہرے پر اس احساس سے پھیل گئی تھی کہ شاید میں نے کوشش کر کے استاد کو نیکی کے راستے پر ڈال دیا ہے۔ اس نے بڑی استقامت، صبر و تحمل اور مستقل مزاجی سے استاد کا ساتھ دیا تھا۔ خدا نے بالآخر اس کی سن لی تھی۔ وہ ذہین عورت سمجھ گئی تھی کہ یہاں سے جا کے اسلام آباد میں سیٹل ہونے کی خواہش صرف گھر اور مقام کی تبدیلی نہیں، یہ اندر کی تبدیلی ہے جو سب کچھ بدل دے گی۔

ریشم کی بات کسی نے نہیں کی۔ نہ اس نے کچھ ظاہر ہونے دیا کہ وہ کسی توقع پر کوئی آس لگائے بیٹھی تھی۔ لیکن اس کی نارمل رہنے کی کوشش ناکام تھی۔ کھانے کے بعد وہ خاموشی سے سر درد کے بہانے اپنے کمرے میں جا کے سو گئی۔ میں مجبور بہ خیالوں کے جنگل میں ادھر سے ادھر بھٹکتا رہا۔ حالات کے دریا کا اگلا موڑ کب اور کیسے آنے گا اب اس کا اندازہ کرنا بھی مشکل تھا۔ اس کا اسکرپٹ دست قدرت لکھ رہا تھا۔ جیل سے میرا فرار...... نورین کا ملنا اور

بچھڑ جانا، ریشم کی زندگی کا انقلاب، بہت کچھ تھا جو ہو گیا۔ کیوں اور کیسے کے بغیر، میں نے انور کے گھر میں جگہ بنالی۔ پھر پیر سائیں نے مجھے فرزندی اور جانشینی میں قبول کیا اور ایک ہنگامے میں وہ سب ختم۔ شاہجہ منظر سے غائب۔ ریشم کو کسی دست غیب نے اٹھا کے استاد کے گھر پہنچادیا۔ وہ ایک دن اور وہیں رہتی تو پیر سائیں اٹھا کے لے جاتے۔ ڈراما، ڈراما، ڈراما۔ استاد اب ملک غلام محمد تھا۔ اب لگتا تھا کہ جیل میں پھانسی کا منتظر فرید الدین بنا میں جس کی خبر تھا کرگئی اور رہتا۔ وہ کسی اور کی زندگی تھی۔ آگے کیا ہوگا۔

شاید اکیلے میں استاد بھی اپنی شریک زندگی کو بتا رہا ہو گا کہ اس کی زندگی کیا تھی مگر اب کیا ہو گئی۔ یہ کلثوم تھی جس کے نوشتہ تقدیر نے اس کو بھی بچالیا تھا۔ میں نہ جانے کتنی دیر سوچتا رہا کہ کیا مجھے اپنے ارادوں کی کامیابی پر کسی خوش گمانی میں رہنا چاہیے؟ یہ تو حضرت علیؓ کا در قول ہے جو آفاقی سچائی ہے کہ میں نے اپنے رب کو اپنے ارادوں کی شکست سے پہچانا۔ میں بھی ارادہ کیا کرتا ہوں، کیا ہو جاتا ہے۔ اب میں کس طرح کہوں کہ مجھے نور بن مل جائے گی اور وہ جو بار بار شاہ کو شکست دے کر رہنے کی انتہائی خواہش تا حال زندہ ہے وہ بھی پوری ہو جائے گی۔ کب...... کیسے؟

اچانک کسی نے میرے دروازے پر دستک دی۔ میں چونک کے اٹھا اور گھڑی دیکھی تو رات پانچ کے تین بجے تھے۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ بجلی کے کوندے کھڑکی کے شیشوں پر ناچ رہے تھے۔ میں نے لائٹ جلا کے دروازہ کھولا تو بے یقینی سے مجسم بت بنا کھڑا رہ گیا۔ میرے سامنے انور کھڑا تھا۔ پریشان حال، آنکھوں میں وحشت، بکھرے بال اور بارش میں بھیگا ہوا۔ بڑی مشکل سے میری زبان سے نکلا۔ ”تو؟“

وہ اندر آ گیا۔ ”ریشم کہاں ہے؟“
یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجیے۔ اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے۔ لگتا تھا کہ انور پیدل اور بارش میں بھیگتا آیا ہے۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ میں نے اسے زبردستی کپڑے کے واش روم میں بند کر دیا۔ ”پہلے کپڑے بدل۔“ میں نے کہا اور وہ چلایا اور مسلسل ”ریشم کہاں ہے...... پہلے مجھے اس سے ملنا ہے“ کی رٹ لگاتا رہا۔ وہ سچ مچ پاگل ہو رہا تھا۔ وہ کچھ دیر میں میرے کپڑے بدل کے نکلا اور پھر وہی سوال کیا۔

”بیٹھو یہاں۔“ میں نے سختی سے کہا اور اسے دھکیل کر صوفے پر بٹھا دیا۔ ”پیدل آیا ہے تو؟“

”پیدل ہی آتا...... جیپ تھی۔ راستے میں خراب ہو گئی۔ یہاں سے کچھ دور کھڑی ہے۔ ریشم......“

”ریشم سو رہی ہے۔ ابھی نہیں مل سکتی۔ صبح ملے گی۔ بیٹھا رہ یہاں آرام سے۔ میں کافی بنا کے لاتا ہوں۔“

جب میں کچھ دیر بعد لوٹا تو وہ بت بنا بیٹھا دیوار کو گھور رہا تھا۔ ”سلیم! وہ ناراض ہے نا مجھ سے۔ میں اس سے معافی مانگوں گا۔ ہاتھ جوڑ کے، پاؤں پکڑ کے۔“

”پہلے کیوں انکار کیا تھا؟“

”تو جانتا ہے۔ خرابی یہاں ہے۔“ اس نے سر کو انگلی سے بجایا ”اور معاملہ ہے یہاں کا۔“ اس نے دل پر ہاتھ رکھا۔

”کلثوم بھابی کی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی انور کے بچے۔“

”جاہل گالیاں دے مجھے، مار...... اتنا مار کے میرے اندر کا جاگیردار مر جائے۔ ذلیل کر مجھے، کیونکہ میں ذلیل ہوں۔“

میں نے اسے تسلی دی۔ ”حوصلہ رکھ انور...... اب تو آ گیا ہے نا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”ریشم مجھے معاف کر دے گی؟“ وہ بچوں کی طرح بولا۔

”تجھے معافی مانگنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی...... تو یہ کہے گا کہ میں تمہیں لے جانے کے لیے آیا ہوں اور وہ کہے گی کہ چلو...... تو ماں جی کو بتا کے آیا ہے؟“

”جھوٹ بول کے آیا ہوں۔“

”مائیں جھوٹ سچ سب جانتی ہیں۔ لیکن مانتی جاتی ہیں۔ شرط لگا لے انہیں معلوم ہوگا۔“

”کیا معلوم ہوگا؟“

”کہ تو کہاں گیا ہے اور وہ بہت مطمئن اور خوش ہوں گی۔“

وہ صبح کا اجالا پھیلنے تک بولتا رہا۔ پھر ہم باہر آ کے بیٹھ گئے۔ اس وقت آسمان روشن ہو رہا تھا۔ یوں جیسے انہیں انتظار تھا۔ استاد کے ساتھ کلثوم نکلی۔ استاد کے ہاتھوں میں کافی کی ٹرے تھی اور اس میں چار مگ رکھے ہوئے تھے۔ میں نے غور سے کلثوم کو دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ ایک رات نے جیسے جادو کر دیا تھا۔ وہ مجھے اتنی حسین لگی جتنی پہلے کبھی نہ لگی تھی۔ میری نظر نہیں بدلی تھی۔ یہ کلثوم کے اندر کی طمانیت اور خوشی اور اعتماد تھا جس کی خوشی نے اس کے چہرے کو نور عطا کر دیا تھا۔ جیسے رات کے اندھیرے میں سیاہ نظر آنے

والے پہاڑوں پر صبح کے سنہرے اجالے میں برف پگھلا ہوا سونا بن جاتی ہے۔ وہ ایک فاتح عورت تھی جس کو دستِ قدرت نے ایک طاقتور، دہشت کی علامت سمجھے جانے والے، خونخوار مرد کے دل پر حکومت کا وہ حق دے دیا تھا جو اس کے لیے خواب تھا اور استاد گامار سمگلروں کا سردار اس عورت کے پیچھے حکم کے غلام کی طرح سر جھکائے کافی کی ٹرے لیے چل رہا تھا۔ یہ محبت کی فتح کے دن کی صبح تھی۔

استاد نے ٹرے کو میز پر رکھا۔ قریب سے دو کرسیاں کھینچ کے قریب رکھیں اور بیٹھ گیا۔

"کیسے ہو انور؟" کلثوم نے چہرے کے گرد ہالہ بنانے والے سیاہ بالوں کو سمیٹ کر کلپ لگایا۔

میں نے حیرانی سے کہا۔ "آپ اسے دیکھ کر حیران نہیں ہوئیں؟"

"یہ تم نے تو مجھے حیرانی ہوئی؟" وہ ہنسی۔

استاد نے کافی کا ایک مگ انور کو تھما دیا۔ "ہم نے دیکھ لیا تھا کھڑکی میں سے کہ کون آیا ہے۔ چوکیدار تمہارے بیڈروم کی طرف لے گیا تھا۔"

"تم کو اس وقت فرصت نہیں تھی نکلنے کی؟" میں نے سادگی سے کہا۔

کلثوم کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے لال ہوا۔ "جلدی نہیں تھی۔ کہو کیسے آنا ہوا؟"

انور نے شرمندگی سے کہا۔ "پہلے آپ سے معافی مانگ لیتا ہوں کل کے رویے پر۔"

"معاملہ تمہارا ہے اور ریشم کا۔ کوشش کرنا میرا کام تھا جس کو نہ کر سکی۔" کلثوم نے کہا۔

"وہ... سو رہی ہے ابھی تک؟"

"کون... ریشم؟ وہ یہاں نہیں ہے... تو میں کیا بتاؤں۔"

"آپ نہیں چاہتیں کہ میں اس سے ملوں؟" انور نے رنجیدگی سے کہا۔

"میں ایسا چاہتی تو تم سے کیوں کہتی۔ مگر تم جس سے ملنا چاہتے تھے۔ پھر وہ یہاں کیوں رہتی وہ چلی گئی۔"

"چلی گئی؟ کہاں چلی گئی؟" انور نے بے یقینی سے کہا۔ "آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔"

"یار تم دیکھ لو اندر جا کے۔" استاد بولا۔ "جاؤ۔"

"مگر... وہ کہاں جا سکتی ہے ایسے..."

استاد بولا۔ "کبھی میں ہوتا تو میں کہتا۔ ادھر سے تم چلے اور ہم ادھر سے... تم لیلیٰ لیلیٰ پکارتے ادھر آئے اور وہ مجنوں مجنوں کرتی تمہاری طرف چلی گئی۔ لیکن ایسا تو اصلی قصہ لیلیٰ مجنوں میں بھی نہیں ہوا تھا صرف مجنوں نے جھک ماری تھی۔ اب ریشم بے گھر تو نہیں ہے۔ خیر سے، ایک رازدار سہیلی تھی اس کی... کیا نام تھا۔"

"سلونی۔" کلثوم نے کہا۔ "اس کے ساتھ چلی گئی۔ وہ تمہارے گھر میں رہی کافی عرصہ۔"

"لیکن... مجھے اس کا پتا معلوم نہیں۔ فون نمبر بھی نہیں ہے۔"

"پتا تو ہمیں بھی نہیں معلوم۔" "اب میں اس کھیل میں شریک ہو گیا۔

"یہ تم نے رات کو نہیں بتایا تھا۔" انور نے خفگی سے مجھے مخاطب کیا۔

"رات کو مجھے کہاں معلوم تھا۔" میں نے سادگی سے کہا۔

"ویسے بات کیا کرنی تھی۔ مجھے بتا دو... فون آیا تو میں کہہ دوں گی اور اس کا جواب تمہیں پہنچا دوں گی۔"

انور کا چہرہ اتر گیا۔ وہ اپنے ہونٹ کاٹتا رہا۔ "میں اسے منانے آیا تھا۔ اس سے معافی مانگنے۔"

کلثوم نے کچھ دیر بعد کہا۔ "اچھا، میں بتا دوں گی اسے۔"

"میں شادی کرنا چاہتا ہوں اس سے۔" انور بولا۔

"یہ بھی بتا دوں گی پھر آ کے جیسے ہو... اگر وہ مان گئی تو اپنی ماں کے ساتھ پیغام لے کے آ جانا۔"

"آپ میری طرف سے اس کو راضی کریں، پلیز۔"

"میں پوری کوشش کروں گی۔ بات یہ ہے کہ اسے میں نے اپنی چھوٹی بہن بنا لیا ہے۔ اب ہم ہو گئے ہیں لڑکی والے۔ رشتے کے معاملات اسی طرح طے ہوں گے جیسے ہوتے ہیں۔ اگر ہوئے۔"

انور شاید دل تھا کہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "اچھا، پھر میں چلتا ہوں۔"

استاد نے رسمی انداز میں کہا۔ "بھئی ناشتا کر کے جاؤ۔"

"نہیں، میں کل فون کروں گا۔ آپ کہیں تو خود آ کے معلوم کر لوں۔"

"ویسے تو گھر ہے تمہارا۔ اب فون کا کیا ہے، ریشم آج کرے یا کل بھی نہ کرے۔"

وہ پریشانی سے بولا۔ "کتنے دن کا کہہ گئی ہے وہ؟"

"کہا تو کچھ نہیں۔ کب تک رہتی ہے سلونی کے

ساتھ..... اس کی مرضی۔" کلثوم بولی اور اسے شکستہ دل، بدحال اور مایوس دروازے کی طرف جاتا دیکھتی رہی۔

میں نے کہا۔ "واہ بھابی..... کمال کر دیا آپ نے تو۔"

"اس کو سزا تو ملنی چاہیے اور اس کے اندر کی جو آگ ہے، وہ ایسے ہی نکلے گی۔ ابھی چکر لگانے کچھ دن..... کل شرافت سے بات کی تو نواب سراج الدولہ کی سمجھ میں نہیں آئی۔"

استاد نے بیوی کو تعریفی نظروں سے دیکھا۔ "جو چیز مشکل سے ملے، دھکے کھا کے، اس کی قدر ہوتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "کیا ریشم کو بھی نہیں بتاؤ گی؟"

"اسے تو میں نے کہہ دیا تمہارا ساتھ ہی..... کہ وہ آئے گا مر کے بل آئے گا۔ تم حوصلہ رکھو۔"

"بھابی! کہیں معاملہ خراب نہ ہو جائے، بچنے بچنے۔" میں نے کہا۔

"تم دیکھتے جاؤ، انور بے وقوف نہیں ہے۔ وہ سب سمجھ گیا ہوگا کہ یہ سلوک اس کے ساتھ کیوں ہوا۔ یہ کل کے رویے کا جواب تھا۔ تم شرط لگا لو مجھ سے۔ وہ شام تک پیغام لے کر آئے گا۔ ماں کے ساتھ۔"

میں نے کان پکڑے۔ "میں ہار جاؤں گا اور ہارنے کو کچھ بھی نہیں ہے میرے پاس۔"

استاد نے کسی سعادت مند شوہر کی طرح چاروں کمرے میں رکھے اور اندر لے گیا۔ فارسی میں کہتے ہیں۔ ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد۔ یہی بات انگریزی میں مشہور ہے اور سچ ہے کہ جو عورت غلام بن کے رہتی ہے، وہی مرد پر حکومت کرتی ہے۔ کلثوم کی خاموشی اور صبر نے استاد کو شاکر و بنا دیا تھا۔ اگر وہ شک بھرے سوالوں سے اور اپنی پھوٹی قسمت کا رونا رو کے استاد کو طعنے دیتی رہتی کہ کس ڈاکو کے پلے پڑ گئی، میرے نصیب میں شریف آدمی نہیں تھا تو اثر الٹا ہوتا۔ اس نے تمام معاملات کو خدا کی رضا پر چھوڑا اور خدا نے اس کے صبر اور حوصلے کو آزما کے اسے انعام سے نوازا۔ اس کا گھر اور مستقبل محفوظ کر دیا۔ یہ سب لڑ جھگڑ کے نہ ملتا۔

بھابی نے اچانک کہا۔ "ایسے کیا دیکھ رہے ہو..... دیور جی۔" اور ہنس پڑی۔

یہ نیا خطاب شوخی سے زیادہ پیار اور اپنائیت کا مظہر تھا۔ "اگر بھابی ہوتی میری..... تو ایسی ہی ہوتی۔ آپ جیسی۔"

"میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی۔" وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔

میں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ "شکریہ مجھ پر واجب تھا۔"

"مجھے ملک نے سب بتا دیا۔.. کل رات..... جو کچھ وہ کرتا رہا اور جو وہ کرنا چاہتا تھا مگر کر نہیں سکتا تھا۔ تم نے اس کی وکالت نہ کی ہوتی....."

میں ہنس پڑا۔ "وکالت..... میں اور وکالت۔"

"سکندر شاہ کے سامنے تمہارے بات کرنے سے اس کو یہ آزادی کی زندگی ملی..... ورنہ۔"

"نہیں بھابی، یہ سب.... میں تو یہی کہوں گا کہ منجانب اللہ تھا۔ خود مجھے اندازہ نہ تھا کہ مجھے وہاں اتنی پذیرائی ملے گی۔ بس جو ہوا اچھا ہوا۔ سب کے لیے اچھا ہوا۔ اور کوئی خرابی پیدا ہونے سے پہلے ہو گیا۔"

"اب ہم واقعی یہاں سے چلے جائیں گے۔ ملک کہتا ہے اسلام آباد میں رہیں گے۔"

میں حیرانی سے اس عورت کی بات سنتا رہا جو اچانک اپنے شوہر اور اپنے گھر.. اور اپنے محفوظ مستقبل پر یقین سے اتنی پُراعتماد ہو گئی تھی کہ اس کا لہجہ بدل گیا تھا جیسے وہ ملک صاحب کبھی تھی اسے ملک کہہ رہی تھی۔ پلان بتا رہی تھی کیونکہ اب اسے یہ اختیار حاصل ہو گیا تھا۔ اب وہ مشورہ دے سکتی تھی اور استاد پر حکم بھی چلا سکتی تھی۔

میں نے ریشم سے کوئی بات نہیں کی کہ انور آیا تھا تو کیوں آیا تھا۔ یہ کام کلثوم بھابی مجھ سے بہتر طور پر کر سکتی تھی۔ جب اس نے انور جیسے کی ساری اکڑفوں نکال دی تو ریشم کیا چیز تھی۔ استاد پہلے وہی باتیں کرتا رہا جو کلثوم کر چکی تھی۔ آنے والی نئی زندگی کے وہ سب خواب جن کی تعبیر کا حصول اس کا مقصدِ حیات ہو گیا تھا۔ کھانے پر میں نے ریشم کو دیکھا تو اس کی صورت سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ خیالات جواب تک صرف اندیشوں اور مایوسیوں کے تاریک سائے تھے امیدوں کے اجالوں میں بدل رہے ہیں۔ جیسے رات کا اندھیرا افق سے روشنی پھوٹنے کے بعد زمین آسمان پر اجلی دھوپ بن کے پھیلتا ہے۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ انور کس لیے آیا تھا اور شاید کلثوم بھابی نے اسے استادوں کی طرح بریف کیا تھا کہ ایک پائیدار مستقبل کی ضمانت کے لیے ان کو اپنی شرائط منوانی ضروری ہیں۔ صبر یعنی خود پر جبر ضروری ہے۔ تبھی سو فیصد اپنی خواہش کے مطابق ملے گا۔ امید نے اس کے چہرے کی راتی اداسی کو نہ چھپائی جانے والی خوشی

میں ڈھال رہا تھا۔ آزمائش کا زمانہ اس نے بڑی استقامت سے گزار لیا تھا۔ اب خوابوں کی تعبیر ملنے کا وقت اس کی دسترس میں تھا تو وہ اپنے ادھورے شکستہ خوابوں کو پھر کیوں نہ جوڑتی۔

ہم اس وقت اکیلے تھے جب استاد نے اچانک کہا۔ "یار! ایک لڑکا آیا تھا۔ مطلب جوان آدمی تھا۔ تجھے پوچھ رہا تھا۔"

"مجھے پوچھتا ہوا یہاں کون آسکتا ہے؟"

"یہی تو میں حیران ہوں۔ اس نے گارڈ سے پوچھا تو گارڈ نے کہہ دیا کہ یہ تو ملک غلام محمد صاحب کی کوٹھی ہے۔"

"نام کیا تھا اس کا؟"

"مجھے یاد نہیں۔ شاید گارڈ کو معلوم ہو۔ اس نے کہا کہ ملک سلیم اختر جو چوہدریوں کی حویلی میں تھے۔"

میں تھوڑا سا متفکر ہوا۔ "دال تو ٹھیک دیا اس نے، اسے کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں ہوں۔"

"میں گارڈ کو بلاتا ہوں۔"

گارڈ اس اچانک طلبی پر کچھ بدحواس سا سامنے آ کھڑا ہوا۔ "سر جی؟" اس نے سلیوٹ کیا۔

"اس شخص کا نام کیا تھا جو ملک سلیم اختر کو پوچھ رہا تھا کل؟"

"نام...... نام تو نہیں پوچھا میں نے سر جی۔"

میں نے کہا۔ "اچھا صورت شکل حلیہ یاد ہے؟"

اس نے اپنی یادداشت کی مدد سے جو حلیہ بتایا وہ کسی کا بھی ہوسکتا تھا۔ پھر اچانک اس نے کہا۔ "وہ کہہ رہا تھا کہ اس نے خود دیکھا تھا ملک صاحب کی جیپ میں...... ملک سلیم اختر کو۔"

جب وہ چلا گیا تو میں نے کہا۔ "آتے جاتے دیکھا تو کہاں؟"

"یار چھوڑ پھر آجائے گا ضرور دیکھے گا تو...... مجھے تو اب نیند آرہی ہے۔ تو بھی آرام کرلے۔"

☆☆☆

مغرب کے بعد رات اپنے پر پھیلا رہی تھی جب مجھے کلثوم بھابی نے جگایا۔ "تیار ہو کے آجاؤ مہمان آئے ہیں۔" اس نے خوشی سے دمکتے لہجے میں کہا اور غائب ہوگئی۔

میں نے اپنے کپڑوں پر ایک نظر ڈالی اور منہ پر پانی کا چھپکا مار کے ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔ جیسا کہ میں نے بہت غور و خوض کے بعد نتیجہ اخذ کیا تھا وہاں انور اور ماں جی چپ چاپ بیٹھے تھے۔ میں رکا اور پھر ماں جی کو سلام کر کے سر جھکایا۔

انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "جیو پتر! دیکھ مجھے آنا پڑا تیرے پاس۔"

میں نے کہا۔ "آپ نے مجھے حکم کیا ہوتا۔"

"رہنے دے سلیم۔ بات کر کے گنوانے سے کیا فائدہ...... کیا چوہدری صاحب نے نہیں کہا تھا، میں نے نہیں کہا تھا کہ مت جا۔"

میں نے شرمندگی سے کہا۔ "وہ میری مجبوری تھی۔"

انہوں نے ایک گہری سانس لی۔ "یہ میری مجبوری ہے۔ سب وقت وقت کی بات ہے کہ آج مجھے ریشم کا ہاتھ مانگنے کے لیے یہاں سوالی بن کے آنا پڑا۔"

کلثوم بھابی نے بروقت مداخلت کی۔ "آپ کو تکلیف دی اس کی معافی چاہتی ہوں۔ لیکن دنیا کی رسم ہے۔ آپ بیٹے کی ماں ہیں۔ آپ آگئیں آپ کی مہربانی...... ہم انکار نہیں کر سکتے۔ ریشم اب آپ کی ہے۔"

"میں اس سے مل لوں؟" ماں جی نے کہا۔

کلثوم بھابی اٹھ کھڑی ہوئی۔ "آئیے، وہ آئے گی نہیں یہاں ورنہ آپ کو نہ جانا پڑتا۔"

جب میں، انور اور استاد رہ گئے تو انور نے کہا۔ "میں اعتبار گنوا بیٹھا ہوں؟"

میں نے کہا۔ "اعتبار پھر قائم ہوجاتا ہے لیکن گنوانے میں جدوجہد نہیں کرنی پڑتی۔ پھر حاصل کرنا مشکل ہوتا ہے۔ ناممکن نہیں۔"

"پہلے والا وقت اب نہیں رہا۔ بہت بدل گیا ہے۔ خود کو بھی بدلنا ضروری ہوگیا ہے سلیم۔" وہ بولا۔

"اچھی بات یہ ہے انور کہ تیرے پاس صرف خواہش نہیں، صلاحیت بھی ہے اور مجھے ایسا لگتا ہے کہ جہاں چاہ ہے وہاں راہ ہے والی بات محض کہاوت نہیں حقیقت ہے۔ تیرے حالات تیرا ساتھ دے گئے ہیں۔ وہ خود بہتری کی طرف لے جائیں گے تجھے۔ سب سے بڑا قدم تو اٹھا چکا ہے۔"

"یہاں آکے رشتے کی درخواست کرنا؟" وہ بولا۔

"نہیں، تو نے اپنے اندر کے زمیندار کو ختم کردیا ہے۔ زمینداری ختم کر کے...... تو حکومت کے ساتھ نفرت اور ظلم اور ناانصافی کرنے والا، استحصال کرنے والا اور طاقت سے سب کچھ چھین لینے والا انور نہیں رہا جو تجھ سے پہلے تیرے آبا و اجداد تھے تو نے محبت کرنا بھی سیکھ لیا ہے۔"

''ہاں، میں اچھا آدمی بننا چاہتا ہوں۔''

''پہلے آدمی اپنی مدد آپ کرتا ہے پھر خدا بھی کرتا ہے۔ اب ریشم تیرے ساتھ ہو لی..... تو کسی اور کی محنت شفقت اور استحصال پر نہیں، اپنے حوصلے اپنی صلاحیت پہ جیے گا۔ تیرے پاس وہ علم ہے جو تجھ سے پہلے والوں کے پاس نہیں تھا۔ تو نے دنیا دیکھی ہے، پہلے والے سب کنو ئیں کے مینڈک تھے۔''

''تم لوگ بھی تو میرے ساتھ ہو۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں انور! ہم سب کے اپنے اپنے راستے اور اپنی اپنی منزلیں ہیں۔ یہ ملک غلام محمد اور کلثوم بھابی..... یہ بھی یہاں نہیں ہوں گے اور میں بھی..... لیکن تجھے ایک نئے خاندان کا سہارا بھی مل سکتا ہے۔''

''وہ کس کا؟''

''تیری کزن روز بینہ زندہ ہے۔ اس کا شوہر اچھا آدمی ہے۔ براہ راست نہ سہی تیرا ایک رشتہ اس سے بھی ہے وہ روز بینہ کا ماموں..... سکندر شاہ..... یہ تجھے اپنے درمیان دیکھنا چاہتے ہیں۔''

وہ کچھ حیران ہوا۔ ''کیوں دیکھنا چاہتے ہیں؟''

میں نے اسے اختصار سے گزشتہ روز سکندر شاہ سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں بتا رہا۔

''اس نے تو تجھے بھی آفر کی ہے۔'' انور بولا۔

''ہاں، لیکن میری اپنی مجبوریاں ہیں۔ میں اس پزل میں شامل نہیں ہو سکتا اور تو بھی پابند نہیں۔ یہ ایک پروفیشنل پارٹنرشپ بھی ہوگی تیرے لیے۔''

''میری بھی دو مجبوریاں ہوں گی۔'' وہ تلخی سے بولا۔

''ایک نورین، دوسرا نادر شاہ، ایک کی زندگی، دوسرے کی موت۔''

میرے جواب دینے سے پہلے کلثوم کے ساتھ انور کی ماں آ گئی۔ وہ پوری تیاری اور نگین کے ساتھ آئی تھی۔ ہم چند لوگوں کی موجودگی میں ''منگنی'' کی باقاعدہ رسم ادا ہوئی۔ انور نے انگوٹھی پہنائی۔ پھر کلثوم نے اعلان کر دیا کہ اب روایتی انداز میں نکاح تک ان کے پردہ ہوگا۔ مٹھائی کے ٹوکرے گاڑی سے اتارے گئے۔ بعد میں کلثوم بھابی نے یہ سارے محلے میں تقسیم کرا دی۔ میرے لیے بھی یہ سارا کسی خواب کے منظر جیسا ہی تھا۔ میں نے زندگی میں کبھی خود کو اس سے زیادہ پرسکون اور خوش محسوس نہیں کیا تھا۔ ریشم سے جب میں ملا تو وہ بس میرے سینے سے لگ کے روتی

رہی۔ ان آنسوؤں نے وہ سب کہہ دیا جو الفاظ میں نہیں کہا جا سکتا تھا۔ جذبات کی ترجمانی الفاظ کہاں کر سکتے ہیں۔ میں کیا کہتا سوائے اس کے کہ خود بھی خاموشی سے اپنے آنسو صاف کرتا رہا۔

کلثوم جس سے رونے کی عمر کو جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے تھے۔ اتنی خوش تھی جیسے سچ مچ اس کی اپنی سگی بہن نہیں اکلوتی بیٹی کا نصیب کھل گیا ہو۔ اور استاد ہم سب کو خوش دیکھ کر خوش تھا۔ دو دن میں کتنا کچھ بدل گیا تھا۔

رات کو کسی وقت میں اور استاد لائٹ جانے کے بغیر لان پہ بیٹھے ابھی سب باتیں کر رہے تھے۔ کل جو گزر گیا۔ کل جو آنے والا ہے۔ دونوں پر کس کا اختیار تھا؟ ظاہر ہے اس تقدیر کا جو ہم نے خود نہیں لکھی تھی۔ ہم تو محض جواری تھے جو پانسا پھینک سکتے تھے۔ یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کس رخ گرے گا۔ ہار ہو گی یا جیت۔ ہار کے بغیر جیت بے معنی۔ نہ ہو سر، تو جینے کا مزہ کیا۔ غم کے بغیر خوشی کا کیا تصور..... عرش کی یہ بلندیاں فرش کی پستیوں سے ہیں۔

اچانک استاد نے کہا۔ ''تو کسی ساون خان کو جانتا ہے؟''

میں بری طرح چونکا۔ ''ہاں، تو نے یہ نام کیوں لیا؟''

''وہ..... دراصل..... گارڈ بعد میں میرے پاس آیا۔ کہنے لگا کہ میں ایک بات بتانا بھول گیا تھا۔ وہ جو بندہ آیا تھا ملک سلیم اختر کو پوچھتا۔ اس نے جاتے جاتے کہا تھا کہ میرا کچھ نہیں، وہ ساون خان ملنا چاہتا تھا۔''

میں ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ ''یہ کہا تھا اس نے اور وہ الو کا پٹھا بھول گیا؟'' میں نے چلا کے کہا۔

استاد حیران ہوا۔ ''تجھے کیا ہو گیا؟''

میں نے کہا۔ ''استاد! مجھے جانا ہوگا..... ابھی۔''

وہ غرا کے بولا۔ ''اور تیرا کیا خیال ہے کہ یہ آسان ہے۔ تو جا سکتا ہے جا ہے۔ بیٹھ جا اور مجھے بتا پہلے۔''

میں بیٹھ گیا۔ ''نورین اس کے پاس ہے۔''

استاد نے کہا۔ ''پھر؟''

''پھر کیا؟ میری زندگی کی تلاش کا حاصل نورین ہے۔ مگر تو کیسے سمجھ سکتا ہے اس بات کو۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں میں واقعی نہیں سمجھ سکتا۔ کچھ باتیں بڑی عام اور غیر اہم سی لگتی ہیں لیکن کسی کو سمجھائی نہیں جا سکتیں۔ میں کیسے بتاؤں کہ جب میرے باپ نے مجھے تین چھیوں والی سائیکل لا کے دی تھی، میری عمر ہو گی تین سال..... تو مجھے کیسا لگا تھا۔ اور جب گیارہ بارہ سال کی عمر

میں پہلی بار میں نے دو پہیوں کی بائیسکل پر توازن قائم رکھتے ہوئے اسے سڑک پر دوڑایا تھا تو میں جذبات کی کس سنسنی خیزی سے دوچار تھا۔ شاید پہلی بار جہاز اڑانے والا پائلٹ بھی ایسا ہی محسوس کرتا ہو۔ مگر کیا وہ الفاظ بیان ہو سکتے ہیں۔ تو یہ جو تیری محبت ہے نا...... میرے لیے تو پاگل پن ہے۔ اب کچھ تھوڑا بہت اندازہ ہونے لگا ہے کہ کلثوم کے لیے میں کیا محسوس کرتا ہوں۔ لیکن تیرے جذبات کا واقعی اندازہ نہیں کر سکتا۔ تجھے جانا چاہیے...... نہ جانا تیرے اختیار کی بات ہی نہیں...... مگر......''

میں نے کہا۔ ''مگر...... رک کیوں گئے استاد؟''

''مگر واپس آنا تیرے اختیار میں ہونا چاہیے۔ تاکہ کل وہ سب میں تیرے لیے کر سکوں یا نور کر سکے...... جو تو نے اس کے لیے اور رستم کے لیے کیا۔''

''ہاں، کہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ مل گئی تو اسے لے کر میں کہاں جاؤں گا ظاہر ہے یہیں آؤں گا۔''

''اور اس کے بعد پھر نکل جاؤں گا۔'' وہ بولا۔

''پھر نکل جاؤں گا؟ کیوں؟''

''ابھی کیا کہا تھا تو نے...... زندگی کے ساتھ تجھے موت بھی چاہیے۔''

میں نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔ ''ہاں، ناور شاہ کی موت۔''

''کیا کسی کے چاہنے سے ایسا ہو جاتا ہے؟ ایک فیصلہ تو زندگی کا ہے دوسرا موت کا...... کیا خدا نے انسان کو بھی یہ اختیار دیا ہے کہ وہ جو چاہے ہو جائے۔''

''کیا مطلب ہے آخر تمہارا؟''

''تیرے پاس کوئی گارنٹی ہے۔ کسی بھی جواری کے پاس جیت کی سو فیصد گارنٹی ہوتی ہے؟ بس ایک چانس ہوتا ہے جیت کا بھی اور ہار کا بھی۔ تو کیا یہ ممکن ہے کہ تو ناور شاہ کے حق میں فیصلہ چاہے اور پانسا تیرے خلاف پلٹ جائے۔ جو موت تو نے اس کا مقدر سمجھ رکھی ہے تیرا نصیب بن جائے؟''

میں خاموش رہا۔ اس کا مطلب صاف تھا کہ تو مارا بھی جا سکتا ہے۔

''تو کہہ کہ مرنے یا مارنے جاؤں گا۔ ہم کون ہوتے ہیں تجھے روکنے والے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ تجھے جو کام پہلے کرنے کا ہے وہ پہلے کرنا چاہیے۔ نورین کو بعد میں تلاش کرنا۔ پہلے ناور شاہ کو ٹھکانے لگا۔ اپنا انتقام لے اور زندہ رہے تو واپس آ کے نورینا کے ساتھ زندگی گزارنے کی سوچنا۔''

''اس طرح تم مجھے روک نہیں سکتے استاد۔''

''میں کہاں روک رہا ہوں...... تو جا۔ نورینا سے مل۔ چاہے تو یہاں لے آ...... مگر فائدہ کیا۔ فرض کر تو خود ناور شاہ کو مارنے کے چکر میں مارا گیا تو تیری تلاش رائیگاں...... نورین رہ گئی کنواری بیوہ...... شادی کے بعد وہ جانے دے گی تجھے؟ اور دیر کی تو ایک بچہ تیرے پاؤں کی زنجیر بن جائے گا۔ پھر یہ انتقام کا فرض رہ جائے گا۔''

میں نے خود کو پہلی بار لاجواب محسوس کیا۔ میں خاموش بیٹھا اندھیرے کو دیکھتا رہا۔

استاد نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''بچپن گیا تا خود اپنے حال میں۔ اتنی تلاش کے بعد نورین کو پالیا تو اسے کیا ملا اور تجھے کیا۔ جب تو کھو جائے گا تو وہ ساری عمر روتی رہے گی۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ نہ روئے۔ کسی سے شادی کر کے ہنسی خوشی زندگی گزار دے۔ غم اور صدمے سے مرتا کون ہے۔ چند دن، چند ماہ، چند سال بعد ایسا ہو سکتا ہے۔ جو آج تیری مشکل ہے وہ نورین کی مشکل بن جائے۔ تیرے پاس امید ہے وہ کس امید پر تنہا زندگی کا عذاب کاٹے گی؟''

میں نے بے بسی سے کہا۔ ''پھر کیا کروں میں آخر استاد؟''

وہ ہنسا۔ ''یہ تو بہت آسان ہے اور بہت مشکل بھی...... تو ناور شاہ کو معاف کر دے۔''

''معاف کر دوں؟''

''ہاں، اس کے سوا تو کیا کر سکتا ہے پاگل کے بچے...... جا انتقام لے۔ دفن ہو جا کہیں اپنے بھائی کی طرح...... اس کی روح بہت خوش ہو گی۔ تیری روح کا استقبال کرے گی۔ اسے معاف کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ زبانی کہنا بہت آسان ہے کہ میں نے یوم حساب پر سب چھوڑا۔ جو اس پر عمل کر سکے وہ تو ولی ہے۔ اب فیصلہ کر لے۔ تو اپنی زندگی سے جوا کھیلے گا اور نورین کی زندگی سے بھی...... یا عفو و درگزر کی نیکی کمائے گا۔ خدا کے انصاف پر سب چھوڑ دے گا۔''

وہ ایک دم اٹھا اور اندر چلا گیا۔ میں وہاں اندھیرے میں اور رات کے سناٹے میں وہ فیصلہ کرنے کی لاحاصل جدوجہد میں اکیلا رہ گیا جو درحقیقت میرے دائرۂ اختیار سے باہر تھے۔ کیونکہ یہ ماقبل زندہ طور پر تقدیر کے فیصلے تھے جن پر اختیار کا دعویٰ خدائی کے دعوے سے کم نہ تھا۔ یہ جواری کے آخری داؤ جیسا فیصلہ تھا جس میں اسے اپنی

ساری پونجی داؤ پر لگائی ہو۔ ایک چھوٹا سا بے جان حقیر پانسا خود مختار تھا۔ کسی کی خواہش، مرضی یا حکم کے تابع نہیں تھا۔ پھر جیسے جیسے رات ڈھلتی گئی اور دن کی روشنی کے ساتھ خنکی غالب آنے لگی میرے جذبات کا جوار بھاٹا بھی کم ہونے لگا۔ میں پرسکون ہوتا گیا اور میرا دماغ اس مشورے کو قبول کرنے پر آمادہ ہو گیا جو استاد نے دیا تھا۔ بلاشبہ اس نے میری مشکل آسان کی تھی۔ ناممکن کو ممکن بنا دیا تھا۔ میں نے انتقام کی جلتی ہوئی آگ کی آخری چنگاری کو بھی راکھ سمیت عفو و درگزر کے دریا میں بہا دیا تھا۔

گو میں پرسکون ہو گیا تھا لیکن کہیں لاشعور کی گہرائی میں ندامت کی کسک ایک کانٹا بن گئی تھی جو پھر میرا خواب بن گیا۔ مجھے احساس تھا کہ میں نے اپنے عہد کو توڑا۔ بھائی کی قبر پر کیے گئے عہد کو اپنے مستقبل کی سلامتی اور اپنی خوشی پر قربان کر لیا۔ یہ میری خود غرضی اور کمینگی تھی۔ بزدلی تھی کہ نادر شاہ جیسا سفاک قاتل جیت گیا تھا۔ مجھ پر خندہ زن تھا کہ طرم خان کے سالے...... تو مجھے مارے گا؟ سالے مچھر...... تیری یہ اوقات کہ شیر کو کاٹے...... اچھا ہوا بھاگ گیا جان بچا کے ورنہ تیرا حشر تیرے بھائی سے برا ہوتا۔

جب میری آنکھ لگی تو پھر خواب نے حقیقت کا روپ دھارا۔ میں نے بھائی کو دیکھا۔ وہ کفن کے سفید لباس میں کھڑا تھا اور خون کے داغ اس کی سفیدی میں چمکتے دکھائی دے رہے تھے۔ میں گھبرا کے اٹھا۔ "بھائی! مجھے معلوم ہے تم کو دکھ ہوا میرے فیصلے سے...... کہ میں نے تمہارے قاتل کو معاف کر دیا۔ میں سب کچھ بھول گیا۔"

اور بھائی نے کفن سے دو ہاتھ نکال کے مجھے سینے سے لگایا۔ "نامی! تو نے وہی کیا جو میں چاہتا تھا۔ جو میں تجھ سے توقع رکھتا تھا اگر تو بدلہ لیتا تو میں تجھ سے ضرور خفا ہوتا۔ بدلہ لینا انصاف نہیں ہوتا نامی۔ اگر دنیا کی عدالت سے انصاف نہ ملے تو پھر سب سے بڑا منصف اللہ ہے۔ اس کی پکڑ سے کون بچ سکتا ہے۔ مجھے تیری خوشی سے بڑھ کر پہلے بھی کچھ عزیز نہ تھا۔ آج بھی ایسا ہی ہے۔ میری روح کا سکون تیری خوشی میں ہے نامی۔"

اچانک لائٹ جلی اور میں نے خود کو کمرے کے وسط میں اکیلا کھڑا دیکھا۔ لائٹ کلثوم بھابی نے جلائی تھی۔ ان کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے۔ "کیوں دیور جی! کس سے بات کر رہے تھے؟"

اس کے پیچھے کھڑا ہوا استاد مسکرایا۔ "میں نے کہا تھا نا اسے نیند میں بولنے اور چلنے کی عادت ہے۔"

"وہ...... دراصل میں کچھ اپ سیٹ تھا۔ ذہنی طور پر۔" میں نے خفت سے کہا۔

"اچھا، چلو اب تم سو جاؤ۔ ہم بیٹھے ہیں یہاں۔" کلثوم بھابی نے کہا اور مجھے ہاتھ پکڑ کے کسی بچے کی طرح لٹا دیا۔

میں نے کہا۔ "آپ بے آرام نہ ہوں۔ میں سو جاؤں گا۔" میں نے کہا مگر وہ نہ مانی۔

مجھے بڑی حیرانی ہوئی جب آنکھ کھلنے پر میں نے گھڑی دیکھی تو صبح کے گیارہ بج رہے تھے یعنی دوپہر ہونے والی تھی۔ میں پرسکون اور تازہ دم ہی نہیں خوش بھی تھا۔ کلثوم بھابی خود میرے لیے ناشتا بنا کے لائی۔ وہ ابھی تک میرے لیے تشویش میں مبتلا تھی اور اس نے کسی اچھے ڈاکٹر سے مشورے کی بات بھی کی۔ میں صرف مسکراتا رہا۔

ایک گھنٹے بعد میں نے استاد سے کہا۔ "میں نورین کو لینے جا رہا ہوں۔"

"تجھے معلوم ہے اس کا پتا؟"

"اب مل جائے گا اور میں نے فیصلہ کر لیا ہے اس کے ساتھ میں یہاں آؤں گا تو پھر اسے چھوڑ کے کہیں جاؤں گا۔ ہوسکتا ہے کہ ایک دو دن لگ جائیں۔"

استاد نے سر ہلایا اور ایک پُراطمینان، پُراسرار مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "گاڑی لے جائے گا کہ جیپ؟"

☆☆☆

جیپ نے مجھے دو گھنٹے بعد سارن خان کے گاؤں میں پہنچا دیا۔ وہ گھر میرا دیکھا ہوا تھا۔ دروازہ بند تھا مگر میں نے دستک دی تو دروازہ کھل گیا۔ اندر سے کسی نے کہا۔ "کون ہے آ جا اندر۔"

اندر داخل ہو کے میری آنکھوں کو نیم تاریکی سے آشنا ہونے میں کچھ وقت لگا۔ اس ایک کمرے میں سامان نہ ہونے کے برابر تھا۔ جھلنگا چارپائی پر سارن خان لیٹا ہوا تھا۔ اس کے کھانے کے برتن سرہانے کی طرف نیچے رکھے تھے جس میں ایک سوکھی روٹی اور پیالے میں دال باقی تھی۔ وہ کافی کمزور اور بیمار لگتا تھا۔ کچھ دیر ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

"تو آ گیا، میں تو مایوس ہو چکا تھا۔" اس نے نحیف آواز میں کہا اور کھانسا۔ "دور ہو جا، مجھے ٹی بی ہے۔"

میں وہیں کھڑا رہا۔ "نورین کہاں ہے؟"

اس نے سانس کی خرخر میں کہا۔ "کون نورین؟"

میں نے چلا کے کہا۔ "جسے تو نے فاطمہ بنا رکھا تھا اور

کون؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا اور سانس کے قابو میں آنے کے بعد بولا۔ ''وہ فاطمہ ہی تھی۔''

میں نے بے بسی سے کہا۔ ''سود کے بیچ تو کیوں چاہتا ہے کہ میں تیرا گلا گھونٹ دوں۔''

''میں تو ویسے ہی مرنے والا ہوں۔ مجھے مار کے کیا ملے گا تجھے اور یہی سچ بتانے کے لیے تو میں نے بلایا تھا تجھے...... وہ جو تیری نور دین تھی۔'' وہ ہانپنے لگا۔ ''اسے میں نے ہی نکالا تھا نہر سے...... یہ ٹھیک ہے۔''

''اور پھر فاطمہ بنا کے رکھ لیا تھا۔ بول وہ کہاں ہے، کس سے سودا کیا اس کا...... کہاں بیچا...... تیری زندگی تو ایسے ہی دھندوں میں گزری ہے... تو جیل میں تھا۔ جرائم پیشہ آدمی ہے۔'' میں نے اس کو بری طرح جھنجوڑا۔

وہ ادھ مرا ہو گیا۔ اسے پھر حواس بحال کرنے میں دیر لگی۔ ''سب ٹھیک کہا تو نے۔ ایسا ہی ہوں میں۔ مگر مرنے وقت جھوٹ کون بولتا ہے۔ مجھے پتا ہے چند دن...... ہفتہ دو ہفتہ...... پھر مجھے قبر میں جا کے سونا ہے۔ وہیں.... جہاں نور دین ہے۔''

''میں نور دین کی نہیں فاطمہ کی پوچھ رہا تھا۔''

''وہ...... وہ اپنے گھر میں خوش ہو گی۔ اس کی شادی کر دی تھی میں نے۔ اب پتا نہیں کہاں ہے.... اس پر واقعی جن آتے تھے... میں شاہ جی کے پاس لے گیا تھا.... انہوں نے کہا مجھ سے...... کہ...... تم سے جھوٹ بولوں۔''

''کیسا جھوٹ؟''

''یہی کہ...... نور دین کو میں نے بچا لیا تھا.... اگر فاطمہ کی صورت اس سے ملتی تھی...... تو میرا کیا قصور......''

''کون تھی آخر یہ فاطمہ...... وہ تیری بیٹی نہیں تھی۔''

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''ہاں، اس گاؤں کی ایک عورت تھی...... فاطمہ اس کی بیٹی تھی۔ میراثن...... میری ہی بیوی...... مر گئی تھی۔''

''جھوٹ...... وہ چودھریوں کے گھر میں رہتی تھی اور کسی کے ساتھ چلی گئی تھی۔''

اس کا چہرہ اذیت سے مسخ ہو گیا۔ ''تم بھی جانتے ہو؟ خیر اب کیا فرق پڑتا ہے جب اس وقت نہیں پڑا۔ میرے اس میراثن کے ساتھ مراسم تھے۔ مگر اس کا میراثی شوہر...... وہ فاطمہ کو اپنی بیٹی سمجھتا تھا۔ جب اسے پتا چلا تو اس نے بیوی کو مار دیا۔ فاطمہ میرے پاس آ گئی۔ اور میں اس کے ساتھ نکل گیا۔ مینا پھر ہواش لوٹ آیا۔ فاطمہ کو یاد کر...... لڑکا نیک ہے۔ حافظ قرآن ہے۔ مدرسے میں بچوں کو پڑھاتا ہے اور گھر گھر جا کے قرآن کی تعلیم دیتا ہے۔ اچھا کما لیتا ہے۔''

''بھاڑ میں گئی تمہاری فاطمہ...... مجھے نور دین کا بتاؤ۔'' میں جیسے تھک کر پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گیا۔

''وہ...... جب میں نے اسے نکالا...... اس کی لاش پانی میں بہتی آ رہی تھی۔ پھر کچھ لوگوں کو بلا لیا۔ کسی نے کہا کہ پولیس کو بتانا چاہیے۔ پھر یہی سمجھا کہ اسے خاموشی سے دفن کر دیا جائے۔ اس کی قبر پر لے جا سکتا ہوں تمہیں اگر تم چاہو۔ کچی قبر ہے۔ بارش میں بیٹھ نہ گئی ہو۔'' وہ ہمت کر کے اٹھ بیٹھا اور جوتیاں تلاش کرنے لگا مگر میں نہیں اٹھا۔

''رہنے دو۔'' میں نے بڑی مشکل سے کہا۔ ''کیا کروں گا میں مٹی کے اس ڈھیر کو دیکھ کے۔ یہی بتانے کے لیے بلایا تھا تم نے مجھے؟''

''ہاں، وہ بھانجا ہے میرا...... اس نے دیکھا تھا۔ تم جیپ میں بیٹھے تھے گاؤں ختم کی۔ جب ہم جیل میں تھے تو اس کے بڑے قصے سنے تھے۔ اس نے پتا چلا لیا تمہارا...... میرا پیغام پہنچا دیا۔''

اچانک دروازہ دھڑ سے کھلا۔ ایک انسپکٹر پولیس کے ساتھ دو سب انسپکٹر میری طرف ریوالور تانے اندر آ گئے۔ ان کے پیچھے ایک جوان آدمی تھا۔ دھوتی اور کرتے والا۔ وہ ساون خان کا بھانجا تھا۔

انسپکٹر نے ریوالور کا رخ میری طرف رکھا۔ ''یہی ہے نا وہ...... ملک سلیم اختر۔''

انہیں ساتھ لانے والے نے سر ہلایا۔ ''آپ اسی سے معلوم کر سکتے ہیں۔ مگر میرا ایک لاکھ کا انعام مت بھول جانا۔''

انسپکٹر کے ساتھ آنے والے دو ماتحتوں نے مجھے دونوں طرف سے پکڑا اور ہتھکڑی پہنا دی۔ ''چل پتر! بڑی مہلت مل گئی تھی تجھے۔'' انہوں نے مجھے دھکا دے کر باہر نکالا اور ایک وین میں ڈال دیا۔ وین چل پڑی۔ جواری یہ آخری بازی ہار گیا تھا اور پھر تختۂ دار ہی اس کی منزل تھی۔

''نہیں.... !'' میں اچانک چلایا اور چلتی وین سے کودنا چاہا۔

ہر محاذ پر ایک نئے داؤ کی منتظر
جواری کی تدبیریں اگلے ماہ پڑھیے

گمشدگی

ایل کیسی

بچے اپنے ہوں... یا پرائے... نازک بیول کی کونپلوں کے مانند ہوتے ہیں... جو ہمیشہ کھلے کھلے اور تروتازہ اچھے لگتے ہیں... قانونِ فطرت ہے کہ جو آج بوئیں گے... وہ کل ضرور کاٹیں گے... باپ اور بیٹے کے درمیان قانونِ قدرت کا عبرت ناک مکافاتِ عمل...

خوف... دہشت اور انتقام کی اجارہ داری کی جھلک

وہ ایک خاموش سہ پہر تھی۔ آسمان پہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ سڑکوں پر گاڑیوں کی آمد و رفت معمول سے کم تھی۔

فون مسلسل بج رہا تھا۔ میرے اعصاب تن گئے۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ میں جانتا تھا کہ دوسری طرف کون ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ گزشتہ چند ہفتوں سے میں اسی کال کا منتظر تھا۔

"ہیلو... ہیلو مسز فریج! کیسی ہیں آپ؟"

یہ اس کی انتہوبی کال تھی۔ میں نے خود کو نارمل رکھنے کی کوشش کی۔ یہ ایک مشکل عمل تھا۔ میز پر شام کا اخبار پڑا تھا جو میرے اندیشے بڑھا رہا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں قلب۔" پریشانی کے باوجود اس کی آواز میں ٹھہراؤ تھا۔ "جیکی اب تک گھر نہیں لوٹا۔"

وہ ایک بااخلاق اور خوش مزاج عورت تھی۔ گو اس وقت اس کے لہجے میں اندیشے بول رہے تھے مگر آواز سن کر آپ بہ آسانی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ فون کی دوسری طرف ایک نیک دل عورت ہے۔ ایک ایسی عورت جسے کسی صورت ذیو فرنچ جیسے آدمی کے ساتھ نہیں ہونا چاہیے، لیکن قدرت کے کچھ فیصلے نرالے ہوتے ہیں۔

اضطراب کم کرنے کے لیے میں پیپر ویٹ گھمانے لگا۔

"اب تک نہیں لوٹا اچھا۔ مجھے دکھ ہے مسز فرنچ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ بالکل ٹھیک ہوگا۔ کیا آپ ڈیو... میرا مطلب ہے مسٹر فرنچ سے بات کرنا چاہتی ہیں؟"

"شاید اس کی ضرورت نہیں۔" اس نے دھیرے سے کہا۔ "وہ ایک مصروف آدمی ہے۔ بس میرا پیغام اس تک پہنچا دینا۔ اس سے کہنا کہ جیکی اب بھی..." عورت نے ایک لمحے کا توقف کیا۔ "جیکی اب تک گھر نہیں لوٹا ہے۔"

میں چاہتا تھا کہ اس جملے کی ادائیگی کے بعد وہ ریسیور رکھ دے۔ فون منقطع ہونے کی پرسکون آواز میری سماعتوں سے ٹکرائے لیکن ایسا نہیں ہوا۔

ایک کھوکھلی خاموشی مجھ پر چڑھائی کر رہی تھی۔ شاید وہ چاہتی تھی کہ میں کچھ کہوں۔ کچھ ایسا... جس سے اسے تھوڑی تسلی مل جائے۔

"اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو اس بابت زیادہ پریشان نہیں ہوتا۔" میں نے مصنوعی قہقہہ لگایا۔ "یہ بات درست ہے کہ اگر کوئی بچہ سات گھنٹوں تک گھر لوٹ کر نہ آئے تو اس کی ماں اندیشوں کا شکار ہو جائے گی مگر آپ تو آج کل کے لڑکوں کو خوب جانتی ہیں۔ گھر سے نکلتے ہی انہیں ایڈونچر سوجھتا ہے۔ دوستوں کے ساتھ کوئی منصوبہ بنا لیتے ہیں۔ موج مستی میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا۔"

وہ خاموشی سے سنتی رہی۔

"یوں بھی ہوتا ہے کہ بچہ کسی وجہ سے تھوڑا گھبرا جاتا ہے۔ وہ سزا کے خوف سے باہر ہی گھومتا رہتا ہے۔ میں خود بھی بچپن میں ایسا کرتا تھا۔ میرے خیال میں آپ کو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔"

"کیا تم جانتے ہو قلب۔" مجھے اس کی آواز دور سے آتی معلوم ہوئی۔ "جیکی بہت چٹورا ہے۔ خوب بھوک لگتی ہے اسے۔ سب سے پہلے کھانے کی میز پر پہنچ جاتا ہے مگر آج دوپہر وہ گھر نہیں لوٹا۔ اور اس کا کتا... وہ چھ گھنٹے بعد گھر تلاش کرتا ہوا آ گیا، مگر میرا بچہ... خیر تمہارا شکریہ قلب۔ مجھے خوشی ہے کہ فرنچ نے تمہارا بطور سیکریٹری انتخاب کیا۔ تم واقعی ایک اچھے انسان ہو۔"

اپنی تعریف سن کر میرے کان کی لو بھی سرخ ہو گئیں۔ "بہت بہت شکریہ مسز فرنچ۔"

رابطہ منقطع ہو گیا۔ میں نے بدن ڈھیلا چھوڑ دیا۔ شفیق عورت نے کبھی اس بارے میں غور نہیں کیا ہوگا کہ اس کے شوہر نے ایک ہیجڑے شخص کو بطور سیکریٹری کیوں چنا... حالانکہ شہر میں سڈول ٹانگوں اور سنہری بالوں والی لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں۔

ایسی لڑکیاں کلائنٹ کو تو بہت اچھی لگتی ہیں مگر مسئلہ یہ ہے کہ انہیں ٹوہ میں رہنے کی عادت ہوتی ہے۔ بولتی بہت ہیں اور ذیو فرنچ کو یہ بات قطعی پسند نہیں۔

وہ انتہائی شاطر وکیل ہے۔ کرمنل کیس کا ماہر۔ جرائم پیشہ حلقوں کا پہلا انتخاب۔ وہ دولت اور کامیابی کو اصولوں سے زیادہ اہم تصور کرتا تھا۔ اپنے موکل کو بچانے کے لیے قانون کو توڑ موڑ کر پیش کرنے میں اسے ملکہ حاصل تھا۔ کئی لٹیروں، بدمعاشوں اور ڈاکوؤں کو وہ قانون کے پھندے سے بچا چکا تھا۔

خوبرو لڑکیوں کی لاابالی فطرت اور بے احتیاطی اس کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔

☆☆☆

میرا سر گھوم رہا تھا۔ مسز فرنچ کے لہجے کی مایوسی کانوں میں چبھ رہی تھی۔

ریسیور رکھنے کے بعد میں سیدھا ذیو فرنچ کے آفس نہیں گیا۔ اپنی کرسی پر خاموش بیٹھا رہا۔ نظریں اخبار پر لگی تھیں۔ جیکی کا چہرہ میری نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ وہ آٹھ سالہ معصوم لڑکا مجھ سے بہت مانوس تھا۔ کئی بار ہم نے ساتھ میں بال بھی کھیلی۔ اس نے ایک اسکارف مجھے تحفے میں دیا تھا جو اس وقت میں نے اپنی گردن پر لپیٹ رکھا تھا۔

میں جذباتی آدمی نہیں ہوں۔ فرنچ کی لا فرم کا حصہ بننے سے قبل شاید میں تھوڑا بہت حساس رہا ہوں مگر اس کے طرز زندگی اور حلقے نے مجھ پر وہی اثر کیا جو کھولتا ہوا پانی انڈے پر کرتا ہے۔ میں بدل گیا تھا۔

عام لوگوں کے برعکس مجھے بچے زیادہ پسند نہیں۔

خصوصاً لاڈلے اور ضدی بچے تو مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ البتہ جیکی مجھے پسند تھا۔

اس کی آنکھیں بالکل اپنی ماں جیسی تھیں، ہلکی نیلی۔ بال گھنگرالے اور سنہری۔ وہ ایک سلجھا ہوا بچہ تھا۔ ماں نے اس کی تربیت اچھے ڈھب پر کی تھی۔ اس پر اپنے باپ کا کوئی اثر نظر نہیں آتا تھا۔ بہت رحم کرتے ہوں گے بچوں کے ماں باپ اسے دیکھ کر ضرور سوچتے ہوں گے کہ کاش یہ بچہ ہمارا ہوتا۔

جیکی سے متعلق سوچتے ہوئے میں نے پھر اخبار پر نظر ڈالی۔ ہیڈلائن میری آنکھوں میں چبھ رہی تھی۔

”نامعلوم مسلح افراد نے عورت اور بچے کو بھون ڈالا!“

متن کچھ یوں تھا:

”آج صبح ہونے والی فائرنگ کے افسوس ناک واقعے میں ایک عورت اور بچہ ہلاک ہو گئے۔ یہ واقعہ آٹھویں اسٹریٹ کے نزدیک پیش آیا۔ خاتون کی 27 سالہ روز رگیٹ کے طور پر شناخت کی گئی۔ خیال ظاہر کیا جا رہا ہے کہ اس کے روابط انڈر ورلڈ سے تھے۔ بچے کی شناخت نہیں ہو سکی۔ پولیس کے مطابق اس کی عمر سات سے آٹھ برس کے لگ بھگ ہے۔ بال سنہری اور گھنگرالے ہیں۔ اس کی لاش مرکزی مردہ خانے پہنچا دی گئی ہے۔ ایک عینی شاہد کے مطابق، جو خود اس واقعے میں بال بال بچا، مرنے والا بچہ مقتولہ روز رگیٹ کے قریب ہی کھیل رہا تھا۔ یہ واقعہ ساڑھے آٹھ بجے کے لگ بھگ ہوا۔ کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی ہے۔۔۔“

یہ ایک سنسنی خیز واقعہ تھا۔ رپورٹ میں مزید تفصیلات تھیں مگر مجھ میں مزید پڑھنے کی تاب نہیں تھی۔ میں جیکی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے صبح چہل قدمی کی عادت تھی۔ زیو فریج کے مکان اور جائے وقوعہ کے درمیان فقط آدھے بلاک کا فاصلہ تھا۔ کوئی بھی بچہ یہ فاصلہ بہ آسانی طے کر سکتا ہے۔ میں نے دیگر خبروں پر نظر ڈالی۔ ایک طویل اسٹوری بالائی بحران سے متعلق تھی۔ ایک رپورٹ میں شہر کے بڑے تاجر پر چلنے والے مقدمے کی تفصیل تھی۔

میں زیو کے کمرے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ بھاری دروازے کے ماتھے پر سفید، ابھرے ہوئے لفظوں میں اس کا نام اور ڈگریاں درج تھیں۔ دروازہ کھولنے پر آپ خود کو ایک آرام دہ، ساؤنڈ پروف کمرے میں پاتے ہیں، جہاں فریج کے من پسند کیوبن سگار کی خوشبو پھیلی ہوتی ہے۔

میں دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوا۔ وہ میز کے پیچھے خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے سفید ہاتھ میز پر دھرے تھے۔ چہرہ بے تاثر البتہ آنکھوں میں تفکرات کا طوفان تھا۔ میں نے اس کے لیے ہمدردی محسوس کی۔ وہ ایک تھکا ہوا بوڑھا معلوم ہوتا تھا۔

”کیسے ہو فلپ؟“ اس کی بھاری آواز کمرے میں گونجی۔

”آپ کے لیے دو فون کالز تھیں۔“

”کوئی خاص بات؟“ اس کے لہجے میں بے فکری تھی۔

میں نے حسبِ عادت گول مول بات کرنے سے اجتناب برتا۔ بری خبر پہنچانے کا یہی طریقہ سب سے کارگر ہوتا ہے۔

”ایک کال شیرف آفس سے تھی۔ وہ شہریوں کے ٹیکس سے حاصل ہونے والے فنڈز ضائع کرنے کو قطعی تیار نہیں۔ شیرف کے بقول محکمہ آپ کے صاحب زادے کو تلاش کرنے کے لیے کوئی میگا آپریشن شروع کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔“

”اس نے ایسا کہا!“ زیو کا لہجہ سپاٹ تھا۔

”ہاں۔“ میں نے دھیرے سے جواب دیا۔ ”اس کا کہنا تھا کہ اس نوع کی مہم وقت کا زیاں ہوگی، کیونکہ قوی امکان ہے کہ جیکی فریج۔۔۔“ میں رک گیا۔

وہ خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا۔

”مسٹر فریج، میرے خیال میں آپ کو مردہ خانے کا چکر لگا لینا چاہیے۔ شیرف بھی یہی کہہ رہا تھا۔ ضروری نہیں کہ وہ لاش جیکی ہی کی ہو۔“

”فی الحال اس کی ضرورت نہیں۔“

”مگر شیرف کہہ رہا تھا کہ۔۔۔“

”بھاڑ میں گیا شیرف۔ مجھے اس کی پروا نہیں۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔ ”میں وہاں جانے کا ارادہ نہیں رکھتا اور نہ ہی چاہتا ہوں کہ میری بیوی وہاں جائے۔ فلپ، کچھ لوگ بہت جلد ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ بدترین کی توقع کرنے لگتے ہیں۔ ہم ان میں سے نہیں۔“

”اس وقت مردہ خانے جانا ہی عقل مندی ہے مسٹر فریج۔ ہمارے کاندھوں سے ایک بھاری بوجھ اتر جائے گا۔“

اس نے میز پر زور سے ہاتھ مارا۔ ”ہم انتظار کریں گے۔ شیرف کے علاوہ کسی کی کال آئی تھی؟“

”آپ کی بیگم نے فون کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ۔۔۔“

”کہ جیکی اب تک نہیں لوٹا۔“ اس نے جملہ مکمل کر دیا پھر جھک کر دراز کھولی۔ وہاں بھرے ہوئے ریوالور کے پہلو میں چاندی کا ایک بکس رکھا تھا۔ اس نے بکس سے سگار

نکالا۔ اسے ہونٹوں کے درمیان رکھا اور اپنے سنہری لائٹر سے اسے سلگایا۔ وہ مطمئن معلوم ہوتا تھا۔

میں جانے کے لیے مڑا تو اس کی آواز سنائی دی۔

"ایک منٹ ٹھہرو قلب! تم ایک ذہین نوجوان ہو۔ ماضی میں جو لوگ میرے سیکریٹری رہے، ان سے زیادہ ذہین۔ مجھے ایک بات بتاؤ... کیا تم مکافات کے قانون پر یقین رکھتے ہو؟"

"کس قانون پر؟" میں ٹھٹکا گیا۔

"وہی قانون جو کہتا ہے کہ جیسا کرو گے، ویسا بھرو گے۔ جو دوسرے کے لیے گڑھا کھودتا ہے، وہ خود اس میں گر جاتا ہے۔ جو بوؤ گے، وہی کاٹو گے۔ وغیرہ وغیرہ... شاید تم اب بھی میری بات نہیں سمجھے۔" اس نے گہرا کش لیا۔ "میرے کہنے کا مطلب ہے کہ کیا قدرت کا کوئی ایسا قانون ہوسکتا ہے، جو انسان کو اس کے برے اعمال کا پھل اسی دنیا ہی میں دے دے؟"

اس کے لیے جو ہمدردی میں نے کچھ لمحوں پہلے محسوس کی تھی، اب اس کی جگہ غصے اور طنز نے لے لی۔ آج وہ اپنے اعمال کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ بیٹے کی گمشدگی کے بعد شاید اسے وہ خطرناک مجرم یاد آنے لگے تھے، جنہیں اس کی مہارت نے قانون کی گرفت سے بچالیا تھا۔

"میں اس بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا مسٹر فریج۔ اگر ایسا کوئی قانون ہے جو آٹھ سالہ معصوم بچے کی جان لے لے تو اسے تبدیل ہو جانا چاہیے۔ خیر، کیا آپ کو کسی شے کی ضرورت ہے۔ کافی؟"

وہ مسکرایا۔ "تم نوجوان بڑے ہی مادیت پرست ہوتے ہو۔ خیر، کوئی مسئلہ نہیں۔ تم نے سیم کروزر کو فون کردیا تھا؟"

سیم بظاہر ایک تاجر تھا۔ ایک فوڈ چین کا مالک۔ لیکن اس فوڈ چین کے پس پردہ وہ منشیات کا کاروبار چلا رہا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ نظر آتا، جنہیں وہ اپنے کاروباری پارٹنر کہہ کر متعارف کرواتا مگر حقیقتاً وہ سب غنڈے تھے۔

"بالکل۔ میں نے ڈھائی گھنٹے پہلے آپ کا پیغام ان تک پہنچا دیا تھا۔"

"کیا تم نے اس سے کہا تھا کہ اپنے لڑکوں کو ساتھ لائے، میں ایک اہم کام کے سلسلے میں ان سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں؟"

"جی ہاں۔" میں نے گردن ہلائی۔ "میرے خیال میں وہ پہنچنے ہی والے ہوں گے۔"

"ان کے حق میں یہی بہتر ہے۔" اس کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ "انہیں میری ضرورت ہے قلب۔"

مجھے اس کی مسکراہٹ زہر لگی۔ سیم پر اس وقت مقدمہ چل رہا تھا۔ پولیس کچھ شواہد اکٹھے کرچکی تھی مگر مسئلہ یہ تھا کہ اس کا وکیل ڈیو فریج تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ اس بار بھی ان بدمعاشوں کو صاف بچالے گا۔

میں نے جی کڑا کرکے کہا۔ "بالکل۔ ان کے حق میں یہی بہتر ہے مسٹر فریج۔ کیونکہ آپ ہی انہیں بچاسکتے ہیں۔ انہیں آپ کی ضرورت ہے، مگر کبھی کبھار مجھے یوں لگتا ہے کہ... آپ کو بھی ان انسان دشمنوں کی ضرورت ہے۔ ان کی بھاری فیسیں... ان کا ساتھ، ان کا تعاون... یہی عوامل تو آپ کو دیگر وکیلوں سے ممتاز کرتے ہیں۔"

میں نے کچھ زیادہ ہی بے باکی کا مظاہرہ کردیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ غصے سے پھٹ پڑے گا مگر وہ متانت رہا۔

"شاید تم نے درست کہا قلب۔" اس نے دھواں فضا میں چھوڑا۔ "تم میں خوشامد اور ریاکاری جیسی خرابیوں کی کمی ہے بچے۔ میں جانتا ہوں کہ تم میرے کلائنٹ کو زیادہ پسند نہیں کرتے۔ خیر، میرے بدمعاش دوستوں کی آمد پر تمہیں یہاں رکنے کی ضرورت نہیں۔ جب سیم اور اس کے لڑکے آ گئیں تو انہیں میرے دفتر میں بھیج کر تم چہل قدمی کے لیے نکل جاؤ۔ آئس کریم وغیرہ کھانا۔ پارک میں بچوں کو گیند بال کھیلتے ہوئے..." وہ رک گیا۔ "خیر، کہیں بھی چلے جاؤ۔ ہم کچھ دیر تنہائی چاہتے ہیں۔"

"امید ہے آپ کا وقت اچھا گزرے گا۔" میں یہ کہہ کر کمرے سے نکل آیا۔

☆☆☆

آج شام طوفانی بارش کی پیشگوئی تھی۔

وہ چاروں اوورکوٹ پہنے آفس میں داخل ہوئے۔ سیم کروزر سب سے آگے تھا۔ بھاری توند، بھدے ہونٹ، آنکھیں چھوٹی اور تیز۔ وہ ایک ایسا آدمی تھا جسے اپنے سوا کسی کی پروا نہیں تھی۔ اس کے پیچھے الکیمن تھا، اس کا دست راست۔ وہ ایک چھلا دبلا آدمی تھا۔ ہونٹ باریک، ناک کھڑی ہوئی۔ دائیں گال پر زخم کا نشان۔ اس کے بعد خوش لباس جونی اندر داخل ہوا۔ جونی کسی زاویے سے جرائم پیشہ آدمی نہیں لگتا تھا۔ اس کے معصوم چہرے کے پیچھے درحقیقت ایک قاتل تھا۔ اس نے بالکل ویسا اسکارف گلے میں ڈال رکھا تھا جو مجھے جنگل نے تحفے میں دیا تھا۔

"کیسے ہو قلب؟" سوئے سیم نے کہا۔

''خیریت ہے۔ مسز فریج آپ کے منتظر ہیں۔''

وہ تینوں ذیو کے کمرے میں چلے گئے۔ میں نے اوور کوٹ اٹھایا اور دفتر سے نکل گیا۔

ابھی اندھیرا نہیں ہوا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ لوگ خاموشی سے آجا رہے تھے۔

میں فٹ پاتھ پر چل رہا تھا۔ دائیں جانب لائن سے کافی ہاؤس اور ریسٹورنٹ تھے۔ لوگ وہاں بیٹھے موسم سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ سڑک کے کنارے کچھ بچے باسکٹ بال کھیل رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر یکدم مجھے جیکی کا خیال آیا۔

میرے قدم ازخود مشرق کی سمت مڑ گئے۔ میں مردہ خانے کی طرف بڑھنے لگا۔ گو بچے کی لاش شناخت کرنا میری ذمے داری نہیں تھی مگر تذبذب کی اس صورتِ حال سے میں اوب چکا تھا۔

میں عمارت کے نزدیک پہنچ گیا۔ وہ ویرانی سے بھرپور تھی۔ خاموشی میری رگوں میں رینگ رہی تھی۔ ٹھنڈ اچانک بڑھ گئی۔

عمارت کے زینے نے جیسے میرے پاؤں پکڑ لیے۔ میں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اس لمحے مجھے اندازہ ہوا کہ جیکی سے مجھے کتنا لگاؤ تھا۔ اس کے اور میرے درمیان ایک غیر مرئی رشتہ قائم ہو گیا تھا۔

میں نے اور ایک کوشش کی۔ کچھ قدم بڑھائے مگر پھر رک گیا۔

مجھے احساس ہوا کہ فریج یہاں آنے سے کیوں کترا رہا تھا۔ جب میرے لیے یہ اتنا مشکل ثابت ہو رہا ہے تو ایک باپ اسے کیوں کر انجام دے سکتا تھا۔

میں مڑا اور جس راستے سے آیا تھا، اسی پر ہو لیا۔ دھیرے دھیرے فریج کے لیے میری نفرت کم ہوتی چلی گئی۔

بادل گرجے۔ میں نے سر اٹھایا۔ گھنے بادل آسمان پر چھا رہے تھے۔ ہوا تیز ہو گئی۔ میں نے رفتار بڑھا دی۔ طوفان وقت سے پہلے حملہ آور ہو گیا تھا۔ جھکڑ چلنے لگے۔ اچانک ہی بارش شروع ہو گئی۔ میں نے کالر نکال کر گردن کے گرد لپیٹ لیا۔

لمحوں میں سب جل تھل ہو گیا۔ پانی کی آواز کاٹ دار تھی۔

دفتر کے نزدیک پہنچ کر مجھے ایک دھماکا سنائی دیا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ آسمان پر اندھیرا چھا گیا تھا۔

☆☆☆

بچہ

''میں نے ایک نیا آلۂ سماعت خریدا ہے۔'' ایک بہرے نے نیا آلۂ سماعت دوسرے بہرے کو دکھاتے ہوئے کہا۔ ''اب میں ٹھیک طور پر تمہاری بات سن سکتا ہوں۔''

''کیا کر سکتا ہوں؟'' دوسرے بہرے نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوال کیا۔ ''تم کیا کہہ رہے ہو؟''

''لو یہ آلہ لگا کر سنو۔'' پہلے بہرے نے آلۂ سماعت دوسرے بہرے کو دے دیا۔ ''اب بتاؤ کہ یہ آلہ کیسا ہے؟''

''اچھا ہے۔'' دوسرے بہرے نے جواب دیا۔ ''بہت اچھا ہے۔''

''بچہ ہے۔'' پہلے بہرے نے غصے سے دوسرے بہرے کی طرف دیکھا۔ ''کس کا بچہ ہے؟''

فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔

مجھے اوور کوٹ اتارنے کی بھی فرصت نہیں ملی۔ میں نے تیزی سے ریسیور اٹھایا۔ ''ہیلو... ہیلو کون؟ او، مسٹر فریج...''

عورت نے جو کچھ کہا، اسے سن کر میں سکتے میں آ گیا۔ وہ ابھی ابھی مردہ خانے سے لوٹی تھی۔

''کیا تم سن رہے ہو فلپ؟'' اس کی آواز میں ٹھہراؤ تھا۔

''جی... جی ہاں۔'' میں لمحۂ حال میں لوٹ آیا۔

''فریج کو میرا پیغام پہنچا دینا۔'' لائن خاموش ہو گئی۔

میں نے اوور کوٹ اتارا۔ فریج کے کمرے کی جانب بڑھا۔ دستک کا کوئی جواب نہیں آیا۔ میں دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔

''ہیلو فلپ، کیسی رہی چہل قدمی؟'' وہ مسکرایا۔ سگار اس کے ہاتھ میں تھا۔ میز پر ریوالور رکھا تھا۔ کھڑکی پر بارش دستک دے رہی تھی۔

''اچھا ہوں مسٹر فریج۔'' میں نے تیزی سے کہا۔ اگلے ہی لمحے میری نظر کمرے پر پڑی اور میرے حلق سے چیخ نکل گئی۔

''مسٹر فریج آپ نے...'' مجھے اپنی آواز اجنبی محسوس ہوئی۔

کمرے کا حسن غارت ہو گیا تھا۔ وہ مشکل جہنم تھا۔ بارود کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے والے صوفے پر مسز گروگز کی لاش پڑی تھی۔ گولی اس کے چہرے پر لگی۔ وہ خون میں

تنا ہوا تھا۔ بھدے ہونٹ کھلے ہوئے تھے۔ وہ مزید بھیانک ہو گیا تھا۔ اس کے پہلو میں نوجوان جولی کی لاش پڑی تھی۔ گولی سینے میں لگی۔ اس کے مہنگے سفید سوٹ پر سرخی چھا گئی تھی۔ باریک ہونٹوں والے الگین کا جسم کرسی پر تھا۔ وہ آگے کی طرف جھکا ہوا تھا۔ پسٹل انگلیوں میں جھول رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں موت کی سی خاموشی تھی۔

”حیران ہونا بند کرو فلپ۔“ فرنچ کی بھاری آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ”یہ تینوں مر چکے ہیں۔“

”مگر... مسز فرنچ... آپ نے ایسا کیوں...“ میں ہکلایا۔

”کیا تم اب تک نہیں سمجھے فلپ۔“ اس نے ایک اور کش لیا۔ ”آج صبح ہلاک ہونے والی عورت روز وگیٹ یاد ہے؟ اس کا تعلق سیم کے مخالف گروہ سے تھا۔ وہ مقدمے کی اہم ترین گواہ تھی۔ جب مجھے اس کی ہلاکت کی خبر ملی، میں فوراً ہی سمجھ گیا کہ اس کے پیچھے کون ہے۔ سیم کو بھی اندازہ تھا کہ میں اس بارے میں جانتا ہوں، جب ہی تو وہ سیدھا چلا آیا۔ اسے یقینی طور پر جیکی کے بارے میں نہیں پتا تھا... درندہ تھوڑی تیاری سے آتا۔“ وہ مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ میں گہری اداسی تھی۔

”مسز فرنچ میری بات سنیں۔ میں...“

”وہ مجھ پر بھروسا کر سکتا تھا۔“ اس نے بات کاٹ دی۔ ”میں نے پہلے بھی اس کی موٹی گردن پھندے سے بچائی تھی۔ تین برس پہلے سیم پروازہ ہونے والا قتل کا مقدمہ میں نے ہی لڑا تھا۔ شہر کا کوئی وکیل یہ کیس اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے تیار نہیں تھا مگر میں نے اسے اور اس کے بدمعاش ساتھیوں کو صاف بچا لیا۔ ان درندوں کو بچا لیا...“ اس کی آواز رندھ گئی۔ ”جنہیں موت کے گھاٹ اتار دینا چاہیے، میں نے انہیں بچا کر مزید زندگیاں تباہ کرنے کا موقع فراہم کر دیا۔ میں نے فلپ... میں نے۔ میں ان کے جرائم میں برابر کا شریک ہوں۔“

”مسز فرنچ خدا کے لیے میری بات سنیں۔“ میں چلایا۔ ”آپ کی بیوی اتنا سے پہر مردو خانے گئی تھیں...“

”وہ وہاں گئی تھی؟“ یکدم وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ چہرہ تن گیا۔ ”تو جیکی...“

”نہیں وہ جیکی کی لاش نہیں تھی۔ لاش کو شناخت کر لیا گیا ہے۔ وہ قصبے کے ایک باورچی کا لڑکا تھا۔ وہ وہاں کھیل رہا تھا اور...“

”اور جیکی... وہ...؟“

”وہ گھر لوٹ آیا ہے۔ وہ جائے وقوعہ کے نزدیک اپنے دوستوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ ساتھیوں نے جیکی کو تنگ کرنے کے لیے اسے ایک ویران عمارت کے کمرے میں بند کر دیا۔ اسی اثنا میں فائرنگ شروع ہو گئی۔ باقی بچے تو بھاگ گئے مگر جیکی وہیں رہ گیا۔ کئی گھنٹے بعد ایک بچے کو اس کا خیال آیا۔ مسز فرنچ بتا رہی تھیں جب وہ مردو خانے سے لوٹیں تو جیکی ان کا منتظر تھا۔ اور...“

میں آگے کچھ کہہ نہیں پایا۔ میرے اردگرد تین لاشیں پڑی تھیں اور سامنے ایک قاتل بیٹھا تھا جس کے چہرے پر خوشی کی روشنی پھیلی تھی۔

”شکریہ فلپ!“ اس نے یوں کہا، جیسے میں نے اس پر کوئی احسان کیا ہو۔ ”تمہارا شکریہ۔ اور ہاں، جو ہوتا ہے، اچھے کے لیے ہوتا ہے۔“

اس نے گہرا سانس لیا۔ ”ان درندوں کا یہی انجام ہونا چاہیے تھا۔ بچ تو یہ ہوتا ہے فلپ۔ چاہے قصبے کے سب سے بڑے وکیل کا ہو یا پھر ایک معمولی باورچی کا۔ اور ویسے بھی اب میں وکالت کے جھمیلوں سے اوب چکا ہوں۔ تو یہ ایک اچھا اختتام ہوگا فلپ۔“

بادل زور سے گرجا۔

”مسز فرنچ... کچھ بھی ختم نہیں ہوا۔ میری بات سنیں۔ عدالت آپ کو مجرم نہیں ٹھہرا سکے گی۔ آپ ثابت کر سکتے ہیں کہ آپ نے اپنے دفاع میں انہیں قتل کیا۔ ان تینوں کے پاس اسلحہ...“

وہ مجھے سن نہیں رہا تھا۔ ”میں جیکی کے لیے اچھی یادیں چھوڑ کر نہیں جا رہا فلپ۔ مجھے احساس ہے... لیکن تم اسے یہ ضرور بتانا کہ میں اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ اور یہ بھی بتانا کہ تمہارے باپ کی کوششوں سے یہ شہر تھوڑا محفوظ ہو گیا ہے۔ تین بدمعاش اپنے منطقی انجام کو پہنچ گئے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس پر وہ تھوڑا بہت فخر کر سکتا ہے۔ کیا تم اس سے یہ کہہ دو گے فلپ؟“

”میں... ہاں مسز فرنچ! میں جیکی سے کہہ دوں گا مگر...“

کمرے میں زوردار دھماکا ہوا۔ بادل ٹکرائے۔ بجلی چمکی۔ فرنچ کا بھاری جسم کرسی پر جھول گیا۔ اس کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا۔

”میں جیکی کو بتا... دوں گا... مسز فرنچ...“

میرا گلا آنسوؤں سے تر تھا۔

آزارِ عشق

سلیم انور

مغرب میں جو نہ ہو وہ بھی کم ہے... اول تو محبت ہوتی نہیں... ہو جائے تو دیرپا نہیں ہوتی... ایک شادی شدہ جوڑے کی پُرسکوت زندگی میں ہلچل مچادینے والے خطرناک الجھے کا جتن...

مرد... عورت کی خلوت میں کسی تیسرے کی شمولیت کا ماجرا
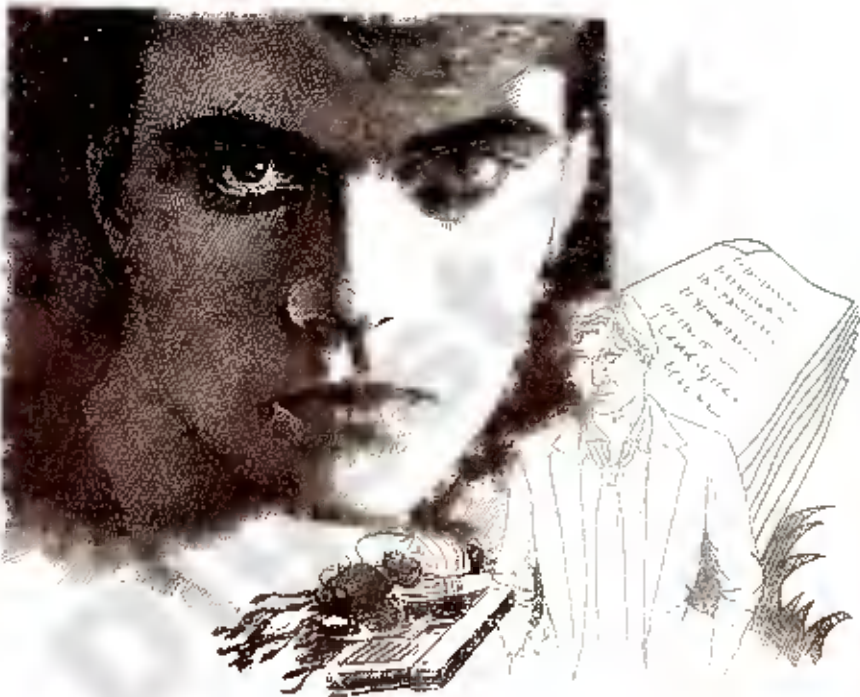
جیک وائٹ کے مطابق یہ اس کی بیوی کے آخری الفاظ تھے جو اس نے اس سے پہلے کبھی اپنی بیوی ایملی کے منہ سے نہیں سنے تھے۔ ایملی نے اس کے دفتر فون کیا تھا اور آواز ریکارڈ کرنے والی مشین پر یہ پیغام چھوڑا تھا۔ ''جیک! ہمیں بات کرنے کی ضرورت ہے۔'' اور پھر فون بند کر دیا۔

جیک جب گھر پہنچا تو اس نے ایملی کو کچن کے فرش پر چت پڑے ہوئے پایا۔ کچن میں ہر طرف اس کا خون پھیلا ہوا تھا۔ ظاہر ہے جب کوئی گولیوں کا نشانہ بنتا ہے تو خون ایسا

طرح پھیلتا ہے۔

جیک کی بدقسمتی یہ تھی کہ ریکارڈنگ مشین پر اپنی بیوی کا پیغام سن کر وہ اپ سیٹ ہوگیا۔ لہٰذا اس نے اپنے کام پر سے جلدی چھٹی لے لی اور گھر جانے سے قبل اپنے ذہنی خلفشار کو سکون پہنچانے کی خاطر راستے میں ایک مانوس شراب خانے پر رک گیا۔

قتل کی تفتیش کرنے والے افسر کی رپورٹ کے مطابق ایملی کی موت لگ بھگ چار بجے سہ پہر واقع ہوئی تھی.... یہ وہی وقت تھا جب جیک گھر جانے سے قبل راستے میں اس مانوس بار میں رکا تھا۔ جیک کے لیے ایک اور بدقسمتی کی بات یہ تھی کہ اس وقت بار میں ایسا کوئی شخص نہیں تھا جو وہاں جیک کی موجودگی کی شہادت دے سکتا یا اسے پہچان سکتا۔

لہٰذا پولیس نے جیک کو حراست میں لے لیا۔ کیونکہ رفیق حیات ہونے کے ناتے سے قتل پر پولیس کا سب سے پہلے شبہ اس کے شوہر پر جاتا ہے۔

جیک نے فوراً ہی اپنی مدد کے لیے مجھے فون کیا۔

میرا نام جسٹن ٹیلر ہے۔ لوگ مجھے جے ٹی کے مختصر نام سے بھی پکارتے ہیں۔ میں فی الحال یہاں ہیریسن، آرکنساس میں ایک چھوٹی سی پرائیویٹ انویسٹی گیشن ایجنسی چلاتا ہوں۔ میں یہاں اس وقت منتقل ہوا تھا جب میری اپنی شادی کا انجام علیحدگی کی صورت میں ہوا تھا۔ میں کنساس سٹی جیسے بڑے شہر سے کسی دوسری جگہ منتقل ہونا چاہتا تھا لیکن میری سابقہ بیوی کو شہر کی رونق اور چہل پہل سے عشق تھا۔ اس کے علاوہ مجھے لکھنے کا بھی شوق تھا اسی لیے میں نے سوچا تھا کہ اگر ہیریسن میں میرا پرائیویٹ سراغ رسانی کا کاروبار زیادہ نہ چلا تو میں اپنے لکھنے لکھانے پر توجہ مرکوز کرلوں گا۔ یہی سوچ کر میں یہاں منتقل ہوا تھا۔

بنیادی طور پر میرا اندازہ درست نکلا۔ یہاں ہیریسن میں پرائیویٹ سراغ رسانی لوگوں کے لیے بکلی نوعیت نہیں رکھتی تھی۔ البتہ مجھے اس کاروبار سے اپنی گزر اوقات کے لیے کچھ نہ کچھ مناسب آمدنی ہوجاتی تھی۔

میرے کلائنٹ جیک رائٹ کے خلاف کیس اتنا ٹھوس نہیں تھا لیکن میں اس کیس میں اپنی زندگی کا خطرہ بھی مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ جیک کا لباس خون میں لت پت تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ جب وہ ایملی کی مدد کی کوشش میں فرش پر جھکا تھا تو اس کا لباس خون آلودہ ہوگیا۔ ان کی زندگی بھی جوش و نشاط سے پُر نہیں رہی تھی۔ انہوں نے حال ہی میں ایک دوسرے کے لیے علیحدہ علیحدہ بیس لاکھ ڈالرز کا زندگی کا بیمہ کرایا تھا۔

چونکہ قتل حادثاتی موت کے زمرے میں آتا ہے اس لیے بیمہ کی پالیسی کی رقم دگنی ہوجاتی ہے اور بیس لاکھ ڈالرز کی رقم قتل کے ارتکاب کا ٹھوس مقصد فراہم کرسکتی تھی۔

اس کیس کا مثبت پہلو یہ تھا کہ پولیس کو آلۂ قتل نہیں ملا تھا اور جیک کے پاس جائے واردات سے عدم موجودگی کا ثبوت تھا بشرطیکہ میں اگر اسے ثابت کردیتا۔

سو میں نے سب سے پہلے جیک کی جائے واردات سے عدم موجودگی ثابت کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے جیک کے گھر سے اس کی ایک تصویر لی اور اس بار کی جانب چل پڑا جس کے بارے میں جیک کا دعویٰ تھا کہ جس وقت اس کی بیوی قتل ہورہی تھی وہ اس وقت اس بار میں بیٹھا ہوا تھا۔

میں اس بار میں عین اس وقت پہنچا جو وقت جیک نے وہاں اپنے پہنچنے کے بارے میں بتایا تھا۔ میرا آئیڈیا تھا کہ اگر اس بار کے باقاعدہ گاہک ہوں گے تو ہوسکتا ہے کہ ان میں سے کسی کو جیک کی وہاں آمد یاد ہو اور وہ گواہی دے دے۔

وہ بار نیز بجیں نامی ایک چھوٹا سا شراب خانہ تھا۔ میں اندر داخل ہوگیا۔ وہاں اتنا اندھیرا تھا کہ اگر میری نانی وہاں موجود ہوتی تو شاید میں اسے بھی پہچان نہ پاتا۔

میں نے ڈائٹ پیپسی کا آرڈر دیا لیکن مجھے کوک پیش کر دی گئی۔ میں بار میں بیٹھ گیا اور چند منٹ تک انتظار کرتا رہا کہ میری آنکھیں اس ماحول میں بہتر دیکھنے کی عادی ہوجائیں۔

پھر میں نے جیک کی تصویر بارٹینڈر کو دکھائی۔

وہ بولا۔ ”کیا یہ وہی شخص نہیں ہے جس کے بارے میں پولیس پوچھتی ہوئی یہاں آئی تھی؟“

یہ بات مجھے اچھی نہیں لگی۔ بارٹینڈر کو جیک کی تصویر تو یاد تھی لیکن بار میں جیک کی آمد کے بارے میں یاد نہیں تھا۔ ”ہاں، یہ وہی ہوسکتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ شخص اب بہت مشکل میں پھنسا ہوا ہے۔“

”ہاں، میرا خیال ہے پولیس والے نے بتایا تھا کہ اس نے اپنی بیوی کو قتل کیا ہے۔“

”اس پر الزام ہے کہ اس نے اپنی بیوی کو قتل.... خیر رہنے دو، یہ بتاؤ کہ اگر میں یہاں موجود گاہکوں سے بات کروں تو تمہیں برا تو نہیں لگے گا؟“ میں نے بارٹینڈر سے پوچھا۔

”تم بات چیت کرسکتے ہو۔“

جیسا کہ ظاہر تھا، مجھے بار میں کسی قسم کی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ جب میں بار سے باہر نکلا تو مجھے ایک منٹ تک ساکت کھڑے رہنا پڑا تب کہیں میری آنکھیں باہر دھوپ میں صحیح دیکھنے کے قابل ہو پائیں۔

جبک کا کہنا تھا کہ بار سے باہر نکلنے کے بعد وہ دائیں جانب مڑ گیا تھا اور پھر گھر جانے کے لیے اپنی کار میں سوار ہوا تھا۔ میں ٹہلتا ہوا کار زر کے بار کے عقبی حصے کی جانب چلا گیا۔ اس کا ایک عقبی راستہ بھی تھا۔ بار کے عین عقب میں ایک پرنٹنگ کمپنی کی عمارت تھی اور اس کی پارکنگ لاٹ کے اطراف میں لوہے کی زنجیروں کا ایک بلند احاطہ بنا ہوا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ انہیں سیکیورٹی کے مسائل درپیش رہے ہوں گے کیونکہ اس بڑے سے احاطے کے حصار کے علاوہ انہوں نے سیکیورٹی کیمرے بھی لگائے ہوئے تھے۔ ایک خراب بات یہ بھی کہ عمارت کے سامنے کے حصے میں کسی نے کیمرے لگانے پر دھیان نہیں دیا تھا۔

پھر میں اپنی کار میں سوار ہو کر اس علاقے کی جانب روانہ ہو گیا جہاں جبک کی رہائش تھی۔

لوگوں کا ایک گروپ جن سے اپنے پیشے کے حوالے سے مجھے پیار تھا وہ پڑوس میں رہنے والی وہ بوڑھی عورتیں تھیں جو ہر وقت کسی نہ کسی کی ٹوہ میں لگی رہتی ہیں۔ وہ عورتیں عام طور پر آپ کو وہ سب کچھ بتا سکتی ہیں جو نہ صرف ان کے محلے میں ہوتا ہے بلکہ پانچ میل دور رہنے والوں کے بارے میں بھی زبردست معلومات فراہم کر سکتی ہیں۔ ان کا فطری تجسس ان کے دائرۂ کار کو وسیع کرتا رہتا ہے۔

مسز گریسی ابابٹ اسی قماش کی ایک بوڑھی خاتون ثابت ہوئیں۔ انہوں نے مجھے اپنے کچن میں مدعو کر لیا جہاں وہ چائے پی رہی تھیں۔

”یہاں اس سہ پہر کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا تھا؟“ میں نے ان سے پوچھا۔

”حقیقت میں تو نہیں۔ البتہ میرے خیال میں یہ ایک نہایت عجیب سی بات کہی جا سکتی ہے کہ ٹھیک اسی وقت ایک پولیس کار اس علاقے میں آئی تھی۔ کیا تم چائے پینا پسند کرو گے؟“

”نہیں میڈم، شکریہ۔ پولیس کار اس علاقے میں کیا کر رہی تھی؟“ میں نے جاننا چاہا۔

”میرا خیال ہے کسی کو ٹکٹ دے رہی تھی۔ انہوں نے اس بلاک کے آخر میں کسی کو روکا تھا۔ میں نے سائرن کی آواز سنی تو یہ دیکھنے چلی گئی کہ کیا ہو رہا ہے۔ جانتے ہو یہاں اطراف میں سائرن کی بہت زیادہ آوازیں سنائی نہیں دیتیں۔“

”نہیں، مجھے نہیں معلوم۔ کیا آپ کو یاد ہے کہ اس وقت کیا بجا ہوگا؟“

”او، ہاں۔“

یہ سن کر مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔

”میں ٹی وی پر اپنی پسندیدہ کہانی سن رہی تھی جو ہر دن چار بجے آتی ہے۔ مجھے اپنی پسندیدہ کہانی کو سنتے ہوئے ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی جب مجھے سائرن کی آواز سنائی دی۔ مجھے اٹھ کر جانا پڑا تو میری کہانی کا ایک بڑا حصہ سننے سے رہ گیا۔“ یہ کہہ کر بوڑھی مسز گریسی نے چائے کا ایک بڑا سا گھونٹ بھرا۔ ”لیکن یقیناً وہ اس کہانی کو دوبارہ بھی پیش کرتے ہیں۔ اگلے روز، پھر اس سے اگلے روز۔“

”ویل، ٹھیک ہے مسز گریسی۔ آپ بے حد مددگار ثابت ہوئیں۔“ یہ کہہ کر میں نے اٹھنا چاہا۔ ”ہائے وا وے، کیا پولیس آپ سے بات کرنے کے لیے یہاں آئی تھی؟“

”اوہ نہیں، لیکن اگر وہ آجاتے تو کتنا لطف آتا؟ تقریباً اتنا ہی لطف جتنا کہ تمہاری یہاں آمد اور تم سے بات چیت کرنے میں آیا۔“ مسز گریسی نے کہا۔

میں نے وہاں سے رخصت ہونے میں عافیت جانی۔

ہیرسن میں جس ایک شخص سے میری گہری دوستی ہو چکی تھی اس کا نام جوزف ہارپر تھا۔ وہ ہیرسن پولیس سے وابستہ تھا۔ کچھ پولیس والے اطراف میں کسی پرائیویٹ سراغ رساں کی موجودگی کا برا مناتے ہیں اور ان سے نفرت کرتے ہیں۔ لیکن جوزف کا کہنا تھا کہ ہم ایک دوسرے کی مدد کر سکتے ہیں۔

اسی لیے میں نے جوزف سے رابطہ کیا اور اس سہ پہر برج اسٹریٹ پر ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی پر کسی کو جرمانے کا ٹکٹ جاری کرنے کے بارے میں دریافت کیا۔ جوزف سے پتا چلا کہ وہ صرف ایک وارننگ ٹکٹ تھا جو جاری کیا گیا تھا لیکن پٹرول کار میں ایک کیمرا لگا ہوا تھا جو تمام وقت ٹی وی پر ریکارڈنگ بھی کر رہا تھا۔

جوزف میرے لیے وہ ٹی وی لے آیا۔ ہم نے ٹی وی چلا کر اس میں گزشتہ منگل کو ریکارڈ ہونے والے مناظر کا غور سے جائزہ لیا تو سہ پہر چار بجے سے کچھ دیر بعد جبک کے ڈرائیو وے سے ایک کار کو نکلتے ہوئے دیکھا۔

کچھ قیمتی کمپیوٹر ورک کے بعد جوزف اس ٹی وی کی تصویروں کو اس حد تک اینلارج کرنے کے قابل ہو گیا کہ جبک کے ڈرائیو وے سے نکلنے والی کار کی نمبر پلیٹ واضح دکھائی دینے لگی۔ پھر ایک دوسرے کمپیوٹر پر چند بار کلک کر کے اس نے ایک نام نکال لیا۔

وہ نام سیسل میلبٹز تھا۔ جوزف نے اس کا پتا بھی نوٹ کر لیا۔

پھر ایک اور شعبے سے سمبوئل میولنز کا ریکارڈ چیک کیا۔ معلومات کے مطابق اسے صرف ایک بار حراست میں لیا گیا تھا۔ وہ بھی شراب پی کر گاڑی چلانے کے الزام میں۔ جب اسے حراست میں لیا گیا تھا تو اس نے اپنی ملازمت کے بارے میں پولیس کو یہ بتایا تھا کہ وہ وینڈل فوڈ پروسیسنگ میں کام کرتا ہے۔ یہ اس علاقے میں موجود متعدد چکن پروسیسنگ پلانٹس میں سے ایک تھا۔

اور جیک بھی اسی پروسیسنگ پلانٹ میں کام کرتا تھا۔

اگلے روز صبح سویرے میں کاؤنٹی جیل پہنچ گیا۔ جیک نے سمبوئل میولنز نامی کسی بھی شخص کو پہچاننے سے صاف انکار کر دیا۔ لیکن جب اس نے یہ بات کہی تو اس کی نظریں فرش پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ مجھ سے نگاہیں ملانے سے گریز کر رہا تھا۔ وہ ضرور کچھ جانتا تھا لیکن مجھے نہیں بتا رہا تھا۔ میں نے اسے اپنا یہ معاہدہ یاد دلایا کہ ہم ایک دوسرے سے سچ بولیں گے۔ لیکن اس کے باوجود اس نے اپنا بیان تبدیل نہیں کیا۔

میں دن کی شفٹ ختم ہونے سے پہلے وینڈل پروسیسنگ پلانٹ پہنچ گیا۔ میں نے پارکنگ لاٹ کا اپنی کار میں بیٹھے بیٹھے جائزہ لیا اور سمبوئل کی کار تلاش کر لی جو مرکزی عمارت کے پیچھے ایمپلائز پارکنگ ایریا میں کھڑی تھی۔

پھر میں واپس مین روڈ پر آ گیا تا کہ سمبوئل کے باہر نکلنے پر اس کی کار کا تعاقب کر سکوں۔ میں انتظار کرنے لگا۔

لیکن یہ میری غلطی ثابت ہوئی۔ یہ ایسا لگا ہوا لینڈ رش کی طرح تھا جب شفٹ ٹائم کے اختتام کا سائرن بجا۔ پارکنگ لاٹ سے نکلنے والی گاڑیوں کے بمپر سے بمپر ملے ہوئے تھے اور ہر کوئی باہر نکلنے کے لیے تیزی دکھا رہا تھا۔ میں نے سمبوئل میولنز کی کار کو پارکنگ لاٹ سے نکلتے ہوئے دیکھا لیکن ٹریفک کا رش اتنا زیادہ تھا کہ میں اس کا تعاقب کرنے کے لیے اس کے نزدیک تک نہیں جا سکتا تھا۔ تعاقب کی قطعی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

تب میں نے اس روٹ پر اپنی کار ڈال دی جو میرے خیال کے مطابق سمبوئل اپنے گھر جانے کے لیے اختیار کر سکتا تھا۔ جب میں اس کے گھر پہنچا تو اس کی کار ڈرائیوے میں موجود تھی۔

میں نے سمبوئل تک براہ راست رسائی کا فیصلہ کیا۔ میں نے سوچا کہ سیدھا اس کے دروازے تک جاؤں اور دیکھوں کہ کیا وہ میرے چند سوالات کے جوابات دینا پسند کرتا ہے۔ اگر اس نے مجھ سے جھوٹ بولا تو پھر میرے پاس اس کی نقل و حرکت کا جائزہ لینے کا بہتر جواز ہو گا۔

جب میں نے اس کے دروازے پر دستک دی تو دروازہ سمبوئل ہی نے کھولا۔ البتہ اس کے ساتھ ایک بڑا سا خونخوار کتا بھی تھا جس کا نام ٹائنی تھا۔ میں نے اپنا پرائیویٹ سراغ رساں کا بیج اس کے سامنے لہرا دیا اور ساتھ ہی یہ بات اس پر چھوڑ دی کہ وہ اس سے کیا نتیجہ اخذ کرتا ہے۔

”کیا میں اندر آ کر تم سے کچھ باتیں کر سکتا ہوں؟“ میں نے پوچھا۔ لیکن ٹائنی کا جثہ دیکھ کر میں اس بارے میں تذبذب میں پڑ گیا۔

”اٹ از او کے، ٹائنی۔ اٹ از او کے بگ بوائے۔“ اس نے اپنے کتے سے مخاطب ہو کر کہا اور فرش کی جانب اشارہ کیا۔ ٹائنی فرش پر بیٹھ گیا۔ ”معاملہ کیا ہے مسٹر۔۔ آں؟“

”دوست مجھے بی جے لی کہہ کر پکارتے ہیں۔“ میں نے اپنے طور پر کولمبو کی بہترین نقل اتارتے ہوئے بتایا۔

”او کے مسٹر کیا معاملہ ہے، بی جے لی؟“ اس نے اسکرین والے دروازے کا تالا کھولے بغیر پوچھا۔

میں نے پہلے ٹائنی اور پھر بند دروازے کی طرف دیکھا اور اندازہ لگایا کہ بند دروازے اور ٹائنی کے باعث اسے میری زیادہ پروا نہیں تھی۔ اگر میں سپر مین بننے کی کوشش کرتا تو پھر ٹائنی کے ہاتھوں میرا انجام یقینی تھا۔

”کیا تم ایکلی وائٹ نامی خاتون کو جانتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے جواب دیا۔ ”مجھے یقین نہیں کہ میں اس نام کی کسی خاتون سے واقف ہوں۔ بس یہی پوچھنا تھا؟“

”اس کے شوہر کے بارے میں کیا خیال ہے۔ اس کا نام جیک وائٹ ہے؟“

”او ہاں، اب مجھے یاد آ گیا کہ ایکلی کون ہے۔ میں اس سے کمپنی کی پارٹیوں میں ایک بار مل چکا ہوں۔ میں پہلے اس کا نام صحیح طور پر سمجھ نہیں پایا تھا۔ جیک اور میں وینڈل پروسیسنگ میں ایک ساتھ کام کرتے ہیں۔“

”کیا تمہیں کبھی جیک کے گھر جانے کا اتفاق ہوا ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”مجھے یقین ہے کہ ایسا اتفاق کبھی نہیں ہوا۔ آخر کار معاملہ کیا ہے؟“

”ایکلی ہلاک ہو گئی ہے اور ہم اس کے ماضی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”اوہ، یہ تو بہت برا ہوا۔ کیا یہ کار کا کوئی حادثہ تھا یا کوئی اور واقعہ پیش آیا ہے؟“

"نہیں، اس کا قتل ہوا ہے۔"

"اور گاڈ! اس طرح اسے شوٹ کرنا تو واقعی بڑا ہولناک ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے وہ خاصی دلکش عورت تھی۔"

میں نے ایملی کی تصویر نکال کر دکھائی۔ "ہاں وہ واقعی بےحد دلکش عورت تھی۔"

ہم دونوں چند لمحوں تک اس کی تصویر کو دیکھتے رہے۔

"ڈیل، وقت دینے کا شکریہ مسٹر سیموئل۔" یہ کہہ کر میں واپسی کے لیے پلٹ گیا۔ ذاتی اپنا خوف تو پہلے ہی میرے ذہن میں بیٹھا چکا تھا لیکن اگر وہ عفریت مجھ پر عقب سے حملہ کر دیتا تو یہ بہت برا ہوتا۔

میرا اگلا سوال خود سے یہ تھا کہ سیموئل نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا تھا۔ بےشک اس کا واحد حقیقی جواب موجود تھا۔ وہ یہ کہ وہ خود اس معاملے میں کسی نہ کسی طرح ملوث تھا۔ اور پھر جیک نے اس سے شناسائی سے انکار کیوں کیا تھا؟ یقیناً اسے پتا لگ جانا تھا کہ میں یہ دریافت کرلوں گا کہ وہ دونوں ایک ہی جگہ کام کرتے ہیں۔

اگلے روز صبح سویرے میں کاؤنٹی جیل چلا گیا۔ میں نے اس شخص کے لیے کچھ ورزشی خرید لیے جو بطور جیلر فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ وہ شخص خوش ہو گیا۔

میں نے جیک کو اس کی کوٹھری کے کنارے پر طلب کر لیا۔ "میں تمہیں صرف یہ بتانے کے لیے آیا ہوں کہ میں اس کیس سے الگ ہو رہا ہوں۔"

"کیا؟ کیوں؟"

"تم نے مجھ سے جھوٹ بولا ہے۔"

"کیسے؟ میں نے کیا جھوٹ بولا ہے؟"

"سب سے پہلی بات سیموئل میولینز سے تمہاری شناسائی سے متعلق ہے۔ تم اس کے ساتھ کام کرتے ہو۔ کیا تم نے یہ نہیں سوچا کہ میں اتنا چالاک نہیں کہ اس بات کا اندازہ لگا لوں گا؟"

"میرا یہ خیال نہیں کہ وہ اس معاملے میں ملوث ہے اور میں اسے اس معاملے میں ملوث کرنا بھی نہیں چاہتا۔" جیک نے جواب دیا۔

"کیوں؟" میں نے زور دیتے ہوئے پوچھا۔

اس نے ایک بار پھر نظریں فرش پر جما دیں۔ "میں بس نہیں چاہتا۔"

"تم جانتے ہو جیک، ایک بات جو خاصی مشکل ہے وہ کسی سے جھوٹ بولنا یا لغو بات کرنا ہوتی ہے۔ اب اگر تم بے گناہ اور معصوم ہو تو تمہیں مجھ سے سچ بولنا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"میں تم سے سچ کہہ رہا ہوں۔" جیک نے کہا۔ "میں اسے اس معاملے میں ملوث نہیں کرنا چاہتا۔"

"سو تم اس شخص کی خاطر جیل جانے کے لیے رضامند ہو؟ یہ وہ کہانی ہے جو میں عام طور پر شوہروں، بیویوں یا عاشقوں کی زبانی سنا کرتا ہوں۔" میں یہ کہہ کر رک گیا۔ مجھے اچانک ہی احساس ہوا کہ میں یہ کیا کہہ گیا ہوں۔

عاشق!

"تو تم دونوں ایک دوسرے کے عاشق ہو، ہے نا؟" میں نے بےساختہ کہا۔ "تم ہم جنس پرست ہو اور یہ ہرگز نہیں چاہتے کہ یہ سچ عیاں ہو جائے۔"

پھر مجھے وہ بات یاد آ گئی جو سیموئل نے کہی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ ایملی کو اس طرح شوٹ کرنا واقعی ہولناک تھا۔ اسے اس بات کا علم کس طرح ہوا تھا؟ میں نے یہ بات تو بالکل بھی نہیں کی تھی کہ ایملی کو شوٹ کیا گیا ہے۔ اور مجھے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ اس حقیقت کو کسی اخبار نے شائع کیا تھا۔ یہ ایک وہ چھوٹی سی حقیقت تھی جو پولیس نے اپنے تک محدود رکھی تھی۔

کیا اس کا یہ مطلب تھا کہ سیموئل نے جیک کی بیوی کو صرف اس لیے قتل کیا تھا کہ اس کا شوہر مکمل طور پر اس کا ہو جائے؟

میں سیدھا اپنے دوست پولیس مین جوزف ہارپر کے پاس چلا گیا۔ میں نے اب تک جو کچھ معلومات... حاصل کی تھیں، وہ جوزف ہارپر کے گوش گزار کر دیں۔

"ڈیل، ہم تمہاری فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں اس معاملے کو چیک کرتے ہیں۔ اس کا جو بھی نتیجہ نکلا، ہم تمہیں باخبر کر دیں گے۔"

مجھے اگلے ہی دن خبر مل گئی کہ پولیس نے سیموئل کے گھر چھاپا مارا تو انہیں وہاں سے ریوالور مل گیا جس سے ایملی کو قتل کیا گیا تھا۔ ساتھ ہی کچھ ایسے محبت نامے بھی ملے جن میں جیک نے جنسی رغبت کا اظہار کیا تھا اور یہ خطوط جیک نے سیموئل کے نام تحریر کیے تھے۔

پولیس نے سیموئل میولنز کو گرفتار کر لیا اور جیک کو رہائی مل گئی۔ البتہ اسے تفتیش میں رکاوٹ ڈالنے کے الزام کا سامنا کرنا پڑا۔

اور میں؟

میں درمیان میں لٹکا رہ گیا کیونکہ مجھے اپنی محنت کے صلے میں ایک دھیلا بھی ہاتھ نہیں آیا۔ البتہ یہ کیس میرے لیے ایک تفریح کا باعث ضرور رہا۔

چور بھوت

مختار آزاد

جو ہم دیکھنا چاہتے ہیں، حالات و واقعات وہی کچھ ہمیں دکھاتے ہیں... ایک شوقین مزاج کا دلچسپ قصہ... سفر میں رہتا... بیش بہا نوادرات کا خزانہ جمع کرتا اور ایسے ہی بہت سے شوق اس کی رگوں میں خون کی طرح دوڑ رہے تھے... اچانک ہی اس کے محل نما گھر کے در و دیوار میں وہی کچھ نظر آنے لگا جسے دیکھ کر اسے تسکین... مسرت اور اطمینان کا احساس ہوتا تھا...

... پر کارنامے سرانجام دینے والے شعبدہ بازی کا ماہر نوجوان

اب تو خیر سب ہی اسے مسٹر جلیکر کہہ کر مخاطب کرتے ہیں لیکن لڑکپن میں سب اسے کن کٹا کہہ کر بلاتے تھے۔ بھلا ہو اس دولت مند عورت جیلن کا جسے چہل قدمی کے دوران میں ایک تیز رفتار کار نے ٹکر مار کر شدید زخمی کر دیا تھا۔ اگر جلیکر اسے گاڑی میں ڈال کر بروقت اسپتال نہ پہنچاتا تو خون زیادہ بہنے کے باعث اس کی موت بھی واقع ہو سکتی تھی۔ جان بچانے کے لیے اس نے یوں شکریہ ادا کیا کہ بھاری رقم خرچ کر کے اس کا مصنوعی کان بنوا دیا۔ گو کہ یہ پلاسٹک کا تھا لیکن اس مہارت اور نفاست سے بنایا گیا تھا کہ چھبیس تیس سال گزرنے کے باوجود وہ ذرا بھی خراب نہ ہوا اور نہ ہی اسے کبھی دیکھ بھال کی کوئی خاص ضرورت پڑی۔

وہ نیویارک کی سڑکوں پر شب و روز بسر کرنے والے بے گھر لڑکوں میں سے ایک تھا۔ ایک دن وہ سڑک کنارے کھڑا تھا کہ ایک اجنبی نے کار روکی۔ ”اے لڑکے... ذرا ادھر آؤ۔ ٹائر بدلنا آتا ہے؟“ اس نے پوچھا۔ وہ عمدہ سوٹ پہنے ہوئے تھا۔

”کار چلا بھی لیتا ہوں۔“ اس نے اعتماد سے جواب دیا۔

”پہلے ٹائر بدل دو۔“ اجنبی نے پرس نکال کر ایک ڈالر کا نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔ یہ اس کے لیے بڑی رقم تھی۔ اس نے نوٹ اُچک کر جیب میں ٹھونسا اور کچھ دیر میں پنکچر ٹائر کی جگہ اسٹپنی لگا دی۔

”بڑی پھرتی ہے ہاتھوں میں۔“ وہ ڈگی بند کر کے پلٹا تو اجنبی نے کہا۔ ”میرے ساتھ چلو، کام دوں گا۔“ اس نے جلیکر کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”چلو...“ وہ خوش ہو کر بولا۔

یوں نیویارک کی سڑکوں سے اٹھ کر وہ ایڈم کے چھوٹے لیکن شان دار گھر میں پہنچ گیا۔ ایڈم ایک شعبدہ باز تھا اور ان دنوں خود اپنا گروپ بنانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ کچھ ہی عرصے میں ایڈم کے شعبدہ باز گروپ نے کام شروع کر دیا۔ اس نے جلیکر کی تربیت کی اور وہ شعبدہ بازی میں اس کے معمول کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔

اگرچہ ایڈم اسے بہت پسند کرتا تھا لیکن اس کے ایک اسسٹنٹ جانسن کو جلیکر ایک آنکھ نہ بھاتا۔ ایک دن نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ اس سے لڑ پڑا۔ غلطی سراسر جانسن کی تھی۔ آخر ایڈم نے اسے نوکری سے نکالنے کا فیصلہ کر لیا لیکن اگلے دن اس کا مقامی تھیٹر میں شو تھا۔ وہ اس وقت کچھ نہ بولا لیکن نہ جانے جانسن نے کس طرح یہ بات بھانپ لی اور پھر اگلے روز جو کچھ ہوا، اس نے جلیکر اور ایڈم دونوں کی زندگی کا رخ بدل دیا۔

ہال بھرا ہوا تھا۔ شو اختتام پر تھا۔ اب ایڈم کو اپنا ایک اہم شعبدہ دکھانا تھا۔ اس کے لیے معمول تھا جلیکر۔ اس شو میں ایڈم سب سے پہلے ایک، ایک کر کے معمول کے دونوں کان اور پھر گردن کاٹ کر سر ہاتھ میں تھام لیتا۔ جانسن اس پورے تماشے میں ایڈم کا مددگار تھا۔

شعبدہ شروع ہوا۔ جلیکر اسٹیج پر رکھے کاؤچ پر لیٹا

تھا۔ بظاہر سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ رکی ڈراما بازی کرنے کے بعد ایڈم آگے بڑھا۔ سرخ مخمل سے ڈھکی پلیٹ میں چاقو رکھا تھا۔ ایڈم نے چاقو مانگا تو جانسن نے پلیٹ آگے بڑھائی۔ بلیکر کے چہرے کا داہنا حصہ ناظرین کے سامنے تھا۔ جانسن نے ایک ہاتھ سے اس کا کان پکڑ کر کھینچا اور دوسرے سے بھرپور قوت کے ساتھ چاقو چلا دیا۔ اس کے ساتھ ہی بلیکر کی زوردار چیخوں سے ہال گونج اٹھا۔ بلیکر کا کان کٹ کر لٹک رہا تھا۔ اس کے چیختے ہی جانسن تو تو دو گیارہ ہوا مگر ایڈم پکڑا گیا اور پھر اسے عدالت نے دس برس قید کی سزا سنا دی۔ بلیکر کو اسپتال پہنچایا گیا لیکن کان نہ جڑ سکا۔ وہ ایک بار پھر اپنے کان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

اس واقعے نے بلیکر کی پوری زندگی بدل دی۔ اسے شعبدہ بازی اور ماورائیت سے نفرت ہو گئی تھی۔ کچھ عرصے بعد اس نے پولیس میں نوکری کی اور بیس برس کی ملازمت کے بعد ریٹائرمنٹ لے کر سراغ رسانی کے لیے اپنا دفتر کھول لیا۔ وہ سراغ رساں تھا لیکن اس کا کام عام سراغ رساں جیسا نہ تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ لوگوں کے دلوں اور ذہنوں سے بھوت پریت اور آسیب جیسے خیالات کا خاتمہ کر کے انہیں حقیقت پسندی کی طرف لائے۔ وہ صرف ایسے ہی کیس لیتا تھا جس میں ماورائیت کا کوئی عمل دخل ہو۔ دوسری خوبی یہ تھی کہ وہ بنا فیس لیے کام کرتا تھا لیکن دفتری اخراجات اور لاگت کے نام پر خرچ ضرور وصول کرتا۔ ویسے بھی تنہا زندگی بسر کرنے والے بلیکر کی گزر بسر کے لیے پنشن کافی تھی۔

☆☆☆

ملاقات طے شدہ تھی۔ دو روز پہلے ہی اس نے بلیکر سے رابطہ کر کے مدد کی درخواست کی تھی۔ گوگل ریسرچ کے مطابق اسی برس کا لیڈ باکس نیویارک کا سابق اسٹاک بروکر تھا۔ اسٹاک مارکیٹ سے کئی پھولے پھلے، کچھ کنگال ہے لیکن کلائنٹ کا جو بھی حشر ہوا سو ہوا، کمپنیاں چاہے آگے بڑھیں یا زوال پذیر ہوئیں لیکن باکس کا ستارہ ہمیشہ روشن رہا۔ چند برس قبل بیوی کی موت کے بعد باکس عملاً کاروبار سے ریٹائر ہو چکا تھا اور ان دنوں وہ گھر پر رہتا تھا۔ اس کا سب سے بڑا شوق تاریخی نوادرات جمع کرنا تھا۔ گوگل پر ریسرچ سے ہی اسے یہ پتا چلا کہ باکس کے کلیکشن میں نہایت قیمتی نوادرات شامل ہیں جن کی قیمت کروڑوں ڈالرز تک ہو سکتی ہے۔ اس کی مرحومہ بیوی کو بھی نوادرات کا شوق

تھا۔ وہ ایک میوزیم میں بطور کیوریٹر کام کرتی تھی۔ اس نے ریٹائرمنٹ تک اسی عہدے پر کام کیا تھا۔

اطراف پر نظر ڈالتا ہوا بلیکر سست رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا۔ آخر نوکٹی اسٹریٹ سے مڑتے ہی اسے اپنا مطلوبہ گھر نظر آ گیا۔ شہر کے کھلے مضافاتی علاقے میں سفید اور کریم کلر کی وہ عمارت سب سے منفرد تھی۔ احاطے میں داخل ہو کر اس نے گاڑی روکی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا۔ وہ گہری نگاہوں سے عمارت کا جائزہ لے رہا تھا۔ انیسویں صدی کے وکٹورین طرز کی وہ عمارت خاصی دلکش اور اپنے مالک کے ذوق کی آئینہ دار تھی۔ وہ جن بھر سیڑھیاں چڑھ کر وہ دالان میں پہنچا تو نفیس سوٹ میں ملبوس، پالش شدہ آبنوسی رنگت کی کرسی پر براجمان، ہاتھ میں گلاس تھامے ایک بوڑھا اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔

”شام بخیر...“ وہ سمجھ گیا کہ یہی اس کا نیا کلائنٹ ہو سکتا ہے۔ ”میں بلیکر ہوں۔“

”اوہ... مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔“ اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ”بیٹھیے۔“

”لگتا ہے خاصی گرمی ہے آج۔“ باکس نے پیڈسٹل فین کا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

”یس سر!“ بلیکر نے مسکرا کر جواب دیا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کی چند بوندیں نمودار ہو چکی تھیں۔ سانس بھی ہلکی سی پھول رہی تھی۔

”کیا پئیں گے آپ؟“

”شکریہ...“ بلیکر مسکرایا۔ ”ایک گلاس ٹھنڈا پانی مل جائے تو مناسب رہے گا۔“

”میرے پاس اس سے بہتر آپشن بھی ہے۔“ باکس مسکرایا۔ ”کیوں نہ تازہ اور ٹھنڈا لیمن اسکواش پیا جائے؟“

وہ پھر مسکرا دیا۔ باکس نے ملازم کو اشارہ کیا۔ ”ویسے ایک اور آپشن بھی ہے۔“

بلیکر نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”اس گرم ماحول کے بجائے اگر آپ چاہیں تو دفتر میں بیٹھ کر بھی بات کی جا سکتی ہے۔ ائیر کنڈیشن ہی اس گرمی کا توڑ ہے۔“

”جیسا آپ چاہیں... ویسے میرے خیال میں دفتر ہی مناسب رہے گا۔“

یہ سنتے ہی باکس اپنی جگہ سے اٹھا۔ ”آئیے...“ بلیکر بھی اس کے پیچھے پیچھے گھر کے اندر داخل ہو گیا۔

گھر اندر سے بھی بہت بڑا تھا۔ ہال سے گزرتے ہوئے وہ آگے بڑھے۔ دائیں ہاتھ پر کچن تھا۔ بلیکر نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ شیف اپنے کام میں مشغول تھا۔ آگے بڑھے تو لائم نظر آیا۔ وہ باکس کا ریسرچ، پرسنل اسسٹنٹ اور اس کے جمع کردہ نوادرات کا کیٹلاگ بناتا تھا۔ ابھی وہ سیڑھیوں سے ذرا دور تھے کہ اس کی نظر باڑس کیپر جینیفر پر پڑی۔ وہ فون پر اس کو رٹیر یوا نے پر بگڑ رہی تھی جسے نئے خریدے گئے نوادرات لانے کے لیے شہر بھیجا تھا۔

گزشتہ روز فون پر ہونے والی طویل گفتگو میں باکس اپنے گھر میں کام کرنے والے تمام لوگوں کے بارے میں اسے تفصیل سے بتا چکا تھا۔ اسی لیے ان سب کو پہچاننے میں اسے کوئی دقت پیش نہ آئی۔ باکس غریب پیدا ضرور ہوا تھا لیکن اب غریب نہیں رہا تھا۔

گھر کے ہر کونے سے باکس کی عیاشیوں کی جھلک واضح تھی۔ بلیکر اس طرح کے تعیشات کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا لیکن وہ باکس تھا۔ مزاج اور دولت، دونوں لحاظ سے انیسویں صدی کے کسی برطانوی نواب کی طرح رہنے والا۔ وہ نسلاً تو انگریز نہیں بلکہ اس کے شوق بھی انہی کی طرح کے تھے۔ اسے زندگی گزارنے کی تگ و دو کے بجائے اپنے شوق کی فکر رہتی تھی۔ اس کے گھر میں قدیم قلمی مخطوطات، پرانی کتابوں، قیمتی تصاویر اور طرح طرح کے بیش قیمت نوادرات کا ایک بڑا ذخیرہ تھا، جنہیں ترتیب دینے، حفاظت اور پھر ان سب کا ریکارڈ رکھنے کے لیے، کیٹلاگ بنانے پر نیویارک اسٹیٹ میوزیم کا ایک ریٹائرڈ افسر مامور تھا۔

باکس کا کلیکشن اتنا زیادہ بڑا تھا کہ اس کے ملازمین کو انہیں حفاظت سے رکھنے کی فکر ہر وقت رہتی تھی۔ ابھی وہ جگہ بنا کر کسی ایک شے کو رکھتے کہ دو اور مزید چلی آتیں۔ صورت حال یہ تھی کہ اس وقت باکس کے وسیع و عریض گھر میں کلیکشن کو رکھنے کے لیے جگہ کم پڑتی جا رہی تھی۔ اب تک بلیکر اس کے کلیکشن کو جتنا دیکھ چکا تھا، وہ نیویارک شہر کے بارے میں تھا۔

”ویسے ہی پوچھ رہا ہوں۔“ باکس نے دوستانہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔ ”کیا تمہارا تعلق نیویارک کے معروف بلیکرز خاندان سے ہے؟ یہ نام شہر کے تجارتی حلقے میں کئی بار سن چکا ہوں۔“

بلیکر نے ہنکارا بھرا۔ وہ سوال سن کر ذرا گڑبڑا گیا تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ خود اسے بھی اپنی ذات سے متعلق سچائی کا علم نہ تھا۔ وہ اپنے والدین، خاندان اور اس کے ورثے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ دراصل یہ نام اس نے خود اختیار کیا تھا ورنہ تو وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ اسے جنم دینے والی ماں نے اس کا نام کیا رکھا ہوگا۔ ''یہ دفتر کم اور اسٹڈی زیادہ لگتا ہے۔'' اس نے کمرے میں چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''دفتر کس طرف ہے؟''

بلیکر نے اس کا سوال نظرانداز کرتے ہوئے بات کا رخ گھمانا چاہا۔

باکس نے اس کے سوال پر کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ شیشے سے بنے ایک بڑے شوکیس کی طرف متوجہ تھا۔ ''اس میں میری نوعمری کی یادیں ہیں۔'' اس نے شوکیس کو چھوتے ہوئے کہا۔ بلیکر نے بھی شوکیس میں جھانکنے کی کوشش کی۔ اس کے اندر امریکا کے مجسمۂ آزادی کے بہت سے چھوٹے ماڈل قطار کی صورت سجے تھے۔

''یہ ہاتھ سے بنا ہے۔'' باکس نے شوکیس کے اندر رکھے چھوٹے سے مجسمۂ آزادی کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔

بلیکر نے بھی اسے دیکھا۔ وہ مٹی سے بنا ایک عام سا مجسمہ تھا جس پر تانبے سے ملتا جلتا رنگ کیا گیا تھا۔ ''بہت خوب۔'' اس نے باکس کا دل رکھنے کی خاطر کہا۔

''یہاں پہلی بار میں اس وقت گیا جب اسکول میں پڑھتا تھا۔ اس کے بعد نو میں لگ بھگ ہر سال یہاں جاتا اور اس سفر کے لیے اپنے جیب خرچ کی ایک ایک پائی جوڑ کر رکھتا تھا۔'' باکس نے ایک بار پھر بڑی چاہت سے شوکیس پر نظر ڈالی۔ ''تمہیں معلوم ہے میں نے بحری جہاز کا پہلا سفر مجسمۂ آزادی کی سیر کے لیے کیا تھا اور اس کے بعد تیس سال کی عمر میں زندگی کے پہلے دس لاکھ ڈالرز کمانے تک، میں سال میں چار بار بحری سفر ضرور کرتا تھا۔''

''بہت خوب۔'' بلیکر کا لہجہ تعریفی تھا۔

''میں سال کے چاروں موسموں میں یہاں جاتا اور ہر بار مجسمۂ آزادی کا ایک ماڈل خریدتا۔ میرے لیے ہر ایک ماڈل سال کا ایک موسم ہے۔''

یہ سن کر بلیکر تھوڑا سا آگے کی جانب جھکا اور شوکیس میں جھانکا۔ ''یہ تو بہت سارے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''جانتا ہوں۔'' باکس نے خوشی سے کہا۔ ''تم جانتے ہو، اس شوکیس کو جس کاریگر نے بنایا، اس کا کہنا تھا کہ اس میں دو سو ماڈل رکھنے کی گنجائش ہے اور اب تک...'' باکس نے توقف کیا اور اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ ''یہ ایک سو اکیس تو ہو چکے ہیں۔'' اس نے شوکیس کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔

''دراز...''

''کاریگر کے مشورے کا مطلب ہے کہ اب بھی اس میں اتنے ہی ماڈل رکھنے کی گنجائش ہے یعنی اتنا ہی سفر۔''

''یہ بات تو ہے۔'' اس نے سر ہلایا۔

''لیکن تم یہ میرے نئے مشغلے بھی تو دیکھ رہے ہو نا اب یہاں جانے کے لیے وقت نکالنا کم اہم مسئلہ نہیں ہے۔'' اس کے لہجے میں ہلکی سی تشویش تھی۔

بلیکر نے مسکرانے پر اکتفا کیا۔

باکس مسکراتے چہرے کا مالک تھا لیکن یکبارگی اس پر شدید سنجیدگی طاری ہوگئی۔ یہ دیکھ کر وہ بھی پریشان ہو گیا لیکن چند لمحوں بعد وہ یکدم کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ ''میں یہ سارے سفر کروں گا۔ ہم ساتھ چلیں گے۔''

''بالکل... لیکن پہلے وہ کام جس کے لیے آپ نے مجھے بلایا ہے۔'' یہ کہہ کر بلیکر مسکرا دیا۔ اس کا دماغ بدستور سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ باکس نہ جانے کہاں کہاں کی بات کر رہا ہے۔

''اچھے، کام کی بات کرتے ہیں۔'' بلیکر نے خالی گلاس تپائی پر رکھا تو باکس کھڑا ہوا اور اسے لے کر کمرے سے باہر نکلا۔

''ہم تیسری منزل پر جا رہے ہیں، وہیں میرا دفتر اور نوادرات کا ذخیرہ ہے۔''

سیڑھیاں چڑھنے کے بعد وہ تیسری منزل کے وسیع و عریض ہال میں پہنچے۔ جگہ جگہ لوہے کی بڑی بڑی الماریاں، شیشے کے شوکیس اور بڑے بڑے صندوق رکھے تھے۔ ''یہ نیویارک کے سب سے پہلے سگار برانڈ ''ہانا'' کے اولین سگار ہیں۔'' الماریوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے باکس ایک شوکیس کے سامنے رکا۔ اس میں طرح طرح کے سگار بڑی نفاست سے رکھے گئے تھے۔

''بہت عمدہ ذخیرہ ہے۔''

باکس تعریف سن کر مسکرا دیا۔ ''میرا گھر نیویارک کی تاریخ کا میوزیم ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھا۔ آخر وہ ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ بھی طرح طرح کے سامان سے اٹا پڑا تھا۔ باکس آگے بڑھا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

اس کی پشت پر ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی جہاں سے روشنی اندر آرہی تھی۔

اس سے چند قدم کے فاصلے پر بلجیر ایک قد آدم تصویر کے سامنے کھڑا اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ انیسویں صدی کی یہ آئل پینٹنگ نیویارک کی تاریخ کے کسی غیر معروف سیاست داں کی تھی۔ وہ پلٹا اور چاروں طرف دیکھا۔ وہاں تابوت نما لوہے کے کئی بڑے صندوق رکھے تھے۔ اسے یقین تو نہیں تھا اور نہ ہی اس نے ایسا ہوتا دیکھا تھا مگر پھر بھی وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں نیویارک کی تاریخ کے مشہور جج اور ماہر قانون کارڈز اور جان لینزنگ کی حنوط شدہ لاشیں بھی یہیں کہیں نہ ہوں۔ نیویارک کی تاریخ سے باکس کا عشق جنون کی حد تک تھا اور ایسا شخص کچھ بھی کر سکتا ہے۔ یہ سوچ کر وہ دل ہی دل میں مسکرا دیا۔

''آؤ... یہاں بیٹھو۔'' آخر باکس نے مداخلت کی تو وہ آگے بڑھا اور کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

اسی دوران میں باکس نے اپنی کرسی ایک طرف دھکیلی۔ ''میرے کندھے سے اوپر کی طرف دیکھو۔'' اس نے بلجیر کو مخاطب کیا۔ ''پیچھے وہی لان ہے جس کے بارے میں فون پر بات کی تھی۔'' باکس کھڑا ہوا۔ کھڑکی سے باہر کا منظر صاف نظر آرہا تھا۔ بلجیر بغور دیکھنے لگا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم بعد میں اسے تفصیل سے بھی دیکھنا چاہو گے۔'' چند لمحوں کے بعد اس نے سیدھا ہوتے ہوئے کہا۔

بلجیر بھی اپنی جگہ بیٹھ چکا تھا۔ ''ضروری نہیں۔'' اس نے شائستگی سے یہ خیال رد کیا۔ ''میرا خیال ہے کہ پہلے ہم یہ طے کرلیں کہ کام کب سے شروع کرنا ہے اور ساتھ ہی رقم مل جائے تو...'' یہ کہہ کر اس نے پھر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ ''اس کے بعد ہی میں ان سب جگہوں کا تفصیلی معائنہ کروں گا جن سے متعلق فون پر بات ہوئی تھی۔''

''اور...'' باکس نے جواب دیا۔ ''میں نے نیویارک ٹائمز میں تمہارے اوپر ایک مضمون پڑھا تھا جس میں لکھا تھا کہ تم کام سے پہلے فیس وصول کرنے والوں میں سے ہو۔''

بلجیر مسکرایا۔ ''یہ کچھ زیادہ غلط بھی نہیں مگر میں فیس نہیں صرف اخراجات وصول کرتا ہوں۔ میری خدمات بالکل مفت ہیں۔''

''وہ مضمون یقیناً کہیں رکھا ہوگا، تمہیں اگر دیکھنے کی ضرورت پڑے تو میں اسے تلاش کر سکتا ہوں۔'' باکس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

بلجیر کو گرمیوں میں ہاتھوں پر پسینا آنے کی شکایت تھی جس کی وجہ سے وہ کاٹن کے سفید دستانے پہنے رہتا تھا۔ اس نے باکس کی بات کا جواب دینے کے بجائے ہاتھ سے دستانے اتار دیے۔ وہ پسینے سے تر ہو رہے تھے۔ اسے یاد تھا کہ وہ جس مضمون کا ذکر کر رہا ہے، وہ تین ماہ پہلے نیویارک ٹائمز کے سنڈے ایڈیشن کی میٹروپولیٹن ڈائری والے حصے میں شائع ہوا تھا جس میں اس کی شخصیت کو کچھ اچھے انداز سے بیان نہیں کیا گیا تھا۔ رپورٹر نے اسے چھچھورا، چالاک اور غیر ضروری کاموں میں ہاتھ ڈالنے والا غیر مناسب سراغ رساں قرار دیا تھا۔ بلجیر نے ایک بار اسے پڑھا اور اخبار ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ وہ اسے دوبارہ پڑھنا تو درکنار دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اسے باکس کے منہ سے اس مضمون کا تذکرہ بالکل بھی اچھا نہیں لگا۔

''تم نے بتایا نہیں کہ وہ مضمون...''

''نہیں...'' بلجیر نے اس کی بات کاٹی۔ ''جس کیس کے پس منظر میں لکھا گیا وہ غیر متعلق ضرور ہو سکتا ہے لیکن جس مضمون کا تم ذکر کر رہے ہو، بنیادی طور پر اس کی کوئی وقعت نہیں... کم از کم میری نظر میں۔'' یہ کہہ کر اس نے باکس کی طرف دیکھا اور لمحہ بھر توقف کے بعد کہا۔ ''کیا یہ بھی اس سے کچھ ملتا جلتا معاملہ ہے؟'' اس کا لہجہ استفساریہ تھا۔

''اگر تمہیں ناگوار نہ گزرے تو ایک بات کہنا چاہوں گا۔'' بلجیر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''تم اپنی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کے اس طرح استعمال کی اجازت کیسے دے سکتے ہو؟'' باکس نے بات مکمل کر کے اس کی طرف غور سے دیکھا۔

''میرا خیال ہے کہ اس مضمون میں پورے معاملے کا بخوبی احاطہ کیا گیا تھا۔'' اس نے باکس کے بجائے چھت کی طرف نظر ڈالتے ہوئے نرم لہجے میں جواب دیا۔

''اس کا تو میں بھی اعتراف کرتا ہوں۔''

''وہ بہت دولت مند تھی آپ کی طرح مگر شاید وہ بھی چاہتی تھی کہ بھوت ہو یا نہ ہو، میں اس کا خیال درست ثابت کردوں اور یقین دلاؤں کہ اس کے فارم ہاؤس میں بھوت رہتے ہیں حالانکہ ایسا حقیقت میں نہ تھا۔'' بلجیر نے گہری سانس لی۔ ''معاملے کی چھان بین کرتے ہوئے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ سب کچھ اس کی خام خیالی تھی لیکن اس نے میرے بعد کسی اور کی مدد لی جس نے یہ ثابت کر دیا کہ وہاں واقعی بھوت ملے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور معاملہ شناس تھا۔ جو وہ سننا چاہتی تھی، اس نے وہی سنایا اور ضرور بھاری

رقم بھی اینٹھی ہوگی۔ بس! یہی وہ بات ہے کہ رپورٹر نے لکھ دیا کہ میں فضول ہوں۔" اس نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ چہرے کے تاثرات سے محسوس ہو رہا تھا کہ اس تذکرے سے اسے تکلیف پہنچتا ہے۔

"بہت دولت مند ہوگا وہ ماہر۔" اسے خاموش دیکھ کر باکس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "دولت اور معاملہ شناسی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔"

"بالکل درست..." ہیلبگر کا ردعمل فوری تھا۔

"ایک اور بات بھی کہنا چاہتا ہوں۔ کیا تم غیر معمولی کیسز کی تلاش میں شہر بھر کا چکر لگاتے رہتے ہو؟" باکس نے لمحہ بھر توقف کیا۔ "تاکہ تمہیں اس طرح کے معاملات کا چیمپئن سراغ رساں تصور کیا جاسکے۔"

ہیلبگر نے کوئی جواب نہ دیا۔ اب وہ اس گفتگو سے چڑنے لگا تھا۔ اسے یہ ساری باتیں غیر ضروری اور کسی حد تک اپنی ذات پر حملے کی طرح لگ رہی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہے جا رہا ہے، اس کی یہاں قطعی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ کمرے میں ائرکنڈیشن چل رہا تھا لیکن اس کے باوجود اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمایاں تھے۔

"میری طرح کے بہت سے دولت مندوں سے تم مل چکے ہوگے۔" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد باکس نے پھر گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔

"میرے بہت سارے کلائنٹ ہیں اور اکثر شاید تم سے بھی زیادہ دولت مند اور مصروف لوگ تھے۔" ہیلبگر کا لہجہ جارحانہ تھا۔

"بے چارے..." باکس نے دبے لہجے میں کہا۔ اس کے لہجے سے طنز صاف نظر آرہا تھا۔

اب اسے لگا کہ بس بہت ہو چکا۔ اس نے خشمگیں نگاہوں سے باکس کو دیکھا۔ اس نے الفاظ چبا چبا کر بولنا شروع کیا۔ "بظاہر ان سب میں سے کسی ایک نے بھی نیویارک ٹائمز کا وہ مضمون سرے سے پڑھا ہی نہیں تھا، جو آپ کو منہ زبانی یاد ہے سارے کا سارا۔"

"اوہ... لگتا ہے تم برا مان رہے ہو۔"

"دیکھو..." اس نے سخت لیکن مہذب لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "اگر اس کام کے متعلق سنجیدہ ہو تو پھر جیسا کہ میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ یہ ذرا مختلف نوعیت کا کیس ہے اور کسی ماہر کی خدمات حاصل کرنے کے لیے مجھے رقم کی ضرورت ہے۔"

"کس طرح کا ماہر؟"

"ان بارے میں تم سے زیادہ اچھا میں سمجھ سکتا ہوں۔" اس نے غصیلے لہجے میں کہا۔ "مجھے کچھ آلات کی ضرورت ہوگی جیسا کہ کیمرا وغیرہ۔" یہ کہہ کر اس نے چند لمحوں کا توقف کیا۔ "ان سب کے لیے مجھے رقم کی ضرورت پڑے گی۔"

"لیکن نیویارک ٹائمز نے تو لکھا تھا کہ تم خدمات کا معاوضہ نہیں لیتے؟"

"آپ کچھ بھول رہے ہیں۔" ہیلبگر نے باکس کی بات کاٹی۔ "وہاں یہ بھی لکھا تھا کہ غیر معمولی کیسز میں میری خدمات مفت ہیں لیکن اس پر آنے والا خرچ پیشگی وصول کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے باکس کی طرف دیکھا۔ "میں کیس کے دوران اگر کسی ماہر کی خدمات حاصل کرتا ہوں تو اسے بھی پیشگی ادائیگی کرتا ہوں۔ اوپر سے میرا دفتر ہے، فیکس، ٹیلی فون اور اس دوران سفر کے لیے گاڑی بھی چاہیے ہوتی ہے اور میری گاڑی صرف پیٹرول سے چلتی ہے۔" باکس کے منہ سے 'مفت خدمات' کا سن کر اسے غصہ آچکا تھا۔

باکس نے ہنکارا بھرا تو ہیلبگر پھر شروع ہوگیا۔ "میں نے آپ کو فیکس بھیج دیا تھا جس میں میری خدمات کی تمام شرائط اور قواعد تحریر تھے، لہٰذا بہتر ہے کہ اس طرح کم از کم اب مجھ سے نیا کھیل نہ کھیلیں۔"

"یہ بات تو ہے۔" کچھ دیر تک سوچنے کے بعد باکس نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تمہارا فیکس میرے دفتر میں کہیں پڑا ہوگا۔"

"ویسے ایک مشورہ ہے اور بالکل مفت۔"

باکس نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"آپ اپنا مکمل اور تفصیلی نفسیاتی معائنہ ضرور کرائیں، شاید اس کی آپ کو اشد ضرورت ہے۔"

"مجھے بالکل کہنا مجلس از وقت ہوگا۔" باکس مسکرایا۔

"یہ ذاتیات کی بات نہیں۔" ہیلبگر نے جواب دیا۔ "ایک اچھا سراغ رساں ایک ایک کر کے تمام آپشنز آزماتا جاتا ہے۔ میں ہمیشہ سے یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں کہ کہاں پر کھڑا ہوں۔"

"تم جانتے ہی ہو کہ ہم کہاں کھڑے ہیں۔ یہ تو میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔"

"مسٹر باکس... یہاں بھوت جیسی کوئی شے نہیں ہے۔" یہ کہہ کر اس نے اطراف پر نظر ڈالی۔ "میری ابتدائی

دانے کے مطابق یہ آپ کا وہم ہوسکتا ہے یا پھر کسی کی کوئی چال...''

''یعنی میں جو کچھ دیکھتا آرہا ہوں، جو سمجھ رہا ہوں، وہ میرا پاگل پن ہے؟''

''بالکل نہیں...'' جلبر نے آہستہ سے کہا۔ ''پاگل پن وہم سے بہت آگے کی بات ہے۔''

''اوکے...'' باکس نے ہنکارا بھر کر کہا۔ ''اگر میں تمہاری بات پر یقین کرلوں تو پھر میری مرحومہ بیوی کا آنا، اس کا اپنا پسندیدہ سوئٹر پہننا، لان میں شیڈ کے پاس جاکر بیٹھنا، یہ سب کیا ہے؟'' یہ کہہ کر اس نے جلبر کو گھورا۔ ''ہر ہفتے، ایک مخصوص دن یہ سب کچھ ہونا، اس کی کیا وضاحت ہوسکتی ہے تمہارے پاس؟''

''ایسا ہر ہفتے ہوتا ہے؟'' جلبر نے پوچھا۔

''ہر ہفتے لیکن صرف ایک بار اور وہ بھی بدھ کو۔'' باکس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''مطلب کہ ہر بدھ کو...'' جلبر نے خود کلامی کی۔

''اس کے آنے کا کوئی خاص وقت؟'' اس نے پوچھا۔

''سورج ڈھلنے سے لے کر رات تک۔ جب میں گھر پہنچا ہوتا ہوں۔''

''تم نے کبھی اسے چھو کر دیکھا ہے؟''

''نہیں میں چھو نہیں سکا، دو چار بار کوشش کی لیکن اس نے چھونے ہی نہیں دیا۔ ہمیشہ پیچھے ہٹ گئی۔''

''اور یہ بدھ کا چکر کیا ہے؟''

''یہ میری زندگی کا بہت مبارک دن ہے۔'' باکس کے چہرے پر مسرت کے تاثرات تھے۔ ''جینی دیکھا کہ میں اور جیسی بھی بدھ کو ملے تھے۔ بدھ کا دن میرے لیے بہت خاص ہے اور ایسا شادی سے دو سال قبل محسوس ہونا شروع ہوا۔ ہم دونوں بھی پہلی بار میٹروپولیٹن میوزیم آف آرٹ میں واقع ویٹنڈ وینچیل میں ملے تھے۔ جس دن ہم پہلی بار اکٹھے کافی پینے ویسٹ 67 اسٹریٹ پر واقع کیفے ڈی بن پہنچے، وہ بھی بدھ کا دن تھا۔ مجھے تو یہ بھی یاد ہے کہ ہم نے کون سی کافی پی تھی۔''

''واقعی...''

''ہاں... تم جانتے ہو جس دن پہلی بار میرا بینک اکاؤنٹ دس لاکھ ڈالرز سے بڑھا، وہ بھی بدھ کا دن تھا۔''

''حیرت انگیز لیکن یہ اتفاق بھی ہوسکتا ہے۔''

''جسے تم اتفاق کہتے ہو وہ ایک دو بار ہوسکتا ہے لیکن میری زندگی میں ایسا تواتر سے ہوا اور تم دیکھ رہے ہو کہ اب میری عمر کتنی زیادہ ہوچکی ہے۔''

جلبر خاموش رہا۔

''معاف کرنا میں کچھ بہک گیا تھا۔'' کچھ دیر بعد اس نے خاموشی توڑی۔

''کوئی بات نہیں۔'' جلبر کا لہجہ ایک بار پھر دوستانہ ہوگیا۔ کچھ دیر پہلے اس کے لہجے میں محسوس ہونے والی تلخی کہیں غائب ہوچکی تھی۔ ''آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں، شوق سے کہیے۔''

''بات یہ ہے کہ میری مرحومہ بیوی جیسی ہر بدھ کو اپنے گھر، اپنے شوہر اور اپنے پسندیدہ سوئٹر کے پاس پلٹ کر آتی ہے۔''

''اور ایسا گزشتہ کئی ماہ سے ہو رہا ہے۔'' جلبر نے لقمہ دیا۔

''بالکل ٹھیک۔''

''تمہاری خوش نصیبی اور بدھ کے اس تعلق کے بارے میں کتنے لوگ جانتے ہوں گے؟'' جلبر کے دماغ میں بدھ اٹک کر رہ گیا تھا۔

''بہت سارے لوگ۔'' باکس نے کہنا شروع کیا۔ ''میں جب اسٹاک بروکر تھا تب بھی کلائنٹ کو ہمیشہ بدھ کے دن سرمایہ کاری کا مشورہ دیتا تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ کوئی اور دن تھا۔ مارکیٹ میں تیزی تھی۔ کلائنٹ کو منع کیا مگر اس کے اصرار پر سرمایہ کاری کرنی پڑی لیکن وہ تیزی اچانک مندی میں بدلی اور کلائنٹ کنگال ہوگیا۔ اس کے برعکس بھی ہوا۔ بدھ کا دن تھا، کمپنی شیئرز ڈاؤن جا رہے تھے مگر میرے مشورے پر کلائنٹس نے سرمایہ لگایا اور پھر چند روز میں وہی شیئرز آسمان کو چھونے لگے۔''

''یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔'' جلبر نے کہا۔ اسے یہ کہانی دلچسپ لگی تھی۔ ''ویسے تمہارے خیال کے مطابق جیسی کا بدھ کو نظر آنا بھی خوش نصیبی کی علامت ہوسکتی ہے؟''

''یہ تو ہے۔'' باکس نے تیزی سے اثبات میں سر ہلایا۔ ''مگر میں یقین کے ساتھ اس بارے میں فی الحال کچھ کہہ نہیں سکتا۔''

''اچھا وہ تمہیں نظر کیوں آتی ہے اور وہ بھی صرف بدھ کو؟'' اس کا لہجہ سوالیہ تھا۔

''لگتا ہے کہ وہ مجھے کچھ بتانا چاہتی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ جلبر کی پوری توجہ اس پر تھی۔ ''مسٹر جلبر... کیا تم اپنی سب سے عزیز شے کو کھو دینے کا دکھ جانتے ہو؟'' باکس کا لہجہ بھرا گیا۔ ''ایک ایسا شخص جسے آپ

اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہوں اور وہ آپ کی آنکھوں کے سامنے دیکھتے ہی دیکھتے مرجائے۔ تم اس تکلیف وہ تجربے کو جانتے ہو؟ شاید نہیں۔ یہ وہی جانتا ہے جو اس سے گزرے اور میں گزر چکا ہوں۔" باکس کی آنکھیں نم ہو چکی تھیں۔

"افسوس..." جلیگر نے گہری سانس بھر کر کہا۔ "کیا میں وہ سوئٹر دیکھ سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں، میرے لیے وہ بہت یادگار سوئٹر ہے۔ بڑی حفاظت سے رکھا ہے اسے۔" باکس نے فوراً ہامی بھر لی۔ "وہ بہت خوبصورت رنگوں والا سوئٹر ہے۔ اسے کروشیا کے ذریعے بنا گیا تھا۔ اس میں آگے کی طرف نارنجی رنگ کے چھ بڑے بڑے بٹن لگے ہیں جنھیں سفید اون کے ذریعے ٹانکا گیا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے چھت کی طرف دیکھا۔ "اُسے بہت پسند تھا اور اُس پر خوب جچتا تھا۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں چمک اتر آئی۔ لگتا تھا کہ وہ تخیل کی آنکھ سے نینسی کو دیکھ رہا ہو۔

"سوئٹر کہاں پر ہے؟" جلیگر نے بات کا رخ واپس موضوع کی جانب موڑا۔

"گھر پر ہی ہے۔"

"چلیے، وہیں چلتے ہیں۔" جلیگر اٹھ کھڑا ہوا۔

"یہ ہے وہ کمرا۔" باکس نے دروازہ کھولا۔ دوسری منزل پر واقع یہ شاندار کمرا تھا۔ وسط میں ایک عمدہ بیڈ بچھا تھا اور کمرے کی آرائش وکٹورین طرز پر کی گئی تھی۔ ایک ایک شے نہایت قیمتی اور نفیس تھی۔ وہ دل ہی دل میں باکس کے ذوق کی داد دے رہا تھا۔ اس نے گہری نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ بیڈ کے عقب میں بڑی سی کھڑکی تھی۔ پردے ہٹے ہوئے تھے اور دھوپ اندر آرہی تھی۔ اس نے گہری سانسیں لیں۔ اس کے نتھنے پھول رہے تھے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کسی قسم کی بو محسوس کرنے کی کوشش کررہا ہو۔

"میرے خیال میں تمہیں کوئی خاص مہک محسوس ہو رہی ہے؟" باکس نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

جلیگر نے سر ہلا دیا۔ "میں ہفتے میں ایک بار بطور باتھ جیل سے نہاتا ہوں، شاید اسی کی مہک ہوگی۔ اس جیل سے ہفتے میں ایک بار نہانا ہی کافی ہے، پورے ہفتے مہک رہتی ہے۔"

"سوری سر..." جلیگر نے اس کی طرف دیکھا۔ "جو مہک مجھے محسوس ہو رہی ہے وہ لیونڈر کی ہے۔"

"اوہ..." باکس نے حیرت سے کہا۔ "مجھے کچھ دنوں سے نزلے کی شکایت ہے، خوشبو محسوس نہیں کرسکتا۔ ویسے یہ نینسی کی پسندیدہ خوشبو تھی۔"

"اچھا..." جلیگر نے گمبھیر لہجے میں خودکلامی کی۔

کچھ دیر تک وہ گہری نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لیتا رہا۔ آخر وہ باکس کو نظرانداز کر کے کھڑکی کی طرف بڑھا اور باہر کی طرف جھانکا۔ لان بہت خوبصورت تھا۔ پہلی نظر میں ہی واضح ہو گیا کہ اس کی کافی اچھی طرح دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ اطراف کی دیواروں کے ساتھ ساتھ بیلوں کی باڑ اور درخت تھے۔ گھاس کے میدان کو چار برابر حصوں میں تقسیم کر کے، سرخ اینٹوں سے واک وے بنائے گئے تھے۔ اسے لان بہت اچھا لگا۔ اس نے ایسی جگہیں بہت کم دیکھی تھیں۔ اس نے چند لمحے لان میں گزارنے کا سوچا۔

"وہاں بیٹھنے کے لیے کوئی شیڈ وغیرہ بھی ہے؟" اس نے مڑ کر باکس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں نہیں... ایک بہت عمدہ شیڈ موجود ہے۔" باکس نے جواب دیا۔ "وہ زیادہ تر وہیں بیٹھ کر کام کاج کیا کرتی تھی۔"

"کس طرح کا کام؟"

"اُسے خاموشی اور قدرتی ماحول سے بہت اُنسیت تھی۔ اکثر وہ وہاں بیٹھ کر سوئٹر بنا کرتی تھی۔"

"ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں اگر برا نہ مانو تو..."

"ضرور۔"

"تم دونوں کیا الگ الگ کمروں میں سوتے تھے؟"

باکس نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر ہی اگلی سانس میں کہا۔ "میرا خیال ہے ہم لان میں چلتے ہیں، اس دوران اس پر بھی بات کرلیں گے۔"

نیچے اترتے ہوئے باکس نے بتایا کہ جس کمرے میں ابھی تھے، وہ مہمانوں کے لیے مخصوص تھا۔ بالعموم وہ ماسٹر بیڈروم میں ہی سوتے تھے لیکن جن دنوں وہ بیمار ہوتی، سونے کے لیے گیسٹ روم ہی استعمال کرتی تھی تاکہ میرے آرام میں خلل نہ پڑے اور نرس زیادہ بہتر انداز سے اس کی دیکھ بھال کرسکے۔ باکس کا کہنا تھا کہ گھر میں مہمانوں کے لیے اور بھی کئی کمرے ہیں، اس لیے اُس کمرے میں ان دونوں کے زیرِ استعمال کپڑے جوتے وغیرہ بھی رکھے رہتے تھے۔

"یہ تمہارے ریٹائرمنٹ کے بعد کی بات ہے؟" جلیگر

نے سوال کیا۔

باکس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں۔''

وہ دونوں گھر کے عقبی حصے کی طرف سے لان کی طرف جا رہے تھے۔ یہ پھسلواں ڈھلوانی راستہ تھا جس کے دونوں اطراف لکڑی کے خوبصورت کٹ ورک کی اسکرین بنی تھی۔ یہ انیسویں صدی کا فیشن تھا۔

''میں نے بروکری کا سلسلہ ختم کرنے کے بعد، ایک شوروم بھی کھولا تھا۔ چند دو خرید و فروخت ہوئی۔ اِدھر اُدھر سے کچھ ڈیل ہو جاتی بس اسی طرح مزے سے سلسلہ چل رہا تھا۔ میں زیادہ تر وقت جینسی کے ساتھ ہی گزارنا چاہتا تھا اور ایسا ہو بھی رہا تھا لیکن پھر ایک دن...''

باکس نے بات ادھوری چھوڑ کر گہری سانس لی۔ ''وہ مجھے اکیلا چھوڑ گئی۔'' اس نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔ ''اس کے بعد، کام پر جانے کو بھی دل چاہا ہی نہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے جلبکر کی طرف دیکھا۔ ''میرا مطلب ہے کہ یہ وہی نکتہ ہے جس پر ہم بات کر رہے ہیں... ٹھیک کہا نا؟'' اس کا لہجہ استفساریہ تھا۔

جلبکر کا دھیان اس کی گفتگو پر نہیں تھا۔ وہ لان میں پہنچ چکے تھے۔ انتہائی سرے پر ایک شیڈ بنا تھا۔ اس نے دو قدم آگے بڑھائے۔ اطراف کا جائزہ لیا تو شیڈ کے عقب سے اسے بالائی منزل پر جاتی سیڑھیاں نظر آئیں۔ آگے بڑھا تو شیڈ کے پیچھے گھر کا عقبی داخلی دروازہ تھا۔ عموماً گھروں میں اس کے دروازے بنائے جاتے ہیں۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ وہ پلٹا اور باغ پر بھرپور نظر ڈالی۔ درختوں پر پرندے چہچہا رہے تھے۔ بڑا دلکش نظارہ تھا۔ ''بہت خوبصورت ہے۔ لگتا ہے بڑی اچھی طرح دیکھ بھال کی جاتی ہے۔'' اس نے تعریف کی۔

''تم ٹھیک کہتے ہو۔'' باکس نے خوش ہو کر کہا۔

''اس کی دیکھ بھال کون کرتا ہے؟''

''میں کرتا ہوں۔''

''تم کرتے ہو؟'' اس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اسے یقین نہ ہوا کہ باکس جیسا خوش پوش آدمی یہ کام بھی کر سکتا ہے۔

''میرا مطلب ہے کہ میں نے اس کام کے لیے ایک مالی رکھا ہوا ہے۔'' باکس نے وضاحت کی۔ ''ویسے جب تک وہ زندہ رہی، اس کی دیکھ بھال خود ہی کرتی تھی۔ اس کے بعد لان کی نگرانی میری ذمے داری بن چکی ہے۔''

''اوہ...'' جلبکر نے ہونٹ سکیڑے۔ ''اس کا مطلب کہ تم تاجر بھی ہو، آن لائن خرید و فروخت کرتے ہو اور اس کے ساتھ ساتھ لان کی دیکھ بھال بھی تمہاری ذمے داریوں میں شامل ہے۔''

''ایسا کہہ سکتے ہو۔''

''تم آخری بار کب باہر گئے تھے؟''

''کیا مطلب...'' باکس نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ''باہر جانے سے کیا مراد ہے تمہاری؟''

''میرا مطلب ہے کہ سیر و تفریح، کوئی فلم، فٹبال میچ دیکھنے یا پھر یونہی شاپنگ وغیرہ کے لیے۔''

''اوہ...''

''تو آخری بار گھر سے کب باہر گئے تھے؟'' جلبکر نے وضاحت چاہی۔

باکس کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں۔ ''تمہارا لہجہ اور انداز، یہ دونوں مجھے پسند نہیں۔'' اس نے منہ دوسری طرف پھیرتے ہوئے کہا اور پھر لمحہ بھر کے توقف کے بعد بولا۔ ''خیر... مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔''

جلبکر نے فوراً موضوع بدل دیا۔ ''مجھے یہاں پر دو آدمی تعینات کرنے ہوں گے جو کام مکمل ہونے تک، چوبیس گھنٹے کیمرے اور دیگر ضروری آلات کی مدد سے اس مقام کی نگرانی کریں گے۔ اس کے لیے مجھے گھر کے سکیورٹی سسٹم کا معائنہ بھی کرنا ہوگا تاکہ کوئی شے اس دوران میں رکاوٹ نہ بنے۔'' یہ کہہ کر اس نے باکس کی طرف دیکھا۔ ''تمہارے لیے بہتر یہ ہوگا کہ اس دوران میں کولمبیا جا کر اپنا مکمل نفسیاتی معائنہ کرا لو۔''

''کیا ڈاکٹر یہاں پر نہیں آ سکتا؟'' باکس نے سوال کیا۔

جلبکر نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ''اوکے... میں دیکھتا ہوں کہ اس سلسلے میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔'' اس نے بے دلی سے جواب دیا۔ ''لیکن پہلے یہ کام ہو جانے دو۔''

''تمہیں کتنے چاہئیں...''

جلبکر نے رقم بتائی۔

''جتنا میں خرچ کر سکتا ہوں، یہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔'' باکس نے منمنا کر جواب دیا۔

صاف ظاہر تھا کہ رقم کے معاملے میں وہ رعایت دینے پر تیار نہ تھا۔ اس نے غور سے باکس کو دیکھا۔ ''تم اس شے کو پکڑنا چاہتے ہو یا نہیں؟''

''اے مسٹر...'' یہ سنتے ہی باکس نے تڑپ کر کہا۔

’’ذرا منہ سنبھال کر۔ وہ کوئی شے نہیں میری بیوی ہے۔ وہ ہر ہفتے یہاں آتی ہے اور کمرے میں جا کر اپنا پسندیدہ سویٹر پہنتی ہے اور پھر شیڈ کے باہر آ کر بیٹھتی ہے، بالکل ویسے ہی جیسے وہ اپنی زندگی میں یہاں بیٹھا کرتی تھی۔‘‘

ایک بار پھر باکس جذباتی ہو رہا تھا۔ ’’میں ہر ہفتے اس کمرے میں جا کر لیٹتا ہوں، وہ وہاں آ کر الماری سے سویٹر نکالتی ہے، مجھے دیکھ کر مسکراتی ہے۔‘‘ وہ اپنی ہی دھن میں بولے جا رہا تھا۔

’’سوری... میری بات سے آپ کے جذبات کو ٹھیس لگی۔ میرے کہنے کا مطلب یہ نہ تھا۔‘‘

’’مسٹر بلیکر... میں کوئی مذہبی بندہ نہیں ہوں لیکن پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ وہ مجھے کوئی پیغام دینا چاہتی ہے لیکن میں سمجھ نہیں پا رہا کہ یہ پیغام کس شے سے متعلق ہو سکتا ہے۔‘‘

’’کیا یہ سویٹر سے جڑی کسی چیز کے بارے میں ہے یا پھر اس شیڈ سے متعلق جہاں وہ اپنی زندگی میں بیٹھا کرتی تھی؟‘‘ بلیکر نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

’’تم مذاق کر رہے ہو۔‘‘

’’ہرگز نہیں۔‘‘ بلیکر بدستور سنجیدہ تھا۔ ’’تم اگر چاہو تو ہم اس نکتے پر تحقیقات آگے بڑھا سکتے ہیں لیکن لگتا ہے کہ تم اس معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے بجائے اپنی رقم بچانے میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہو۔‘‘ یہ کہہ کر اس نے باکس کی طرف دیکھا۔ وہ خالی خالی نگاہوں سے شیڈ کی طرف دیکھ رہا تھا جس کے سامنے لکڑی کی خوبصورت کرسی رکھی تھی۔ ’’ویسے میرا اندازہ ہے کہ یہاں بھوت ووت کچھ نہیں، مجھے تو یہ تمہارے دماغ کی اختراع نظر آتی ہے۔‘‘

’’سوری...‘‘ یہ کہہ کر باکس بنا جواب دیے پلٹا۔ ’’میں چیک بک لے کر آتا ہوں۔‘‘

رقم ملنے کے فوراً بعد بلیکر نے اچھی طرح اس پرانے گھر کا معائنہ کیا۔ اس نے لان کے ایک سرے پر چھوٹا سا خیمہ لگوا رکھا تھا جس میں اس کا سامان تھا۔ اس نے گھر کے ہر کمرے میں ایسے سینسرز نصب کرا دیے تھے جن کی مدد سے کسی بھی مادرائی شے کی نقل و حرکت ریکارڈ کی جا سکتی تھی۔ اس نے شیڈ کے سامنے بھی خاص کیمرا لگا دیا تھا۔ خیمے کے اندر مانیٹر لگے تھے۔ اس طرح گھر کے ہر اس حصے کی ہمہ وقت نگرانی کا انتظام ہو چکا تھا جہاں باکس کے مطابق نینسی ہر ہفتے بدھ کے روز چہل قدمی کرتی نظر آتی تھی۔

ملاقات

ایک بچے نے سرِراہ ایک پادری کو دیکھ کر کہا۔

’’ہیلو مسٹر!‘‘

پادری نے مشفقانہ انداز میں کہا۔ ’’تم مجھے مسٹر کے بجائے فادر کہہ کر مخاطب کرو تو زیادہ اچھا ہوگا۔‘‘

بچے نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔ ’’اچھا تو آپ یہاں گھومتے پھر رہے ہیں اور امی اتنے سالوں سے مجھ سے یہی کہے جا رہی ہیں کہ انہیں نہیں معلوم کہ میرا باپ کون ہے۔‘‘

برتاؤ

☆ کچھ لوگوں کے ساتھ عمر بھر رہ لو، لمحے بھر کے لیے بھی یاد نہیں آئیں گے اور کچھ لوگوں کے ساتھ ایک لمحہ گزار لو ساری عمر یاد آتے رہیں گے۔ یہ بھی کیا عجب پاگل پن ہے کہ یادیں گزری مدت اور عرصے کی وجہ سے نہیں بلکہ روا رکھے گئے برتاؤ کی وجہ سے محفوظ رہتا ہے۔

عاجزی

اگر تو دیکھے کہ لوگ تجھے بہت احترام سے دیکھتے اور محبت سے ملتے ہیں تو جان لے یہ تیری ان خوبیوں کی وجہ سے ہے جو اللہ نے تجھ میں عیاں کر دی ہیں اور لوگ تیری ان قبیح حرکتوں، برائیوں اور بدیوں کو دیکھ نہیں پائے جن پر اللہ نے پردے ڈال رکھے ہیں تو بس پھر شکر کیا کر اور عاجزانہ کر۔

انصاف

بھیڑیے کی صفتیں بتاتے نہیں تھکتے جو ان کی جان کا دشمن ہے۔ کتے سے ان کی حقارت دیکھی نہیں جاتی۔ جو ان کی چوکیداری کرتا ہے۔ بہت سے لوگ بھی کچھ ایسا ہی کمال کرتے ہیں جو ان کی خدمت کریں۔ وہ ان کے لیے حقیر ٹھہریں۔ جو ان کی اہانت کا کوئی موقع نہ جانے دیں۔ وہ ان کے لیے عزت دار و معتبر ہوتے ہیں۔

عبدالجبار رومی انصاری چوہنگ ملتان روڈ لاہور

بلیکر کو اس کہانی پر قطعی یقین نہ تھا لیکن پھر بھی اگر باکس سچا تھا تو پھر ان انتظامات کے بعد ثبوتوں کا ملنا طے تھا۔ وہ ریٹائرڈ پولیس والا اور بنیادی طور پر سراغ رساں تھا۔ حقیقت ثابت کرنے کے لیے، اس کے نزدیک جذبات اور بیانات کی نہیں، ثبوت کی اہمیت تھی۔ اسے ثبوت چاہیے تھے۔ ایسا نہ ہوتا تو پھر باکس کے دماغ کا خلل یقینی ہوتا۔

بدھ کے آنے میں کئی روز باقی تھے۔ وہ ہر روز باکس کے گھر جاتا۔ ریکارڈنگ کا معائنہ کرتا۔ جن دو آدمیوں کی اس نے خدمات حاصل کی تھیں، وہ ریکارڈنگ کے ذریعے صورت حال کو جاننے اور ثبوتوں کی تلاش میں اس کی مدد کرتے تھے۔ گھر کے دونوں داخلی دروازوں پر لوہے کے دو مضبوط گیٹ نصب تھے۔ ان کی بھی کیمروں سے نگرانی کی جارہی تھی۔ پورے ہفتے اس نے خود کئی بار یہ چیک کیا کہ دروازے لاک ہیں یا نہیں۔ اسے یہ بھی شبہ تھا کہ کہیں کوئی اور تو ایسی حرکت نہیں کررہا، جس کی بنا پر باکس کے دماغ میں اپنی مرحومہ بیوی کے بھوت کے آنے کی کہانی پختہ ہوچکی ہے۔

باکس کا باورچی، ہاؤس کیپر اور اسسٹنٹ شام چھ بجے اپنی ڈیوٹی ختم کر کے چلے جاتے تھے۔ جانے سے پہلے وہ الیکٹرانک سسٹم سے گھر کے دونوں بڑے گیٹ لاک کرنے کا خودکار نظام آن کر جاتے۔ اندھیرا ہوتے ہی وقت مقررہ پر سیکیورٹی سسٹم بھی خودبخود آن ہوجاتا تھا۔ قدیم طرز کے اس پرانے اور بڑے سے گھر میں رات کو باکس کے سوا کوئی اور نہیں ہوتا تھا۔ بلیکر بھی دیگر ملازمین کے ہمراہ شام ہوتے ہی نکل جاتا اور فلیٹ پر پہنچتے ہی سستانے کے لیے لیٹ جاتا۔ اسے سویرے جلد اٹھنا پڑتا تھا اس لیے رات جلد سونے کی کوشش کرتا۔ جب تک وہ تیسی کے بھوت کا راز نہیں جان جاتا، اس وقت تک کے لیے اس نے اپنی تمام دیگر مصروفیات اور مشغلے ترک کردیے تھے۔

بلیکر کے انتظامات بالکل درست تھے۔ اس نے یہ آلات نصب کرانے کے لیے جس ماہر کی خدمات حاصل کی تھیں اور جس کمپنی سے کرائے پر آلات لیے، وہ دونوں قابل بھروسا تھے۔ غلطی کا تو کوئی امکان نہیں تھا۔ بھوت کا نظر آنا دور کی بات، اب تک کی ریکارڈنگ سے گھر کے اندر کسی بھی غیر معمولی نقل و حرکت کا معمولی سا بھی سراغ نہیں ملا تھا۔ اسے یقین ہونے لگا تھا کہ بھوت کی بات دراصل باکس کے دماغ کا ہی خلل ہے یا پھر کچھ اور اس کے پیچھے ہے۔

نہ اتوار کو کچھ خاص نظر آیا نہ پیر کو۔ اب بلیکر منگل کی ریکارڈنگ دیکھ رہا تھا لیکن نتیجہ وہی پہلے جیسا تھا۔ اب اسے صرف بدھ کا انتظار تھا۔ خود باکس کا بھی یہی کہنا تھا کہ وہ ہر بدھ کو آتی ہے۔ اگر وہ اس بدھ کو بھی آگئی تو پھر حقیقت کھلنے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہتی۔ بلیکر کو بے صبری سے بدھ کا انتظار تھا۔ منگل کی رات اور بدھ کا دن بلیکر کے لیے نتیجہ خیز ثابت ہوسکتا تھا۔

وہ جمعرات کی صبح تھی۔ بلیکر ناشتا کررہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ ”ہیلو...“

”تم نے کیا کردیا۔“ باکس تلملا رہا تھا۔

”کچھ خاص نہیں۔“ اس نے سکون سے جواب دیا۔

”یہاں سے آکر اپنا سارا سامان اٹھاؤ۔“ وہ سخت غصے میں بول رہا تھا۔

”مگر کیوں؟“

”تم نے تیسی کو ڈرا دیا۔ وہ کل نہیں آئی۔ میں ساری رات اس کا انتظار کرتا رہا۔“

”گڈ...“ یہ سن کر بلیکر بہت خوش ہوا۔ شبہ حقیقت میں بدل رہا تھا۔

”میں نے تمہاری خدمات اس لیے حاصل کی تھیں تاکہ پتا چل سکے کہ وہ مجھ سے کیا کہنا چاہتی ہے لیکن تم...“

”مرنے والے لوٹتے نہیں۔“ بلیکر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”بکواس مت کرو کمینے انسان... میری بیوی آتی ہے، وہ کل رات بھی آتی لیکن تمہاری وجہ سے...“

”درست کہا میری وجہ سے...“

”تمہاری وجہ سے ہی وہ نہیں آئی۔“ باکس نے اسے بات مکمل کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ ”او میرے خدا... تم نے تو میری محبوبہ کا دیدار بھی مجھ سے چھین لیا۔ خدا تمہیں ہرگز معاف نہ کرے۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔

”کچھ نہیں چھینا، شاید کچھ بچالیا ہے۔“

”بکو مت...“ باکس سیخ پا ہورہا تھا۔ ”یہاں آکر فوری طور پر یہ سامان اٹھاؤ ورنہ...“

”کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں آرہا ہوں سامان لینے۔“ باکس نے جواب دینے کے بجائے فون پٹخ دیا۔

دو گھنٹے بعد بلیکر اپنے دو معاونین کے ہمراہ باکس کے گھر پر تھا۔ اس کے ساتھی گھر میں لگے سینسرز کیمرے اور

دیگر سامان پیک کر رہے تھے۔ عقبی داخلی دروازے پر ان کی چھوٹی کیاروین سامان لے جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

”یہ خیمہ احتیاط سے اکھاڑنا، کہیں لان خراب نہ ہو۔“ اس نے سامان اٹھانے والے سے کہا۔ ”میں باکس سے ملنے جارہا ہوں۔ تم لوگ سامان لے کر چلے جانا۔“ یہ کہہ کر وہ گھر کے اندر داخل ہونے والی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ ”گڈ مارننگ۔“ باکس لاؤنج میں تنہا بیٹھا تھا۔

”تم...“ اس نے بلجبر کو دیکھتے ہی کہا۔ وہ سخت غصے میں تھا۔

”سامان لینے آیا تھا۔“

”اچھا کیا ورنہ میرے آدمیوں کو اسے اٹھا کر باہر پھینکنا پڑتا۔“

”میں نے کہا تھا نا کہ اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔“ بلجبر نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

”سامان اٹھاؤ اور چلتے بنو۔“ باکس نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے ناگوار لہجے میں جواب دیا۔ ”اس مضمون کو پڑھنے کے بعد مجھے تمہاری خدمات لینی ہی نہیں چاہیے تھیں۔“ اس نے تاسف سے ہاتھ مل کر کہا۔ ”تم نہ ہوتے تو کم از کم وہ ملنے تو آتی رہتی۔“

”وہ ملنے آئیں گی اور ضرور آئیں گی۔“ بلجبر کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔

”کیا...“ اس نے حیرت سے دیکھا۔

”جی ہاں...“ بلجبر نے باکس کے لہجے میں نبد یلی محسوس کی تو بات آگے بڑھائی۔ ”میں شرمندہ ہوں۔“

”تم جانتے ہو کیا کہہ رہے ہو؟“

”جانتا ہوں۔“ وہ شرمندہ نگاہوں سے باکس کو دیکھ رہا تھا۔ ”نہ تمہیں کوئی دماغی خلل لاحق ہے اور نہ ہی نینسی کی صورت میں کوئی اور چکر۔“

”شکر ہے...“ باکس نے گہری سانس لی۔ ”تم تو مجھے پاگل قرار دینے پر تلے بیٹھے تھے۔“

”وہ میری غلطی تھی۔“

”اب سمجھ گئے نا...“ باکس نے فاتحانہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”جی ہاں۔“ اس کا لہجہ بدستور شکست خوردہ تھا۔ ”ساری زندگی بھوت پریت پر یقین نہ کرنا میری غلطی تھی۔ یہ ہوتے ہیں اور یقیناً نینسی دوسری دنیا سے اس دنیا میں آپ سے ملنے آتی ہے اور وہ ضرور کچھ کہنا چاہتی ہے تم سے۔“

”دیکھا میں تم سے کہہ رہا ہوں۔“ باکس کا لہجہ اب بالکل بدل چکا تھا۔ اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ”مگر تمہیں تو ان باتوں پر یقین ہی نہیں۔“ اس نے طنزیہ فقرہ کسا۔ ”خیر بیٹھو۔“

”میں اعتراف کرتا ہوں کہ تمہاری رائے درست تھی۔ میں نے میڈم نینسی کو پریشان کیا اور وہ ناراض ہو کر اس بدھ کو یہاں نہیں آئیں لیکن مجھے ایک دعا آتی ہے اور میں ان کی تصویر کے سامنے وہ عبارت کروں گا تو وہ مجھے معاف کر کے آپ سے ملنے دوبارہ بدھ کو ضرور آئیں گی۔“

”واقعی...“ باکس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ اس کی آنکھوں میں چمک اتر آئی۔ ”ایسا ہوسکتا ہے؟“ اس نے کچھ توقف کے بعد کہا۔

”بالکل...“ میرے یہاں آنے کا مقصد ہی آپ سے معذرت کرنا اور حقیقت کا اعتراف کر کے میڈم کی روح سے معافی مانگنا ہے۔“

”چلو... کم از کم تم اپنی غلطی کا ازالہ کرنے کی اخلاقی ہمت تو اپنے اندر رکھتے ہو۔“

”لیکن اس کے لیے دو باتیں ضروری ہیں۔“

”وہ کیا؟“ باکس نے پوچھا۔

”اول تو آپ ایڈی سے رابطہ کر کے اس پورے واقعے کے بارے میں کوئی بات نہیں کہیں گے ورنہ وہ نیویارک ٹائمز میں اسے شائع کر دے گا۔“

”وعدہ...“ باکس نے جلدی سے کہا۔ ”ہوا سمجھو ایسا کچھ ہوا ہی نہیں لیکن دوسری بات...“ اس نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”مجھے خصوصی دعا نینسی کی تصویر کے سامنے کرنا ہوگی مگر...“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور چاروں طرف طائرانہ نظر ڈالی۔ ”یہاں تو ان کی کوئی تصویر نظر نہیں آتی۔“

”نہیں نہیں...“ باکس نے جلدی سے ٹوکا۔ ”اس کی کئی تصاویر ہیں، پورٹریٹ ہیں۔ وہ قد آدم آئل پینٹنگ بھی ہیں۔“

”لیکن کہاں... مجھے تو ایک بھی نظر نہیں آئی۔“ باکس نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

”میں نے ایک کمرے کو اس کی تمام تصاویر سے سجا رکھا ہے۔“ یہ کہہ کر باکس لمحہ بھر خاموش رہا۔ ”پچپن برس کی رفاقت کے بعد وہ جدا ہوئی، اس کی تصویر دیکھنے کی مجھ میں ہمت نہیں۔“ اس کا لہجہ بھرا گیا تھا۔

”تو مجھے وہ کمرا دیکھنے کی اجازت ہے تاکہ دعا

کرسکوں؟"

"بالکل کیا ہے۔" باکس کھڑا ہوا۔ "مگر میری بھی دو شرطیں ہیں۔"

"وہ کیا؟" ایلبکر نے پوچھا۔

"ایک تو تم اس کمرے میں تنہا جاؤ گے، مجھ میں اس کی تصاویر دیکھنے کی تاب نہیں اور دوسرا یہ کہ..." اس نے بات ادھوری چھوڑ کر بلبکر کو گھورا۔ "اگر وہ اس بدھ کو ملنے نہ آئی تو اس پورے شہر میں تمہاری دو نمبریوں کا ریکارڈ پیش رہا ہوگا۔" اس مرتبہ باکس کا لہجہ دھمکی آمیز تھا۔

"مجھے منظور ہے۔"

"گڈ... میرے ساتھ آؤ۔"

یہ ہال نما کمرا تھا۔ اندر داخل ہو کر بلبکر نے کمرا الاک کیا۔ دروازے کے عین سامنے کی دیوار پر ورقد آدم پینٹنگ آویزاں تھیں۔ اس نے وا کیا باکس دیکھا۔ چھ ضرب چھ انچ کے فریم سے لے کر تین ضرب تین فٹ تک، مختلف سائز کی تصاویر دیوار پر نہایت قرینے سے لگی تھیں۔

"نہایت خوبصورت..." بلبکر نے قدآدم پینٹنگ کے سامنے کھڑے ہو کر کہا۔ جہاں تبتسی کی زندگی کے مختلف ادوار کی تصاویر تھیں۔

ہال میں سب سے تازہ ترین یہ پینٹنگ تھی جو اس کی موت سے چند برس پیشتر بنائی گئی تھی۔ بلبکر غور سے تصویر دیکھ رہا تھا۔ تبتسی چھریرے بدن کی مالک تھی۔ دراز قامت، سیاہ بال جن کے درمیان سفید بال بھی نظر آ رہے تھے۔ چہرے سے نہایت متانت، شخصیت میں سادگی لیکن وقار نمایاں تھا۔ نیلی آنکھیں گہری سوچ میں ڈوبی محسوس ہوتی تھیں۔ "مصور بھی غضب کا ہوگا۔" بلبکر نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے خود کلامی کی۔ اسے کمرے میں داخل ہوئے تین منٹ گزر چکے تھے۔

وہ دروازے کی طرف پلٹا۔ باہر نکلا تو باکس کوریڈور میں کھڑا تھا۔ "کیا ہوا؟" اس نے سوال کیا۔

"مجھے امید ہے کہ انہوں نے میری معافی قبول کر لی۔ اب وہ بدھ کو ضرور ملنے آئیں گی۔" بلبکر نے خوش کن لہجے میں کہا۔

باکس مسکرا دیا۔ "ایسا ہوا تو سمجھو میں نے تمہیں معاف کر دیا۔"

"میں معافی مانگنے کے لیے ہی حاضر ہوا تھا۔" اس کا لہجہ ایک بار پھر معذرت خواہانہ تھا۔ "ویسے میری ناکامی اور اعتراف کا ذکر اپنے ملازمین سے کر سکتے ہو لیکن وہ ایڈی..."

"خیر... ایسا تو میں کروں گا ہی مگر ایڈی والی بات مشروط ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" بلبکر نے کہنا شروع کیا۔ "آپ کو جو تکلیف پہنچی اس کے لیے ایک بار پھر معذرت اور ہاں وہ..."

"اب کیا؟" باکس نے بات کاٹی۔ ایک بار پھر اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔ "کہیں وہ تبتسی..."

"نہیں نہیں..." بلبکر نے کہا۔ "اصل بات یہ ہے کہ جو آپ کی رقم خرچ ہوئی، اس پر مجھے افسوس ہے۔"

"میں اس نقصان کو اپنی اس غلطی کی قیمت سمجھ کر بھول چکا جو تمہاری خدمات لے کر میں نے کی تھی۔" اس نے طنز بھرے انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے، میں چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر بلبکر مڑا۔ "گڈ بائے۔"

باکس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اسے جاتا دیکھتا رہا۔

وہ جمعرات کا دن تھا۔ باکس کو آنے والے بدھ کا شدت سے انتظار تھا۔ ایک ہفتہ باقی تھا۔ یہ سات روز اذیت میں گزر رہے کہ آیا اس نے بلبکر کی معذرت قبول کی بھی یا نہیں۔ وہ تبتسی کو جان سے بڑھ کر چاہتا تھا۔ اس کے لیے یہی کافی تھا کہ وہ کم از کم اسے نظر تو آنے لگی ہے۔ عمر کے اس حصے میں تنہائی نے اسے گھیر لیا تھا۔ اسے تبتسی کی شدت سے ضرورت محسوس ہوتی تھی لیکن... یہ خیال آتے ہی وہ خود پر لعنت بھیجتا کہ نہ وہ بلبکر کی خدمات حاصل کرتا اور نہ ہی تبتسی کے آنے جانے کا سلسلہ بند ہوتا۔ اب تو وہ یہ خیال بھی ترک کر چکا تھا کہ آخر تبتسی کا بھوت اسے بتانا کیا چاہتا ہے۔ اسے نفع نقصان کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ اب بوڑھا تھا اور مزید دولت سے اسے کوئی فائدہ نہ پہنچتا۔ وہ صرف تبتسی کی دید پر ہی اکتفا کرنے پر خود کو تیار کر چکا تھا۔

آخر منگل کی شب گئی اور بدھ کا سورج طلوع ہوا۔ اس روز باکس بہت خوش تھا۔ اسے تبتسی کے نظر آنے کی امید تھی۔ ساتھ ہی دل میں یہ وسوسہ بھی تھا کہ پتا نہیں کہ وہ آئی بھی ہے یا نہیں۔

وہ دن اس کے لیے بہت خاص تھا۔ باکس نے خوشبودار غسل کیا۔ شاندار سوٹ پہنا اور شام ڈھلنے سے پہلے وہ اس گیسٹ روم کے کئی چکر لگا چکا تھا جہاں الماری

میں نینسی کا پسندیدہ سوئیٹر رکھا تھا۔ آج وہ اتنا خوش تھا کہ اس نے دو گھنٹے پہلے ہی تمام ملازمین کی چھٹی کر دی تھی۔ ولیم نے ڈنر تیار کیا تھا لیکن باکس کی بے قراری دیکھتے ہوئے کوئی بھی یہ کہہ سکتا تھا کہ اسے بھوک پیاس کی کوئی فکر نہ تھی۔ نینسی کی آمد کی خوشی میں وہ اتنا مگن تھا کہ لنچ بھی ٹھیک طرح سے نہیں کیا تھا۔

آخر سورج نے مغرب میں جا کر روپوشی اختیار کی تو وصل کی تمنا میں سرشار باکس بے تابی سے گیسٹ روم کی طرف چل دیا۔ اس نے کور بیڈ ور کی لائٹس آف کیں اور بیڈ پر جا کر لیٹ گیا۔ ٹیبل لیمپ کی مدھم زرد روشنی میں کمرا نیم تاریک لگ رہا تھا۔

خاصی دیر گزر گئی لیکن نینسی کا بھوت نظر نہ آیا۔ باکس بے تابی سے کروٹیں بدل رہا تھا۔ اچانک کمرے کا دروازہ آہستہ سے تھوڑا کھلا اور ایک عورت اندر داخل ہوئی۔ آہٹ پا کر باکس کی بھی پوری توجہ دروازے کی طرف ہو چکی تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اُس الماری کی طرف بڑھی جہاں وہ سوئیٹر موجود تھا جس کے بارے میں باکس نے بلیئر کو تفصیل سے بتایا تھا۔ الماری کا دروازہ کھلا اور پھر اس نے وہی سوئیٹر نکالا اور پہن کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا چہرہ بیڈ کی طرف تھا۔ نیم دراز باکس ٹکٹکی باندھے اسے ہی دیکھے جا رہا تھا۔ کمرے میں لیونڈر کی مہک پھیل چکی تھی۔

چند لمحوں تک وہ وہیں اپنی جگہ ساکت رہی اور پھر چند قدم آگے بڑھ کر بیڈ کے پائنتی جا کر کھڑی ہو گئی۔ باکس کو دیکھ کر لگ رہا تھا کہ جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہے۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ وہ باکس کے اتنے قریب تھی۔ باکس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر بول نہ پایا۔

"ڈارلنگ..." اچانک نینسی کے بھوت نے آہستہ سے کہا۔

یہ سنتے ہی باکس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ گزشتہ چھ ماہ میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے کچھ کہا تھا لیکن ایک بات عجیب تھی۔ اس کے منہ سے آواز ایسے نکلی جیسے کہ منہ میں کچھ رکھا ہو۔ باکس کو... یہ آواز نینسی کی نہ لگی لیکن اس نے اگلے ہی لمحے یہ خیال ذہن سے جھٹک دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ایک بار مرنے کے بعد دنیا میں پلٹ آنے والوں کی آواز شاید ایسی ہی ہو جاتی ہوگی۔ آخر اب وہ زندہ نینسی تو تھی نہیں، رہے بھوت تو ان کے بارے میں وہ کچھ جانتا نہ تھا۔

"تم کچھ..." باکس نے بڑی دقت سے کہا۔

"ہیلو ڈارلنگ..." وہ ذرا سا اور آگے بڑھی۔

ایک انٹرویو

"تمہارا سوشل بیک گراؤنڈ کیا ہے؟ کس خاندان سے تعلق ہے؟"

"میرا تعلق اپنے ہی خاندان سے ہے۔"

"سچ بولنے کا شکریہ۔"

جی تو بہت چاہا کہ ان کے ہاتھوں پہ بھی بتا دیں کہ بزرگ جب جاہ و مال سے بے نیاز تھے۔ فقط ہمیں اپنی نشانی چھوڑا۔ بادشاہ نے تو اپنی ولدیت شمشیر ابنِ شمشیر ابنِ شمشیر بتا کر بدخواہوں اور مورخوں کا منہ بند کر دیا تھا۔ لیکن یہ فقیر ابنِ آدم، ابنِ آدم، ابنِ آدم کے علاوہ کیا بتاتا؟

اس کے منہ سے ایسی لپٹ آ رہی تھی جیسی روئی کے اس پھوئے سے آتی ہے جو انجکشن سے پہلے خواہ مخواہ جلد پر رگڑا جاتا ہے۔ استفسار فرمایا۔ "تم کب اور کہاں 'ڈلیور' ہوئے تھے؟ بابا!"

وہ زور سے ہنسا۔ ہم ذرا گھبرائے تو کہنے لگے۔ "اچھا یہ بتاؤ کہ جس سنہ میں تم پیدا ہوئے، اس سال اور کون سا بین الاقوامی سانحہ ہوا تھا؟"

انٹرویو کے سلسلے میں ایک عرصہ پہلے ہم نے معلوماتِ عامہ کے نامعقول سے نامعقول سوالوں کے جواب رٹ لیے تھے۔ مثلاً کرکٹ کی گیند کا وزن۔ مکھی کی ٹانگوں اور بچھو کے دانتوں کی تعداد۔ نپولین کا قد۔ اگر بینک سے صرف 100 روپے 7 فیصد سود پر قرض لے جائیں تو وہ کس طرح 250 سال میں 2,217,902,400 ہو جائیں گے! خالص سونا کتنے کیرٹ کا ہوتا ہے؟ بلی کی آنتوں کی لمبائی۔ کتا زبان کیوں باہر نکالے رکھتا ہے؟ انسان منہ کھولنے سے کیوں ڈرتا ہے؟ اچھا خاصا (.RS اور &) لکھ کر انہیں حرفِ غلط کی طرح کاٹ کر (.Rs اور &) کیوں جاتا ہے؟ شخص بزدلی کیوں پہلی جاتی ہے؟ شیکسپیئر کے ہاں شادی کے کتنے ماہ بعد بچہ تولد ہوا؟ بانس پولا کیوں ہوتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ... لیکن اپنی پیدائش کے بین الاقوامی متوازیات کی طرف ہمارا دھیان کبھی نہیں گیا تھا۔

ہمارا آدھا جسم تو اس کے مقابل تھا بالکل ٹھنڈا ہو گیا اور ہم اچانک بے بسی کے عالم میں جھومنے لگے تو اس نے ہماری درخواست میں تاریخِ پیدائش دیکھ کر اندوہ گیں لہجے میں کہا۔ "بائی دی وے، جس سال تم پیدا ہوئے اسی سال میرے باپ کا انتقال ہوا۔ جو اسّی نوے سال کا تھا!"

مشتاق احمد یوسفی کی کتاب "زرگزشت"

انتخاب: محسن اقبال، گولارچی، بدین

"تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو؟" بارکس نے سوالیہ لہجے میں کہا۔

"ہاں... میں تمہاری زندگی بچانے کے لیے اس دنیا میں آئی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے دایاں ہاتھ آگے بڑھایا۔ "تمہارا دماغ کمزور ہو رہا ہے۔ یہ دوسری دنیا کا امرت رس ہے۔ اسے پی لو۔ تمہاری تمام بیماریاں دور ہو جائیں گی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے بند مٹھی کھول کر ہتھیلی پھیلا دی۔ شیشے کی ایک چھوٹی سی بوتل پھسل کر بستر پر جا گری۔ "اس کا ڈھکن کھولو اور پی جاؤ یہ امرت رس۔"

بارکس نے ہپناٹائز کیے معمول کی طرح اس بوتل کو اٹھا کر ڈھکن کھولنا چاہا۔ اسی دوران میں اچانک پورا کمرا تیز روشنی میں نہا گیا۔ دروازے کے سامنے جلیبر کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ "ہاتھ اوپر اٹھا لو بھوتنی..." وہ دہاڑا۔

بارکس پھٹی پھٹی نگاہوں سے جلیبر کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ننسی کو پستول کی زد پر رکھتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھا اور جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے شیشی چھینی۔

"تم کمینے..." بارکس دہاڑا۔

"چپ رہو۔" جلیبر نے اسے ڈانٹا۔

اسی دوران میں کمرے کا دروازہ کھلنے کی آہٹ ہوئی۔ جلیبر نہایت تیزی سے ایڑی کے بل پر گھوما لیکن تب تک نووارد نے گولی چلا دی تھی مگر خوش قسمتی سے جلیبر کی مہارت کام آئی۔ گولی دیوار میں جا کر لگی لیکن اس کے پستول سے نکلی گولی اس کی ران پر لگی۔ گولی چلانے والا یہ نووارد کوئی اور نہیں بارکس کا شیف ولیم تھا۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" وہ بھی شیف کو دیکھ چکا تھا۔ بارکس سخت خوف زدہ تھا۔ اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔ جلیبر اسے نظر انداز کر کے پولیس کو فون کر رہا تھا۔ اگلے دس منٹ میں ننسی کا بھوت دوبارہ انسان کا روپ دھار چکا تھا۔ ولیم کو اسپتال لے جایا گیا۔ محلول کی وہ بوتل پولیس کے فرانزک سیکشن کو بھیج دی گئی تھی۔

یہ جمعرات کی صبح تھی۔ نو بج رہے تھے۔ جلیبر دو ہفتوں کے بعد اپنے پسندیدہ ریستوران میں ناشتا کر رہا تھا کہ موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف بارکس تھا۔ "میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔" وہ درخواست کر رہا تھا۔

"میرے پاس وقت نہیں ہے۔" جلیبر نے رکھائی سے کہا۔

"پلیز... آئی ایم سوری۔ میں غلطی پر تھا۔"

"گڈ... تو پھر ہم گیارہ بجے ملتے ہیں۔" اس کی معذرت سن کر جلیبر پگھل گیا۔

وقت مقررہ پر وہ بارکس کے گھر پر تھا۔ "تو بات یہ ہے کہ تمہیں جان بچنے کی خوشی میں میرا شکر گزار ہونا چاہیے۔" لاؤنج میں بارکس کے روبرو بیٹھتے ہوئے اس نے بات شروع کی۔

"وہ تو ہے مگر یہ سارا چکر..." بارکس نے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ رسمی کلمات کے سیدھے مطلب کی بات پر آ گیا تھا۔

"ولیم ہے تو پیشہ ور شیف لیکن اس کا پس منظر مجرمانہ ہے۔ وہ اس طرح چوری کرتا ہے کہ کئی بار گرفتار ہونے کے باوجود آج تک اس کے خلاف کوئی ثبوت پولیس کو نہ مل سکا۔ اس لیے ہر بار بچ نکلتا ہے۔"

"لیکن وہ ننسی کا بھوت؟" بارکس نے سوال کیا۔

"وہ ولیم کی گرل فرینڈ اور ایک ٹی وی چینل کی میک اپ آرٹسٹ شارلین ہے۔ دونوں لوٹ مار کے بھی ساتھی ہیں لیکن اس کے خلاف بھی پولیس آج تک اتنا بھی ثبوت حاصل نہ کر سکی کہ صرف ایک رات اسے لاک اپ میں رکھ سکتی۔"

"اوہ خدایا... یہ لوگ۔" بارکس نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ "میں تو یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا۔"

"کہانی یہ ہے مسٹر بارکس کہ ولیم نے لاک سسٹم کا کوڈ معلوم کر لیا تھا۔" جلیبر نے کہنا شروع کیا۔ "وہ دونوں آہستہ آہستہ نوادرات پر ہاتھ صاف کر رہے تھے لیکن جب میں یہاں آیا تو وہ چوکنا ہو گئے۔ کیمرے اور سینسرز کی وجہ سے انہوں نے پچھلے ہفتے کارروائی نہ کی لیکن میرے جانے ہی انہوں نے بھی طے کر لیا کہ اب ایک ہی ہلے میں جتنا کر سکتے ہیں، اتنا مال صاف کر لیا جائے۔" جلیبر سانس لینے کو رکا۔ بارکس دم بخود سارا ماجرا سن رہا تھا۔

"ہاں تو بات یہ ہے..." اس نے پانی کا گھونٹ بھر کر گلاس رکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "جو محلول تمہیں دیا جا رہا تھا، وہ دراصل نیند کی دوا تھی لیکن اس کی مقدار اتنی زیادہ تھی کہ تم سونے کے سوتے رہ جاتے۔ دراصل تمہیں سلانے کا مقصد یہ تھا کہ اس بڑے ٹرک کی آواز نہ سن سکو جسے یہ اندر لا کر نوادرات سے بھر کر لے جانے والے تھے۔" یہ کہہ کر جلیبر نے لحہ بھر توقف کیا۔

"میں تو یہ بات سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔" بارکس نے لقمہ دیا۔

’’تو یہ ہے مسز ہمفرسی سے تمہاری بے انتہا محبت سے فائدہ اٹھانے والوں کی کہانی۔‘‘ ملیکر نے گہری سانس لی۔

کمرے میں کئی منٹ تک خاموشی طاری رہی۔ باکس کے پُرشکن ماتھے پر پسینے کی بوندیں صاف نظر آرہی تھیں۔

’’میں تم سے سخت شرمندہ ہوں...‘‘

’’چھوڑیے وہ باتیں۔‘‘ ملیکر نے بات کاٹ دی۔

’’نہیں...‘‘ اس نے تڑپ کر کہا۔ ’’تمہارے ساتھ میرا رویہ بہت خراب تھا۔‘‘ اس کے لہجے سے شرمندگی عیاں تھی۔ شرم کے مارے وہ ملیکر کی طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔

’’مجھے معاف کردو۔‘‘

’’میرے خیال میں...‘‘ ملیکر نے لمحہ بھر توقف کیا اور چھت کی طرف دیکھا۔ ’’اس کا بہترین حل یہ ہے کہ ایڈی کو فون کرکے ساری بات بتادو تاکہ تمہاری طرح کا کوئی اور کلائنٹ، اگلی بار کم از کم نیویارک ٹائمز میں شائع شدہ تمہاری کہانی کا ہی حوالہ پیش کرے۔‘‘ ملیکر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

’’بالکل ٹھیک کہا، میں ابھی اس سے رابطہ کرتا ہوں۔‘‘ یہ سنتے ہی باکس نے مسرت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

’’ٹھیک ہے۔‘‘ یہ کہہ کر وہ اٹھا۔ ’’میں چلتا ہوں۔‘‘ دروازے کے پاس پہنچ کر ملیکر رکا اور مڑ کر دیکھا۔ ’’گڈ بائے مسٹر لیوپڈ باکس۔‘‘

’’ایک منٹ۔‘‘ باکس نے اسے روکا اور آگے بڑھا۔ ’’کیا تم میرے نوادرات کی حفاظت کے لیے چیف سکیورٹی افسر بننا پسند کرو گے؟‘‘

’’کیا...‘‘ اس نے سوالیہ نگاہوں سے باکس کو گھورا۔

’’پلیز... مجھے تمہاری ضرورت ہے۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘ چند لمحوں تک سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا۔

یہ سنتے ہی باکس کی باچھیں کھل گئیں۔

’’اتنا خوش مت ہو، پہلے میری شرط سن لو۔‘‘

’’وہ کیا ہے؟‘‘ یہ سنتے ہی اس کا چہرہ فق ہوگیا۔

’’میں ملازمت کے لیے اپنی خدمات بنا معاوضہ نہیں دے سکتا۔ مجھے تنخواہ چاہیے ہوگی اور وہ بھی شایانِ شان۔‘‘

’’ہاں...‘‘ باکس نے خوش ہوکر اس کی طرف داہنا ہاتھ بڑھا۔

ایک خیال

’’مردوں کے جھوٹ بولنے کی تمام تر ذمے داری عورتوں پر ہے۔‘‘

’’وہ کیسے؟‘‘

’’آخر وہ ایسے سوال ہی کیوں کرتی ہیں؟‘‘

ایک سائنس داں نے ایک ایسی دوا ایجاد کی جس کو بے جان اشیا پر ملنے سے انہیں جان دار بنایا جاسکتا تھا۔ سب سے پہلے اس نے لندن میں چرچل کے مجسمے پر بطور آزمائش اس دوا کی مالش کی۔

مجسمے نے ایک ہاتھ ہلایا۔ اس کا پورا جسم تھرایا، دیکھتے ہی دیکھتے اسے زندگی مل گئی۔ اس کے جوڑوں سے کڑکڑ کی آواز نکلی اور اس نے آنکھیں جھپکتے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھنا شروع کیا۔

سائنس داں بڑی دلچسپی سے چرچل کے مجسمے کی حرکات و سکنات کو دیکھ رہا تھا۔ آگے بڑھ کر اس نے کہا۔ ’’مسٹر چرچل کے مجسمے! میری حیرت انگیز دوا کی بدولت تمہیں زندگی ملی ہے مگر میرا شکریہ ادا کرنے سے پہلے اب یہ بتاؤ کہ سب سے پہلے تم کون سا کام انجام دینا چاہتے ہو؟‘‘

چرچل کے مجسمے نے کمر سے لٹکا ہوا پستول نکال کر آسمان کی طرف دیکھا اور گرج دار آواز میں کہا۔ ’’میں اپنی بے عزتی کا انتقام لوں گا۔‘‘

’’انتقام ار کے۔ کس سے؟ میں سمجھتا ہوں قوم نے ہمیشہ تمہاری عزت کی ہے۔‘‘

’’میں قوم کی نہیں۔‘‘ چرچل کے مجسمے نے جواب دیا۔ ’’ہم وحشی ان تین ہزار کبوتروں کی بات کررہا ہوں جنہوں نے میرے آرام و سکون کو غارت کر رکھا تھا۔‘‘

☆☆☆

اسی سالہ بوڑھے نے ڈاکٹر کو بتایا کہ اگلے ہفتے وہ ایک بائیس سالہ دوشیزہ سے شادی کررہا ہے۔

’’کیا؟‘‘ ڈاکٹر نے منہ پھاڑ کر کہا۔ ’’تم شادی کررہے ہو۔ نہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت اور وہ بھی بائیس سال کی لڑکی سے؟‘‘

’’میرا تو شادی کا کوئی ارادہ نہیں تھا ڈاکٹر۔‘‘ بوڑھے نے کہا۔ ’’مگر لڑکی کے والدین کہتے ہیں کہ میں نے شادی نہیں کی تو وہ پولیس کو سب کچھ بتا کر مجھے گرفتار کرادیں گے۔‘‘

فتح پور لیہ سے سید محی الدین اشفاق کا تعاون

سرپرائز

جمال دستی

دوستوں کے ملنے اور بچھڑنے کا وقت کٹھن ہونے کے ساتھ نہایت چونکا دینے والا ہوتا ہے... برسوں سے بچھڑے ہوئے دو افراد کے ملاپ کا سنسنی خیز ماجرا...

رات کے اندھیرے میں وہ سایہ آرتھر اور میری ایلسن کے گھر کے باہر نہایت سکون سے روشنیاں گل ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔

گھر کے اندر آرتھر نے بیڈ پر لیٹنے کے بعد روشنی بجھا دی۔ اب گھر میں مکمل اندھیرا چھا گیا تھا۔

وہ پُراسرار شخص مزید کچھ دیر تک انتظار کرتا رہا پھر وہ مسکرا دیا۔ اس نے دبے پاؤں لان عبور کیا اور سیڑھیوں پر ایک چھوٹا سا پیکٹ رکھنے کے بعد پلٹ کر اندھیرے میں گم

ہو گیا۔

اگلے دن جب آرتھر نے اخبار اٹھانے کے لیے دروازہ کھولا تو اسے وہ پیکٹ دروازے کے پر رکھا ہوا ملا۔ وہ اخبار کے ساتھ پیکٹ اٹھا کر اندر چلا آیا۔

''گڈ مارننگ ہنی، یہ دیکھو پورچ میں کیا رکھا ہوا تھا؟'' اس نے اپنی بیوی میری سے کہا۔

''یہ کیا ہے؟'' میری نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے بالارم ہے۔'' آرتھر نے کہا اور پیکٹ کھولنے لگا۔ ''یہ تو کسی قسم کا کوئی آلہ دکھائی دے رہا ہے اور اس کے ساتھ ایک تحریر بھی ہے۔''

آرتھر نے اس تحریر کو پڑھنا شروع کیا:

''ڈیئر آرتھر،

باسٹھ سال کے ایک بوڑھے سپاہی ہونے کے ناتے تم اس بات سے بخوبی واقف ہو گے کہ تمہارے رفیق سپاہیوں میں سے پندرہ سو روزانہ وفات پا رہے ہیں۔ مجھے تمہیں یہ اطلاع دینے کا شرف حاصل ہو رہا ہے کہ آج نصف شب کے بعد تمہیں ان کے ساتھ شامل ہونے کے لیے منتخب کر لیا گیا ہے اور تمہارا نمبر سات سو اکسٹھواں ہے۔

اس تحریر کے ہمراہ ایک الیکٹرانک کاؤنٹر بھی ہے۔

تمہارا خیر خواہ!

دی کاؤنٹ کیپر۔''

آرتھر نے وہ تحریر کوڑے دان میں پھینک دی اور الیکٹرانک کاؤنٹر اپنے پاس رکھ لیا۔

''یقیناً یہ کسی نے مذاق کیا ہے۔'' اس کی بیوی میری نے کہا۔

''اگر مذاق ہے تو نہایت ہی بھونڈا مذاق ہے۔''

اس تحریر کے پیغام نے آرتھر کو شش و پنج میں ڈال دیا تھا۔ تمام دن اور پھر رات ہونے پر طرح طرح کے خیالات اس کے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔ خوف اس کی آنکھوں سے امڈا پڑ رہا تھا۔

''ہنی! تم جاگ رہی ہو؟ مجھے نیند نہیں آ رہی۔ میں کچھ دیر کے لیے بیٹھ کر کمر سیدھی کرنے جا رہا ہوں۔''

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' میری نے تشویش سے پوچھا۔

''بس ایسے ہی بے چینی سی ہو رہی ہے۔''

وہ بستر سے اٹھا اور پھر چلتا ہوا مکان کے اس حصے میں جا پہنچا جہاں اس کی آرام کرسی رکھی ہوئی تھی۔ اس نے ایک لیمپ روشن کیا اور کاؤنٹر اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔

نصف شب کے ایک سیکنڈ بعد وہ سیاہ بکس نما کاؤنٹر حرکت میں آ گیا اور آرتھر کے ہاتھوں میں لرزنے لگا۔ اس کا چھوٹا سا اسکرین روشن ہو گیا۔ ایک گھنٹی سی بجی اور گنتی شروع ہو گئی۔

ڈنگ!

آرتھر دبک کر بیٹھا ہوا تھا۔

صبح بھی گزر گئی۔

''ناشتا نہیں کیا۔ اب لنچ تو کر لو۔'' میری نے آواز دی۔

''مجھے بھوک نہیں ہے۔''

ڈنگ!

سہ پہر کے آخری لمحات میں آرتھر کا چہرہ پھیکا پڑ چکا تھا۔ وہ بار بار اپنی پیشانی پونچھ رہا تھا۔

''تم اس احمقانہ خط پر یقین کر بیٹھے ہو؟'' میری نے کہا۔

''ہو سکتا ہے کہ...''

''وہ محض ایک بکواس ہے۔ تم جانتے ہو۔''

''میں کچھ نہیں کر سکتا... لعنت ہو۔''

ڈنگ!

سات سو ساٹھ...

آرتھر کے جسم نے ایک جھٹکا سا لیا۔

ڈنگ!

سات سو اکسٹھ...!

''آہ...'' وہ کراہنے لگا۔ اسے اپنا سینہ جکڑتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ تھام لیا۔

پھر وہ اپنی کرسی پر آگے کی جانب جھکا اور اس کا جسم کرسی پر سے نیچے لڑھک گیا۔

وہ مر چکا تھا!

☆☆☆

فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔

کوئی جواب نہیں دے رہا تھا۔

''پلیز اپنا پیغام ریکارڈ کرا دیں۔'' فون سے منسلک مشین نے جواب دیا۔

''ہائے آرتھر، یہ میں ہوں تمہارا دوست رونالڈ، کیا تمہیں میرا بھیجا ہوا چھوٹا سا سرپرائز مل گیا تھا؟ اپریل فول!''

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم یکایک چونک کے اٹھ جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ آنکھیں کھول دی ہیں... لیکن ہوتا یہ ہے کہ ہم خواب کی ایک لہر کو خواب کی دوسری لہر پر ہموار دیتے ہیں... اور پھر مل ملا کے ایک نیا خواب بن جاتا ہے... اور نیا خواب خوب پک کر خیالی حقیقت کا پیکر بن جاتا ہے... لیکن اصل حقیقت سے کم بھی نہیں ہوتا... ماضی کی طرف مڑ کر دیکھنے سے حوادث کا سلسلہ ہی نہیں... محبتوں اور چاہتوں کی کرنیں بھی جاگ اٹھتی ہیں... اور اپنے طلسمانہ حصار میں مقید کر لیتی ہیں... کسی اور ہی دنیا کے آہنگ میں یکی داستان عشق... شہزادی کی آگ اسے جلاتا رہی تھی... اس نے لیے اپنی محبوبہ کو حاصل کرنے کا وہ ایسا موڑ تھا... جس میں دور دور تک سیاہی نہ تھی...

دو دنیاؤں کے کردار پر کرشمیں بنے بگڑے

کرداروں کا حیرت انگیز فسانہ

میری کہانی کی ابتدا ایک معمولی سے واقعے سے ہوئی تھی۔

عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے۔ کوئی موڑ، کوئی حادثہ، کوئی واقعہ زندگی کا رخ بدل کر رکھ دیتا ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

لیکن میرے اس واقعے کا ایک بیک گراؤنڈ بھی تھا۔ اور وہ تھا میری ناکامیاں... ان ناکامیوں نے مجھے غصہ ور بنا دیا تھا۔ میری رگوں میں خون کے بجائے آگ کی گردش رہتی تھی۔

عرصہ ہوا والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ دو بھائی اور بھابیاں تھیں اور ان کے نزدیک میرا وجود اور عدم وجود ایک جیسا تھا۔ کیونکہ میں ان کی نگاہوں میں ایک ناکارہ انسان تھا۔

میرا نام فرہاد فیصل ہے۔ میں نے ماسٹر کر رکھا ہے۔ بچپن ہی سے مجھے سائنسی علوم میں دلچسپی رہی ہے۔ یعنی یوگا، مراقبہ، ٹیلی پیتھی اور خاص طور پر مارشل آرٹ۔ میں نے جوڈو کراٹے، تائی کوانڈو وغیرہ سیکھنے میں بہت وقت لگایا ہے۔

میں نے کئی ماہرین کی شاگردی اختیار کی اور ان کے معیار پر پورا اترتا چلا گیا۔ ان علوم نے مجھ میں بے پناہ قوت برداشت بڑھا دی تھی۔

ہو سکتا ہے کہ میں پہلے کبھی بزدل بھی رہا ہوں لیکن تربیت حاصل کرنے کے بعد بزدلی کا عنصر میری ذات سے نکل گیا ہے۔ میں بہت اچھا فائٹر بن چکا ہوں۔

لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود میں ایک ناکام انسان اس لیے تھا کہ ان کی مہارت پیٹ تو نہیں بھر سکتی۔ پیٹ بھرنے کے لیے کوئی کام چاہیے۔ کوئی روزگار چاہیے۔ اور وہی میرے پاس نہیں تھا اس لیے گھر والوں کے نزدیک میری کوئی حیثیت نہیں تھی۔ میں نے کہاں کہاں کوششیں نہیں کیں لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

نہ جانے کچھ لوگوں کی تقدیر ایسی کیوں ہوتی ہے کہ وہ ہزار کوششوں کے باوجود کچھ نہیں کر پاتے اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے لیے کامیابیاں دروازے کھولے ان کے انتظار میں رہتی ہیں۔

میں یہاں ان علوم کے حصول کی تفصیلات بتانا نہیں چاہتا جو میں نے حاصل کیے ہیں۔ کیونکہ پھر میری یہ حیرت انگیز کہانی کسی اور رخ پر چلی جائے گی۔

میں نے اپنی سخت ترین تربیت کے دوران میں بہت تکلیفیں برداشت کی ہیں۔ گھر والوں کا یہ خیال تھا کہ میں شاید پاگل ہو گیا ہوں۔ اتنا پڑھ لکھ کر اپنا وقت برباد کر رہا ہوں۔

شاید ان کا کہنا بھی ٹھیک ہی ہوگا۔ کیونکہ یہاں کامیابی اور ناکامی کا معیار یہی ہے کہ کس کی جیب کتنی بھاری ہے۔ کس کے پاس بائیک ہے اور کون شاندار گاڑی میں سفر کرتا ہے۔ یا کون بے چارہ صرف پیدل ہی چلتا رہتا ہے۔ بس یہی معیار ہے۔

اور مجھے افسوس ہے کہ میں اس معیار پر پورا اترنے میں ناکام رہا ہوں۔ اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود میں کچھ نہیں کر پایا۔

ویسے میرے پاس کیا نہیں تھا۔

اچھی صورت، اچھی تعلیم، اچھی صحت اور کئی علوم کی سوجھ بوجھ رکھنے والا۔ اس کے باوجود کچھ بھی نہیں تھا۔ میری محبت بھی اس لیے روٹھ گئی تھی کہ میرے پاس محبت کی گاڑی میں لگانے کے لیے پیسوں کے پہیے نہیں تھے۔ اور وہ گاڑی چل نہیں پائی تھی۔

میں نے جس لڑکی سے محبت کی، اس کا نام ارم تھا۔

اس نے میری صورت میں اپنے خوابوں کی تکمیل ہوتے ہوئے دیکھ لی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ میں شاید آگے چل کر اپنی صلاحیتوں کے بل پر کوئی اہم مقام حاصل کر لوں گا۔ معاشرے کا معزز فرد کہلاؤں گا۔

کیونکہ اس دور میں معاشی کامیابیاں ہی انسان کو معزز بناتی ہیں اور ناکامیاں اسے ذلیل کر کے رکھ دیتی ہیں۔ مفلسی سب بہار کھوتی ہے۔ مرد کا اعتبار کھوتی ہے۔

تو ارم نے جب یہ دیکھا کہ میں اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود ناکام ہوتا جا رہا ہوں تو اس نے مجھ سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ میں اس سلسلے میں اس کی یہ تعریف ضرور کروں گا کہ اس نے منافقت نہیں کی تھی بلکہ صاف صاف کہہ دیا تھا۔ "فرہاد فیصل! افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ تم ایک ناکام انسان ثابت ہو رہے ہو۔ تم نے ابھی تک کچھ بھی نہیں کیا ہے اور شاید تم آئندہ بھی کچھ نہیں کر سکو گے۔"

"ارم یہ ٹھیک ہے کہ میں ابھی تک کچھ نہیں کر پایا ہوں لیکن اتنا ضرور ہے کہ میری امیدوں نے دم نہیں توڑا ہے۔ میں آنے والے اچھے دنوں کو دیکھ رہا ہوں۔ اس کے علاوہ دوسری بات یہ ہے کہ محبت کرنے والے ہر حال میں زندگی گزار ہی لیتے ہیں۔"

''مجاز میں مجھو گوا دینا محبت کو۔'' وہ پڑ کر بولی۔ ''جو محبت سلیقے سے زندہ نہ رکھ سکے، اس سے تو نہ ہونا بہتر ہے۔ تم تو جانتے ہو کہ میں زندگی کس انداز کی گزارنا چاہتی ہوں اور تمہارے حالات دیکھ کر احساس ہو گیا ہے کہ میری خواہشیں پوری کرنا تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔''

اور وہ روٹھ کر چلی گئی کیونکہ اسے جانا ہی تھا۔ محبت واقعی پیٹ نہیں بھر سکتی۔ جو پیٹ بھرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، محبت کا حق اسی کو ہوتا ہے۔

ارم کے جانے کے بعد میں بہت بددل ہو گیا.....

کیا فائدہ تھا ایسی زندگی کا۔ کیا ملا تھا مجھے، سوائے مایوسیوں کے۔ ارم ہی کی بات نہیں تھی بلکہ اپنے گھر والوں نے بھی یہ جتانا شروع کر دیا تھا کہ میں ایک ناکام انسان ہوں۔ ناکارہ ہوں۔ میں اپنی زندگی میں کچھ بھی نہیں کر سکوں گا۔

ان سب باتوں نے مجھے بہت اداس اور بددل کر دیا تھا۔ میرے مزاج میں چڑچڑا پن اور غصہ شامل ہو گیا تھا اور یہی چڑچڑا پن مجھے اسکندر تک لے آیا تھا۔

لیکن نہیں۔ میں اسکندر براہ راست نہیں آیا تھا۔ ایک حادثہ مجھے یہاں لا پہنچا... یہاں آنے سے پہلے کچھ اور ہوا تھا میرے ساتھ۔

وہ ایک صحت مند پولیس والا تھا۔ جو ایک کمزور سے نوجوان کو بلاوجہ مار رہا تھا۔ میں اس وقت اسی چوراہے سے گزر رہا تھا، جب میں نے یہ تماشا دیکھا۔

وہاں اور بھی کچھ لوگ کھڑے تھے لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ اس مظلوم نوجوان کو اس پولیس والے سے بچا سکے۔

لوگوں نے میرے دریافت کرنے پر بتایا کہ وہ نوجوان اپنی بائیک پر جا رہا تھا کہ پولیس والے نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ نوجوان کا دھیان شاید دوسری طرف تھا یا کوئی اور بات تھی کہ اس نے بائیک نہیں روکی۔ پولیس والے نے آگے کھڑی ہوئی موبائل کو اشارہ کیا کہ وہ بائیک والے کو روک لے۔

موبائل نے بائیک رکوالی۔ نوجوان کو بائیک سے اتروایا گیا۔ اس کے بعد پولیس والے نے اس کے پاس جا کر اسے گالیاں دینا شروع کر دیا۔

نوجوان یہ برداشت نہیں کر پایا ہوگا۔ اس نے بھی جواب میں کچھ کہا اور پولیس والے نے اسے مارنا شروع کر دیا۔ بس اتنی سی بات ہوئی تھی۔

حالانکہ میرا اس جھگڑے سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن اس نوجوان کی بے بسی دیکھی نہیں گئی۔ میں نے اس پولیس والے کا ہاتھ تھام لیا۔ ''کیا ہو گیا، کیوں مار رہے ہو اس بے چارے کو؟''

''کیوں، کیا تو اس کا باپ لگتا ہے؟'' پولیس والا غصے سے دہاڑا۔

میرے لیے بس اتنا ہی بہت تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے اسے اٹھا کر ایک طرف پھینک دیا۔ بس اس کے بعد تو قیامت ہی آگئی۔ دور جو موبائل کھڑی تھی، وہ پولیس والے بھی آ کر مجھ پر ٹوٹ پڑے۔

میں نے ان میں سے تین کو تو لٹا دیا تھا۔ میرا مارشل آرٹ اس وقت میرے کام آ رہا تھا جو چوتھا بچا تھا، اس نے مجھے قابو کرنے کے لیے ہوائی فائرنگ شروع کر دی۔

اور ویسے بھی میں ان کے خلاف لڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ میرے ملک اور میرے شہر کے پولیس والے تھے۔ ان سے میری دشمنی بھی نہیں تھی۔ میں تو خوامخواہ اس جھگڑے میں الجھ گیا تھا۔

میں نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔ دلچسپ بات یہ ہوئی کہ وہ پٹنے والا نوجوان موقع پا کر بھاگ نکلا تھا جبکہ وہ پولیس والا ابھی تک اسی جگہ پڑا تھا جہاں میں نے اسے اٹھا کر پھینکا تھا۔

پولیس والوں نے مجھے موبائل میں بٹھا لیا۔

چار پولیس والے میرے ساتھ بیٹھ گئے۔ ''دیکھ کمینے! اب ہم تیرا کیا حشر کرتے ہیں۔'' ایک پولیس والے نے کہا۔

''دیکھو۔'' میں نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے دھیرے سے کہا۔ ''میں نے اپنے آپ کو خود تم لوگوں کے حوالے کیا ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ مجھے گالیاں نہ دو۔ ورنہ میں مجبور نہیں ہوا ہوں۔ کسی وقت بھی تم لوگوں کو مزہ چکھا کر یہاں سے نکل سکتا ہوں۔''

''ارے واہ...'' پولیس والے ہنس پڑے۔ ''ذرا دیکھو تو اس کو۔ اس کی بات سنو... یہ کیا بکواس کر رہا ہے، اس کی تو...''

اس نے پھر ایک گالی دی۔ اب معاملہ میری برداشت سے باہر ہو چکا تھا۔ میں نے سب سے پہلے ایک زوردار مکا سامنے والے کو رسید کیا اور اس کے ساتھ ہی اپنی دونوں کہنیاں برابر والوں کے سینے میں گھونپ دیں۔ یہ معمولی وار نہیں تھے۔ ایک تربیت یافتہ انسان نے ان پر غصے کی پوری شدت کے ساتھ حملہ کیا تھا۔ وہ اوغ کر کے وہیں ڈھیر ہو گئے۔ چوتھا ابھی سنبھل بھی نہیں پایا تھا کہ میں

نے اس کو بھی قابو میں کرلیا۔

"موبائل رکواؤ۔" میں نے چونتے سے کہا۔ وہ تینوں نوردرد کی شدت سے تڑپنے لگے تھے۔

چونچے نے خوف زدہ آواز میں موبائل کے ڈرائیور کو موبائل روکنے کے لیے کہا اور موبائل کے آہستہ ہوتے ہی میں نے موبائل سے چھلانگ لگادی۔

میں ایک طرف دوڑتا چلا گیا۔ حالانکہ کسی نے میرا تعاقب بھی نہیں کیا تھا لیکن اس وقت ذہن پر ایک دھند کی سی کیفیت تھی۔ یہ کیا کررہا تھا میں نے؟

انسان کبھی کبھی بعد میں سوچتا ہے۔ پہلے وہ کر گزرتا ہے، اس کے بعد ساری زندگی پچھتاوے اس کا ساتھ دیتے رہتے ہیں۔ اول تو مجھے پولیس اور اس نوجوان کے جھگڑے میں ملوث ہونا ہی نہیں چاہیے تھا۔ اس کے بعد جب پولیس مجھے موبائل میں بٹھا کرلے جارہی تھی تو مجھے پولیس والوں کی باتیں برداشت کرلینی چاہیے تھیں۔ خوامخواہ اشتعال میں آنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہاں تو یہ معمول ہے۔

اب میں کہاں جاتا۔

گھر والوں کو تو پہلے ہی مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ وہ میرے غم میں پریشان ہوتے رہتے۔ والدین کا انتقال ہوچکا تھا۔ مجھ سے بڑے دو بھائی تھے، ان کی شادیاں ہوچکی تھیں۔ وہ اپنی اپنی زندگیاں گزار رہے تھے، انہیں میری کیا ضرورت تھی؟

کون تھا جسے اس بات کا احساس ہوتا کہ میں کہاں رہ گیا ہوں۔ ابھی تک گھر کیوں نہیں واپس آیا لیکن سوال یہ تھا کہ میں کہاں جاؤں؟

مجھے یہ گمان بھی نہیں تھا کہ اب کوئی مجھ پر ہاتھ نہیں ڈال سکے گا۔ کیونکہ میں کئی پولیس والوں کو مار کر بھاگ نکلا تھا اس لیے وہ مجھے قبر سے بھی باہر نکال لاتے۔

اب میں کوئی اتنا سپرمین تو نہیں تھا کہ پورے شہر کی پولیس کا مقابلہ کرپاتا اس لیے میرے لیے بہت دشواریاں ہونے والی تھیں۔

اصل میں ہوتا بھی ہے۔ کوئی ایک واقعہ، کوئی ایک حادثہ زندگی کا رخ بدل کررکھ دیتا ہے۔ اگر میں اس وقت اس نوجوان کی حمایت میں پولیس والے سے نہیں بھڑتا تو یہ سب بھی نہیں ہوتا۔

اس کہانی کا جنم ہی نہیں ہوتا۔ شاید قدرت اسی طرح ماحول تخلیق کررہی ہے۔ سب کچھ اسی طرح ہوجاتا ہے اور کہانیاں اپنے آپ کو ظاہر کرنے لگتی ہیں۔

اس وقت بھی میرے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ ایک چھوٹا سا واقعہ سنگین صورت اختیار کرگیا اور میں کسی پناہ گاہ کے لیے دوڑتا چلا گیا۔

کہاں جاتا ہے... کس طرف جاتا ہے، مجھے کچھ نہیں معلوم تھا۔

اچانک کسی نے آواز دی۔ "رکو... رک جاؤ۔"

وہ ایک ہی آدمی تھا جو میرے پیچھے دوڑتا چلا آرہا تھا۔

وہ مجھے پولیس والا نہیں لگ رہا تھا اس لیے میں رک گیا۔ میں الجھا ہوا ضرور تھا لیکن خوف زدہ نہیں۔ وہ شخص میرے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔

وہ ایک صحت مند اور بادقار قسم کا آدمی تھا۔ اس کے جسم پر بہت قیمتی لباس تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک تھی جس نے مجھے مرعوب کردیا۔

"میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔" وہ دھیرے سے بولا۔ "بلکہ مجھے اپنا دوست سمجھو۔"

"لیکن تم ہو کون؟"

"اس بحث میں نہ پڑو۔" اس نے کہا۔ "میں نے تمہیں ان ایکشن دیکھا ہے۔ اس وقت بھی جب تم ایک نوجوان کو بچا رہے تھے اور اس وقت بھی جب تم موبائل والوں کو مار کر بھاگے تھے۔"

"تم نے کہاں سے دیکھ لیا؟"

"میں تمہیں واچ کررہا تھا۔" اس نے کہا۔ "مجھے تمہارے انداز اچھے لگے۔ ذہین باذوق معلوم ہوتے ہو۔ آؤ میرے ساتھ میں تمہیں کچھ اور بھی سکھاؤں گا۔"

"تم سکھاؤ گے؟" میں ایک دم سے بھڑک اٹھا۔

"بری بات۔" وہ مسکرا دیا۔ "کبھی بھی زندگی میں اپنے آپ کو آخری اور سب سے بہتر سمجھنے کی حماقت مت کرنا۔ تم نہیں جانتے کہ ان ہی گلیوں میں کیسے کیسے ہنرمند گھوم رہے ہوں گے جو تم سے بہت بہتر ہوسکتے ہیں۔"

"سوری۔" میں نے معذرت کی۔ "تم نے اچھی بات بتائی۔ نہ جانے کیوں میں اپنا ٹمپر لوز کرنے لگا ہوں۔"

"یہی تمہاری سب سے بڑی کمزوری ہے۔" اس نے کہا۔ "طاقت اور ہنر کا استعمال ہر جگہ نہیں کیا جاتا۔ جس کو یہ مل جائے اسے بہت صبر اور برداشت کی ضرورت ہوتی ہے۔ تم آؤ میرے ساتھ۔ میرا اندازہ ہے کہ اس وقت تمہارے سامنے کوئی منزل بھی نہیں ہوگی۔"

"تمہارا اندازہ بالکل درست ہے دوست۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔ "اگرچہ منزل ہے لیکن میں وہاں جانا نہیں چاہتا۔"

"یہی تمہاری عقل مندی ہے۔" اس نے کہا۔ "کیونکہ پولیس والے تمہیں تلاش کرتے ہوئے تمہارے گھر تک جا پہنچیں گے۔"

"بے چارے پولیس والوں کو کیا معلوم کہ میں کون ہوں اور کہاں رہتا ہوں؟"

"اس خوش فہمی میں مت رہنا۔" اس نے کہا۔ "ذرا اپنی جیب میں دیکھو۔ مار پیٹ کے دوران میں تمہارا شناختی کارڈ تمہاری جیب سے گر گیا تھا اور وہ پولیس والوں کے ہاتھ لگ گیا ہے۔"

میں نے بوکھلا کر اپنی ساری جیبیں ٹٹول ڈالیں۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میرا شناختی کارڈ کہیں گر گیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے تھوڑی سی پریشانی ہوئی۔

اب میرا پتا بہت آسانی سے ٹریس ہو سکتا تھا اور پولیس ایک بار جس کے پیچھے پڑ جائے، اسے کہاں چھوڑتی ہے۔

"گھبراؤ نہیں۔" اس نے میرے شانے پر تھپکی دی۔ "تمہارا یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔"

"لیکن تم مجھے کہاں لے جاؤ گے؟"

"اپنے گھر، جہاں کوئی پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔" اس نے بتایا۔ "اس گلی کے باہر میری گاڑی کھڑی ہے۔"

مجھے وہ آدمی بہت پُراسرار سا معلوم ہوا تھا۔ میں نے اس کے لہجے میں ایک خاص بات یہ نوٹ کی کہ وہ بہت پُراعتماد تھا۔ جیسے وہ جو کچھ کہہ رہا ہو وہ ہر حال میں ہوتا ہے۔

میں اس اجنبی کے ساتھ ہو لیا۔ اجنبی اس لیے کہ اس نے ابھی تک مجھے اپنا نام نہیں بتایا تھا۔ وہ بس ہوا کے ایک جھونکے کی طرح مجھ پر نازل ہوا اور مجھ پر چھاتا چلا گیا۔

اس گلی کے باہر واقعی ایک شاندار سی نئی گاڑی کھڑی تھی جس کے شیشے سیاہ ہو رہے تھے۔ گاڑی کے باہر ایک ڈرائیور بھی تھا جو اس شخص کو دیکھ کر مؤدب ہو گیا تھا۔

اس کی مالی حیثیت کا اندازہ تو اس کے قیمتی لباس ہی سے ہو گیا تھا لیکن اس گاڑی نے اور بھی واضح کر دیا تھا کہ وہ کوئی دولت مند انسان ہے۔

اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ بہت ٹھنڈی گاڑی تھی۔ اس میں بیٹھ کر سکون کا احساس ہونے لگا۔ وہ خود ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا۔

گاڑی اس کے اشارے پر چل پڑی لیکن فوراً ہی بریک بھی لگا دیا گیا۔

سامنے پولیس والوں نے ناکا بندی کر رکھی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ یہ ناکا بندی میرے ہی لیے کی گئی ہو۔ تین چار پولیس والے گاڑی کے پاس آ گئے۔

اس شخص نے اپنی کھڑکی کا شیشہ نیچے کر دیا۔ جبکہ میں نے ایک اور معرکے کے لیے ذہنی طور پر اپنے آپ کو تیار کر لیا تھا۔

لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ پولیس والے اس کی صورت دیکھ کر مؤدب انداز سے پیچھے ہٹ گئے اور گاڑی پھر چل پڑی۔ یعنی وہ آدمی صرف دولت مند ہی نہیں بلکہ بااختیار بھی تھا۔

آخر وہ کون ہو سکتا تھا۔ گاڑی میں آ کر اس نے خاموشی اختیار کر لی تھی جبکہ اس کے موڈ کو دیکھتے ہوئے میں بھی خاموش تھا۔

بالآخر بہت دیر کے سفر کے بعد شہر کے ایک پوش علاقے کی عمارت میں وہ گاڑی داخل ہو گئی۔ اس کے گیٹ پر باوردی چوکیدار کھڑے تھے جنہوں نے فوری طور پر گیٹ کھول دیا تھا۔

ہم جس عمارت میں داخل ہوئے، وہ ایک شاندار عمارت تھی۔ انتہائی پُرشکوہ... جس کی دیواریں بہت اونچی اونچی تھیں۔ کسی قلعے کی طرح۔ اس نے سچ ہی کہا ہو گا کہ یہاں کوئی پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔

وہ مجھے اپنے ساتھ وسیع و عریض شاندار ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ انتہائی شاندار اور بیش قیمت۔ دیواروں پر مشہور مصوروں کی تصاویر۔ انتہائی قیمتی اور نفیس فرنیچر۔ سب کچھ مرعوب کر دینے والا تھا۔ جو یہ احساس دلا رہا تھا کہ وہ کوئی عام آدمی نہیں ہے۔

"بیٹھ جاؤ۔" اس نے ایک صوفے کی طرف اشارہ کیا اور خود سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"ہاں اب بتاؤ، نام کیا ہے تمہارا؟" اس نے پوچھا۔

"فرہاد قیصل۔" میں نے بتایا۔ "کیا میں آپ کے بارے میں جان سکتا ہوں؟"

"سب کچھ بتا دوں گا۔ پہلے اپنے بارے میں سب کچھ بتاتے جاؤ۔ کن حالات میں زندگی گزار رہے ہو؟ کیا کرتے ہو؟ کہاں رہتے ہو؟ وغیرہ وغیرہ۔"

میں نے کچھ سوچ کر اسے اپنے بارے میں بتانا

شروع کر رہا۔ اپنا بیک گراؤنڈ، اپنی تعلیم، اپنی تربیت، مارشل آرٹس اور ماورائی علوم سے دلچسپی۔ میں نے اسے سب کچھ بتا دیا تھا۔

"خوب!" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ بہت مشکل زندگی گزاری ہے تم نے؟"

"جی ہاں اور اب تک گزار رہا ہوں۔"

"لیکن اب نہیں گزارو گے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تمہارے ستارے اب عروج پر جانے والے ہیں۔ حالانکہ میں تمہارے راستے میں بہت سی دشواریاں دیکھ رہا ہوں لیکن تم ان پر قابو پاتے چلے جاؤ گے۔ تمہیں ایک غیر معمولی انسان بننا ہے۔ قدرت شاید اسی لیے تمہیں میرے پاس لے آئی ہے۔"

"ہو سکتا ہے۔" میں نے گردن ہلائی۔ "ویسے کیا میں اپنے محسن کا نام جان سکتا ہوں؟"

"بالگو نام ہے میرا۔" اس نے بتایا۔ "شاید تم کو میرا یہ نام جان کر حیرت ہو؟"

"جی ہاں۔" میں نے اعتراف کیا۔ "میں واقعی حیران ہوا ہوں، یہ کیا نام ہے؟"

"میرا نام تو کچھ اور ہے۔" اس نے بتایا۔ "اور اس کا جاننا تمہارے لیے ضروری بھی نہیں ہے۔ لوگ مجھے بالگو کے نام سے جانتے ہیں۔ کیا تمہیں قدیم یونانی دیوی دیوتاؤں سے بھی دلچسپی رہی ہے؟"

"میں نے ان کے بارے میں کسی حد تک پڑھا ضرور ہے لیکن زیادہ نہیں جانتا۔" میں نے بتایا۔

"ایزرلیس یونان کی ایک قدیم دیوی تھی۔" اس نے کہا۔ "اس کو دوسرے دیوتاؤں نے یہ بددعا دی تھی کہ اگر اس نے کسی سے محبت کی تو اس کا محبوب مر جائے گا۔ یہ کہانی دیوتاؤں سے ہوتی ہوئی انسانوں تک پہنچ چکی تھی۔ کوئی بھی موت کے خوف سے ایزرلیس کے پاس نہیں جاتا تھا۔ پھر ایتھنز کا رہنے والا بالگو اس کے عشق میں مبتلا ہو گیا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ ایزرلیس کی محبت موت ہے، اس نے ایزرلیس کو اپنی محبت کا یقین دلا دیا۔ وہ صرف ایک رات گزارنے کے عوض اپنی زندگی ہارنے کو تیار تھا۔ سن رہے ہو تم؟"

"ہاں سن رہا ہوں۔" میں چونک اٹھا۔ "بہت ہی عجیب کہانی ہے۔ اس کے بعد کیا ہوا؟"

"وہی ہوا جو دیوتاؤں نے کہا تھا، بالگو مر گیا۔ اس نے محبت کے لیے جان دے کر اپنے آپ کو زندہ کر لیا۔

بہرحال، میں نے... تاریخ کے اس کردار سے متاثر ہو کر اپنا نام بالگو رکھ لیا۔ اب شاید خود مجھے بھی اپنا اصلی نام یاد نہیں ہے۔ میں بالگو ہوں۔ سب اسی نام سے جانتے ہیں مجھے۔"

اس کی بات میری سمجھ سے باہر تھی۔ اس نے اپنا بیک گراؤنڈ بتایا ہی نہیں تھا۔ ایک کہانی میں الجھا دیا تھا۔ اس کے پاس اتنی دولت کہاں سے آ گئی۔ وہ کیا کرتا ہے، یہ سب کچھ نہیں بتایا تھا اس نے۔

"فرہاد فیصل۔" اس نے میری طرف دیکھا۔ "تم نے اپنا یہی نام بتایا ہے نا؟"

"جی ہاں، میرا یہی نام ہے۔"

"میں نے تم میں کچھ صلاحیتیں دیکھ لی ہیں اور میں تمہاری صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔"

"بتائیں، میں آپ کے کس کام آ سکتا ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"کیا تم میرے لیے یونان جا سکتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"یونان۔" میں حیران رہ گیا۔ "میں یونان جا کر کیا کروں گا؟"

"وہاں جا کر ایزرلیس کو تلاش کرنا ہے۔" اس نے کہا۔ "نوجوان! تمہیں میری باتیں کسی دیوانے کی باتیں لگ رہی ہوں گی لیکن اس کائنات کے مکمل بھید کون جان سکا ہے۔ نہ جانے ہر قدم پر کیا کیا کہانیاں ہیں۔ تمہارے اردگرد چلنے پھرنے لوگوں میں کون کیا ہے، کون جانتا ہے۔ لوگ تو ظاہری آنکھ سے جو سامنے نظر آتا ہے وہ دیکھتے ہیں۔ کیا معلوم کہ اندھیروں کی دیوار کے اس طرف کیسی دنیا آباد ہے۔"

اس کا لہجہ بہت متاثر کن اور پرزور ہوتا جا رہا تھا۔ وہ جو کچھ بھی کہہ رہا تھا، وہ میرے اعصاب پر ہتھوڑے کی طرح برس رہا تھا۔

"ہو سکتا ہے کہ جو لوگ تم سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے ہوں، جنہیں موت آ گئی ہو، وہ کسی نہ کسی شکل میں تمہارے آس پاس ہی موجود ہوں۔ انہیں پہچاننے کے لیے خاص نظر چاہیے۔ وہ نظر مل جائے تو زندہ لوگوں کی بھیڑ میں ہر دوسرا آدمی تمہیں مرا ہوا دکھائی دے گا۔"

"بالگو صاحب! آپ کی باتیں خوف زدہ کر رہی ہیں۔" میں نے کہا۔

"خوف زدہ ہونے کی نہیں، سمجھنے کی ضرورت ہے۔"

بالگو مسکرا دیا۔ ''تمہیں میرا ایک کام کرنا ہے۔ اس کے عوض میں تمہیں ایک ایسا علم دوں گا جس کی مدد سے تم جان جاؤ گے کہ تمہارے اردگرد چلنے پھرنے والے کتنے لوگ زندہ ہیں اور کتنے مر چکے ہیں۔''

''بالگو صاحب! اول تو یہ بات مان لینا ہی بہت دشوار ہے۔'' میں نے کہا۔ ''فرض کریں، اگر ایسا ہو بھی جائے تو اس سے فائدہ کیا ہوگا؟''

''فائدے کا سوچنا تم پر منحصر ہے۔ تمہاری عقل مندی اور ہوشیاری کا امتحان ہوگا۔ تم اپنی ذہانت سے کام لو گے۔''

''تو آپ کا یہ کہنا ہے کہ میں یونان جا کر آپ کی ایزریس کو تلاش کروں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، کیونکہ مجھ پر کچھ ایسی پابندیاں ہیں کہ میں وہاں نہیں جا سکتا۔'' اس نے کہا۔

''کیا میں یہ سمجھوں کہ پچھلے جنم میں آپ ہی بالگو تھے؟'' میں نے ایک احمقانہ سا سوال کیا جس پر خود مجھے بھی یقین نہیں تھا۔

''ہاں۔'' اس کی مسکراہٹ بہت گہری تھی۔

''ہاں... میں ہی بالگو تھا۔''

''کیسے یقین کیا جائے۔ یہ نظریہ تو شاید ہندوؤں کا ہے۔ آوا گون کا پورا فلسفہ اس پر منحصر ہے۔''

''ہوسکتا ہے کہ ایسا ہی ہو۔ لیکن مجھے ان کے نظریے سے کچھ نہیں لینا دینا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں بالگو رہ چکا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''حیرت انگیز طور پر مجھے اپنے گزشتہ جنم کی ہر بات یاد ہے۔ خیر، وہ کہانی تو ختم ہوگئی۔ اب سچائی یہ ہے کہ تم میرے سامنے ہو... اور میں تم سے درخواست کر رہا ہوں کہ تم یونان جا کر ایزریس کو میرے لیے تلاش کرو۔''

''بالگو صاحب! وہ مجھے مل بھی گئی تو میں اسے کیسے پہچانوں گا؟''

''اس کی پشت پر ایک ہلال بنا ہوا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''ویسے یونان میں جگہ جگہ اس کے مجسمے بھی موجود ہیں۔ تم ان کو دیکھ کر اس کے خدوخال کا اندازہ کر سکتے ہو اور سب سے بڑی پہچان تو بتا دی ہے۔''

''میرا دوسرا سوال یہ ہے کہ آپ خود یونان تو نہیں جا سکتے۔ کیونکہ وہاں آپ پر پابندی ہے۔ پھر آپ اس سے کیسے ملیں گے؟''

''اب یہاں سے تمہارا اصل کام شروع ہوگا۔ اس نے بتایا۔ ''تم اسے یونان سے نکال کر کسی اور ملک میں لے جاؤ گے۔ مجھے خبر کر دو گے اور میں اپنی کھوئی ہوئی محبت کے پاس پہنچ جاؤں گا۔''

''چلیں مان لیا کہ یہ سب ہو گیا لیکن میں یہاں سے جاؤں گا کیسے؟ میرا پاسپورٹ، ویزا، شناختی کارڈ اور وہاں رہنے کے اخراجات یہ سب کہاں سے ہوں گے؟''

''تم اس کی فکر مت کرو۔ دو دنوں میں سارا بندوبست ہو جائے گا۔'' اس نے کہا۔ ''کچھ دیر بعد تمہاری تصویریں اتاری جائیں گی اور دو دنوں میں سب کچھ بن کر آ جائے گا۔ ہاں، اب تمہارا نام فرہاد فیصل نہیں ہوگا بلکہ تم اب ایک نئی شناخت اور نئے نام کے ساتھ زندگی گزارو گے۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

''یہ تمہیں کرنا ہوگا۔ کیونکہ پولیس تمہاری تلاش میں ہوگی۔'' اس نے کہا۔ ''اگر تم خود کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑنا چاہتے ہو تو بات دوسری ہے۔''

''میں تو صرف اپنی بقا چاہتا ہوں۔''

''تو بس، میری بات مان لو۔'' اس نے کہا۔ ''دو دن تمہیں یہیں قیام کرنا ہوگا۔ یہاں تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔''

پھر اس نے انٹرکام پر کسی کو کچھ ہدایات دیں اور میری طرف دیکھا۔ ''ابھی جینیفر آ رہی ہے، وہ تمہیں تمہارا کمرا دکھا دے گی، تم دو گھنٹے آرام کرو۔ دو گھنٹوں کے بعد فوٹوگرافر آ جائے گا۔''

نہ جانے یہ جینیفر کون تھی لیکن جب وہ کمرے میں آئی تو ایسا لگا جیسے کمرے میں چاند اتر آیا ہو۔ وہ اتنی ہی خوب صورت تھی۔ اس نے نیلی جینز اور سرخ شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کا جسم تپش دیتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اپنے دل کش ہونٹوں پر دل کش مسکراہٹ سجائے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

''جینی! یہ تمہارے مہمان ہیں۔'' بالگو نے میری طرف اشارہ کیا۔ ''ان کا خیال رکھنا۔''

''یس باس۔''

دونوں نے انگریزی میں بات کی تھی۔ جب جینی مجھے اپنے ساتھ لے جانے لگی تو میں نے بالگو سے پوچھا۔ ''بالگو صاحب! کم از کم آپ مجھے یہاں کی شناخت تو بتا دیں۔ یہاں آپ کو بالگو تو نہیں کہا جاتا ہوگا۔''

''نہیں۔'' وہ ہنس پڑا۔ ''بالگو تو میرے ماتحتوں کے لیے ہے، ویسے مجھے راز فراز کہتے ہیں۔'' اس نے بتایا۔

"رانا فراز۔" میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔

"رانا فراز۔ وہ مشہور سیاست داں اور سماجی کارکن۔"

"ہاں، میں وہی رانا فراز ہوں لیکن تمہارے لیے بالکو ہوں۔ تم مجھے بالکو ہی کہا کرو گے۔"

☆☆☆

رانا فراز کے نام سے مجھے بہت کچھ یاد آنے لگا تھا۔

وہ ایک مشہور انسان تھا۔ بہت دولت مند۔ رانا گروپ آف کمپنیز کا مالک۔ بہت داستانیں اس نام سے وابستہ تھیں۔

وہ سیاست داں اور صنعت کار ہونے کے علاوہ ایک مشہور کوہ پیما بھی تھا۔ اس نے پاکستان کے لیے کئی خطرناک مہمات سر کی تھیں۔ سرکاری و غیر سرکاری حلقوں میں اسے عزت اور احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔

اس نے جس لڑکی جینیفر کو میرے ساتھ کیا تھا، وہ ایک پھول ہی کی طرح نہیں بلکہ پورے چمن کی طرح تھی۔ اس کے جسم کا ہر عضو کسی پھول کی طرح خوب صورت اور مکمل تھا۔ یورپ میں رنگ تو گورا ہوتا ہے لیکن نقوش پرکشش نہیں ہوتے جبکہ اس لڑکی کے نقوش بھی تیکھے اور دل کش تھے۔

وہ میرے آگے آگے چل رہی تھی اور میں دل ہی دل میں اس کی ہر ادا پر قربان ہوا جا رہا تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ ایک بہت ہی خوب صورت کمرے میں لے آئی۔

میں اس کمرے کی سجاوٹ اور اس کے ساز و سامان کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا تھا لیکن وہ ایسا ضرور تھا کہ میں ایک لمحے کے لیے گنگ ہو کر رہ گیا۔

"تم یہاں آرام کرو۔" جینیفر کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "یہ کمرا تمہارے لیے ہے۔" پھر اس نے پوچھا۔ "تم انگریزی تو سمجھ لیتے ہو نا؟"

"بہت اچھی طرح۔" میں نے بتایا۔ "میں انگریزی کے علاوہ جرمن اور فرنچ بھی جانتا ہوں۔"

"پھر تو تم کام کے آدمی ہو گے۔" اس نے کہا۔ "میرا تعلق آئرلینڈ سے ہے۔"

"اسی لیے تمہاری انگریزی اتنی اچھی ہے۔ آئرلینڈ والے انگریزوں کی انگریزی سے خوش نہیں ہوتے۔"

"ہاں۔" وہ ہنس پڑی۔ "اس سلسلے میں تمہاری نالج اچھی ہے۔ تم آرام کرو۔ وہ سامنے واش روم ہے۔ یہ وارڈ روب بھی ہے۔ تمہیں تمہارے سائز کے کپڑے مل جائیں گے۔ میں اب چلتی ہوں۔ کچھ دیر میں فوزیہ آ کر تمہاری نصویر اتارے گا۔"

میں نے سوچا کہ میں جینیفر سے کچھ باتیں کروں۔ اس سے پوچھوں کہ رانا صاحب نے اپنے بالکو ہونے کی جو کہانی سنائی ہے، کیا وہ اس کہانی پر یقین کر سکتی ہے؟ کیا واقعی رانا صاحب میں غیر معمولی باتیں ہیں۔ میں اس سے یہ سب پوچھنا چاہتا تھا لیکن شاید اتنی جلدی یہ سب مناسب نہیں تھا۔

ابھی تو یہ دیکھنا تھا کہ رانا کی تھیلی میں کیا ہے۔ اس نے بڑی حیرت انگیز کہانی سنائی تھی اور ابھی تک مجھ سے ہضم نہیں ہو پا رہی تھی۔ لیکن میں مصلحتاً اس لیے خاموش تھا کہ میرے پاس اور کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں تھا۔ میں پولیس والوں سے جھگڑا کر کے شاید مصیبت میں پھنس چکا تھا۔

"کیا تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہے؟" جینیفر کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

وہ اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں چراغ جلائے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"نہیں۔" میں نے انکار میں اپنی گردن ہلا دی۔

"تمہارا شکریہ۔"

وہ منہ ہی منہ میں کچھ کہتی ہوئی چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ وہ دراصل کیا کہنا چاہتی تھی۔ اتنی خوب صورت اور دل کش لڑکی نے خود کو پیش کرنے کی بات کی تھی لیکن میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ دراصل ایسے معاملات میرے لیے ہمیشہ سے انوکھے اور سنسنی خیز رہے ہیں۔

میرے مزاج میں جو ایک جھجک اور شرم ہے، وہ میرے سامنے آ کر کھڑی ہو جاتی ہے اور میں نگاہیں چرا کر دوسری طرف دیکھنے لگتا ہوں۔

میں نے جس لڑکی سے محبت کی تھی، اس کے ساتھ بھی کبھی کبھی ایسا ہی ہوا کرتا۔ وہ میری حماقت پر ہنس کر رہ جاتی۔ بہرحال جینی کے جانے کے بعد میں بستر پر لیٹ گیا۔

میں بہت دیر تک سوچتا رہا تھا۔ وہ نرم اور آرام دہ بستر ایسا ہی تھا کہ اس پر لیٹتے ہی نیند آ گئی۔ سو کر اٹھا تو رات ہو چکی تھی۔

میں باعث غسل خانے میں داخل ہو گیا۔ وہ غسل خانہ بھی اس مکان کے شایانِ شان ہی تھا۔ میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے اتنا پرتکلف غسل خانہ شاید ہی دیکھا ہو۔

میں بہت دیر تک نہاتا رہا۔ وارڈ روب دیکھا تو میرے سائز کے ان گنت سوٹ تھے۔ میں نے ایک کا

انتخاب کیا اور اسی وقت دروازے پر دستک ہونے لگی۔

دروازہ کھولا تو جینی موجود تھی۔ اس نے گہری نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ ”باس نے تمہیں یاد کیا ہے۔“

ظاہر ہے کہ وہ باس بالکو بارانا کے سوا اور کون ہوسکتا تھا۔

میں اس کے ساتھ ڈرائنگ روم کی طرف چل پڑا۔ ڈرائنگ روم میں بالکو کے ساتھ ایک اور آدمی بھی موجود تھا جس کے ہاتھ میں ایک عدد کیمرا تھا۔

”یہ تمہاری تصویریں اتاریں گے۔“ بالکو نے کہا۔

میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ یہ مرحلہ پانچ منٹ کا تھا۔ فوٹوگرافر کے جانے کے بعد بالکو نے کہا۔ ”اب تمہارا نیا شناختی کارڈ تمہارے نئے نام سے بنے گا۔ اب تمہاری نئی شناخت ہوگی۔ تم فرہاد فیصل نہیں ہو بلکہ شاہد حیات ہو۔ کیسا نام ہے؟“

”بہت اچھا۔“ میں نے تعریف کی۔

”تمہارا ایک گراؤنڈ یہ ہے کہ تم رانا فراز کے دور کے عزیز ہو۔ تم نے رانا فراز کے یہاں پرورش پائی ہے، تعلیم حاصل کی ہے اور اب رانا فراز کے کسی کام سے لوبان جا رہے ہو۔“

”لیکن بالکو صاحب! اس کے لیے تو کالج اور اسکول وغیرہ کے ریکارڈز کی ضرورت ہوتی ہے۔ شاہد حیات کے نام سے یہ سب چیزیں کہاں سے آئیں گی؟“

”تم اس کی فکر مت کرو۔ اب یہ میرا کام ہے۔“ اس نے کہا۔ ”تم بس دو دن یہاں آرام کرو۔“

رات کا کھانا ہم نے ساتھ ہی کھایا تھا۔ کیا پُرتکلف کھانا تھا۔ کون سی ایسی ڈش تھی جو اس کی میز پر موجود نہیں تھی۔ باوردی خدام ایک طرف مؤدب کھڑے تھے اور میں یہ دیکھ رہا تھا کہ پیسے میں کتنی طاقت ہوتی ہے جس کے پاس دولت ہو، وہ اپنی دولت کی طاقت سے دوسروں کو روبوٹ بنا کر رکھ دیتا ہے۔

یہ انسانی روبوٹ اس کے اشارے پر عمل کرتے ہیں۔ وہ انہیں چلنے کے لیے کہتا ہے، وہ چلنے لگتے ہیں۔ بیٹھنے کے لیے کہتا ہے، بیٹھ جاتے ہیں اور کبھی کبھی جب مرنے کے لیے کہتا ہے تو مر بھی جاتے ہیں۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد بالکو نے مجھ سے کہا۔ ”شاہد حیات! اب تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ چار پانچ گھنٹوں کی گہری نیند لے لو۔ اس کے بعد تمہیں اٹھا دیا جائے گا۔“

”کیوں بالکو صاحب؟“ میں نے پوچھا۔

”میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”تاکہ تم میرے بارے میں جس قسم کے شک اور شبے میں ہو وہ دور ہو جائے۔“

بہت ہی الجھی ہوئی بات کی تھی اس نے۔ میں اس کے بارے میں واقعی شبے میں تھا۔ اس نے جو کچھ بھی بتایا تھا، وہ میرے لیے سوائے کہانی کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔

شاید اس نے یہ بات اسی لیے کی تھی۔ وہ مجھے کچھ دکھانا چاہتا تھا لیکن کیا دکھانا چاہتا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ میں چار پانچ گھنٹوں کی نیند لے لوں پھر مجھے اٹھا دیا جائے گا۔

نہ جانے کیوں مجھے نیند نہیں آئی۔ حالانکہ وہی ماحول تھا۔ وہی حالات تھے۔ وہی آرام دہ بستر تھا۔ کمرے میں اے سی کی خنکی بھی تھی، اس کے باوجود نیند نہیں آرہی تھی۔

ایک طرح کی وحشت سی ہو رہی تھی جو آج سے پہلے نہیں ہوتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے میرے ساتھ کچھ ہونے والا ہے۔ کیا ہونے والا تھا، میں اس کا اندازہ نہیں کر پا رہا تھا۔

ایک احساس یہ بھی تھا کہ اگر کوئی الٹی سیدھی بات ہوئی تو میں اداکاری کرتا ہوا آسانی سے نکل جاؤں گا۔ قدرت کے بعد اپنی صلاحیتوں پر تو بھروسا تھا۔ اس کے باوجود ایک بےچینی سی ہو رہی تھی۔

بہرحال، اتنا ہوا کہ میں سو نہیں سکا بلکہ بستر پر لیٹا چھت کی طرف گھورتا رہا۔ اس کمرے میں دیوار پر ایک کلاک بھی لگا ہوا تھا۔

میں دہشت کے زیرِ اثر جھنجل بدل کر دیکھتا رہا لیکن میرا دل نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ میں اگر چاہوں تو یہاں سے نکل کر جا بھی سکتا ہوں۔ کون روکے گا مجھے؟

اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی تھا کہ یہ تو دھوکا دینے والی بات ہوگی اور میں کوئی بچہ تو ہوں نہیں کہ بالکو بارانا مجھ پر قابو پالے گا۔ میں اپنا دفاع کر سکتا ہوں اور یہ بات بالکو بھی جانتا ہے۔

بہرحال اسی کشمکش میں تین چار گھنٹے گزر گئے اور احساس اس وقت ہوا جب دروازے پر ہونے والی دستک نے مجھے چونکا دیا۔

جینیفر دروازے پر کھڑی تھی۔ اس نے اوپر سے نیچے تک میری طرف دیکھا۔ ”کیا بات ہے، کیا تم سوئے نہیں تھے؟“

”نہیں، نیند نہیں آرہی تھی۔“ میں نے جواب دیا۔

’’چلو، تمہیں بلا لیا گیا ہے۔‘‘ اس نے کہا۔

اس بار پھر وہی احساس کہ شاید کوئی گڑبڑ ہونے والی ہے۔ پورا جسم بوجھل سا ہونے لگا اور پیروں میں جیسے وزنی پتھر باندھ دیے گئے ہوں۔

ایک ایک قدم بھاری ہو رہا تھا لیکن میں مڑ کر جا بھی نہیں سکتا تھا۔ قدرت کی طرف سے اس قسم کے تماشے جو رچائے جاتے ہیں ان تماشوں کا منطقی انجام بھی ہوا کرتا ہے۔

اس وقت تو انجام بہت دور کی بات تھی۔ میں نے تو ابھی سفر بھی شروع نہیں کیا تھا۔ جینیفر کئی راستوں اور کمروں سے گزارتی ہوئی مجھے ایک دروازے پر لے آئی۔

’’اب تم دستک دے کر اندر چلے جاؤ۔‘‘ جینیفر نے کہا۔ ’’دو گھنٹے بعد تم سے ملاقات ہوگی۔‘‘

وہ مڑ کر چلی گئی۔ میں کچھ دیر تک اس کے دل کش سراپا کو دیکھتا رہا پھر دروازے پر دستک دے دی۔ اندر سے بالگو جی کی آواز آئی۔ ’’آجاؤ اندر۔‘‘

میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

مجھے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ وہ کمرا اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ کہیں بھی کوئی روشنی نہیں تھی۔ میں نے ایسے مکمل اندھیرے کا کبھی تجربہ نہیں کیا ہوگا۔

’’پیچھے مڑ کر دروازہ بند کر دو۔‘‘ بالگو کی آواز آئی۔

نہ جانے وہ اندھیرے میں کہاں چھپا ہوا تھا اور کس طرح مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کے کہنے پر دروازہ بند کر دیا۔ شاید اس کمرے میں کوئی اسکرین یا پروجیکٹر وغیرہ ہوگا جس پر وہ مجھے کچھ دکھانا چاہ رہا ہوگا لیکن ابھی تو کوئی چیز دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

پھر اچانک سامنے والی ایک دیوار کے ساتھ مجھے دو چراغ جلتے ہوئے دکھائی دے گئے۔ وہ چراغ نہیں وہ چراغ تو نہیں تھے، آنکھیں تھیں، دو عدد روشن آنکھیں۔

میں نے اپنی زندگی میں ایسی روشن آنکھیں کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ ایسی چمکتی ہوئی آنکھیں تو جنگلی جانوروں وغیرہ کی ہوتی ہیں جو دور سے بھی دکھائی دے جاتی ہیں۔

’’گھبراؤ نہیں۔‘‘ ان روشن آنکھوں کے درمیان سے آواز آئی اور پتا چل گیا کہ وہ آنکھیں بالگو جی کی ہیں۔

’’بالگو صاحب! اس کمرے میں اتنا اندھیرا کیوں کر رکھا ہے؟‘‘ میں نے کہا۔ ’’اگر کہیں تو میں بلب جلا دوں؟‘‘

’’نہیں، اس کمرے میں کوئی بلب نہیں ہے۔‘‘ بالگو کی آواز آئی۔ ’’تم آگے آؤ۔‘‘

’’یہ کیا ہو رہا ہے بالگو صاحب۔‘‘ میں اب کچھ پریشان ہونے لگا تھا۔ ’’کیا چاہتے ہیں آپ؟‘‘

’’تم آگے آؤ۔‘‘ اس بار اس نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ’’تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔‘‘

مجھے کیا نقصان ہو سکتا تھا، وہ میرا کیا بگاڑ لیتا۔ دیکھنا تو چاہیے کہ وہ چاہتا کیا تھا۔ میں دھیرے دھیرے ان روشن آنکھوں کی طرف بڑھنے لگا۔

اچانک ان آنکھوں کی روشنی غائب ہو گئی یا تو اس نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں یا کوئی اور بات ہو گئی تھی۔ ان آنکھوں کی روشنی غائب ہوتے ہی اس کمرے کا اندھیرا بہت دبیز ہو گیا۔

’’کہاں ہیں بالگو صاحب؟‘‘ میں نے اسے پکارا۔

اسی وقت میرے کانوں کے پاس ایسی بھن بھن ہونے لگی جیسے کوئی اڑنے والا کیڑا بھنبھناتا ہوا ادھر سے ادھر پرواز کر رہا ہو اور پہلی بار مجھے ایک خوف کا احساس ہوا۔

کوئی غلیظ سی چیز میرے چہرے سے ٹکرا کر واپس چلی گئی۔ میں اسے غلیظ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ وہ بے حد گندی سی چیز تھی جس کے چہرے سے ٹکراتے ہی ایک بدبو کا احساس بھی ہوا تھا۔ بدبو کا بھبکا۔ اس کے ساتھ ہی بہت ہی مکروہ سی بھن بھن چر چر کی آوازیں بھی آنے لگیں۔

میں تو کبھی خوف وغیرہ جیسے جذبوں سے شناسا نہیں تھا لیکن اس وقت بے حد خوف محسوس ہو رہا تھا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

’’بالگو صاحب! کہاں ہیں آپ؟‘‘ میں گلا پھاڑ کر چلّایا۔

اسی وقت وہ آنکھیں روشن ہو گئیں۔ یہ آنکھیں روشن تو تھیں لیکن ان کا سائز بہت چھوٹا تھا۔ پہلے وہ دو روشن آنکھیں بہت بڑی تھیں لیکن اب بہت چھوٹی ہو گئی تھیں اور اس کمرے میں پرواز کر رہی تھیں جیسے کمرے میں کوئی جگنو اڑتا پھر رہا ہو۔

پھر وہی غلیظ سی چیز میری گردن سے آ کر چپک گئی۔ یہ حملہ اس نے میری پشت سے کیا تھا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے میری گردن میں کسی نے یا تو کوئی انجکشن اتار دیا ہو یا کسی نے اپنے تیز نکیلے دانتوں سے میری گردن پکڑ لی ہو۔

میں نے بوکھلا کر اس چیز کو اپنی گردن سے الگ کرنا چاہا لیکن ایسا ممکن نہیں ہو سکا۔ وہ بری طرح چمٹی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ہی میرا سر چکرانے لگا تھا۔

کمزوری کے ایک شدید احساس نے مجھے نڈھال

کرنا شروع کر دیا۔ میں نے اپنی پوری طاقت سے کام لیتے ہوئے اس چیز کو اپنی گردن سے الگ کر کے پوری قوت سے فرش پر دے مارا۔

مجھے تو ایسا ہی لگا جیسے کوئی بوڑھی بدن فرش پر دھپ سے جا گرا ہو۔ اس وقت ایک جنونی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ میں نے ایک پاگل پن کی کیفیت میں اس کیڑے کو یا وہ جو کچھ بھی تھا، کچلنا شروع کر دیا۔

پھر کچر کچر کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جیسے کوئی پیروں تلے چرمرا رہا ہو اور اس کے ساتھ ہی مجھ پر بھی ایک انجانی سی نقاہت طاری ہوتی جا رہی تھی۔

شاید میں بے ہوش ہونے والا تھا۔ میں ایک جنونی حالت میں سب کچھ کرتا رہا تھا لیکن نقاہت شدید تر ہوتی جا رہی تھی... میں خود کو لاکھ کوششوں کے باوجود سنبھال نہیں سکا۔ بے ہوش ہو کر ایک طرف لڑھک گیا۔

نہ جانے کب تک بے ہوش رہا۔ مجھے اس کا احساس نہیں تھا۔ احساس ہوا تو نرم نرم لمس اور ایک مدہوش کر دینے والی خوشبو کا احساس تھا۔ کوئی میرے وجود پر محیط ہوتا جا رہا تھا۔ دھیرے دھیرے جیسے کسی نے مجھے گلاب کی بے شمار پتیوں کے ڈھیر پر لٹا دیا ہو۔

ایک بے پناہ مدہوشی... سنسنی خیز لذت... ایک ایسی سرشاری کہ الفاظ میں جس کا اظہار کرنا ناممکن ہے۔ نہ جانے کیوں میں اس دھارے میں بہتا چلا جا رہا تھا۔

میں نے اپنے آپ کو مضبوط کرنے کے لیے اپنے قدموں کو جمانے کی بھی کوشش کی لیکن وہ سیلاب اتنا شدید تھا کہ میں بہتا ہی چلا گیا۔ بہتا ہی چلا گیا اور جب ہوش آیا تو جیسے کمرے سے باہر تھی۔

ایک سنسناہٹ ایک لذت بھری غنودگی طاری تھی مجھ پر۔ کچھ سوچنے سمجھنے کی نہ تو صلاحیت رہی اور نہ ہی دل چاہ رہا تھا کہ میں اس پر غور کروں کہ یہ سب کیا ہوا، کیوں ہوا؟

میں بے سدھ پڑا رہا۔ بہت دیر کے بعد ہوش و حواس بحال ہونے شروع ہوئے تھے۔ بہت کم وقتوں میں وہ ایسے تجربات ہو چکے تھے کہ میں متحیر ہو کر رہ گیا تھا۔

پہلا تجربہ اس اندھیرے کمرے میں دو روشن آنکھوں کے ساتھ ہوا تھا۔ کس کی تھیں، وہ روشن آنکھیں، کیا وہ بالگو ہی تھا؟

کیا بالگو واقعی اس دنیا کا انسان نہیں تھا۔ میں نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا، اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ انسان نہیں کچھ اور ہے۔

لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ اس کے بعد مجھے اپنی دہشت یاد آنے لگی۔ وہ عجیب سی چیز میری گردن سے آ کر چپک گئی تھی۔ وہ کوئی غلیظ سا وجود تھا۔ جب میں نے اسے کچلا تو کچر کچر کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مگر وہ قسم کی آوازیں۔ اس کے بعد جیسے کمرے کا میرے پاس آنا اور جذبات کے شدید ترین سیلاب میں میرا بہہ جانا۔

شاید مجھے اپنے آپ پر اختیار نہیں رہا تھا۔ بالگو نے جو چاہا تھا، وہ میں کر گزرا تھا۔ لیکن کیا چاہا تھا اس نے۔ اس نے اپنا وہ عجیب روپ مجھے کیوں دکھایا؟

مجھے پھر اپنے خیالات پر ہنسی آنے لگی۔ یہ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ بالگو اسی دنیا کا انسان ہے۔ راجا ایک مشہور اور مستند نام۔ ہزاروں لوگ جانتے ہیں اس کو۔ وہ غیر انسانی مخلوق کیسے ہو سکتا تھا۔ وہ تو گوشت پوست کا ایک حقیقی وجود تھا۔

تو پھر اس کمرے میں کیا تھا؟ میں نے کس کو دیکھا تھا؟ میں نے اس کی آواز بھی پہچان لی تھی۔ وہ آواز اسی کی تھی جو مجھے روشن آنکھوں کی طرف آنے کے لیے کہہ رہا تھا۔

میرے خدا میں کن شیطانی چکروں میں پھنس گیا۔ بات کہاں سے شروع ہوئی تھی اور کہاں تک آ گئی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ یہ ابھی آغاز ہو۔ مجھے ابھی اور بہت کچھ دیکھنا ہو۔

یہی سب سوچتے سوچتے مجھے نیند آ گئی لیکن سونے سے پہلے میں نے ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ فیصلہ یہ تھا کہ اب مجھے یہاں نہیں رہنا۔

بالگو مجھے زبردستی نہیں روک سکتا تھا۔ میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔

دوسرے دن میں بہت دیر تک سوتا رہا۔ دروازے پر ہونے والی دستک نے بیدار کیا۔ دروازہ کھولا تو ایک ملازم میرے سامنے موجود تھا۔

"صاحب آپ کو ناشتے پر یاد کر رہے ہیں۔" اس نے بتایا۔

"ٹھیک ہے تم چلو میں نہا کر آتا ہوں۔"

کچھ دیر بعد میں نہا کر اور کپڑے بدل کر بالگو کے سامنے پہنچا تو اس وقت میرا ارادہ اور مستحکم ہو چکا تھا۔ مجھے یہاں سے جانا تھا۔

ناشتے کی میز پر بالگو اکیلا تھا اور اس کے ہاتھ پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ وہ ہاتھ پٹی کا سہارا دے کر اس کی گردن سے لٹکا دیا گیا تھا۔

میرے تصور میں کچر کچر کی آوازیں پھر گونجنے لگیں۔ کیا وہ آوازیں بالگو کی ہڈی کچلے جانے کی تھیں لیکن یہ کیسے ممکن

تھا۔ تو پھر یہ دانتوں رات زخمی کیوں کر ہو گیا۔

بالکو کے ہونٹوں پر ایک سنسنی خیز طنزیہ سی مسکراہٹ تھی۔ ”آؤ شاہد آؤ۔“ اس نے مخاطب کیا۔ ”بہت دیر تک سوتے رہے؟“

پہلے تو سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر یاد آیا کہ اس نے میرا نام شاہد رکھا تھا شاہد حیات۔

”جی ہاں بالکو صاحب۔“ میں اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”رات کچھ عجیب گزری ہے۔ کچھ ایسے تجربات ہوئے ہیں جو پہلے کبھی نہیں ہوئے تھے۔“

”بھول جاؤ، رات گئی، بات گئی۔“ اس نے کہا۔ ”بس اپنے آپ کو ہر لمحہ اسی قسم کے تجربات کے لیے تیار رکھو، کیونکہ زندگی اسی کا نام ہے۔“

”بالکو صاحب! میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ آپ کے ہاتھ کو کیا ہوا ہے؟“

”کیا تم نہیں جانتے؟“ اس نے سنسنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا پھر بات بدل کر بولا۔ ”کل رات سیڑھیاں اترتے ہوئے... گر گیا تھا۔“

”اوہ...!“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”بالکو صاحب! اب یہ بتائیں کیا میں اس گھر میں قید ہوں؟“

”یہ کس نے کہہ دیا؟“

”مجھے ایسا احساس ہو رہا ہے۔“

”غلط احساس ہے۔ تم اپنی مرضی کے مالک ہو۔ آزاد ہو۔ جہاں چاہو جا سکتے ہو۔“

”کیا میں اپنے گھر واپس جا سکتا ہوں؟“

”اپنے گھر۔“ اس نے براہ راست بتایا۔ ”کیا کرو گے وہاں جا کر۔ تم کو تو معلوم ہے کہ وہاں کتنی رشتہ دار ہاں تمہارے انتظار میں ہوں گی۔ پولیس تمہیں تلاش کر رہی ہو گی۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔“

”بالکو صاحب! آپ نے مجھ پر بہت احسانات کیے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”سب سے بڑی بات یہ کہ آپ نے مجھے پناہ دی ہے۔ اس کے باوجود میں اپنے گھر، اپنے ماحول میں واپس جانا چاہتا ہوں... جہاں تک رسک کا سوال ہے تو وہ دیکھا جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ ایسی کوئی بات ہی نہ ہو۔ پولیس کو میرے بارے میں پتا ہی نہ ہو کہ میں کون ہوں اور کہاں رہتا ہوں۔“

”اب تم بچوں جیسی باتیں کر رہے ہو۔“ بالکو نے کہا۔ ”ویسے تم جانا ہی چاہتے ہو تو جا سکتے ہو۔ میں تمہیں نہیں روکوں گا۔ میری نیک خواہشات تمہارے ساتھ ہوں گی لیکن اتنا ضرور یاد رکھو کہ پولیس اپنے دشمنوں کو کبھی معاف نہیں کرتی۔“

”بالکو صاحب! میں اس خطرے سے کسی طرح نمٹ لوں گا۔“

”ٹھیک ہے، تو پھر تم جا سکتے ہو۔“ اس نے کہا۔ ”میں تمہیں روکنا نہیں چاہتا اور ہاں۔“ اس نے اپنی جیب سے کچھ نوٹ نکال کر میری طرف بڑھا دیے۔ ”یہ لو اپنے پاس رکھو تمہارے کام آئیں گے۔“

”نہیں بالکو صاحب! یہ میں نہیں لے سکتا۔“ میں نے کہا۔

”بے وقوف نہ بنو۔ میں تمہارا ہمدرد ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تم مجھے چھوڑ نہیں سکتے۔ کچھ بھی ضرورت ہو سکتی ہے، رکھ لو۔“

اور میں نے وہ روپے لے کے اپنی جیب میں رکھ لیے۔

بالکو نے آفر کی تھی کہ اس کا ڈرائیور مجھے پہنچا دے گا لیکن میں نے شکریے کے ساتھ منع کرتے ہوئے بتایا۔ ”نہیں بالکو صاحب! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ میرا اپنا شہر ہے، میں چلا جاؤں گا۔“

”ایک بات اور...“ بالکو نے کہا۔ ”راستے میں پھر کسی پولیس والے سے مت الجھ جانا۔“

”ارے نہیں۔“ میں ہنس پڑا۔ ”اب تو ان سے بچنے کی ہی کوشش کروں گا... ویسے نہیں معلوم کہ گھر پر کیا ہو۔“ لیکن گھر پر تو کچھ بھی نہیں تھا۔

میں کئی واہموں میں مبتلا ہو گیا۔ ہو سکتا ہے کہ میرا شناختی کارڈ کہیں اور گرا ہو۔ یہ اور بات ہے کہ گھر والوں نے یہ معلوم کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی کہ میں کہاں چلا گیا تھا۔

اور پولیس والے بھی میری تلاش میں وہاں نہیں آئے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو کوئی نہ کوئی ضرور تذکرہ کرتا لیکن کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔

میں نے کچھ روپے اپنی بھابی کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ میں نے محسوس کیا کہ نوٹوں کی گرمی نے اس عورت کے کڑے تیور کو نرم کر دیا تھا۔

جیسا چیز ہی ایسی ہے۔ میں نے ان میں سے کسی کو نہیں بتایا کہ میرے ساتھ کیا گزری ہے۔ میں اپنی کہانی کس سے شیئر کرتا؟

پھر مجھے اپنے ایک جاننے والے کا خیال آ گیا۔

پروفیسر رباض عالم۔ وہ بہت پڑھے لکھے آدمی تھے۔ ان کا موضوع تاریخ اور مذہب تھا۔

وہ میرے ایک جاننے والے کے والد تھے۔ اسی جاننے والے کے ذریعے دو تین بار پروفیسر رباض عالم سے بھی ملاقاتیں ہوئی تھیں اور میں ان کی عظمت سے مرعوب ہوا تھا۔

میں ان سے بالگو کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ ہوسکتا تھا کہ وہ اس موضوع پر روشنی ڈال سکتے۔ شام کے وقت میں پروفیسر صاحب سے ملنے ان کے گھر چلا گیا۔

خوش قسمتی سے پروفیسر صاحب گھر پر ہی موجود تھے۔ بہت خندہ پیشانی سے ملے۔ اپنی لائبریری میں لے جا کر بٹھا دیا۔ "ہاں میاں! خیریت تو ہے۔ بہت دنوں کے بعد آنا ہوا ہے تمہارا؟"

"سر! ایک الجھن مجھے آپ کے پاس کھینچ لائی ہے۔" میں نے بتایا۔ "اور شاید سوائے آپ کے اور کوئی اس کو حل بھی نہ کر سکے۔"

"بتاؤ، کیسی الجھن ہے۔" انہوں نے پوچھا۔

"یہ دیوی ایز وہس کون تھی؟" میں نے سوال کیا۔

"ایز وہس؟" وہ چونک پڑے۔ بہت دیر تک الجھی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھتے رہے۔ "میاں! یہ دیوی ایز وہس تمہارے ذہن میں کہاں سے آگئی؟"

"پہلے آپ مجھے اس کے بارے میں کچھ بتائیں۔" میں نے کہا۔ "پھر آپ کو بتاؤں گا کہ میں اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہا ہوں۔"

"یہ قدیم یونان کی ایک حسین و جمیل دیوی تھی۔" پروفیسر صاحب نے بتانا شروع کیا۔ "یونان کے علاوہ مصر میں بھی اس کے عقیدت مند موجود تھے۔ اس کو حسن کی دیوی بھی کہا جاتا ہے۔ اس سے وابستہ کہانیوں میں ایسے دو جنوں دیوتاؤں اور انسانوں کا ذکر ملتا ہے جو اس کے عشق میں مبتلا رہے ہیں۔"

"اب یہ بتائیں کہ ان میں سے بالگو کا بھی نام تاریخ میں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بالگو؟" پروفیسر صاحب پھر چونک پڑے۔ "میرے خدا تمہیں یہ سب نام کہاں سے معلوم ہوئے؟ تم نے کہاں سے پڑھ لیا ہے؟"

"آپ مجھے بتاتے جائیں سر، پھر میں آپ کو بھی بتا دوں گا۔"

"ایز وہس کے ساتھ دیوتاؤں کی بددعا تھی کہ جس کسی نے بھی اس سے محبت کی، وہ ہمیشہ کے لیے فنا ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ صرف ایک رات ہی گزارنے کی سزا موت تھی۔ دیوتاؤں کو یہ راز معلوم تھا۔ اسی لیے کوئی بھی ایز وہس کے قریب نہیں ہوا لیکن ایتھنز کے ایک نوجوان نے اس کے وصل کے لیے موت کو گوارا کر لیا۔ وہ اس کے عشق میں پاگل ہو چکا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ بالگو کی موت کے بعد ایز وہس بھی اس کی محبت میں پاگل ہو گئی تھی لیکن تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"سر! مجھے کچھ اور بتائیں۔" میں نے کہا۔ "ویسے یہ کہانی میں پہلے بھی سن چکا ہوں۔"

"تم اور کیا معلوم کرنا چاہتے ہو؟"

"کیا ایسا ممکن ہے کہ ان دونوں کی محبتوں کا سفر آج بھی جاری ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہوسکتا ہے۔" رباض صاحب نے پرخیال انداز میں اپنی گردن ہلائی۔ "قدرت کے بھید کوئی نہیں جان سکتا۔ ہوسکتا ہے کہ بالگو ابھی تک ایز وہس کی تلاش میں بھٹک رہا ہو۔ ہوسکتا ہے کہ ایز وہس پھر سے اسی دنیا میں موجود ہو۔ کسی اور نام سے۔ کسی اور روپ میں۔ میرے ساتھ کچھ ایسے تجربات ہو چکے ہیں کہ میں اب کسی بات کو ناممکن نہیں کہتا۔ سب کچھ ممکن ہے۔ ہوسکتا ہے کہ بھونرا بن کر اس کے اردگرد منڈلا رہا ہو۔"

"بھونرا۔" میں چونک پڑا۔ "کیا کہا آپ نے؟ بھونرا؟"

"کیوں، تم کیوں پریشان ہو گئے۔ ارے بھئی اس دیوی کا نشان بھونرا تھا۔ ایک بڑا سا بھونرا ہر وقت اس کی پیشانی پر بیٹھا رہتا تھا یا ایسا دکھایا گیا ہے۔"

میرے خدا! مجھے اب یاد آنے لگا۔ میں نے اس اندھیرے کمرے میں جن دو چمکیلی روشن آنکھوں کو دیکھا تھا، وہ کسی بھونرے کی ہی ہو سکتی تھیں پھر اس کی بھن بھن آواز نکالتی ہوئی پرواز۔ میں نے اسے اپنی گردن پر بھی رینگتے ہوئے محسوس کیا تھا۔

میں نے جب اسے اپنے جوتوں سے کچلا تھا تو پھر ویسی ہی آواز آئی تھی جیسے کسی بڑے سے کیڑے کو کچلا جا رہا ہو۔

"کیا بات ہے میاں؟" رباض صاحب کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "تم کیوں اتنے پریشان ہو رہے ہو؟ کیا تمہارے ساتھ کسی قسم کا تجربہ ہوا ہے؟"

میں نے سوچا کہ رباض صاحب کو سب کچھ بتا ہی

دوں۔ وہ ایک امکان تھے۔ جب وہ اتنا جانتے تھے تو یہ بھی جانتے ہوں گے کہ میں اس شیطانی چکر سے کس طرح نکل سکتا ہوں...؟

میں نے انہیں بتانا چاہا اور اسی وقت ایک عجیب سی بات ہوئی۔ میرے اطراف میں بھن بھن کی آوازیں گونجنے لگیں۔ جیسے ایک ساتھ کئی بھوزے پرواز کرنے لگے ہوں۔

میں بزدل تو کبھی نہیں رہا ہوں۔ میں نے ہر طرح کی تربیت حاصل کی ہے۔ میں نے اپنے اعصاب کی لگام ہمیشہ اپنے ہاتھوں میں رکھی ہے لیکن اس وقت میں بری طرح خوف زدہ ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا پورا جسم پسینے سے بھیگ گیا ہو۔ میری زبان سوئی ہو گئی تھی۔

میں نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن مجھ سے بولا نہیں گیا۔ زبان کو جیسے کسی نے جکڑ لیا تھا۔ پروفیسر ریاض کو شاید میری اس کیفیت کا اندازہ ہو گیا۔ میرے چہرے کی بدلتی ہوئی رنگت نے شاید انہیں یہ احساس دلا دیا تھا کہ میرے ساتھ کوئی گڑبڑ ہو رہی ہے۔ اسی لیے انہوں نے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ ”ارے بھائی، کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ کیا کسی پرابلم کا سامنا کر رہے ہو؟“

پھر ایسا ہوا جیسے میرے ذہن اور میرے وجود پر چھائی ہوئی جکڑن اچانک ختم ہو گئی ہو۔ وہ مکروہ بھن بھن بھی غائب ہو گئی۔

زبان کا بوجھل پن بھی اب نہیں رہا۔ انتہائی تیزی کے ساتھ وہ کیفیت ختم ہو چکی تھی۔ میں شاید اب آزاد ہو چکا تھا! کر دیا گیا تھا۔

”بتاؤ نا، کیا ہوا ہے تمہیں؟“ پروفیسر صاحب نے دوبارہ پوچھا۔

”جی، کچھ نہیں، میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”پتا نہیں کیا ہو گیا تھا لیکن اب ٹھیک ہوں۔“

”میاں! اگر تمہارے ساتھ کوئی مسئلہ ہو تو بتاؤ۔ شاید میں تمہارے کسی کام آ سکوں؟“

”جی ہاں، جی نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ میں کھڑا ہو گیا۔ ”آپ کی بڑی مہربانی۔ آپ نے راہنمائی فرما دی۔ میں اب چلتا ہوں، پھر حاضر ہوں گا۔“

انہوں نے مجھے روکنا چاہا لیکن میں ان کے گھر سے باہر آ گیا۔

اس وقت میری عجیب کیفیت تھی۔ میں خواب اور بیداری کے درمیان تھا۔ یقین اور بے یقینی کی کیفیت تھی۔

کون تھا یہ آدمی۔ راما یا بالگو؟ آج کا انسان یا ہزاروں سال پہلے کی کوئی روح۔

یہ کیسا بھید تھا اور میں اس بھید میں کیونکر شامل ہو گیا تھا۔ جو کچھ بھی تھا اگر وہ سچائی تھی تو کیسی بھیانک سچائی تھی۔ دیوی ایزرٹس، بالگو، بھوزا، میری اپنی حالت۔ کیا تھا یہ سب۔ کیا اس دور میں بھی ایسے واقعات ممکن تھے؟ اگر ممکن نہیں تھے تو پھر میرے ساتھ کیوں ہو رہے تھے۔

اس نے مجھے گھر جانے کی اجازت دے دی تھی۔ اس نے یہ کہا تھا کہ میں آزاد ہوں لیکن کیا میں واقعی آزاد تھا؟ پروفیسر ریاض کے گھر میری ایسی کیفیت کیوں ہوئی تھی؟ بھوزے کی بھن بھن کیوں سنائی دی تھی۔ میں پروفیسر کے پوچھنے پر بھی ان کو کچھ کیوں نہیں بتا سکا تھا؟ میری زبان پر تالے کیوں پڑ گئے تھے؟

کیا تھا یہ سب؟

مجھے اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے کیا کرنا تھا؟ اس کے پاس واپس چلا جاؤں یا اپنی قوتِ ارادی سے کام لے کر خود کو اس عذاب سے نکالنے کی کوشش کروں۔

”نہیں، مجھے اس پُراسرار شخص کے پاس واپس نہیں جانا تھا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ ایک پولیس کا خوف تھا تو ان سے تو نمٹا جا سکتا تھا۔ عدالت زیادہ سے زیادہ سزا ہی دیتی۔ وہ بھی برداشت کر لیتا۔ میں نے دو چار پولیس والوں کو مارا پیٹا تھا۔ اس سے زیادہ تو کچھ نہیں کیا تھا؟ مجھے پھانسی تو نہیں دے سکتے تھے؟

میرا اب یہ فیصلہ تھا کہ مجھے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اس کے پاس واپس نہیں جاؤں گا۔ دیکھتا ہوں وہ کیا کرتا ہے۔

حیرت انگیز طور پر اس فیصلے نے دل کو ایک تقویت سی دے دی تھی۔ ایک خوش گوار سکون سا محسوس ہونے لگا۔

”میری وہ قوتِ ارادی جو تقریباً ختم ہو چکی تھی، دوبارہ واپس آ گئی تھی۔

پروفیسر صاحب کے گھر سے میں اپنے گھر واپس آ گیا۔ یہاں میرے لیے وہی بے نیازی کی کیفیت تھی جیسے کسی کو اس بات سے غرض ہی نہ ہو کہ میں کہاں ہوں اور کیا کرتا پھر رہا ہوں۔

ظاہر ہے ان کے نزدیک میں ایک ناکارہ ترین انسان ہی تو تھا۔ میری کیا حیثیت تھی۔

رات کے کھانے سے فارغ ہو کر میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ میرا یہ چھوٹا سا کمرا میری کائنات ہوا کرتا تھا۔

یہاں ہر طرف میری کتابیں تھیں۔ کتابوں کے سوا اور کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں تھی وہاں۔

ایک سوٹ کیس تھا جس میں میرے کپڑے ہوا کرتے اور ضرورت کی کچھ چیزیں کمرے کی چھوٹی میز پر رکھی رہتیں۔

اس رات بہت دیر تک نیند نہیں آئی۔ میرے ذہن میں پروفیسر راغب کی باتیں تھیں۔ انہوں نے جو کچھ بھی بتایا تھا وہ بہت حیرت انگیز تھا۔

میں تو خود اپنی آنکھوں سے وہ سب کچھ دیکھ چکا تھا۔

اس اندھیرے کمرے میں ہونے والے تجربات میرے لیے بہت بھیانک تھے۔ اگر میں کسی شیطانی چکر میں پھنس گیا تھا تو اس سے نجات کی کیا صورت ہو سکتی تھی۔

یہی سب سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی۔

میں کسی آواز سے بیدار ہوا تھا۔ اچانک جیسے کسی نے جھنجوڑ کر جگا دیا ہو۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ یہ اندھیرا میں نے ہی کیا تھا۔ ہر طرف کی روشنی گل کر کے سونے کی عادت تھی مجھے۔

اس اندھیرے میں وہ آواز پورے کمرے میں گونج رہی تھی۔ یہ وہی منحوس بھن بھن کی آوازیں تھیں جو پورے کمرے میں ادھر سے ادھر پرواز کر رہی تھیں۔

میں نے بوکھلا کر مسہری سے اترنے کی کوشش کی لیکن میرا جسم تو جیسے مفلوج ہو چکا تھا۔ ذرا بھی حرکت نہیں تھی۔ خوف نے ایک بار پھر حملہ کر دیا تھا۔

اس گھپ اندھیرے میں بھن بھن کی مکروہ آوازوں کے ساتھ پھر ویسی ہی دو آنکھیں روشن ہو گئیں جیسی چھوٹی روشن آنکھیں میں نے پاتلو کے گھر میں دیکھی تھیں۔

خدایا! میرا پورا جسم پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ جو کچھ بھی تھا وہ انتہائی مکروہ اور انتہائی خوفناک تھا۔ بخدا میں بزدل انسان نہیں ہوں لیکن جو کچھ بھی ہو رہا تھا وہ اس سے نمٹنا کسی عام انسان کے بس کی بات تو نہیں تھی۔

وہ روشن آنکھیں میرے اردگرد بھن بھن کرتی رہیں اور ایک بار پھر ایک غلیظ سا احساس میری گردن پر رینگنے لگا۔

مجھ پر کپکپی سی طاری ہونے لگی۔ ٹھنڈے پسینے نے مجھے بھگو کر رکھ دیا تھا۔ میں نے بمشکل تمام اپنا ہاتھ اس چیز کو گرفت میں لینے کے لیے اپنی گردن کی پشت پر مارا لیکن وہ وہاں نہیں تھا۔ وہ روشن آنکھیں بجھ گئی تھیں اور بھن بھناہٹ بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔

میں نے دیوار پر لگا ہوا بجلی کا بٹن دبا دیا۔ کمرے میں روشنی ہو گئی۔ کمرے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ شاید وہ بھونرا یا وہ جو کچھ بھی تھا کھڑکی کے راستے باہر چلا گیا تھا۔

مجھے تو ایسے لگ رہا تھا جیسے میں نے میلوں دوڑ لگائی ہو۔ میری سانسیں پھولنے لگی تھیں۔ ایک عجیب طرح کا خوف مجھ پر مسلط ہو گیا تھا۔

میں نے دروازہ کھول دیا۔ گھر والے سوئے ہوئے تھے۔ پورے گھر میں خاموشی تھی۔ مجھ پر ایک وحشت سی سوار تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے یا مجھے کیا کرنا چاہیے۔

پتا نہیں کس جنجال میں پھنس گیا تھا۔ اگر میرے سامنے کوئی عام انسان ہوتا تو اب تک میں اس کے ٹکڑے کر چکا ہوتا لیکن یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ نہ سمجھ میں آنے والا۔

میں کانپتے ہوئے قدموں کے ساتھ بستر پر بیٹھ گیا۔ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ کس کے پاس جاؤں؟ اس جنجال سے چھٹکارے کی کیا ترکیب ہو سکتی تھی۔

میں نے کمرے کا بلب اسی طرح جلائے رکھا۔ اندھیرا میرے لیے بلاؤں کی طرح نازل ہونے لگا تھا جبکہ روشنی میں کم از کم اتنا تو ہو سکتا تھا کہ میں اس بلا کو دیکھ لیتا جس نے میرے اعصاب شل کر کے رکھ دیے تھے۔

میں بہت دیر تک بستر پر بیٹھا رہا پھر اسی عالم میں نیند آ گئی۔

صبح ہوئی تو کئی چہرے میرے کمرے میں تھے۔ یہ میرے دونوں بھائی تھے۔ جو بہت غصے اور نفرت سے مجھے آوازیں دے رہے تھے۔

"کیا بات ہے؟" میں بوکھلا کر اٹھ بیٹھا۔

"یار، جا کر سنبھالو پولیس والوں کو۔" بڑا بھائی گرجا۔ "تمہاری وجہ سے اب پولیس بھی یہاں تک آنے لگی ہے۔"

پولیس کا سن کر میری تو نیند ہوا ہو گئی۔ یہ وہی معاملہ ہو سکتا تھا۔ دروازے پر زوردار دستک نے مجھے پوری طرح بیدار کر دیا۔

"میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔" میں نے کہا۔ "پھر بھی جا رہا ہوں پولیس والوں کے پاس تاکہ آپ لوگوں پر کوئی حرف نہ آئے۔"

"اچھا بابو، ذرا دیکھنا یہ پولیس تمہارا کیا حشر کرتی ہے۔"

میں خون کے گھونٹ پیتا ہوا باہر آ گیا۔ میری دونوں بھابیاں قہر آلود نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ ان کے خیال میں، میں اتنا بڑا مجرم تھا کہ پولیس کی پوری بٹالین میری گرفتاری کے لیے پہنچ گئی تھی۔

وہ بٹالین ہی تھی۔ چار عدد پولیس موبائل۔ ان پر بیٹھے ہوئے درجنوں پولیس کے لوگ اور ان سے کچھ فاصلے پر محلے کے لوگ۔ جو یہ تماشا دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے تھے۔

مجھے باہر آتا دیکھ کر ایک پولیس والے نے نعرہ لگایا۔

''ہاں ہاں، یہی ہے، یہی ہے۔''

یہ شاید ان پولیس والوں میں سے ایک ہو سکتا تھا جن کی میں نے ٹھکائی کی تھی۔

کئی عدد پولیس والے مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے مجھے بری طرح مارنا شروع کر دیا۔ لاتیں، گھونسے۔ میں اپنے دفاع میں اس وقت کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

میرے گھر والے دروازے پر کھڑے ہو کر یہ کارروائی دیکھ رہے تھے۔ میں نے ان میں سے کسی کے چہرے پر افسوس یا ہمدردی کے تاثرات نہیں دیکھے۔

کئی عدد پولیس والوں نے زبردستی مجھے ایک موبائل میں بٹھا دیا۔ اس کے بعد یہ قافلہ فاتحانہ انداز میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔ انہوں نے آج ایک بہت بڑے مجرم پر قابو پا لیا تھا۔

وہ مجھے لیاقت روڈ کے تھانے میں لے آئے تھے۔

پھر مجھے برا بھلا کہتے اور گالیاں دیتے ہوئے موبائل سے اتارا گیا۔ ان میں سے کئی اس وقت بھی مجھ پر تھپڑ اور گھونسے برسا رہے تھے۔

برآمدے میں ایک موٹا سا کرخت چہرے والا پولیس انسپکٹر کھڑا تھا۔ شاید وہی اس تھانے کا ایس ایچ او تھا۔ مجھے اس کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا گیا۔ دو پولیس والوں نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ رکھے تھے۔

''سر جی! یہ وہی ہے نارزن۔'' ایک پولیس والے نے بتایا۔ ''بڑی مشکلوں سے ہمارے ہاتھ لگا ہے۔ یہ تو وہاں سے بھی بھاگنے کی تیاری کر رہا تھا لیکن میں نے اس کو گھیر ہی لیا۔''

اس وقت مجھ سے برداشت نہیں ہو سکا۔ میں نے تڑخ کر کہا۔ ''تم لوگ کیوں جھوٹ بول رہے ہو؟ اگر میں خود ہی سرنڈر نہ کرتا تو تمہارا باپ بھی مجھے نہیں پکڑ سکتا تھا۔''

اس پر مجھے اور کئی ہاتھ پڑ گئے۔

''چلو اس کو کوٹھری میں لے چلو۔'' ایس ایچ او نے حکم دیا۔

میں سمجھ گیا کہ کوٹھری سے اس کی کیا مراد تھی۔ وہ مجھ پر تشدد کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے مجھے ایک جانب دھکیلنا شروع کر دیا۔ میں خاموشی سے ان کے ساتھ ہو لیا۔

وہ کوئی خاص ہی کوٹھری تھی جو شاید اسی مقصد سے بنائی گئی تھی۔ آپ اسے ٹارچر سیل کہہ سکتے ہیں۔ حیرت کی بات تھی کہ ایک سرکاری تھانے میں بھی اس قسم کی کوٹھری کا وجود تھا۔

اس کی دیواروں کے رنگ اجڑ چکے تھے۔ جگہ جگہ سرخ دھبے دکھائی دے رہے تھے۔ شاید یہ ان بدنصیب لوگوں کے خون کے نشانات تھے جنہیں ٹارچر کے لیے اس کوٹھری میں لایا گیا ہوگا۔

انہوں نے مجھے کوٹھری میں دھکا دیتے ہوئے کہا۔ ''اب تو یہاں آرام کر۔ کچھ دیر بعد تیرا حساب کتاب ہو گا۔ ہم بھی دیکھتے ہیں کہ تو کتنا بڑا نارزن ہے۔'' یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔

میں اس وقت بہت کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ کیوں ہوا تھا ایسا؟ پہلا سوال تو یہی تھا کہ کیا میں واقعی مجرم تھا؟ میں نے تو ایک شخص کی مدد کی تھی۔ اس کے چکر میں پولیس والوں سے لڑنا پڑ گیا تھا۔ اس کے بعد پھر واقعات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

اور یہ سلسلہ تھانے کی اس کوٹھری تک آ پہنچا تھا۔ اب بظاہر یہاں سے نجات کی کوئی صورت میرے سامنے نہیں تھی۔ ویسے اس بات کا اندیشہ تو تھا کہ اب مجھ پر بدترین تشدد کیا جائے گا۔

میں نے پولیس والوں پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ ان سے جنگ کی تھی۔ اس کے محرکات چاہے کچھ بھی ہوں لیکن یہ کون دیکھتا ہے۔ اصل بات یہی کہ میں مجرم تھا۔ انتہائی خطرناک مجرم۔

میں انسان ہی تھا۔ لاکھ تربیت یافتہ سہی لیکن انسانی جسم تشدد برداشت کرنے کی ایک حد رکھتا ہے۔ حد سے گزر جائے تو یا تو مفلوج ہو جاتا ہے یا اسے موت آ جاتی ہے۔ اب میرے سامنے دونوں ہی امکانات تھے۔

اس کوٹھری میں سانس لینا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ میں تو آوارہ اور آزاد پرندے کی طرح تھا۔ اب کہاں آ کر پھنس گیا تھا۔

کچھ دیر بعد دو پولیس والے کوٹھری میں داخل

ہوئے۔ وہ ایک ٹرے میں کچھ کھانے کو لے کر آئے تھے۔

”یہ لے۔ اس وقت ایس پی صاحب دورے پر آئے ہوئے ہیں۔“ ایک نے بتایا۔ ”تیری اصل خاطر تواضع تو ہم رات کو کریں گے۔ اس وقت یہ روٹی کھالے۔ بھوکا نہیں مارنا ہے تجھے۔“

دونوں بے ڈھنگے پن سے ہنس پڑے۔ بہت بھیانک اور رگوں میں خون جمانے والی ہنسی تھی ان کی۔ وہ ٹرے رکھ کر چلے گئے۔

اس ٹرے میں روکھی روٹی ایک پیاز اور پانی کا ایک گلاس تھا۔ یہ کھانا دیا گیا تھا مجھے۔ میں نے اپنی جان برقرار رکھنے کے لیے کھانا شروع کر دیا۔

میں بھوکا رہ کر اپنے آپ کو کمزور کرنے کا قائل نہیں تھا۔

اس کے بعد شام تک کسی نے نہیں پوچھا۔ کوئی میری کوٹھری کی طرف بھی نہیں آیا۔ شاید ایس پی نے پورے تھانے کو مصروف کر رکھا ہوگا۔

پھر جیسے جیسے شام ہوتی گئی میری پریشانی بڑھتی چلی گئی۔ نہ جانے رات کے وقت میرے ساتھ کیسا سلوک ہونے والا تھا۔

یہ لوگ تو مجھ سے ویسے ہی چڑے ہوئے تھے۔ میں ان کی نظر میں کوئی عام مجرم نہیں تھا۔ بہت ہی خطرناک آدمی تھا۔ نہ جانے مجھ پر کون کون سی دفعات لگنے والی تھیں۔

پھر مغرب ہوئی۔ رات ہوگئی۔ میں ابھی تک اسی ایک روٹی اور پیاز کے ٹکڑے پر تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے کچھ بھی نہیں دیا تھا۔

پھر اندھیرا چھا گیا۔ کوٹھری سے باہر کچھ فاصلے پر تو روشنی کا انتظام تھا لیکن کوٹھری بالکل تاریک تھی اور میں اس تاریکی میں اپنے انجام کا انتظار کر رہا تھا۔

لیکن پھر کچھ ہوا۔

کچھ ایسا جو میرے تصور میں بھی نہیں تھا۔ اس اندھیرے میں ایک بار پھر اسی مکروہ بھونرے کی بھن بھن گونجنے لگی اور دو چھوٹی روشن آنکھیں پرواز کرنے لگیں۔

میرے خدا! کیا اس بلا سے یہاں بھی چھٹکارا نہیں تھا میرا۔ میں اسی کی وجہ سے تو اس حال کو پہنچا تھا۔ اب وہ ایک بار پھر میرے اردگرد منڈلا رہا تھا۔

لیکن حیرت انگیز طور پر وہ چیز میری گردن پر نہیں آئی بلکہ پرواز کرتی ہوئی کوٹھری سے باہر چلی گئی۔ کیا اس نے میرا پیچھا چھوڑ دیا تھا؟ یا کوئی اور بات تھی؟

کچھ دیر بعد قدموں کی آہٹیں گونجنے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ تاریک برآمدہ بھی روشن ہو گیا۔ وہی ایس ایچ او دو اور پولیس والوں کے ساتھ کوٹھری کی طرف آ رہا تھا۔

اس نے کوٹھری کے پاس آکر مجھے مخاطب کیا۔ ”اوئے چل، تیری ضمانت آگئی ہے۔ تو کچھ دنوں کے لیے بچ گیا ہے لیکن ہم تجھے نہیں چھوڑیں گے۔“

”کون ہے میرا ضامن؟“ میں نے پوچھا۔

”چل کر خود دیکھ لے۔ باپ ہے تیرا۔“ اس نے بدتمیزی سے جواب دیا۔

میرا خون کھول کر رہ گیا لیکن مصلحت اسی میں تھی کہ اس وقت خاموش رہا جائے۔ انہوں نے کوٹھری کا دروازہ کھول دیا اور میں ان کے ساتھ ہولیا۔

وہ سب مجھے کینہ توز نگاہوں سے دیکھ رہے تھے جیسے ان کا شکار ان کے ہاتھوں سے نکل گیا ہو۔ میں ان کے ساتھ ایس ایچ او کے کمرے میں پہنچا اور وہاں کمرے کے وسط میں وہی کھڑا تھا۔ رانا، رانا فراز یا بابا لگو یا جو بھی ہو۔ وہ اس وقت پوری شان کے ساتھ کھڑا تھا۔

اس کمرے میں پولیس کا ایک اور آفیسر بھی موجود تھا۔ وہ سب کے سب رانا کے سامنے مؤدب کھڑے تھے۔

”یہ میرا سیکریٹری ہے منصور۔“ رانا نے ایس پی کو میرے بارے میں بتایا۔ ”سر پھرا سا آدمی ہے۔ کسی پر زیادتی ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ تمہارے پولیس والوں پر اس لیے حملہ کیا تھا کہ وہ شاید کسی پر زیادتی کر رہے ہوں گے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے سر! لیکن اس آدمی سے بہت بڑا جرم سرزد ہو چکا ہے۔ اس نے دو پولیس والوں کو بری طرح زخمی کر دیا ہے۔“

”اس کے خلاف کوئی ایف آئی آر تو نہیں کاٹی گئی ہے؟“ رانا نے ایس ایچ او سے پوچھا۔

”نہیں سر! ابھی تو ہم تفتیش ہی کر رہے تھے۔“ ایس ایچ او نے بتایا۔

”اوہ۔“ رانا مسکرا دیا۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابھی گنجائش ہے۔“

”جو آپ مناسب سمجھیں۔“

”جو پولیس والے اس کے حملے میں متاثر ہوئے ہیں، ان بچوں کے لیے پچاس پچاس ہزار۔ اس کے بعد یہ باب ہمیشہ کے لیے ختم ہو جانا چاہیے۔“

”رانا صاحب اس کے لیے ان پولیس والوں سے بات کرنی ہوگی کہ وہ صلح نامے کے لیے تیار ہیں یا نہیں۔“

ایس پی نے ایک اصولی بات کی۔ ”اگر وہ تیار ہیں تو پھر ہمیں کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔“

”لیکن اب یہ یہاں نہیں رہے گا۔ یہ ہمارے ساتھ جارہا ہے۔“ رانا نے بتایا۔ اس نے اپنے ساتھ آئے ہوئے آدمی کو اشارہ کیا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں دبا ہوا بریف کیس کھول کر اس میں سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر ایس ایچ او کی طرف بڑھادی۔

”نہیں سر! یہ تو میں نہیں لے سکتا۔“ ایس ایچ او نے کہا۔ وہ شاید اپنے آفیسر کی موجودگی میں جھجک رہا تھا۔

”یہ کوئی رشوت نہیں ہے۔“ رانا، ایس پی کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”پلیز، اپنے آدمیوں سے کہیں کر وہ یہ رقم رکھ لیں۔ یہ زخمیوں کے علاج معالجے کے لیے ہے۔“

ایس پی کے اشارے پر ایس ایچ او نے وہ گڈی لے لی اور ہم تھانے سے باہر آگئے۔ سب کچھ ختم ہوگیا تھا۔ اب کوئی کیس نہیں رہا تھا۔

دولت میں کتنی قوت ہوتی ہے۔ اس کا مظاہرہ اس وقت دیکھنے میں آیا تھا۔

رانا کیا زبردست آدمی تھا۔ وہ مجھے مکھن سے بال کی طرح نکال کر لے آیا تھا۔ تھانے سے باہر اس کی شاندار گاڑی ڈرائیور کے ساتھ موجود تھی۔

رانا نے اپنے ساتھ آئے ہوئے آدمی کو اشارہ کیا کہ وہ اپنی گاڑی میں آجائے، جبکہ مجھے اپنے ساتھ بٹھالیا تھا۔ ہم رانا کے گھر کی طرف چل پڑے۔

رانا نے آنکھ کے اشارے سے مجھے منع کردیا کہ میں گاڑی میں اس سے کسی قسم کی بات نہ کروں۔ شاید وہ ڈرائیور کے سامنے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

کچھ دیر بعد میں پھر اس کے شاندار ڈرائنگ روم میں تھا۔ رانا کے ہونٹوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ تھی۔ ”یہ لو اپنا شناختی کارڈ۔“ اس نے اپنی جیب سے میرا پرانا شناختی کارڈ نکال کر میری طرف بڑھادیا۔ ”یہ وہی کارڈ ہے جو تم جھگڑے کے دوران میں گرا آئے تھے اور پولیس والے اس کارڈ پر لکھے ہوئے پتے کے ذریعے تمہارے گھر تک پہنچ گئے تھے۔“

”رانا صاحب! یہ کارڈ آپ کے پاس؟“ میں حیران ہوگیا۔

”یہ فضول سوال ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اور ہاں، تم مجھے بالکو کہا کرو۔ بالکو سے پکارا جانا مجھے اچھا لگتا ہے۔ اس نام سے ایزریس کی یادیں وابستہ ہیں۔“

میرے خدا! پھر وہی کہانی شروع ہوگئی تھی۔ ایزریس... بالکو... مجوزا... قدیم روح... آج کا رانا۔ نہ جانے کیا تھا یہ سب۔

”تم کیا سمجھتے تھے کہ تم میرے پاس واپس نہیں آؤ گے؟“ رانا نے ایک دم سے سوال کیا۔

”نہیں تو... ایسی تو کوئی بات نہیں تھی۔“ میں نے گڑبڑا کر کہا۔

”ایسا ہی تھا۔“ وہ مسکرادیا۔ ”میں تمہاری روح تک میں جھانک کر دیکھ سکتا ہوں۔ تم نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ تم کسی بھی حال میں میرے پاس واپس نہیں آؤ گے لیکن یہ دیکھو اتفاقات تمہیں واپس لے آئے۔“

میں اس سے یہ کہنا چاہتا تھا کہ اتفاقات نہیں بلکہ اس کی شیطانی قوتیں اس کے پاس مجھے واپس لے آئی ہیں لیکن میں اس سے یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا۔

اس دوران میں وہی لڑکی جینی اپنے ہوش ربا حسن کے ساتھ کمرے میں داخل ہوگئی۔ اس نے رانا کا اشارہ پاکر آگے بڑھ کر میرا بازو تھام لیا۔ ”چلو، میرے ساتھ چلو۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔“

”ہاں، تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔“ رانا نے بھی کہا۔ ”اور ہاں، تمہارا نیا شناختی کارڈ اور پاسپورٹ تیار ہوکر آچکا ہے۔ دو چار دنوں بعد تم یہاں سے ایتھنز کے لیے روانہ ہوجاؤ گے۔“

میری قوت ارادی نے پھر میرا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ جینیفر نے مجھے اٹھایا اور میں کرسی سے اٹھ گیا۔ وہ اسی طرح مجھے اس کمرے میں لے آئی جہاں میں نے پہلے قیام کیا تھا۔

وہ کمرا ایک بار پھر جینیفر کے بدن کی خوشبوؤں سے مہک اٹھا تھا۔ اس وقت بھی میرے ذہن میں ان گنت سوالات تھے لیکن کچھ بولا نہیں جارہا تھا۔

میں اس کے سامنے آتے ہی سحر زدہ سا ہوجاتا تھا۔

”چلو بستر پر لیٹ جاؤ۔“ جینی نے کہا۔

”وہ کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”اس لیے کہ تمہیں اس وقت مکمل مالش کی ضرورت ہے۔“ اس نے کہا۔ ”تم نے پولیس والوں سے بہت مار کھائی ہے۔ اس وقت تمہارا جوڑ جوڑ درد کررہا ہوگا۔“

وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ اس کے احساس دلانے پر بدن کی چوٹوں کا احساس ہونے لگا۔ پولیس والوں نے سوبار میں بٹھاتے اور اٹھاتے ہوئے بری طرح مارا تھا

تھے۔

"جانتے ہو۔ پورے شہر میں مجھ سے بہتر مالش کرنے والی کوئی نہیں تھی۔" جینی نے کہا۔

جینیفر۔ کی زندگی کا ایک پہلو میرے سامنے آ گیا تھا۔

میں اس لڑکی سے اپنی خدمت نہیں کروانا چاہتا تھا لیکن وہاں پہنچ کر تو میں بے بس ہو جاتا تھا۔ شاید وہاں کی فضاؤں میں ایسا سحر گھلا ہوا تھا جو اعصاب کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیتا ہے۔

جینی ملحقہ غسل خانے سے کئی طرح کے آئل اٹھا کر لے آئی تھی۔ اس کے بعد اس نے اپنا کام شروع کر دیا۔ پوری مہارت اور ہنر مندی کے ساتھ۔

اور میں آہستہ آہستہ ایک سرشار بھری غنودگی میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆☆☆

میں ایتھنز میں تھا۔

ایتھنز۔ قدیم تہذیب کا گڑھ... دنیا نے تمدن کا سبق اس شہر سے لیا تھا۔ دنیا کے عظیم ترین فلاسفر اسی شہر میں پیدا ہوئے۔ پوری دنیا میں جمہوریت کی ابتدا اسی شہر سے ہوئی تھی۔

میں اب شاہد حیات تھا۔ ایک نیا نام، ایک نئی شناخت۔ نہ جانے یہ راما کی دولت اور اقتدار کا کھیل تھا یا اس کی شخصیت کے گرد جس قسم کے سحر اور پُراسراریت کا حصار تھا، اس نے یہ مشکلیں آسان کر دی تھیں۔

میرا نیا شناختی کارڈ، پاسپورٹ، ویزا اور ٹکٹ وغیرہ سب دو دنوں میں تیار ہو کر مل گئے تھے۔ میرے ساتھ جینی کو بھی بھیجا گیا تھا۔

اس کو کسی نئے نام اور نئی شناخت کی ضرورت نہیں تھی۔

ہمارا جہاز نے انٹرنیشنل ایتھنز ائرپورٹ پر اترا تھا۔

وہاں سے ہم کیب کے ذریعے شہر کے ایک خوب صورت ہوٹل میں آ گئے تھے۔

ایتھنز جینی کے لیے نیا شہر نہیں تھا۔ وہ یہاں پہلے بھی کئی بار آ چکی تھی اس لیے وہ اس شہر سے اچھی طرح واقف تھی۔

ہمارا قیام ہوٹل کی نویں منزل پر تھا۔ کمرے کی کھڑکی سے دور تک پھیلا ہوا ایتھنز اپنی پوری شان و شوکت اور خوب صورتی کے ساتھ دکھائی دے رہا تھا۔

ہم نے رات کا کھانا ڈائننگ ہال ہی میں کھایا تھا۔

جینی کے کتاب میں کی جینی ہی نے مدد کی تھی کیونکہ وہ حرام اور حلال کے فرق سے اچھی طرح واقف تھی۔

اب مجھے اس کے ساتھ کی عادت ہو گئی تھی۔ وہ ایک اچھی لڑکی تھی۔ ہر انداز سے تعاون کرنے والی لیکن مجھے ابھی تک اس کے بیک گراؤنڈ کے بارے میں نہیں معلوم ہو سکا تھا۔

کھانا کھانے کے دوران میں یہ سوچتا رہا تھا کہ میں یہاں کس قسم کی احمقانہ مہم پر آیا ہوں۔ ایک ایسی عورت کی تلاش میں جو صدیوں پہلے مر چکی ہے۔

یہ مہم احمقانہ ہونے کے ساتھ ساتھ پُراسرار بھی تھی۔ بالکل کوئی پاگل پن نہیں تھا۔ وہ روشن آنکھیں میرا واہمہ نہیں تھیں۔ وہ تنیلا سا مجوزا میرا خواب نہیں تھا بلکہ یہ سب واقعات اسی دنیا اسی زمین پر پیش آ رہے تھے جب یہاں تک ہو سکتا تھا تو ایزرنس بھی ہو سکتی تھی۔

ہو سکتا تھا کہ وہ ایتھنز کی کسی گلی... کسی محلے میں رہتی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا نام ایزرنس نہ ہو۔ کچھ اور ہو لیکن مجھے تو اس کو تلاش کرنا تھا۔

اس ڈائننگ ہال میں بیٹھ کر کافی پیتے ہوئے میں نے یہی سوال جینیفر سے کیا۔ "جینی! تم یہ بتاؤ، تم یہاں میرے ساتھ کیوں آئی ہو؟"

"تم بھول رہے ہو۔ میں خود نہیں آئی، مجھے بھیجا گیا ہے۔"

"لیکن کیوں؟"

"اس لیے کہ ایزرنس کی تلاش میں تمہاری مدد کر سکوں۔" اس نے بتایا۔ "اس کے علاوہ اس لیے بھی بھیجا گیا ہے کہ ایتھنز میرے لیے نیا شہر نہیں ہے۔ میں اسے برسوں سے جانتی ہوں۔"

"تم یہ بتاؤ کہ تم اس کی تلاش میں کس طرح مدد کر سکو گی؟" میں نے پوچھا۔

"اس لیے کہ میں اسے پہچانتی ہوں۔" جینی نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

"کیا؟ تم اسے پہچانتی ہو؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں، اور کل کے بعد تم بھی اسے پہچاننے لگو گے۔" اس نے کہا۔

"کیسی بات کر رہی ہو؟"

"ایتھنز میں کئی مقامات پر اس کے مجسمے موجود ہیں۔" جینیفر نے بتایا۔ "اس زمانے کے فنکاروں نے بڑی

مہارت اور باریکی کے ساتھ پتھروں میں اس کے خدوخال کو محفوظ کر دیا ہے۔ تم ایک بار اس کا کوئی مجسمہ دیکھ لو تو پھر اسے بھول نہیں پاؤ گے۔''

''ہوں۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''جینی! ایک بات بتاؤ۔ کیا یہ مہم تمہیں عجیب نہیں لگ رہی۔ کیا واقعی ایسا ہو سکتا ہے؟''

''رانا کے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا!'' جینی نے سرگوشی کی۔ ''کیا تم بالکو کا اپنا وہم کہہ سکتے ہو؟''

''نہیں۔'' میں نے اپنی گردن ہلا دی۔ ''میں اسے وہم کیسے کہہ سکتا ہوں۔''

''اور نہ ہی تمہارا یہاں تک آنا وہم ہے۔'' اس نے کہا۔

''ہاں، یہ بھی حقیقت ہے۔''

''تو پھر سن لو کہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے، وہ حقیقت ہے۔'' جینی نے کہا۔

''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔''

''عقل مندی اسی میں ہے کہ وقت کے دھارے تمہیں جس طرف لیے جا رہے ہیں، اسی طرف بہتے چلے جاؤ۔ اگر تم نے مخالف سمت میں تیرنے کی کوشش کی تو سوائے بربادی کے اور کچھ بھی نہیں ملے گا۔'' جینی نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''تم یہ بتاؤ کہ رانا صاحب سے تمہاری ملاقات کیسے ہوئی۔ میرا مطلب ہے تم کب سے ان کو جانتی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''تم اس کھوج میں نہ ہو۔'' جینی نے کہا۔ ''اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔ میں کون ہوں، کہاں سے آئی ہوں، تم ان چکروں میں نہ پڑو۔''

''چلو کم از کم یہی بتا دو کہ کیا ہم ایزوریس کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے؟''

''ہاں، کیونکہ ہم اسی لیے اس شہر میں آئے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''اور وہ یہیں رہتی ہے۔ اسی شہر کے کسی گوشے میں۔''

''ایک بات بتاؤ، کیا میرے ساتھ جو کچھ بھی ہوا ہے، وہ پاگل کر دینے والا ہے یا نہیں؟''

''اگر تم نے اپنی آنکھیں کھلی رکھیں اور فرمانبردار بنے رہے تو کچھ بھی نہیں ہوگا بلکہ فائدے میں رہو گے۔ تم خود دیکھ لو۔ رانا صاحب نے کتنی آسانی کے ساتھ پولیس سے نہ صرف تمہاری جان چھڑوا دی بلکہ تم اپنے ملک سے ہزاروں میل دور ایتھنز میں دکھائی دے رہے ہو۔'' جینی نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں یہ تو ہے۔ میں تو ان کی پراسرار قوتوں کو ماننے لگا ہوں۔''

''تو بس خاموش ہو جاؤ اور چل کر سو جاؤ۔ صبح ہم اپنی مہم کا آغاز کریں گے۔''

ہوٹل کے ڈائننگ روم سے ہم اپنے کمرے میں آگئے۔ اس وقت رات ہو چکی تھی اور کھڑکی سے جگمگاتے ہوئے شہر کا نظارہ بہت دلفریب لگ رہا تھا۔

میں کھڑکی کے پاس کھڑا ہو کر باہر کی طرف دیکھ رہا تھا کہ جینی مجھ سے آکر چپک گئی۔ ''کیا دیکھ رہے ہو؟'' اس نے سرگوشی کی۔

''ایتھنز کی خوب صورتی دیکھ رہا ہوں۔'' میں نے بتایا۔

''یہ بہت قدیم اور بہت ہی عظیم شہر ہے۔'' اس نے کہا۔ ''یہ شہر بارہ پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے اور ساری پہاڑیاں بہت مقدس اور متبرک مانی جاتی ہیں۔ ہر پہاڑی کے ساتھ نہ جانے کتنی داستانیں وابستہ ہیں۔''

''بہت معلومات ہیں تمہاری۔'' میں نے تعریف کی۔

''ہاں کیونکہ میری جڑیں بھی اسی شہر میں تھیں۔'' اس نے کہا پھر اس نے دور جگمگاتی پہاڑیوں کے ایک سلسلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''اسی جگہ وہ مشہور مندر بھی مثلث ہے جسے پلاکا بھی کہتے ہیں اور سائی ری کہتے ہیں۔ اگر تم تاریخ کے طالب علم رہے ہو گے تو ضرور جانتے ہو گے۔''

''ہاں، میں نے بہت کچھ سن بھی رکھا اور پڑھا بھی ہے۔''

''پھر تو جانتے ہو گے کہ دنیا کے سات عجائبات میں سے ایک ''ایکروپولس'' اسی شہر میں ہے۔''

''ہاں، میں یہ بھی جانتا ہوں اب تم مجھے ایزوریس کے مجسمے کے بارے میں بتاؤ، وہ کہاں ہوگا؟''

''نیشنل آرکیالوجیکل میوزیم میں اس کا مجسمہ ابھی تک موجود ہے۔'' جینیفر نے بتایا۔ ''ہم کل وہیں چلیں گے۔ چلو اس وقت سو جاؤ، بہت رات ہو گئی ہے۔''

میری وہ رات بھی جینیفر کی زلفوں کے سائے میں گزری تھی۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ بے بس ہو جانے اور بس ہو جانے کا احساس بالکو اور جینیفر دونوں کے سامنے ہوا کرتا تھا۔

اگرچہ دونوں کی نوعیت بہت مختلف ہوتی تھی۔

بالکو یا رانا کے سامنے بے پناہ خوف کا احساس ہوتا۔

جبکہ جینیفر کے سامنے اپنی مرضی سے پیش جاتا تھا۔ وہاں بے بسی کا احساس تھا اور یہاں بے خودی کا۔

دوسری صبح جینیفر نے کہا۔ ''شاہد حیات! آج ہمیں ایتھنز کی سیر کرنی ہے۔ خاص طور پر وہ مقامات دیکھنے ہیں جہاں دیوتا ایزوریس کی یادیں ہیں۔ تاکہ تم اس کی صورت دیکھ کر ذہن نشین کر سکو اور جب دکھائی دے تو اسے پہچان لو۔''

''کیا اس کام میں تم میرا ساتھ نہیں دو گی؟''

''کیوں نہیں۔ میں تو تمہارے ساتھ ہی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''اور جانتے ہو تمہارا اصل کام کیا ہے؟''

''ایزوریس کو تلاش کر کے کسی دوسرے ملک میں لے جانا۔''

''ہاں، یہ تو ہے۔ اس کے علاوہ اصل کام یہ ہے کہ تم کو ایزوریس کے مجسمے کو توڑ دینا ہے۔''

''کیا مجسمے کو توڑ دینا ہے؟''

''ہاں، جب تک تم اس کے مجسمے کو نہیں توڑو گے'' وہ ایتھنز سے باہر نہیں جائے گی۔'' جینیفر نے بتایا۔ ''وہ اس کے اردگرد بھٹکتی رہتی ہے۔''

''تم تو بتا رہی تھیں کہ اس کے مجسمے پورے ایتھنز میں ہیں۔ اب میں کس کس کو توڑتا رہوں گا؟''

''ہاں، یوں تو...... ایزوریس کے مجسمے پورے شہر میں ہیں لیکن مکمل مجسمہ صرف اپالو کے مندر میں ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''اپنی پوری جزئیات کے ساتھ۔ دوسرے مجسمے استداد زمانہ کے ساتھ ادھورے ہو گئے ہیں۔ کسی کی ناک غائب ہے۔ کسی کے کان ٹوٹے ہوئے ہیں۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا۔''

''ہاں، سمجھ رہا ہوں۔ بس مجھے اس کے اس مجسمے کو توڑنا ہوگا جو اچھی حالت میں ہے۔''

''ہاں، اس کے بعد ایزوریس بے بس ہو کر رہ جائے گی۔ کیونکہ اس کا ٹھکانا ہی ختم ہو چکا ہوگا پھر تم اسے بہت آسانی سے جہاں چاہو، لے جا سکتے ہو۔''

''تم چلو، میں جب تک نہا کر فریش ہو جاؤں۔''

ہم نے ناشتا نیچے ہال ہی میں کیا تھا۔ یہاں ہر طرف یورپین ہی تھے۔ اس ہوٹل میں پاکستانی یا ہندوستانی ذرا کم ہی آیا کرتے تھے۔

عام طور پر ایتھنز میں وہی پاکستانی آیا کرتے تھے جنہیں جہازوں میں ملازمت درکار ہوتی تھی۔ ایک زمانے میں تو یہ وبا تھی کہ ہر تیسرا پاکستانی پاسپورٹ بنوا کر ایتھنز جانے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ کیونکہ یہاں بے شمار شپنگ کمپنیاں تھیں اور وہ ایسے ضرورت مند نوجوانوں کو فوراً ان ...وں کے پیچھے رہ گیا تھا جو تمام یورپین نہیں کرتے تھے۔ جیسے ڈیک اور انجن روم کی صفائی، جہاز کا رنگ و روغن وغیرہ۔

بندرگاہ کے ساتھ ساتھ ایسے بے شمار سستے ہوٹل تھے جو پاکستانی اور ہندوستانی نوجوانوں سے بھرے رہتے۔ لیکن ہم نے جس ہوٹل میں قیام کیا تھا، وہ ایک شاندار اور مہنگا ہوٹل تھا۔ یہ سب اس پُراسرار ورانا کی وجہ سے ممکن ہو سکا تھا۔

ناشتے کے دوران میں جینیفر نے مجھ سے پوچھا۔ ''ایک بات بتاؤ۔ تمہارا میرے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''اگر میں اپنے معاشرے اور اپنی اقدار کے حوالے سے بات کروں تو تم ایک ایسی لڑکی ہو جس نے اپنا جسم کسی غیر کے حوالے کر دیا ہے اس لیے میرے معاشرے میں تمہیں اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھا جائے گا۔''

''شاید تم اپنے پوائنٹ آف ویو سے صحیح کہہ رہے ہو لیکن ہمارے یہاں معاملہ کچھ اور ہے۔ ایسے ہر وصال کے بعد عورت کی تکمیل ہوتی رہتی ہے اور جب وہ مقررہ وصال تک پہنچ جاتی ہے تو پھر اس کا امان مل جاتی ہے۔''

''جینی! تمہاری یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ کیسا فلسفہ ہے؟''

''یہ بہت قدیم فلسفہ ہے۔'' وہ مسکرا دی۔ ''یہ اس زمانے کا فلسفہ ہے جب ایزوریس اور بالگو رہا کرتے تھے۔ میرا مطلب ہے کہ جب ایزوریس اور بالگو بالگو تھا۔ روایت یہ تھی کہ جو شخص یا دیوتا ایزوریس کا ہو جائے اور ایزوریس اس کے ساتھ وقت گزارے۔ اس شخص کو کسی اور دیوی یا عورت کی مجال نہیں تھی کہ اپنی طرف متوجہ کر سکے یا اس سے محبت کا اظہار کر سکے۔''

''سمجھ گیا، یعنی اس بالگو کو کوئی اور پسند نہیں کر سکتی تھی یا اس کے قریب نہیں جا سکتی تھی۔''

''ہاں، ایسا ہی ہوتا تھا۔'' اس نے کہا۔ ''اور اگر کسی نے ایسی جرأت کی تو سارے دیوتا مل کر اسے سزا سناتے۔''

''اور وہ سزا کیا ہوتی تھی؟''

''وہ سزا یہ ہوتی تھی کہ اس عورت یا دیوی کے جسم کو پامال کیا جاتا رہے گا۔ صدیوں تک۔ وہ ان گنت دیوتاؤں اور فانی مردوں سے جسمانی تعلقات قائم کرے گی اور جب مقررہ گنتی ختم ہو جائے گی تو پھر وہ بالگو کو حاصل کر لے گی یعنی اس بالگو کو جس کی محبت میں اسے یہ دن دیکھنا پڑا ہے۔ یہ سزا برداشت کرنی پڑتی ہے۔''

''کیا بالگو ایسی صورت میں بھی اسے قبول کر لے گا کہ وہ ہزاروں مردوں سے ملتی ہوئی آئی ہے؟''

''ہاں، کیونکہ ہر عذاب اس کے لیے تازہ دن کی طرح ہوگا۔ جس طرح نہانے کے بعد جسم صاف و شفاف ہوتا چلا جاتا ہے، اسی طرح وصال کے بعد وہ پاک ہوتی چلی جائے گی۔''

''بہت ہی عجیب فلسفہ ہے۔'' میں نے گہرا سانس لیا۔ ''لیکن تمہیں یہ کہانی کہاں سے معلوم ہوئی؟''

''یہ روایتیں تو صدیوں سے چلی آرہی ہیں۔'' اس نے کہا۔

''چلو مان لیا کہ ایسا ہے لیکن تمہارا اس روایت سے کیا تعلق؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا تعلق...'' وہ بے ساختہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ ''اب چلو، یہاں سے چلتے ہیں۔ تمہیں ایڈریس کا دیدار کروا دوں۔''

ہم ہوٹل سے باہر آگئے۔ کئی سرد گائیڈ ہماری طرف آئے۔ وہ ایتھنز کی سیر کی باتیں کر رہے تھے۔ ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ ماہر تاریخ داں تھا۔

لیکن جینیفر نے یونانی زبان میں کچھ کہہ کر انہیں وہاں سے ہٹا دیا۔

''جینی! تم تو بہت اچھی یونانی بول لیتی ہو۔'' میں نے کہا۔

''ہاں، میں یہ بتا چکی ہوں کہ میری جڑیں یونان میں ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''خاص طور پر ایتھنز میں۔ میں یہاں کے چپے چپے سے واقف ہوں۔ یہ بے چارے تو تاریخ سنائیں گے اور میں نے تاریخ اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں چونک گیا۔

''کچھ نہیں، یونان کا ایک محاورہ یاد آگیا تھا۔ روانی میں بول گئی۔'' اس نے کہا۔ ''چلو کیب لے لیتے ہیں۔''

ہم ایک خوب صورت سی کیب میں بیٹھ گئے۔

الیاس ایونیو سے ہوتے ہوئے ہم الیگزینڈرا ایونیو پہنچ گئے۔

جینیفر سارے راستے بتاتی رہی تھی۔ ''یہ دیکھو یہ ہیپائی اسٹریٹ ہے۔ یہ الاذا اسٹریٹ ہے۔ اسے ہائی اسٹریٹ کہتے ہیں اور یہ ہے ساتنا روزا اسٹریٹ۔''

''کیا ہم اس وقت پورے شہر کی سیر کو نکلے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔ ''کیونکہ میں محسوس کر رہا ہوں کہ ہم کسی ایک ڈائریکشن میں جا رہے ہیں کبھی دوسری ڈائریکشن میں۔''

''ہاں۔'' وہ مسکرا دی۔ ''تم ذہین آدمی ہو۔ تم نے یہ بات محسوس کر لی۔ میں دراصل ان راستوں سے گزار رہی ہوں جہاں سے جا رہی ہوں جہاں ایڈریس کے مجسمے ہوا کرتے تھے لیکن اب کہیں بھی ان کا نام و نشان نہیں رہ گیا ہے۔''

''تو پھر کہاں ملے گا؟''

''وہی اپالو کے مندر میں۔'' اس نے بتایا۔ ''وہاں وہ اپنی اصلی حالت میں موجود ہے۔''

ہم اپالو کے مندر میں پہنچ گئے۔ راستے میں اور بہت کچھ دیکھنے کو ملا تھا جن کے بارے میں جینیفر بتاتی رہی تھی۔ ایتھنز سٹی ہال، رصدگاہ، نیشنل تھیٹر، نیشنل لائبریری۔ ہماری کیب گرینڈ بریٹین ہوٹل کے سامنے سے بھی گزری تھی۔ اس نے بتایا کہ یہ ایتھنز کے مہنگے ترین ہوٹلوں میں سے ہے۔

یہ وہ شہر تھا جہاں ہر قدم پر تاریخ بکھری ہوئی تھی۔ کتنی قدیم تہذیب اور کتنی قدیم تاریخ تھی، اس شہر کی۔ ایک طرح سے وقت یہاں آکر منجمد سا ہو گیا تھا۔

بہت دیر کے سفر کے بعد ہم اپالو کے مندر پہنچ گئے۔

کیا شاندار مقام تھا۔ اس زمانے کا آرکیٹیکچر حیران کیے جا رہا تھا۔ اونچے اونچے ستون، محرابیں۔ اس قدیم عمارت کو اسی انداز میں برقرار رکھا گیا تھا۔

یہاں سیاحوں کی بھیڑ تھی۔

سب کے سب اس عظیم الشان تاریخی یادگار کو دیکھنے آئے ہوئے تھے۔ یہاں آکر احساس ہوا کہ دنیا کی قومیں کس طرح اپنے تاریخی اثاثوں کو سنبھال کر رکھتی ہیں۔ اور ایک ہم ہیں کہ ان کو برباد کرنے کے چکر میں لگے رہتے ہیں۔

دنیا کے بے شمار ملکوں کی آمدنی کا انحصار ہی سیاحت پر ہے جبکہ ہمارے یہاں اس شعبے کو اہمیت ہی نہیں دی جاتی۔

بہرحال ہم اپالو کے عظیم الشان مجسمے کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔ کیا شاندار مجسمہ تھا۔ اپنی تمام تر جزئیات سمیت۔ فنکار نے پتھروں میں جان ڈال دی تھی۔ پتھر کا مجسمہ بولتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

اور اس سے کچھ ہی فاصلے پر ایڈریس کا مجسمہ تھا۔

فنکار نے اس کو بنانے میں بھی اپنی بے مثال مہارت کا ثبوت دیا تھا۔ کیا دل کش نقوش تھے۔ پتلے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ آنکھوں کے تاثرات ایسے تھے جیسے دنیا کو فتح کرنے کا عزم رکھتی ہو۔

اور ان سب چیزوں کے علاوہ جس نے مجھے مبہوت کر دیا تھا، وہ ایک جھومر تھا۔

وہ کوئی زیور تھا۔ جھومر کی شکل کا۔

کسی قیمتی پتھر سے بنایا ہوا وہ جھومر اس کی پیشانی کے وسط میں چپکا ہوا تھا.... اس کو بنانے میں بھی کمال کی

مہارت دکھائی گئی تھی۔

وہ اتنا زندہ معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی بھن بھن کرتا ہوا پرواز کر جائے گا اور سب سے حیرت انگیز اور بھیانک اس کی وہ دو چھوٹی روشن آنکھیں تھیں جو مجھے گھورتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

''کیا احساس ہو رہا ہے اسے دیکھ کر؟'' جینیفر نے سرگوشی کی۔

''یہ، یہ تو وہی بھونرا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں، یہ بھونرا ہی ایزرلیس کی نشانی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''تم اس بھونرے سے دیوی کو نجات دلا دو۔ اس کے بعد دیوی تمہیں ایتھنز کی کسی سڑک پر مل جائے گی۔ تم اسے اپنے ساتھ لے جا سکتے ہو۔''

''جینی! تم مجھے ایک بات بتاؤ، اگر میں یہ سب نہ کروں تو کیا ہوگا؟''

''بہت برا ہوگا۔'' جینی نے کہا۔ ''یہ بھونرا میرا مطلب ہے بالگو تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ اس کی آنکھیں دنیا کے ہر کونے میں تمہارا تعاقب کرتی رہیں گی۔ تمہاری نیندیں برباد ہو جائیں گی۔ تمہارا سکون غارت ہو جائے گا۔ بالگو نے لاکھوں لوگوں میں سے تمہارا انتخاب کیا ہے۔ وہ کبھی نہیں چاہے گا کہ تم اس کے مشن کو ادھورا چھوڑ دو۔''

''ہوں۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''اگر میں نے اس کی بات مان لی تو پھر کیا ہوگا؟''

''آزادی، تم آزاد ہو جاؤ گے۔ پھر کوئی بھونرا تمہارا پیچھا نہیں کرے گا پھر تمہیں بھن بھن کی کوئی آواز سنائی نہیں دے گی اور میں یہ جانتی ہوں کہ بالگو تمہیں اتنی دولت بھی دے دے گا کہ تم ساری زندگی آرام سے گزار سکو۔''

''کیا تم جانتی ہو کہ مجھے بھن بھن کی آوازیں سنائی دیتی ہیں یا وہ آنکھیں میرا پیچھا کیا کرتی ہیں۔''

''ہاں۔'' وہ ہنس پڑی۔ ''بالگو کا ایسا کون سا راز ہے جو مجھ سے چھپا ہوا ہو۔''

''تو پھر کیا کروں میں۔ توڑ دوں اس مجسمے کو؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، ابھی نہیں۔'' جینی نے کہا۔ ''دن کا وقت ہے۔ ہر طرف لوگ موجود ہیں۔ تم اتنے بڑے ورثے کو تباہ کرو گے تو یہاں کی حکومت اور عوام تمہیں معاف نہیں کرے گی۔ تم ایک اور بڑی الجھن میں پھنس جاؤ گے۔ اس کے لیے ہمیں رات کو آنا ہوگا۔''

''کیا رات کے وقت یہاں کی نگہبانی نہیں ہوتی؟''

''وہ کس لیے۔ ان مجسموں کو کس سے خطرہ ہو سکتا ہے کہ یہاں کی چوکیداری کی جائے۔'' جینی نے کہا۔ ''البتہ تم جو کچھ کرو گے، وہ پہلی حرکت ہوگی کیونکہ یہاں اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا ہوگا۔''

''میرا تو دل چاہ رہا ہے کہ میں اسی وقت یہ قصہ ختم کر دوں۔'' میں نے کہا۔ ''کیونکہ میں بری طرح الجھ گیا ہوں۔ اس قسم کے پُراسرار واقعات نے میری زندگی اجیرن کر دی ہے۔ آخر ایسا کیوں ہوا؟ کچھ میں نہیں آیا۔''

''دیکھو شاہد حیات! اصل کہانی یہ ہے کہ واقعات اور حادثات کسی کا انتخاب کر لیتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ سب کچھ ایک دم سے ہو جاتا ہے بلکہ وقت کی برسوں پرانی پلاننگ ہوا کرتی ہے۔ ان واقعات کو پیش آنا تھا اور وہ پیش آ رہے ہیں۔ اگر تمہارے ساتھ نہیں ہوتے تو کسی اور کے ساتھ ہوتے لیکن ہوتے ضرور اور ہر ایک کو یہی شکوہ ہوتا کہ اس کے ساتھ کیوں ہو رہے ہیں؟''

''یعنی تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ میری قسمت میں یہی لکھا ہوا تھا؟''

''ہاں، سیدھے سادے الفاظ میں تم یہی سمجھ سکتے ہو۔'' جینی نے کہا۔ ''بہرحال! اب چلو۔ ہم ایتھنز کی سیر کرتے ہیں۔ رات کو پھر واپس آ جائیں گے۔''

ہماری کیب ہمارا انتظار ہی کر رہی تھی۔ ہم پھر کیب میں آ گئے۔ جینی اب مجھے ایتھنز کے جدید مقامات کی سیر کروا رہی تھی۔

سب ہی کچھ تو تھا اس شہر میں۔ ایک طرف سیکڑوں ہزاروں سال کی تہذیب اور یادگاریں تھیں۔ اور دوسری طرف ماڈرن یورپ تھا۔

قدیم اور جدید کا ایسا حسین امتزاج بہت کم شہروں کو نصیب ہوتا ہوگا۔

ہم رات نو بجے تک یونہی گھومتے رہے پھر رات کے کھانے کے لیے ایک ہوٹل میں داخل ہو گئے۔ یہاں جینی نے اچانک میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''حیات! تم بہت اچھے آدمی ہو۔ میں نہیں چاہتی کہ...'' وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

''بتاؤ، تم خاموش کیوں ہو گئیں؟'' میں نے پوچھا۔

''میں، میں یہ چاہتی ہوں کہ تم واپس چلے جاؤ۔'' اس نے کہا۔

''کہاں چلا جاؤں؟''

''اپنے ملک۔'' اس نے کہا۔ ''یہاں تمہارے لیے دشواریاں ہیں لیکن میں... میں بتاؤں گی تمہیں۔''

”جینی! مجھے نہیں معلوم کہ تم اس وقت کیا کہہ رہی ہو؟“

”کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں۔“ جینی نے زور زور سے اپنا سر جھٹکنا شروع کردیا جیسے کوئی بات غلطی سے کہہ گئی ہو۔

”جینی! اب تم ایک بات بتاؤ۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”تمہارا اور بالکو دونوں کا یہ کہنا ہے کہ ایزریس کو تلاش کرنے کے لیے بالکو خود یہاں نہیں آسکتا۔“

”ہاں، وہ نہیں آسکتا کیونکہ اس پر کچھ پابندیاں ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”اور یہ پابندیاں کس نے عائد کی ہیں؟“

”دیوتاؤں نے۔“ اس نے بتایا۔ ”اور اس کا ہر حال میں ان پر عمل کرنا ضروری ہے۔“

”تو اس کے اثرات اور ان کی طاقت یہاں تک نہیں آسکتی؟“ میں نے دوسرا سوال کیا۔

”ہاں، وہ یہاں اثر انداز نہیں ہوسکتا۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں اگر ایزریس کو تلاش نہ کروں اور اس کے مجسمے کو نہ توڑوں تو بالکو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“

”ہاں۔“ اس نے گردن ہلا دی۔ ”بالکو تو کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ لیکن بالکو اکیلا تو نہیں ہے۔ دوسری طاقتیں تو اس کی دوست ہیں نا۔“

”وہ کون سی ہیں؟“

”یہ تمہیں اس وقت پتا چلے گا جب تم اس کا حکم ماننے سے انکار کرو گے۔“

”یہ عجیب مصیبت ہے۔“ میں پریشان ہوگیا۔ ”یعنی اس کی پُراسرار طاقتوں سے کہیں چھٹکارا نہیں ہے۔“

”چھٹکارا مل سکتا ہے۔ تم کیوں ان چکروں میں پڑ گئے ہو۔ بس آج رات ایزریس کے مجسمے کو توڑ دو اور ہمیشہ کے لیے آزادی حاصل کرلو۔“

”چلو ٹھیک ہے۔“ میں نے گہری سانس لی۔ ”اب تو مجھے یہ کام کرنا ہی ہوگا۔“

ریستوران سے باہر نکل کر ہم پھر ایتھنز کی سڑکیں ناپتے رہے۔ جینی اہم مقامات کے بارے میں بتاتی رہی۔ وہ بہت اچھی گائیڈ بھی ثابت ہورہی تھی۔

ٹھیک دس بجے ہم پھر اپالو کے مندر کی طرف روانہ ہوگئے۔ عمل کا وقت آگیا تھا۔ جینی نے احتیاطاً کیب کو بہت فاصلے پر رکوایا تھا۔ جس کا جواز اس نے یہ دیا تھا کہ رات کے وقت کوئی مندر کی طرف نہیں جاتا! اس لیے کیب والے کو کسی بات کا شبہ بھی ہوسکتا ہے۔ ہم پیدل چلیں گے۔

ہم چند دوسیں منٹ کی واک کے بعد مندر تک پہنچ گئے۔ جینی کی یہ بات بھی درست ثابت ہوئی کہ اس وقت وہاں کوئی گارڈ وغیرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

وہ قدیم تاریخی عمارت ایک لمحے کے لیے مجھے اس دور میں لے گئی جب اس قسم کے کردار زندہ ہوتے ہوں گے۔ جہاں ہر طرف حیرت انگیز اور پُراسرار دیوی دیوتاؤں کا راج ہوگا۔

ہم اپالو اور ایزریس کے مجسمے کے سامنے جاکر کھڑے ہوگئے۔ جینی نے میرے ہاتھ میں لوہے کی سلاخ دے دی۔ یہ سلاخ وہ نہ جانے کہاں سے اپنے ساتھ لے آئی تھی، مجھے اس کا اندازہ نہیں ہوسکا تھا۔

ایک خوف پھر مجھے پریشان کرنے لگا۔

اگر کسی نے مجھے ایزریس کے مجسمے کو تباہ کرتے ہوئے دیکھ لیا تو پھر میرا کیا حشر ہونے والا تھا۔ کیا یونان کی حکومت مجھے سلامت واپس جانے دے گی؟ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ کیونکہ میں نے ان کے قیمتی تاریخی ورثے کو برباد کر دیا تھا۔ وہ مجھے جان سے مار دیتے۔

میں نے جب اپنے اس خوف کا اظہار جینی سے کیا تو وہ جھلا اٹھی۔ ”بے وقوف ہو تم۔ جب ہمیں یہاں کوئی دیکھنے والا ہی نہیں ہے تو پھر کون آئے گا۔ جلد شروع ہوجاؤ۔“

میں سلاخ لے کر ایزریس کے مجسمے کے سامنے آگیا۔

اور اس وقت ایسا لگا جیسے اس کی پیشانی سے چپکے ہوئے بھونرے میں جان پڑ گئی ہو۔ اس کی روشن آنکھیں انتہائی غصے اور نفرت سے مجھے گھور رہی ہوں۔

میں خوف زدہ ہوکر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اسی وقت جینی نے میرے شانے پر تھپکی دی۔ ”کیا سوچ رہے ہو۔ اپنا کام کیوں نہیں کرتے؟“

”جینی! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ایسا لگ رہا ہے جیسے وہ بھونرا زندہ ہوگیا ہو۔“

”اس بھونرے کی بناوٹ ہی ایسی ہے کہ وہ زندہ معلوم ہوتا ہے۔“ جینی نے بتایا۔

”ایک بات بتاؤ۔ مان لیا کہ بالکو یہاں نہیں آسکتا۔ اس پر کچھ پابندیاں ہیں لیکن تم تو یہاں آسانی سے آگئی ہو... تم بالکو کی ساتھی بھی ہو پھر بالکو نے یہ کام تم سے کیوں نہیں لیا؟“

”اوہ، اب کیا اس موقع پر اس قسم کی بحث کرو

گے؟"

"میری بات کا جواب دو جیفی۔" میں نے کہا۔ "یہ کام تم بھی تو کر سکتی تھیں؟"

"ہاں، یہ کام میں بھی کر سکتی تھی لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ میں اپنی مالک کے مجسمے کو تباہ کر سکوں۔" اس نے بتایا۔

"مالک کے مجسمے کو؟" میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ "کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"جلدی کرو بے وقوف۔" وہ زور سے چیخی۔ "ورنہ کوئی آ جائے گا۔"

میں نے بوکھلا کر غیر ارادی طور پر لوہے کی سلاخ اس مجسمے پر دے ماری۔ ایک بار، دو بار، دس بار اور اچانک ایزوربس کی پیشانی سے چپکا ہوا بھونرا اس کی پیشانی سے الگ ہو کر پرواز کرنے لگا۔

بھن بھن کی آوازیں۔ میں مبہوت ہو کر اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اس کے ساتھ ہی ٹوٹے ہوئے مجسمے کے اندر سے بھونرے نکلنے لگے۔ درجنوں کی تعداد میں۔ شاید سیکڑوں۔ ہزاروں۔ ہر طرف ان کی بھن بھناہٹ۔ ہزاروں لاکھوں روشن آنکھیں۔ ان کے ننھے وجود جو مجھ سے آ کر چمٹ گئے تھے۔

میں چیخ رہا تھا۔ پاگلوں کی طرح اچھل رہا تھا۔ اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے اس وقت یہ بھی ہوش نہیں رہا تھا کہ جیفی کہاں رہ گئی تھی۔

میں تو شدید اذیت میں تھا۔ سیکڑوں بھونروں کے ڈنک میرے جسم میں اترتے جا رہے تھے۔ پھر مجھے کسی بات کا ہوش نہیں رہا۔ میں بے ہوش ہو کر گر پڑا تھا۔

☆☆☆

میں نہیں جانتا کہ میری بے ہوشی کا وقفہ کتنا طویل تھا۔ شاید ایک گھنٹا... ایک ہفتہ یا ایک مہینا۔ بس میرے چاروں طرف اندھیرے کا سمندر تھا اور میں اس سمندر میں ڈوبتا جا رہا تھا۔

ہوش آیا تو میں ایک کمرے میں تھا۔

میرے اردگرد کچھ لوگ کھڑے تھے۔ وہ مجھے ڈاکٹرز معلوم ہوئے۔ ان کے درمیان ایک پاکستانی چہرہ بھی دکھائی دیا۔ جسے دیکھ کر مجھے تقویت ہوئی تھی۔ مجھے ہوش میں دیکھ کر وہ میرے پاس آ گیا۔

"تم اس وقت ایتھنز کے اولمپین اسپتال میں ہو۔" اس نے اردو میں بتایا۔ "اور پولیس تمہیں گرفتار کر چکی ہے۔ اب جو بیان دو گے، سوچ سمجھ کر دو گے۔"

"آپ کون ہیں جناب؟" میں نے پوچھا۔

"میرا نام اطہر طلوئی ہے۔" اس نے بتایا۔ "میرا تعلق پاکستانی قونصلیٹ سے ہے۔ صبح مجھے اطلاع دی گئی تھی کہ ایک پاکستانی زخمی حالت میں اپالو کے مندر میں پڑا ہوا ہے۔ اس کے ہاتھ میں لوہے کی سلاخ ہے اور ایزوربس کے مجسمے کے ٹکڑے ہو چکے ہیں۔ شاید یہ حرکت اسی نے کی ہے۔"

"جی جناب۔" میں دھیرے سے بولا۔ "وہ مجسمہ میرے ہی ہاتھوں تباہ ہوا ہے۔"

"خدا کے بندے، یہ تم نے کیسی حرکت کر دی۔ تم کو اندازہ نہیں ہے کہ تم نے کتنا بڑا جرم کر دیا ہے۔ آخر کیوں؟"

"جناب! میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔ آپ جینیفر کو بلوا دیں۔ اس سے سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔"

"جینیفر؟" اطہر طلوئی نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔ "کون جینیفر؟"

"وہ لڑکی جس کے ساتھ میں پاکستان سے آیا تھا اور جو اپالو کے مندر میں میرے ساتھ تھی۔"

"وہاں تو تم اکیلے بے ہوش پڑے تھے۔ پولیس کا کہنا ہے کہ اگر تمہیں وقت پر طبی امداد نہیں ملتی تو تم مر چکے ہوتے۔"

"جناب! خدا کے لیے اس لڑکی کو تلاش کریں۔"

"تم یہ بتاؤ، تم کہاں ٹھہرے تھے؟"

میں نے ہوٹل کا نام بتاتے ہوئے کہا۔ "اگر وہ لڑکی مل جائے تو میری بے گناہی ثابت ہو جائے گی۔ کیونکہ یہ کام میں نے خود سے نہیں کیا بلکہ نادیدہ طاقتوں نے کروایا ہے۔"

"کون سی نادیدہ طاقتیں؟"

"میں آپ کو پوری کہانی سنا دوں گا صاحب! لیکن پہلے اس لڑکی کو تلاش کروا دیں۔"

ایک گھنٹے کے بعد مجھے یہ اطلاع دی گئی کہ ہوٹل کے کمرے سے میرا پاسپورٹ مل گیا ہے۔ میرا سوٹ کیس مل گیا ہے لیکن اس لڑکی کا کوئی پتا نہیں چلا ہے جو میرے ساتھ آئی تھی بلکہ ہوٹل والوں کا تو یہ کہنا ہے کہ میں ہوٹل میں اکیلا تھا۔ میرے ساتھ کوئی نہیں آیا تھا۔"

"اب شاید میں پاگل ہو جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "وہ لڑکی پاکستان سے میرے ساتھ آئی تھی۔ اس کا پتا لگ ہو گا۔ ایئرپورٹ پر اس کی انٹری ہو گی۔"

"یہاں کی پولیس میرے کہنے پر سب چھان بین کر

بچی ہے۔'' اطہر علوی نے بتایا۔'' ایسی کسی لڑکی کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ تم پاکستان سے اکیلے چلے تھے اور یہاں آ کر بھی اکیلے ہی رہے ہو۔''

''میں اب کچھ نہیں کہہ سکتا جناب۔ میں پاگل ہو گیا ہوں مجھے خواب دکھائی دیتے ہیں۔ جب اس لڑکی کا کوئی وجود نہیں ہے تو پھر رانا فراز کا بھی کوئی وجود نہیں ہوگا جس کی وجہ سے یہ کہانی شروع ہوئی ہے۔''

''کون رانا فراز! وہ سیاست داں؟''

''جی جناب! میں اسی کی بات کر رہا ہوں۔''

''انہوں نے تو کل رات خودکشی کر لی ہے۔'' اطہر علوی نے بتایا۔'' اسی وقت پاکستان سے یہ خبر آ گئی ہے۔''

''پھر تو میں اب کچھ نہیں کہہ سکتا جناب۔ اب کوئی ثبوت نہیں ہے میرے پاس۔''

''تم ایسا کرو، تم اپنی پوری داستان بتا دو۔ اس طرح تمہارے سنگین جرم کی شدت تو کم نہیں ہوگی لیکن اتنا ضرور ہو گا کہ تمہارے دل کا بوجھ کم ہو جائے گا۔''

میں خاموش رہا۔

اطہر علوی کے کہنے پر مجھے قلم اور کاغذ دے دیا گیا تھا۔ مجھے یہ پتا چلا تھا کہ میرے خلاف بہت غم اور غصہ پایا جاتا ہے۔ کیونکہ میں ایک تجارتی ادارے کی تباہی کا ذمے دار تھا اس لیے اسپتال میں بھی مجھے سخت حفاظت میں رکھا گیا تھا کہ کوئی مجھے نقصان نہ پہنچا سکے۔

میں نے یہ دیکھا کہ میرے اس سنگین جرم کے باوجود ڈاکٹرز اور نرسوں کا رویہ میرے ساتھ بہت ہمدردانہ تھا۔ وہ ہر طرح میرا خیال رکھ رہے تھے۔

میں نے خود پر گزرنے والی داستان لکھنا شروع کر دی۔

دوسرے دن اطہر علوی میری خیریت معلوم کرنے آئے۔

میں دن بھر لکھتا رہا تھا اور رات کے وقت جینیفر میرے پاس آ گئی۔ نہ جانے کس طرح۔ میں اس وقت سویا ہوا تھا۔ جب کسی نے آہستگی سے مجھے جگا دیا۔ میں نے آنکھیں کھولیں۔ جینیفر میرے سامنے کھڑی تھی۔

''تم...!'' میں نے اٹھنے کی کوشش کی۔

''لیٹے رہو۔'' اس نے میرے شانوں پر ہاتھ رکھ کر مجھے لٹا دیا۔'' ابھی بہت کمزور ہو۔''

''جینی! یہ سب کیا ہوا ہے میرے ساتھ؟'' میں نے کہا۔'' یہ کیا تماشا ہے۔ تم کہاں غائب ہو گئی تھیں؟''

''میں تمہیں صرف یہ بتانے آئی ہوں شاہد حیات کہ میرا کوئی وجود نہیں ہے۔ میں صرف ایک پرچھائیں ہوں۔ جس طرح رانا فراز بالکو کی پرچھائیں بن کر زندگی گزار رہا تھا اسی طرح میں بھی ایزرلیس کی خادمہ اول ایک پرچھائیں ہوں۔''

''ایزرلیس کی خادمہ۔''

''ہاں، میں اس دیوی کی خادمہ تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''جب بالکو دیوی کی زندگی میں ایک رات کے لیے آیا تو میں خود اس فانی انسان کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔ میں نے تمہیں ایک کہانی سنائی تھی کہ اسے وصال کے بعد ایک لڑکی کو نجات ملے گی۔''

''ہاں، تم نے بتایا تھا۔''

''تو وہ لڑکی میں ہی تھی۔ مجھے اس بات کی سزا ملی تھی کہ میں نے ایزرلیس کے محبوب کو اپنا محبوب سمجھا پھر مجھے جینیفر بن کر رانا فراز کے ساتھ اس دنیا میں واپس آنا پڑا۔ اس دوران میں رانا فراز کو یہ معلوم ہو گیا کہ اس کی دیوی ایزرلیس انسانی روپ میں اکھنز میں موجود ہے۔ تو اس نے تمہیں دیکھا اور تمہیں اس کام کے لیے یہاں بھیج دیا۔''

''لیکن مجھے یاد ہے کہ اس نے مجسمے کو توڑنے کے لیے نہیں کہا تھا۔''

''وہ تو میں نے جان بوجھ کر تڑوایا ہے۔'' جینیفر ہنس پڑی۔'' تاکہ ایزرلیس دوبارہ اس دنیا میں نہ آ سکے اور بالکو کو میں اپنی محبت کا یقین دلا کر اسے اپنا بنا سکوں لیکن پھر بھی نہیں ہوا۔ ادھر تم نے ایزرلیس کے مجسمے کو توڑا اور اس طرف بالکو نے خودکشی کر لی۔ اب وہ دونوں پھر ایک دوسرے کے ساتھ ہیں اور میں پہلے کی طرح اکیلی رہ گئی ہوں۔ لیکن... میں پھر جا رہی ہوں ان کے پاس۔ دیکھتی ہوں، میری قسمت میں ناکامیاں کہاں تک لکھی ہیں۔''

''جینیفر! تم... تم نہ جاؤ۔'' میں نے کہا۔'' میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔''

''میں تو صرف ایک پرچھائیں ہوں اور پرچھائیوں کے ساتھ زندگی نہیں گزاری جاتی۔ میں جا رہی ہوں۔ دیوتا تمہاری حفاظت کریں۔'' اور وہ چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

میں اطہر علوی ہوں۔

شاہد حیات نے اپنی یہ کہانی لکھ کر میرے حوالے کر دی تھی۔ میں اسے پڑھتا رہا سوچتا رہا کہ کیا آج بھی اس قسم کے واقعات رونما ہو سکتے ہیں۔

کیا ہماری اس روشن دنیا کے اس پار کوئی اور بھی دنیا ہے۔ پُراسرار... نہ سمجھ میں آنے والی۔

معمّا

روبینہ رشید

زندگی حادثات... واقعات اور اتفاقات کا مجموعہ ہے... ایک واقعہ ایسی صورت اختیار کرلیتا ہے جیسے شطرنج کی بساط... ایسا لگتا ہے کہ یہ ہمارا مطلوبہ ہدف ہے... مگر بساط پر بچھے مہرے ہر دفعہ ایک نئی راہ سجھا دیتے ہیں... کبھی بالکل سیدھی... کبھی انتہائی پیچیدہ تر... کچھ ایسی ہی صورتِ حال کا منظر نامہ... قتل کی واردات رونما ہوئی وقت کا کارواں آگے ہی بڑھتا جارہا تھا... ہر شخص مشکوک تھا... مگر قاتل کون تھا... یہ سوال معمّا ہی بنتا جارہا تھا۔ خوف... وحشت اور بدحواسی کی بڑھتی سنگینیوں کا احوال...

موسم اچانک ہی نہایت خوشگوار ہوگیا تھا۔

ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آسمان پر چھائے بادلوں کو گویا چھیڑتے ہوئے گزر رہے تھے۔ خسرو یہ شام ثنا کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔ یہ اس کا پسندیدہ موسم تھا۔ یوں بھی گزشتہ کئی رتوں سے کام کی زیادتی کی وجہ سے وہ قدرے تاخیر سے گھر جارہا تھا۔ ثنا کی آنکھیں اس دوران میں کئی احتجاجی نوٹس پیش کر چکی تھیں۔ سو اس نے آج ثنا کو سرپرائز دینے کی پوری تیاری کرلی تھی۔

وہ اپنے تمام کام نمٹا چکا تھا اور جو نمٹنے والے نہیں تھے، انہیں ''انتظار فرمایئے'' کا ٹیگ لگا کر کل کے نام کر رہا تھا۔

اس دوران وہ دل ہی دل میں پورا پروگرام بھی ترتیب دے چکا تھا۔ تقریباً سات بجے تک گھر میں انٹری، اس کے بعد ساحلِ سمندر پر روانگی، کچھ دیر وہاں گزار کر ثنا کے پسندیدہ ریسٹورنٹ میں ڈنر اور پھر واپس گھر... مگر عین اس وقت جب وہ اپنی کرسی سے کھڑا ہوا ہی تھا کہ نادر نے اس کے کیبن میں قدم رنجہ فرمایا۔ نادر کو آتا دیکھ کر خسرو نے ٹھنڈی سانس لی اور دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

نادر طویل القامت اور روبیلے اسمارٹ جسم کا مالک تھا۔ اس کی شخصیت تکبر مزاجی کے باوجود نہایت پرکشش اور دبنگ تھی۔ وہ شہر کے چند ممتاز لا فرمز میں سے ایک کا مالک تھا۔ خاندانی اور کاروباری معاملات میں اکثر سینئرز وکلا بھی اس کی مہارت کا لوہا مانتے تھے۔

خسرو خود بھی ایک کامیاب وکیل تھا اور نادر کے ساتھ پارٹنر کے طور پر چھ سال سے کام کر رہا تھا۔ شروع میں یہ اس کی مجبوری تھی کیونکہ ثنا سے شادی کے لیے یہ نادر کی واحد شرط تھی۔ ثنا، نادر کی اکلوتی بہن تھی۔ والدین کے انتقال کے وقت اس کی عمر صرف نو سال تھی جبکہ نادر اس سے سولہ سال بڑا تھا۔

خسرو جانتا تھا کہ نادر نے اسے کبھی دل سے پسند نہیں کیا مگر اب چھ سال گزر جانے کے بعد وہ نادر کی ضرورت بن چکا تھا۔ خود خسرو کو بھی اپنا کام پسند تھا... یوں یہ گاڑی چل رہی تھی۔

''کیا بات ہے؟ بڑی جلدی فارغ ہو گئے۔ لگتا ہے کہ کام کم ہے تمہارے پاس؟'' وہ اپنے مخصوص خشک انداز میں بولا۔

''کام تو ہے مگر آج ذرا جلدی گھر پہنچنے کا ارادہ ہے۔''

''ٹھیک ہے، پلیز یہ لفافہ نازلی کے گھر پہنچاتے ہوئے چلے جاؤ۔'' وہ براؤن لفافہ خسرو کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

جمشید علی خان اور ان کی بیگم نازلی جمشید نہ صرف کمپنی کے پرانے کلائنٹس تھے بلکہ وہ نادر اور ثنا کے خاندانی دوستوں میں سے تھے۔ جمشید کے والد اور نادر کے والد بچپن کے ساتھی رہے تھے۔ جمشید علی خان کا شمار اچھے متمول خاندانوں میں ہوتا تھا اور ان کا گھر شہر کے امرا کے قدیمی علاقے میں تھا۔ وہاں سے ہوتے ہوئے گھر جانے کا مطلب ایک گھنٹے کی ڈرائیو سے کم نہیں تھا۔

''ان کے گھر... اور اس وقت...؟'' خسرو نے اسے گھورا۔

''خسرو، یہ اہم ہے۔ اس لفافے کا آج اس کے ہاتھ میں پہنچنا ضروری ہے۔'' ''کیوں؟'' ''یہ میں نہیں جانتا مگر یہ اس کا آرڈر ہے بلکہ میرا خیال ہے تم اس پر ایک نظر ڈال لو۔'' اس نے لفافہ کھول کر اندر موجود کاغذات اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

ابتدائی صفحے نے ہی خسرو کو چونکا دیا۔ اس نے حیرت زدہ ہو کر نادر کی طرف دیکھا جس کے جواب میں وہ کندھے اچکا کر رہ گیا۔ اس نے بقیہ صفحات پر سرسری نظر ڈال کر انہیں دوبارہ احتیاط سے لفافے میں رکھا۔

''دیکھ لیا تم نے... اس کے لیے وکیل خاص طور پر آئی تھی۔ یہ ذمے داری کا کام ہے اور وہ دونوں میاں بیوی تمہیں پسند بھی کرتے ہیں اس لیے میں چاہتا ہوں کہ یہ تم ہی اس تک پہنچاؤ۔''

اس بار وہ قدرے نرمی سے بولا مگر اس کی آنکھوں سے جھلکتا تحکمانہ رنگ اور گردن کا سریا اسی طرح برقرار تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' خسرو چند لمحوں بعد بولا۔ ''یہ میں اسے دیتا ہوا چلا جاؤں گا۔''

''شکریہ۔'' نادر تیزی سے مڑا اور مزید کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔

☆☆☆

وہ جمشید علی خان کی رہائش گاہ پر پہنچا تب تک ہلکی ہلکی پھوار شروع ہو چکی تھی۔ کئی بارن بجنے کے باوجود بھی جب ان کے چوکیدار کی جھلک تک نظر نہیں آئی تو وہ جھنجلاتا ہوا گاڑی سے اترا۔ اس نے گیٹ کو زور سے تھپتھپانا چاہا مگر لوہے کا چھوٹا دروازہ ہاتھ لگتے ہی کھلتا چلا گیا۔ اس نے اندر آ کر چوکیدار کو آواز دی۔ کوئی جواب نہ ملنے پر پھر باہر آیا، گاڑی سے لفافہ نکال کر تیزی سے اندر کی جانب چل پڑا۔

لکڑی کا بڑا سا منقش اندرونی دروازہ بھی کھلا ہوا تھا وہ جھجکتا ہوا اندر داخل ہوا۔

''سلمیٰ... سلمیٰ بی بی!'' خسرو نے نازلی جمشید کی پرانی ملازمہ کو آواز دی مگر اس کی پکار صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔ خوب صورتی سے سجا کمرا نہایت خاموش تھا۔ وہ ان چھ سالوں میں سیکڑوں بار اس گھر میں آیا تھا مگر آج نہ جانے کیوں سب کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ نازلی اتنی بے پروا ہرگز نہیں تھی۔ وہ لاؤنج سے گزر کر اندرونی کمرے میں داخل ہوا اور پھر ٹھٹک کر ساکت ہو گیا۔

نازلی صوفوں کے درمیان قیمتی قالین پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کا خوب صورت چہرہ دہشت اور تکلیف سے مسخ ہو رہا تھا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور زبان باہر نکلی ہوئی تھی۔ گردن پر سیاہی مائل جامنی رنگ کی دھاریاں دور سے نظر آ رہی تھیں۔

خسرو کو کئی لمحوں تک اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا پھر وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ اس نے نازلی کی نازک کلائی کو پکڑا اور پھر مایوسی سے چھوڑ دیا۔ وہ مر چکی تھی۔

وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر اس نے سامنے موجود فون سے پولیس کا نمبر ملایا۔ خسرو فون رکھ کر مڑا تب اس کی نظر کافی ٹیبل پر رکھی ۔ نازلی کی تصویر پر پڑی۔ وہ ایک خوب صورت پورٹریٹ تھا جس میں نازلی زندگی سے بھرپور اور نہایت خوب صورت نظر آرہی تھی۔ وہ پہلے بھی اس تصویر کو کئی مرتبہ جمشید کی اسٹڈی میں دیکھ چکا تھا۔ اب وہ یہاں میز پر پڑی تھی اور کسی نے تیز دھار چھری یا چاقو سے اس کی آنکھیں نکال دی تھیں۔ یہ ایک دہشت ناک منظر تھا۔ اس نے پلٹ کر قالین پر پڑی نازلی کو دیکھا پھر اس کی نظر اس تصویر پر پڑی... اسے یکلخت چکر سا آگیا اور وہ برابر میں رکھے صوفے پر ڈھے گیا۔

چند لمحوں بعد کسی خیال نے اسے کھڑا ہونے کی سکت دی۔ اس نے نادر کا بھیجا ہوا لفافہ زمین سے اٹھایا اور نازلی اور اس کی تصویر کی جانب دیکھے بغیر کمرے سے نکل گیا۔ اس کا رخ اپنی کار کی طرف تھا۔ اس وقت یہاں سے جانے کا تصور بھی ناممکن تھا مگر وہ اس لفافے کو فی الحال پولیس کی نظر میں نہیں لانا چاہ رہا تھا۔ اس لیے اس نے اسے اپنی سیٹ کے نیچے رکھ دیا اور خود گاڑی سے ٹیک لگا کر پولیس کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ اس کا ذہن سوچوں کے بھنور میں ہچکولے کھا رہا تھا۔

☆☆☆

ثنا سے اس کی شادی ہونے میں نازلی جمشید کا اہم کردار تھا۔ ثنا نے اپنے رشتے داروں اور جاننے والوں میں سب سے پہلے خسرو کو نازلی سے ہی ملوایا تھا۔ اس ملاقات کے امتحان میں پاس ہونے اور اس کی پسندیدگی کی سند حاصل کرنے کے بعد جمشید اور پھر نادر سے اس کی ملاقات کا اہتمام کیا گیا تھا۔

نادر نے پہلی ملاقات کے بعد ہی نادر شاہی حکم کے تحت اسے مسترد کردیا تھا۔ اس کے خیال میں وہ اس کی بہن کے لیے موزوں نہیں تھا۔ یہ نازلی ہی تھی جس نے اسے سمجھایا، ثنا کے جذبات سے آگاہ کیا، ممکنہ نتائج پر روشنی ڈالی اور بالآخر اسے راضی کر ہی لیا۔ اگرچہ اس کے بعد بھی سب کچھ بہت آسان نہیں تھا مگر نازلی کی موجودگی کے بغیر شاید یہ سب اس طرح ممکن نہ ہوتا۔

خسرو ان دنوں نیا نیا بیرسٹری پڑھ کر لوٹا تھا۔ بابا اور اماں اس کے لندن جانے کے کچھ عرصے بعد یکے بعد دیگرے اللہ کی رحمت میں چلے گئے تھے۔ اماں کے انتقال پر... آیا تو وہ یہیں رکنا چاہتا تھا مگر بابا کی خواہش کے احترام میں تعلیم مکمل کرنے واپس جانا پڑا۔ یہ بھی اس کے بابا ہی کی خواہش تھی کہ وہ پڑھ لکھ کر واپس اپنے ملک میں ہی کام کرنا ہے۔ خسرو ان سے دیوانہ وار محبت کرتا تھا یوں وہ لندن میں اچھے خاصے روشن امکانات کو ٹھکرا کر لوٹ آیا تھا اور ان دنوں کام کی ابتدا کی پلاننگ میں مصروف تھا جب ایک اتفاق نے اسے ثنا سے ملا یا بلکہ ٹکرا دیا... دل کی لگی سچی ہو تو منزل آسان ہوتی چلی گئی۔

ثنا کی طرف سے سب کچھ نازلی نے ہی کیا تھا اور اب وہ خود... اس سے آگے اس سے سوچا نہیں گیا۔ ثنا تک

یہ خبر پہنچانا آسان نہیں تھا۔ اس نے [illegible] سوچا۔ خسرو جورشی کی گرانی کی جلد اس نے دوسرا سگریٹ سلگا لیا۔

اسی وقت سائرن کی آواز اور دور سے قریب آتی روشنی نے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ پہلی پولیس کار پہنچ چکی تھی۔

کار کے رکتے ہی اس میں سے ایک قدرے جوان اور دبلا پتلا آفیسر نکلا اور تیزی سے گھر کے اندر چلا گیا جبکہ دوسرا گاڑی بند کر کے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"کیا ہوا تھا؟" اس نے کاروباری بےزاری سے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" خسرو نے اسی انداز میں جواب دیا۔

"اچھا۔" اس نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "مگر لاش آپ نے دریافت کی ہے نا؟"

"جی... صرف دریافت کی ہے۔ میں صرف پندرہ منٹ پہلے یہاں پہنچا تھا۔ مسز جمشید ہماری کلائنٹ تھیں، میں ان کا وکیل ہوں۔" اس نے جیب سے کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے آپ اندر چلیں۔ ابھی ایس پی صاحب آ رہے ہیں۔" وہ نرمی سے بولا۔

تھوڑی دیر میں دوسری پولیس پارٹی بھی پہنچ گئی۔ خسرو بیرونی کمرے میں موجود صوفے پر اس طرح بیٹھ گیا کہ اسے اندر موجود نازلی کی لاش یا تصویر نظر نہ آ سکے، ہاں اس کے کانوں میں پولیس والوں کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔

"اوہو... ذرا اس تصویر کو دیکھو۔" یہ غالباً نوجوان پولیس افسر کی آواز تھی۔

"لگتا ہے کہ ہمیں کسی سائیکو قاتل سے پالا پڑنے والا ہے ورنہ عام طور پر کوئی اس قسم کی حرکتیں نہیں کرتا۔" دوسرا انسپکٹر بولا۔ "یہ اس لیے زیادہ خطرناک ہے کہ اس قسم کے قاتل ایک قتل پر اکتفا نہیں کرتے۔"

دروازہ پھر کھلا۔ اس بار علاقے کا ایس پی پولیس ٹیم کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ ایمبولینس اور فرانسک والے اس کے پیچھے تھے۔ وہ سب اپنی کارروائیوں میں مصروف ہو گئے کچھ دیر بعد ایس پی اس کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔

وہ ایک درمیانی قامت اور مضبوط جسامت کا خوش شکل انسان تھا۔ اس کی تیز نگاہیں خسرو پر جمی ہوئی تھیں۔

"تو آپ مقتولہ کے وکیل ہیں؟" اس نے اس انداز میں پوچھا جیسے اس سارے حادثے کی وجہ بھی ہو۔

"جی۔" خسرو بولا۔ اسے پانی کی شدید ضرورت

"مسز جمشید سے آپ کی ملاقات پہلے سے طے تھی؟"

"نہیں، میں دفتر سے گھر جاتے ہوئے تھوڑی دیر کے لیے ان کی طرف آیا تھا۔"

"اوہ... اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں آپ کی آمد کا علم نہیں تھا؟"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا، دراصل انہوں نے کل میرے پارٹنر سے ملاقات کی تھی۔"

"اور آپ نے نکلتے ہوئے انہیں فون کرنا ضروری نہیں سمجھا؟" اس نے ایک ابرو اچکائی۔

"نہیں، جمشید فیملی صرف کلائنٹ نہیں دوست بھی ہیں۔"

"آپ کی آمد کی وجہ کیا تھی؟"

"کچھ گفتگو کرنی تھی۔"

"اور کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ کس بابت میں؟" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

"ایس پی صاحب! یہ میری کلائنٹ کا ذاتی معاملہ ہے، میں نہیں سمجھتا کہ مجھے آپ سے اسے ڈسکس کرنا چاہیے۔" خسرو نے نرمی سے جواب دیا۔

"مگر آپ کی کلائنٹ مر چکی ہے اور وہ بھی غیر طبعی موت ایک دردناک قتل کی صورت میں..."

"میں صرف ان کا نہیں پورے جمشید خاندان کا وکیل ہوں۔"

"یعنی۔"

"یعنی ان کے شوہر جمشید علی خان کا بھی۔"

"ہوں، آپ ان کے دوست ہیں۔" اس کی آنکھیں سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں اور انگلیاں صوفے پر بے آواز انداز میں متحرک رہی تھیں۔

"دوست اور وکیل۔" اس نے تصحیح کی۔

"تو آپ کا دوست اور کلائنٹ اس وقت کہاں ہے بیرسٹر صاحب؟" اس نے سرد آواز میں پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" خسرو بے اختیار بولا۔ ایس پی کے سوال نے یک دم اسے جمشید کی طرف سے متفکر کر دیا تھا۔ وہ اتنی دیر سے اس کے بارے میں سوچ ہی نہیں پایا تھا۔ جو وہ سوچ رہا تھا اگر وہ درست تھا تو پھر اس کی جان کو بھی خطرہ ہو سکتا تھا۔ خسرو بے کلی سے کھڑا ہو گیا۔

''کیا ہوا خسرو صاحب؟'' ایس پی اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔

''میری کار کی اگلی سیٹ کے نیچے ایک براؤن لفافہ ہے، کیا آپ اسے منگوا سکتے ہیں؟''

''ضرور۔'' وہ بولا اور اس نے مڑ کر پیچھے کھڑے انسپکٹر کی جانب دیکھا۔ انسپکٹر اشارہ پاتے ہی کمرے سے نکل گیا۔

''تو آپ کے خیال میں یہ سب اس نے کیا ہے؟'' اس کے جانے کے بعد ایس پی نے پوچھا۔

''محترم ایس پی۔'' خسرو نے اس کی وردی پر لگی نیم پلیٹ کو دیکھا پھر بولا۔ ''پرویز احمد صاحب آپ اندازے لگانے کے بجائے ان کاغذات کو دیکھ لیجیے تو بہتر ہے۔''

انسپکٹر اتنی دیر میں لفافہ لے آیا تھا۔ ایس پی چند لمحے ان کی پڑتال میں مصروف رہا۔

''تو اب اس کہانی میں ایک بیٹا بھی داخل ہو گیا ہے۔'' اس نے گویا خود سے پوچھا۔

''ہاں... جمشید۔''

''وہ یہاں رہتا ہے؟''

''نہیں، وہ الگ رہتا ہے۔''

''اس کی عمر؟''

''تقریباً تیس سال۔''

''کام اور رہائش؟''

''کوئی کاروبار کرتا ہے شاید امپورٹ ایکسپورٹ۔ اس کا پتا یہاں سے مل جائے گا۔''

''ہوں، ہمیں فوراً اس تک پہنچنا ہوگا۔'' وہ بڑبڑایا پھر خسرو کی جانب مڑا۔ ''آپ نے اپنے پارٹنر کا ذکر کیا تھا، کون ہے وہ؟''

''نادر مصطفیٰ... وہ میرا سالا بھی ہے۔''

''انہیں یہاں آنے کو کہیے۔'' وہ بولا اور اندرونی کمرے کی جانب چل دیا۔

☆☆☆

نادر پلکیں جھپکائے بغیر نازلی جمشید کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے اردگرد پولیس کا عملہ جمع تھا۔ قریب ہی اسٹریچر موجود تھا۔

''نادر صاحب۔'' بالآخر ایس پی پرویز نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ نادر اس کی جانب مڑا۔ اس کا چہرہ بالکل بے تاثر ہو رہا تھا مگر اس کی آنکھیں اندرونی کرب کا پتا دے رہی تھیں۔

زود عمری

ایک اخباری نمائندہ بوڑھوں کے لیے بنائے گئے ریٹائرمنٹ ہوم میں ان کی طویل عمری کا راز معلوم کرنے پہنچا۔ اس ریٹائرمنٹ میں سفید بالوں اور جھکی کمر والے بوڑھے رہتے تھے۔ ان کے چہروں سے ان کی طویل عمری ظاہر ہوتی تھی۔ نمائندے نے ایک بوڑھے سے جس کے چہرے پر بے شمار جھریاں تھیں، بال سفید تھے اور ہاتھوں پیروں میں اس قدر رعشہ تھا کہ پورا جسم کانپتا محسوس ہوتا تھا، سوال کیا۔

''جناب! کیا آپ بتائیں گے کہ آپ کے مشاغل کیا تھے؟''

بڑے میاں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''مجھے سگریٹ نوشی، شراب نوشی اور شب بیداری سے بہت دلچسپی تھی۔ روزانہ تقریباً ساٹھ سگریٹ پیتا تھا، چائے بھی بہت پیتا تھا اور شراب کا تو ذکر کرنا ہی بے کار ہے، جوا بھی اتنا کھیلتا تھا کہ بعض اوقات صبح ہو جاتی تھی۔''

نمائندے نے حیرت سے پوچھا۔ ''خوب! اب آپ کی عمر کتنی ہے؟''

بڑے میاں نے سر جھکا کر جواب دیا۔ ''چھبیس سال۔''

سحرش افضل، مرتضیٰ

''نادر صاحب! آپ ان کاغذات کو پہچانتے ہیں؟'' انسپکٹر نے لفافہ اس کے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا۔

''اس وقت میں صرف یہ جانتا ہوں کہ کمرے میں ہماری پرانی دوست کی لاش پڑی ہے جسے وحشیانہ انداز میں قتل کر دیا گیا ہے۔'' وہ بھاری لہجے میں بولا۔

''میں سمجھتا ہوں اور مجھے اس کا افسوس ہے مگر قاتل نے جو انداز اختیار کیا ہے اس سے ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ آپ کے کسی اور دوست کو بھی نشانہ بنانے گا اس لیے تحقیقات کا آگے بڑھنا ضروری ہے۔'' ایس پی سنجیدگی سے بولا۔ ''آپ خود وکیل ہیں اور ہماری مجبوری بھی بخوبی سمجھتے ہیں۔''

''میں جانتا ہوں۔'' نادر گہری سانس لے کر بولا۔

''اور مجھے بات کرنے میں کوئی اعتراض بھی نہیں ہے مگر کیا اس سے قبل میں خسرو صاحب سے چند لمحے بات کر سکتا ہوں

اکیلے میں؟''

ایس پی کو اس کی اس فرمائش پر خاصا اعتراض تھا مگر اس نے طوعاً کرہاً اجازت دے دی۔

''تم نے اسے وصیت کے کاغذ کیوں دکھائے؟'' گاڑی کے پاس پہنچتے ہی وہ غرایا۔

''جمشید غائب ہے اس لیے۔'' خسرو نے اسے گھورا۔

''تو کیا تمہارے خیال میں وہ قاتل ہے؟''

''نہیں مگر یہ احمق ایس پی یہی سمجھ رہا ہے۔ ابتدائی تفتیش یہ ثابت کر رہی ہے کہ قاتل کوئی جان پہچان کا شخص ہے جو بھی آیا نازلی کی اجازت سے اندر آیا تھا۔''

''کیا... جنید؟''

''ہو سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا۔'' خسرو نے کندھے اچکائے۔

''مجھے اس سے کوئی ہمدردی نہیں ہے مگر تم نے ان کے خاندانی معاملات کے اچھلنے کا انتظام کر دیا ہے۔'' وہ بولا۔

''یہ ضروری تھا۔ مجھے خطرہ ہے کہ اگر جنید نے ہی یہ سب کیا ہے اور اس کی وجہ وصیت ہے تو شاید وہ جمشید کو بھی قتل نہ کر دے۔ اسے روکنے کے لیے حقیقت کا سامنے آنا ضروری تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ پولیس کا پہلا شک بھی جمشید پر ہی جا رہا تھا...''

''چپ رہو۔'' نادر اس کو دیکھتے ہوئے بولا۔ وہ پولیس والے گیٹ سے باہر نکل رہے تھے۔

''تم نے انہیں اور کچھ بتایا ہے؟'' اس نے ان کے نکل جانے کے بعد دھیرے سے پوچھا۔

''نہیں۔'' خسرو بولا۔

''چلو پھر اندر چلتے ہیں۔ ویسے بھی اب بحث کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ یہ سب ہو چکا ہے۔ ثنا کو بتا دیا ہے؟''

''نہیں، میں اسے گھر جا کر بتاؤں گا۔'' خسرو بولا۔

''اس کے لیے اسے برداشت کرنا آسان نہیں ہوگا۔''

''ہاں یہ تو ہے، وہ بچپن سے ہی نازلی سے بہت اٹیچڈ رہی ہے۔''

وہ دونوں کمرے میں داخل ہوئے تب چادر سے ڈھکا اسٹریچر باہر لے جایا جا رہا تھا۔ نادر اسے دیکھ کر ٹھٹک کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ خسرو نے اسے حیرت سے دیکھا تو وہ خود کو سنبھالتے ہوئے صوفے پر جا بیٹھا۔

''اب آپ بیان دینے کے لیے تیار ہیں؟'' ایس پی ان کا منتظر تھا۔

''جی ہاں... ویسے بتانے کے لیے بہت لمبی تفصیل ہے بھی نہیں... مسز جمشید کل شام تین بجے میرے دفتر آئی تھیں۔ آپ میری اسسٹنٹ سے وقت کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ وہ اپنی وصیت بدلنا چاہتی تھیں۔'' نادر کی آواز میں اداسی گھلی ہوئی تھی۔ ''ان کی پچھلی وصیت میں ان کے شوہر اور بیٹے کو برابر کا حصہ ملتا تھا مگر اب وہ سب کچھ اپنے شوہر کے نام کرنا چاہتی تھیں۔ بحیثیت وکیل میں نے ان سے پوچھا کہ کیا انہوں نے اس بارے میں اپنے شوہر کو بتایا ہے۔ ان کے انکار پر میں نے انہیں اس کا مشورہ دیا مگر ان کا جواب یہ تھا کہ یہ دولت ان کی اپنی ہے۔''

''اپنی سے کیا مطلب؟'' ایس پی نے پوچھا۔

''دراصل یہ سب انہیں اپنے والد سے ملا تھا۔ جج شفیق احمد... شاید آپ نے ان کا نام سنا ہو۔''

''وہی... جو سخت فیصلوں کی وجہ سے خبروں میں آتے رہے تھے؟''

''جی ہاں... مسز جمشید کافی جذباتی ہو رہی تھیں اور انہوں نے مجھے اگلے روز تک ہر صورت وصیت تیار کرا کر بھیجنے کی سختی سے ہدایت کی تھی۔ اس میں بہت زیادہ کام بھی نہیں تھا سو ان کے جانے کے بعد میں نے اپنی اسسٹنٹ مس سحرش کو یہ کام دے دیا اور شام کو خسرو اسے لے کر نازلی کے گھر پہنچے۔ اس کے بعد جو ہوا وہ آپ جانتے ہیں۔''

نادر اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ اس سے قبل کہ ایس پی کچھ کہتا کمرے کا دروازہ دھڑام سے کھلا اور جمشید کمرے میں داخل ہوا۔

وہ درمیانے قد و قامت کا مالک تھا۔ اس وقت اس کی حالت تباہ تھی، اس کا پورا جسم کپکپا رہا تھا۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

''جمشید...'' نادر اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

''یہ... یہ... سب کیا ہو گیا نادر؟'' اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

''خود کو سنبھالو۔'' نادر اس کی طرف بڑھا اور اس سے پہلے کہ ایس پی یا خسرو کچھ کہہ پاتے وہ اسے تھامے اسٹڈی میں گھس گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اکیلا باہر آیا تھا۔

''جمشید اس وقت بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں

ہے، میں نے ڈاکٹرز کو بلوایا ہے۔ ایس پی صاحب! میرا خیال ہے کہ اس کے بیان کے لیے آپ کو صبح کا انتظار کرنا پڑے گا اور میں امید کرتا ہوں کہ یہ کوئی میڈیا ایونٹ نہیں بن سکے گا۔"

"کیا اب آپ مجھے میرا کام سکھائیں گے؟" اس نے چڑ کر پوچھا۔ یقینی طور پر اسے یہ سب بالکل پسند نہیں آیا تھا مگر مقابل شہر کا ایک بڑا وکیل تھا اور گاؤ ایک ممتاز جیکار... اس کے پاس اس تجویز کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی اور چارہ نہیں تھا۔

☆☆☆

خسرو گھر پہنچنے ہی والا تھا۔

وہ عجیب خالی الذہنی کی کیفیت میں ڈرائیو کر رہا تھا۔ مادر نے جمشید کے سو جانے تک وہیں رکنے کا فیصلہ کیا تھا۔ خسرو کو ثنا کی فکر تھی اس لیے وہ بنگلے آیا تھا۔ اچانک موبائل کی بیل نے اسے چونکا دیا۔ اسکرین پر ثنا کی تصویر جگمگا رہی تھی، اس نے فون ریسیو کرنے کا سوچا مگر پھر ارادہ ملتوی کر رہا۔ پارکنگ میں گاڑی لگا کر وہ تیز تیز قدموں سے گھر کی طرف بڑھا۔

پہلی ہی بیل پر دروازہ کھل گیا جیسے وہ وہیں کھڑی اس کا انتظار کر رہی ہو۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں بالکل خشک اور خالی خالی لگ رہی تھیں۔

"ثنا!" خسرو نے گھبرا کر اسے تھام لیا۔

"نازلی آپا کے ساتھ یہ کیا ہو گیا خسرو؟" وہ سسک پڑی، گویا وہ سب جان چکی تھی۔ خسرو نے گہری سانس لی، اندر لاؤنج سے ٹی وی پر بریکنگ نیوز کی آواز گونج رہی تھی۔

"خود کو سنبھالو ثنا... یہ زندگی ہے یہاں کسی کے ساتھ کبھی بھی کچھ ہو سکتا ہے۔" وہ اسے کرسی پر بٹھاتے ہوئے بولا۔

"مگر اس طرح..." وہ بڑبڑائی۔ "یہ جمشید ہی کر سکتا ہے، وہی... وہی ہے یہ۔"

"پلیز ثنا۔" خسرو نے کچھ کہنا چاہا مگر اس نے اس کی بات کاٹ دی۔

"وہ پاگل ہے آدھا... جنونی... وہ نفرت کرتا تھا ان دونوں سے..." وہ زور سے بولی۔ "ٹی وی پر بتا رہے ہیں کہ جس نے بھی ان کا قتل کیا ہے وہ اور قتل بھی کر سکتا ہے، خسرو مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔"

"تم کو ذرا بھی ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے ثنا۔" "ضرورت ہے، وہ نازلی آپا سے نفرت کرتا تھا، جمشید بھائی سے بھی اور مجھ سے بھی..." وہ بولی۔

"کیوں؟ تم سے کیوں...؟" خسرو کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"کیونکہ پہلے وہ سمجھتا تھا کہ نازلی آپا مجھے زیادہ چاہتی ہیں اور پھر..." وہ یک دم خاموش ہو گئی۔

"پھر کیا... بولو ثنا..." خسرو نے اس کا کندھا ہلایا مگر وہ چپ ہی رہی۔ اس کا چہرہ مزید زرد ہو گیا۔

"کیا کوئی ایسی بات ہے جو تم مجھے نہیں بتانا چاہتیں؟" خسرو نے نرمی سے پوچھا۔

"نہیں..." وہ بالآخر بولی۔ "میں بتانا چاہتی ہوں، اس نے مجھے ایک دن بہانے سے بلایا اور کہا کہ وہ مجھ سے شادی کرے گا۔ میرے انکار پر وہ پاگل سا ہو گیا تھا۔ میں بمشکل وہاں سے بھاگنے میں کامیاب ہو پائی تھی ورنہ خدا جانے کیا ہو جاتا۔" وہ لرز کر بولی۔ "میں نے سب کچھ بھائی جان کو بتا دیا تھا۔ انہوں نے جمشید بھائی سے بات کی تھی تب ہی اسے ہاسٹل شفٹ کر دیا گیا تھا۔ وہ اسی طرح مسائل کھڑے کرتا رہتا تھا۔ بعد میں کسی تقریب میں یا جب بھی میرا اس کا سامنا ہوتا وہ مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورتا رہتا تھا۔" وہ دھیرے دھیرے بولی۔ "میں جانتی ہوں کہ وہ مجھ سے بہت نفرت کرتا ہے۔"

"اوکے... مان لیا مگر ابھی تو یہ بھی طے نہیں ہوا کہ نازلی آپا کو اس نے قتل کیا ہے وہ اس کی ماں تھیں یار۔" خسرو ماحول کو ہلکا کرنے کے لیے نارمل انداز میں بولا۔

"پھر بھی... مجھے یہ اسی کا کام لگتا ہے۔"

"اچھا فی الحال تم یہ سب پولیس پر چھوڑ دو اور خود کو سنبھالو۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں اب آرام کرنا چاہیے صبح بہت کچھ کرنا ہو گا۔ نازلی آپا جا چکی ہیں مگر جمشید کو مشکلات سے بچانا ضروری ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اس سب میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔" وہ بولا۔

"سو فیصد... وہ نازلی آپا تو کیا کسی کو بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔" ثنا نے سر ہلایا۔

وہ رات نیند کے دریا میں ڈوبتے تیرتے گزر گئی۔ صبح خسرو کی آنکھ ثنا کی آواز سے کھلی۔

"کک... کیا ہوا؟" وہ چونک کر کھڑا ہی ہو گیا۔

"کچھ نہیں۔" ثنا پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔ "تمہاری چائے اور میں..."

"میں ہمیشہ صبح اٹھتے ہی تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

خسرو بھی مسکرایا۔ ”شکر ہے کہ تم اب بہتر ہو۔“

”ہاں، آ جاؤ ناشتا تیار ہے، تم نے کل سے کچھ نہیں کھایا۔“

”اوکے! بس دس منٹ۔“

”اب تم کیا کرو گے؟“ ناشتے کے بعد ثنا نے پوچھا۔

”مجھے تھانے جانا ہوگا۔ ذرا دیر پہلے تمہارے بھائی جان کا پیغام آیا تھا، جمشید کو بیان دینے تھانے جانا ہوگا۔“

”اوکے... بھائی جان تو ہوں گے وہاں؟“

”ہاں مگر تمہیں معلوم ہے نا کہ وہ اپنے مخصوص انداز میں سوچنے کے عادی ہیں۔“

”ہاں۔“ وہ دھیرے سے بولی۔ ”مگر تم ان سے الجھنا مت۔“

”کوشش کروں گا ویسے وہ خود اس کام میں اتنے ماہر ہیں کہ کسی اور کے کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ تم بھی میرے ساتھ چلو... میں تمہیں ان کے گھر پر اتار دوں گا۔ یوں بھی تم یہاں تنہا دو کر گھبراتی رہو گی۔“

”نہیں، میں اب ٹھیک ہوں بس کچھ دیر اکیلے رہنا چاہتی ہوں۔ تم فکر مت کرو... میں دروازے بند رکھوں گی۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

”تمہیں یقین ہے۔“

”ہاں۔“ وہ مسکرائی۔ ”تم جمشید بھائی کا خیال رکھنا۔“

خسرو جانتا تھا کہ ضد میں وہ اپنے بھائی جان کی کاپی ہے اور اب اس کی نہ کو ہاں میں بدلنا مشکل ہے اس لیے وہ اسے محتاط رہنے کی ہدایت کر کے نکل گیا۔

اس کی گاڑی کا رخ تھانے کی طرف تھا۔ جمشید اور نادر وہاں پہنچ چکے تھے۔ وہ جمشید کو شروع سے ہی بہت پسند کرتا تھا۔ نرم مزاج، دھیمے انداز میں گفتگو کا عادی جمشید مزاجاً نازلی سے بہت مختلف تھا۔ وہ پارٹیوں کی دلدادہ تھی جبکہ اسے تنہائی پسند تھی۔ نازلی کی شامیں دوستوں کے ساتھ گزرتی تھیں جبکہ جمشید کا زیادہ وقت اسٹڈی میں مطالعہ کرتے ہوئے کٹتا تھا پھر بھی ان دونوں کی جوڑی مثالی گردانی جاتی تھی۔ خسرو اور جمشید کی رسمی ملاقات بہت جلد دوستی میں بدل گئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ سب کچھ جمشید کے لیے کس قدر مشکل تھا۔

تھانے پہنچتے ہی اسے اندر بھجوا دیا گیا تھا۔ کمرے میں ایس پی کے علاوہ دو انسپکٹر، نادر اور جمشید موجود تھے۔ جمشید معمول کے مطابق بہترین سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس کے جوتے چمک رہے تھے اور بال سلیقے سے بنے ہوئے تھے مگر اس کا چہرہ پیلا پڑا ہوا تھا۔

”تو آپ صبح ہی حیدرآباد چلے گئے تھے؟“ ایس پی نے پوچھا۔

”جی ہاں، مجھے بینک کے کام کے سلسلے میں ایک سائٹ کے معائنے کے لیے حیدرآباد جانا پڑا تھا۔“ جمشید کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔ ”کام تو بارہ ایک بجے تک ختم ہو گیا تھا مگر گرمی کی وجہ سے میں ہوٹل میں رک گیا تھا۔ سوچا تھا کہ شام میں نکلوں گا۔“

”پھر؟“

”پھر میں سو گیا۔ تقریباً چھ بجے میں وہاں سے نکلا اور گھر آ گیا۔ باہر پولیس والوں نے یہ سب بتایا۔“

”ہوٹل میں آپ کے ساتھ کوئی تھا؟“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ کیا کوئی آپ کی وہاں موجودگی کی گواہی دے سکتا ہے؟“

”ہاں، ہوٹل والے... پھر تو میں سو گیا تھا؟“

”کیا آپ نے گھر پر اس کی اطلاع دی تھی؟“

”ہاں میں نے فون کیا تھا نازلی کو۔“

”کیا انہوں نے گھر پر کسی کی موجودگی کے بارے میں بات کی تھی؟“

”نہیں۔“

”آپ کی ان سے کتنی دیر بات ہوئی تھی؟“

”دو منٹ۔“

”ہوں، اس کا مطلب یہ ہے کہ دو بجے سے چھ بجے تک آپ ہوٹل میں تھے یا نہیں اس کا کوئی گواہ موجود نہیں۔“ ایس پی کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”کیا آپ میرے موکل پر الزام لگا رہے ہیں؟“ نادر نے تیز لہجے میں پوچھا۔

”کیا آپ اپنے موکل کو جواب دینے سے روک رہے ہیں؟“ ایس پی نے بھی سخت لہجے میں پوچھا۔

”نہیں مگر میں نازلی کو کبھی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔“ جمشید مضبوط لہجے میں بولا۔

ایس پی جواب میں کچھ نہیں بولا۔ اس کی انگلیاں میز پر مسلسل متحرک تھیں۔

”مسٹر خان! کیا آپ کی اہلیہ کے کسی اور سے تعلقات تھے؟“

”بس بہت ہو گیا۔“ خسرو اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

''آپ اس قسم کے سوال نہیں کر سکتے۔''

جمشید کا منہ کھلا تھا پھر بند ہو گیا۔ اس کا چہرہ مزید پیلا پڑ گیا تھا۔ پھر وہ بمشکل بولا۔

''خسرو بیٹھ جاؤ۔ نہیں ایس پی صاحب۔''

''آپ کے گھر کوئی ملازم نہیں ہے؟'' دوسرے انسپکٹر نے متفکر ہو کر رخ بدلا۔

''ہم زیادہ جھنجھٹ جھاڑ کے عادی نہیں ہیں، ہاں ایک مستقل ملازمہ ہے سلمٰی بی بی۔'' وہ بولا۔

''وہ کب سے کام کر رہی ہیں آپ کے گھر؟''

''پچیس سال سے زیادہ ہو گئے باقی کاموں کے لیے جز وقتی ملازم ہے۔''

''مگر اس شام تو وہاں کوئی نہیں تھا؟''

''سلمٰی بی بی اس شام اپنے گھر گئی ہوئی تھی۔''

''اور کوئی ملازم... چوکیدار؟''

''ہم نے نیا چوکیدار رکھا ہے... مجھے اس کا نام یاد نہیں... وہ نہ جانے کہاں تھا۔ شاید اس نے چھٹی لی ہو۔''

''کوئی اور جو آپ کی بیوی سے نفرت کرتا ہو؟'' ایس پی نے پوچھا۔

''نہیں... میرے خیال میں کوئی نہیں۔''

''اچھا آپ نے اپنے بیٹے جنید کو بتایا یہ سب؟''

''جی ہاں۔'' جمشید کا چہرہ جنید کے ذکر پر مزید تناؤ میں آ گیا۔

''پھر وہ کیوں نہیں آیا؟''

''وہ آئے گا۔ اصل میں ہمارے درمیان سب کچھ ٹھیک نہیں ہے۔'' وہ بمشکل بول پا رہا تھا۔

''بس اب اس سلسلے کو رک جانا چاہیے۔'' خسرو دوبارہ بولا۔

''یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' نادر بولا۔ ''ایس پی صاحب آپ صرف دو سوال اور کر سکتے ہیں۔''

''شکریہ وکیل صاحب!'' ایس پی طنزیہ انداز میں بولا۔ ''تو جمشید صاحب! کیا آپ جانتے ہیں کہ مقتولہ نے جنید کا نام اپنی وصیت سے نکال دیا تھا؟''

''نہیں۔'' وہ فوراً بولا۔

''آپ بتا سکتے ہیں کہ اس نے ایسا کیوں کیا ہو گا؟''

''ان دونوں کا جھگڑا ہوا تھا۔ میں اس روز گھر پر نہیں تھا اس لیے مجھے وجہ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔''

''تو... آپ کیا سمجھتے ہیں، کیا جنید نے یہ سب کیا ہے؟''

یہ سوال گویا بم کی طرح جمشید کے دل پر لگا۔ اس نے دونوں ہاتھ میز پر رکھ دیے اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''بس۔'' نادر حتمی لہجے میں بولا۔ ''تمہیں یہ معلوم کرنا ہے تو یہ اس سے جا کر پوچھو۔'' اس نے جمشید کو سہارا دے کر کھڑا کیا۔ ''ہم جا رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے مگر ہمیں دوبارہ خان صاحب کے بیان کی ضرورت پڑے گی۔'' ایس پی بولا۔

''وہ آج بھی یہاں مدد کرنے ہی آئے تھے۔ آپ نے سوالات کیے اور اپنے جواب حاصل کر لیے ہیں اب اپنا کام کریں۔ اب اگر آپ کو دوبارہ طلب کرنا ہے تو اس کے لیے آپ کے پاس وارنٹ ہونا چاہیے۔'' نادر کڑے لہجے میں بولا۔

''ضرور... ہم اپنا کام کر رہے ہیں۔'' ایس پی نے اسی کے انداز میں جواب دیا۔

جمشید اب باقاعدہ کانپ رہا تھا۔ خسرو نے سامنے رکھے جگ سے پانی نکال کر اسے پلایا۔ پھر وہ نادر کے ساتھ باہر نکل گیا۔

باہر خسرو کے بدترین خدشات کے مطابق کئی رپورٹرز اور کیمرے موجود تھے۔ نادر، جمشید کا بازو پکڑے تیزی سے کار کی طرف بڑھا۔

''کیا پولیس جمشید علی خان پر نازلی کے قتل کا شک کر رہی ہے؟'' ایک رپورٹر نے مائیک خسرو کی طرف بڑھایا۔

''آپ سب میری بات سنیں۔'' خسرو نے ان سب کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا فوری فیصلہ کیا۔ ''ایسا کچھ نہیں ہے وہ یہاں اپنا بیان ریکارڈ کرانے آئے تھے۔ اس معاملے میں جیسے ہی کوئی پیش رفت ہو گی میں خود اسے فوراً آپ کے علم میں لے آؤں گا۔''

وہ اتنا کہہ کر تیزی سے جمشید کی جانب لپکا اور سہارا دے کر جمشید کو سیٹ پر بیٹھنے میں مدد دی۔ ان کی نظریں لیے بھر کو ملیں۔

''تم... تم تو مجھ پر یقین رکھتے ہو نا... یقین کرو میں نے نازلی کو نہیں مارا... میں مار ہی نہیں سکتا۔'' وہ بے چارگی سے بولا۔

''میں جانتا ہوں۔'' خسرو اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھامتے ہوئے بولا۔ ''دوبارہ یہ مت پوچھنا۔ اگر آپ چاہیں تو میں اور نتاشا کچھ دنوں کے لیے آپ کی طرف آ جائیں۔''

”نادر نے میری بہن کو بلوا لیا ہے ویسے تم جب چاہو آسکتے ہو۔“

”جلدی بھجو یہ رام لیلا بعد میں بھی ہوسکتی ہے۔“ نادر غرایا۔ ”رپورٹرز اس طرف آرہے ہیں۔“ خسرو نے جلدی سے دروازہ بند کیا اور لمحے بھر میں سیاہ سوک سڑک پر تیرتی ہوئی دور نکل گئی۔

☆☆☆

اگلے دو دن تیزی سے گزر گئے۔ نازلی کی تدفین ہو گئی تھی۔ جمشید مسلسل دواؤں کے زیر اثر تھا۔ اس کی بہن نے آکر گھر کا سارا انتظام سنبھال لیا تھا۔ خسرو اور ثنا وہیں تھے اور آج ان کی اپنے گھر روانگی تھی۔

”خسرو میں اپنے معاملات تمہیں سونپ رہا ہوں، ایک وکیل سے زیادہ ایک دوست کی حیثیت میں۔“ جمشید نے ان کی روانگی سے قبل اسے خصوصی طور پر اسٹڈی میں بلایا تھا۔

”آپ فکر مت کریں۔“ خسرو نے اسے تسلی دی۔

”فکر کی بات ہے۔ پولیس کا رویہ ضرورت سے زیادہ تلخ اور سخت ہے۔ خود میں بھی اس سارے معاملے کو لے کر بہت پریشان ہوں، آخر کون یہ کرسکتا ہے؟ اور نازلی کے اس طرح جانے کا سبب کیا ہوسکتا ہے؟ میں جتنا سوچتا ہوں اتنا ہی الجھتا جارہا ہوں۔“ وہ بے بسی سے بولا۔

”ہمیں ان سب سوالوں کے جواب مل جائیں گے۔“ خسرو بولا۔ ”اس وقت آپ خود کو سنبھالیں۔“

”ہاں، میں سمجھتا ہوں۔“ وہ مسکرایا۔ ”نادر میرا بچپن کا دوست ہے مگر اکثر اوقات وہ چیزوں کو انتہا تک لے جاتا ہے، تم سمجھ رہے ہو نا اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم اس سب پر نظر رکھو۔“

”ٹھیک ہے۔“ خسرو اس کی بات سمجھ رہا تھا۔ سب کچھ درحقیقت بہت الجھا ہوا تھا۔

وہ گھر پہنچے ہی تھے کہ اس کا فون بج اٹھا۔

”میں سعدیہ ملتانی بول رہی ہوں، خسرو صاحب۔“ دوسری طرف ایک ممتاز چینل کی رپورٹر تھی۔ ”میں آپ سے نازلی کیس کے بارے میں کچھ بات کرنا چاہتی ہوں۔“

”فرمایئے... ویسے کیا وہ بات صبح نہیں ہوسکتی؟“

”نہیں، کیونکہ میرے پاس ایک اطلاع ہے جو ابھی نیوز میں جائے گی، میں اس سے قبل آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔“

”کیسی اطلاع؟“

”کیا آپ جانتے ہیں کہ جمشید نے پولیس کو نازلی سے فون پر ہونے والی بات چیت کا دورانیہ کیا بتایا تھا؟“

”جی ہاں، غالباً دو منٹ۔“

”مگر انہوں نے پورے بارہ منٹ بات کی تھی، پولیس نے فون ریکارڈ نکلوالیا ہے۔“

”وہ جس ذہنی کیفیت میں تھا اس میں غلطی ہوسکتی ہے۔“

”ایسا نہیں ہے خسرو صاحب، ذرا سوچیے وہ بارہ منٹ تک یہ تو نہیں بتا رہا ہوگا کہ وہ شام کو آئے گا، اس نے وقت کے بارے میں جھوٹ بولا ہے اور اسی طرح ان کے درمیان جو بات ہوئی وہ بھی چھپائی ہے۔ اگر وہ اس بارے میں غلط بیانی کر رہا ہے تو ہوسکتا ہے کہ دوسری باتوں کے بارے میں اس کا بیان درست نہ ہو۔“

”کیا بکواس ہے، یہ وہ بھی جانتا ہے کہ وقت کا پتا لگایا جاسکتا ہے۔ یہ غلطی ہوسکتی ہے مگر جھوٹ نہیں۔“ خسرو سخت لہجے میں بولا۔

”خیر یہ خبر آن ائیر جارہی ہے، میں سوچ رہی تھی شاید آپ کو معلوم ہو کہ ان کے درمیان کیا بات ہوئی تھی؟“

”نہیں، میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“

”کوئی کمنٹس؟“

”نہیں، مگر کچھ بھی نشر کرنے ہوئے یاد رکھیے گا کہ ہم قانونی کارروائی کا حق محفوظ رکھتے ہیں اور انسپکٹر پی پرویز کو میرا سلام کہیے گا۔ میرا مشورہ ہے کہ اسے اگر یہ کیس حل کرنا ہے تو جمشید کے علاوہ بھی کچھ سوچنا ہوگا۔“ اس نے اتنا کہہ کر فون بند کر دیا۔

”کیا تمہارے خیال میں یہ چیز جمشید بھائی کے لیے مسئلہ کھڑا کرسکتی ہے؟“ ثنا نے اس کے فون بند کرنے ہی پوچھا۔

”شاید... دیکھتے ہیں۔“ وہ کچھ سوچتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔

”کل فاتحہ کے بعد بھی لوگ عجیب عجیب باتیں کر رہے تھے۔“ وہ اس کے برابر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”کیسی باتیں؟“

”نازلی آپا کے بارے میں... اس سب کے بارے میں... کچھ تو اس سب کے ڈانڈے ان کے والد کے تحت فیصلوں سے ملا رہے تھے۔ انہوں نے اپنے آخری کیس میں جس شخص کو سزائے موت کا فیصلہ سنایا تھا اس نے عدالت میں کہا تھا کہ وہ اور اس کا خاندان اس خون ناحق کو

معاف نہیں کرے گا۔"

"وہ بہت پرانی بات ہے شنا۔" خسرو بولا۔

"ہاں، میں نے بھی یہی کہا تھا مگر لوگوں کی زبانیں کون روک سکتا ہے۔ مسز بازہ تو پاگل ہی ہو گئی تھیں۔ میرا ان سے جھگڑا ہوتے ہوتے بچا۔" وہ تیزی سے بولی۔

"جھگڑا......؟ مگر کیوں؟"

"کیونکہ اس نے بات ہی ایسی کی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ جو وہ کر رہی تھیں اس کا نتیجہ یہی نکلنا تھا۔"

"کیا مطلب...... وہ کیا کر رہی تھیں؟" خسرو اب پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھا۔

"یہ...... یہ نہیں معلوم ہو سکا۔ لیکن اسی وقت اس کے شوہر فیصل بھائی آ گئے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی اس نے چپ سادھ لی تھی۔ جھوٹ جو بول رہی تھی۔"

"فیصل؟" خسرو کچھ سوچتا ہوا بڑبڑایا۔

"وہ فیصل سجاد...... تیزگام انٹرسٹریز کے مالک...... وہ نازلی آپا کے تمام سوشل ورک پروجیکٹس کے نگران بھی رہے ہیں۔ ہم ان سے کئی بار آپا کے گھر مل بھی چکے ہیں وہی جو راحت کاظمی سے ملتے ہیں۔"

"اچھا اچھا۔" خسرو کو یاد آ گیا۔

"خیر دنیا کا تو کام باتیں بنانا ہے جہاں ایک دوست وہاں سو دشمن...... جلنے والے کم نہیں ہوتے۔ نازلی آپا کے ساتھ جو ہوا وہ اتنا خوفناک اور تکلیف دہ ہے مگر اس سے زیادہ افسوس ناک یہ سب ہے۔" وہ جھرجھری لیتے ہوئے بولی۔

"ویسے کیا تمہارے خیال میں یہ ممکن ہے؟" خسرو سوچتے ہوئے بولا۔

"کیا؟"

"یہی کہ نازلی آپا کی زندگی میں جمشید کے علاوہ بھی کوئی ہو؟"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" شنا زور سے بولی۔ "اگر ایسا ہو بھی تو میرے علم میں نہیں ہے۔"

"اچھا...... ویسے یہ سلمٰی بی بی نظر نہیں آئی، وہ کہاں ہے؟"

"وہ...... نازلی آپا کی خبر سے اس کی حالت بگڑ گئی تھی بستر پر پڑی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کا 25 سال کا ساتھ تھا۔ نازلی آپا ان پر بہت بھروسا کرتی تھیں۔ اب دیکھو کب آ پاتی ہیں وہ؟ اب میرا خیال ہے کہ تمہیں سو جانا چاہیے، کئی دن سے بے آرام رہے ہو اور شکل زرد بھی ہو جاتا ہے۔"

ریل گاڑی

"بھائی خیرو دین! بڑا دکھ ہوا۔ ریل گاڑی نے تمہاری گائے کو کچل دیا...... اللہ تمہیں صبر دے۔ تمہاری گائے بہت پیاری تھی، بستی میں بھری رہتی تھی... وہ ریل گاڑی کے نیچے کیسے آ گئی؟"

"وہ ریل گاڑی کو دیکھ کر بھاگی۔" خیرو دین نے کڑوے لہجے میں کہا۔ "اسے دیکھ کر انجن پٹری سے اتر کر کھیتوں میں اس کا پیچھا کیا، میدان میں بھی اسے نہیں چھوڑا، پھر بانگ کر پٹری پر لے گیا اور اسے کچل کر سیٹی بجاتا ہوا آگے چلا گیا...... بھلے آدمی! تم کو یہ بھی پتا نہیں کہ آدمی اور جانور ریل گاڑی کے نیچے کیسے آتے ہیں!"

"ہاں، میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔"

"مجھے تم سے ایک بات اور کرنی ہے۔" وہ چند لمحے بعد دھیرے سے بولی۔

"بولو۔" خسرو غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"جمشید بھائی نے جو بھی تم سے کہا ہے مگر میں چاہتی ہوں کہ اس معاملے کو لے کر تم اور بھائی جان میں کوئی تلخی نہ ہو۔"

خسرو نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا: "تم کس بات سے خوف زدہ ہو شنا؟"

"میں خوف زدہ ہوں اس لیے کہ میں تم سے پیار کرتی ہوں اور بھائی جان سے بھی پیار کرتی ہوں اور تم دونوں کی رنجش مجھے ڈراتی ہے۔ بھائی جان بوڑھے ہو رہے ہیں۔ ان کا کوئی خاندان، بیوی بچے نہیں ہیں، انہیں کئی پریشانیاں ہیں مگر وہ اسے تسلیم نہیں کرتے۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم دونوں میں سب ٹھیک رہے۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"شنا میرا مسئلہ اس وقت نازو نہیں جمشید ہے اور نادر بھائی کو اس معاملے میں بیچ نزدیک پر رکھنا ضروری ہے ورنہ ان کی غیر ضروری مہم جوئی جمشید کو بھاری پڑ سکتی ہے۔"

"بہرحال اس معاملے کو تم دونوں کے درمیان چپقلش کی وجہ نہیں بننا چاہیے۔" وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔

"میں پوری کوشش کروں گا۔" خسرو نے خشک لہجے میں جواب دیا۔ اس کے بعد سونے تک ان دونوں میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ خسرو اس رات تھکن کے باوجود نہیں سو

پایا۔ شاہ سو گئی مگر وہ نیند میں بھی بے چین تھی۔ خسرو اسے دیکھتا رہا۔ بالآخر رات کے آخری پہر نیند اس پر مہربان ہوئی۔ سوتے سوتے جو آخری خیال اس کے ذہن میں گونجا وہ سلمٰی بی بی کا تھا۔ وہ اس سے کل ضرور ملے گا۔ اس نے فیصلہ کیا۔

☆☆☆

ٹریفک جام ہونے کی وجہ سے خسرو کو گاڑی روکنی پڑی تھی۔ اس نے احتیاطاً گاڑی کے شیشے چڑھائے ہوئے تھے اور بہت محتاط انداز میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ شہر کا قدیمی علاقہ تھا۔ یہاں کے باسی برسوں اور نسلوں سے یہاں رہائش پذیر تھے۔ سلمٰی بی بی بھی ان میں سے ایک تھی۔

خسرو نے جمشید سے اس کا پتا حاصل کیا تھا اور اب وہ اس کے مکان سے کچھ ہی فاصلے پر تھا۔

نادر نے اسے یہاں آنے کے ارادے سے باز رکھنے کی کافی کوشش کی تھی۔ اس کے مطابق یہ نہ صرف وقت کا زیاں تھا بلکہ پولیس تفتیش میں اس بات کی خبر کہ خسرو یہاں آچکا ہے ان کے اور کمپنی کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ ”تم ایک وکیل ہو اور ہمارے ملک میں وکیل جمہوریت نہیں بنا کرتے۔ بہتر ہے کہ تم وکالت کے کام پر توجہ دو۔ کئی کیس تمہاری توجہ مانگ رہے ہیں۔“ وہ زہر خند لہجے میں بولا تھا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں اس نوکرانی سے ملنے سے کیا مل جائے گا؟ آخر تم جاننا کیا چاہتے ہو؟“

”یہ کہ نازلی آپا کن لوگوں سے ملتی جلتی تھیں اور یہ بھی کہ کیا ان کی زندگی میں کوئی اور موجود تھا۔“

”اور اس قسم کی باتیں کر کے تم جمشید کی مدد کی بات کرتے ہو۔ اس طرح وہ صرف بدنام ہو سکتا ہے۔ میرے خیال میں تمہیں اس معاملے میں دخل ہی نہیں دینا چاہیے۔ پولیس تفتیش کر رہی ہے جو ہوگا سامنے آجائے گا۔ تم اس معاملے کو صرف بگاڑ رہے ہو۔“ وہ تلخی سے بولا۔

”یہ تمہاری سوچ ہے۔“ خسرو نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی۔

اب وہ بالکل صحیح جگہ پر پہنچا تھا۔ دروازہ خود سلمٰی بی بی نے کھولا تھا۔ وہ قدرے کمزور نظر آرہی تھی۔ اس کی گہری سانولی رنگت مرجھائی ہوئی سی تھی اور گھنگریالے بال سختی سے چوٹی میں بندھے ہوئے تھے۔ اسے دیکھ کر وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔

”آپ..... آیئے۔“ خسرو اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ وہاں کی زیادہ تر چیزیں نازلی کی استعمال کردہ تھیں۔ جنہیں وہ اس کے گھر پر دیکھ چکا تھا۔ سامنے میز پر نازلی کی چھوٹی سی تصویر بھی موتیوں سے سجے فریم میں لگی ہوئی تھی۔

”جی خسرو صاحب؟“ سلمٰی اس کے بیٹھنے کے بعد بولی۔ اس کی اردو خاصی صاف تھی۔

”میں جمشید کی مدد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ خسرو نے بات شروع کی۔

”وکیل صاحب کا فون بھی آیا تھا مگر وہ بات کر ہی نہیں پائے، رو پڑے تھے۔ میں ان کا دکھ سمجھتی ہوں، جو ہوا بہت برا ہوا۔“ وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

”بالکل اور میں اسی حوالے سے آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔“

”جی ضرور۔“

”شاید یہ آپ کے لیے مشکل ہو مگر میں یہ جاننے کی کوشش کر رہا ہوں کہ آخر ان کا اس طرح قتل کیوں ہوا؟ وہ آپ کے بہت قریب تھیں شاید آپ ان کے رازوں سے سب سے زیادہ واقف تھیں۔“

”شاید۔“

”جنید کے بارے میں آپ کیا کہتی ہیں؟“ اس نے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”میں نے سنا ہے کہ گزشتہ ہفتے ان میں زبردست جھگڑا ہوا تھا۔“

”وہ دونوں اکثر لڑتے رہتے تھے۔“ وہ محتاط انداز میں بولی۔

”سلمٰی بی بی میں جانتا ہوں کہ آپ نازلی آپا کی بہت وفادار ہیں اور رہی ہیں مگر اب وہ مر چکی ہیں اور اب باتیں چھپانے سے زیادہ اہمیت جمشید صاحب کی مدد کی ہے۔“

وہ جواب میں اسے دیکھتی رہی۔ ”ان کے درمیان کس بات پر جھگڑا ہوا تھا؟“ خسرو نے پھر پوچھا۔

”وہ دونوں اندر تھے اس لیے میں زیادہ بات سن نہیں پائی، مجھے ان کے غصے میں چیخنے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں۔“

”موضوع کیا تھا؟ وہ کیوں چلا رہا تھا؟“

”پیسا..... دراصل جنید عجیب ہے وہ اپنی ماں سے پیار بھی کرتا ہے اور نفرت بھی۔“

”آپ کو یقین نہیں قتل کر سکے؟“ خسرو نے پوچھا۔

”مجھے نہیں معلوم۔“ وہ بمشکل بولی، اس کے چہرے پر اب غصے کے تاثرات تھے۔

”نازلی آپا کے پاس کیا بہت لوگ ملنے آتے تھے؟“

”جی ہاں، وہ سوشل ورک جو کرتی تھیں۔“

"کوئی خاص دوست؟" اس نے جھجک کر پوچھا۔

اس سوال پر سلمٰی بی بی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "آپ پوچھنا کیا چاہتے ہیں؟"

خسرو اس ردعمل پر خاموش ہو گیا۔ "کیا پولیس یہاں آچکی ہے؟" اس نے یکلخت موضوع بدل دیا۔

"نہیں۔"

"تو پھر وہ آئیں گے سلمٰی بی بی اور وہ یہی پوچھیں گے جو میں نے پوچھا ہے اور آپ کو انہیں سچ جواب دینا پڑے گا۔ میں آپ سے یہ سب جمشید کی مدد کے لیے پوچھ رہا ہوں۔"

سلمٰی بی بی اس کی بات پر چند لمحے پریشان نظر آئی پھر دھیرے سے بولی۔ "میں انھیں بتاؤں گی کہ وہ دونوں بہت خوش تھے۔"

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔"

"مسز جمشید بہت مہربان اور اچھی عورت تھیں۔" وہ سرد لہجے میں بولی۔ "اور اس سے زیادہ کچھ بھی جاننا جمشید صاحب یا کسی کے لیے بھی فائدہ مند ثابت نہیں ہوسکتا۔"

اس کا انداز بتا رہا تھا کہ اب وہ کوئی اور بات نہیں کرنا چاہتی۔ خسرو وہاں صرف چند لمحے اور رکا۔ اسے نئے چوکیدار کا نام و پتا بھی درکار تھا۔

☆☆☆

اس ٹوٹی پھوٹی سڑک پر کار چلانا مشکل تھا۔ اس سڑک کے دائیں ہاتھ پر بنے کوارٹر نما مکانات میں سے چوتھا خسرو کی منزل تھی۔ کوارٹر کے سامنے برآمدے جیسی جگہ بنی ہوئی تھی جس پر ٹین کی چھت پڑی ہوئی تھی۔ برآمدے میں رکھی چارپائی پر مضبوط کاٹھی والا ایک ادھیڑ عمر آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا قد درمیانہ تھا اور چہرے پر عجیب سی سختی نظر آرہی تھی۔ اس کی داہنی آنکھ بھینگی تھی۔ خسرو کو آتا دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا اور سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔

"مجھے فیروز خان سے ملنا ہے۔" خسرو نے کہا۔

"کیوں؟" وہ مسلسل اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

"مجھے نازلی جمشید کے بارے میں بات کرنی ہے۔"

"تم پولیس والے ہو؟" اس نے ایک ابرو اچکائی۔

"نہیں، میں جمشید خان کا وکیل ہوں۔ میں ان تمام لوگوں سے مل رہا ہوں جو کسی نہ کسی طرح جمشید کے رابطے میں تھے۔"

"ہاں، ام نے سنا ہے کہ اس کا خون ہو گیا ہے۔" اس نے سرسری انداز میں کہا جیسے یہ کوئی عام سی بات ہو۔ "اور اس سے امارا کوئی رابطہ واسطہ نہیں تھا۔ اس کے بنگلے پر ام نے ایک دوست کی جگہ صرف پچیس دن کام کیا ہے۔ امارا کام ختم ہو گیا تو ام واپس آگیا ویسے بھی یہ بڑا لوگ اپنے نوکروں کو پہچانتا تک نہیں ہے۔"

"میں جانتا ہوں، میں صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ کیا تمھیں اندازہ ہے کہ کون یہ خون کر سکتا ہے؟"

"نہیں۔"

"اچھا کوئی ایسا شخص جو وہاں بہت آتا جاتا ہو؟"

"یہ سوال گھر میں رہنے والی اس ملازمہ سے کرو، اس کا نام شاید سلمٰی بی بی ہے ویسے ایک صاب وہاں اکثر آتا جاتا تھا ہفتے میں کم از کم تین بار، اس کی گاڑی گہرے ہرے رنگ کی تھی...... لمبی اور شاندار......" وہ بولا۔

"اچھا ٹھیک ہے، میں چلتا ہوں۔" اس نے کھڑے ہوتے ہوئے چند نوٹ فیروز خان کی طرف بڑھائے۔

فیروز خان نے نوٹوں کی طرف دیکھا پھر غصے سے خسرو کو گھورا۔ "تم لوگ کو ہر غریب فقیر کیوں لگتا ہے۔ ام محنت کر کے کھاتا ہے سمجھا تم۔"

"جی جی..... یہ میں اس لیے نہیں دے رہا تھا۔" خسرو گڑبڑا گیا۔ "میں تو صرف مدد کرنا چاہتا تھا۔"

"ام جانتا ہے کہ کوئی پیسا والا کسی غریب کی مدد نہیں کرتا صرف حکم دیتا ہے یا پھر سزا، چاہے وہ قصوروار ہو یا نہ ہو۔" وہ عجیب سے انداز میں بولا اور پھر اٹھ کر اندر چلا گیا۔ اس کی آواز اور آنکھوں میں عجیب شدت کی نفرت تھی جس نے خسرو کو لرزا دیا تھا۔

☆☆☆

کئی دن کی غیر حاضری کی وجہ سے جمع شدہ کام کو نمٹانے میں خسرو کو دو دن لگ گئے۔ اس دوران اس کا دماغ مسلسل کام کرتا رہا تھا۔ نازلی کا قتل ایک معما بن کر رہ گیا تھا... مسئلہ یہ تھا کہ اس... پزل کی کڑیاں اس قدر بکھری ہوئی تھیں کہ انہیں جمع کرنا بھی آسان کام نہیں تھا۔ خسرو اس لمبی سی گہرے ہرے رنگ کی شاندار کار کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا۔ اس کار کا مالک اس معمے کے حل میں اہم کردار ادا کر سکتا تھا مگر سوال یہ تھا کہ وہ کہاں تھا اور کون تھا؟ سلمٰی بی بی مدد کر سکتی تھی مگر وہ اپنے ہونٹ سیے بیٹھی تھی۔

آج دفتر آتے ہی اسے جمشید کا پیغام ملا تھا۔ "وہ آج شام کو آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔" ریسپشنسٹ شاہین

نے اسے مطلع کیا۔

"اور میرا آج کا شیڈول؟"

"مقابلتاً سخت ہے۔" وہ مسکرائی۔ "آج لنچ سے پہلے آپ کی تین ملاقاتیں طے ہیں جبکہ لنچ کے بعد احمد ٹی انٹرنیشنل کے کاغذات تیار کرنے ہیں۔"

"ٹھیک ہے اس کے علاوہ اگر آسمان بھی ٹوٹ پڑے تو مجھے پریشان مت کرنا۔"

"او کے باس۔" وہ بڑا سا مسکرائی۔

مگر جو نہیں ہو کر رہتی ہے۔ چار بجے جب وہ طے شدہ تمام کاموں سے نمٹ کر فارغ ہوا ہی تھا کہ اچانک اس کے کیبن کا دروازہ کھلا اور کسی نے اندر داخل ہو کر اسے بند کر لیا۔

یہ سعدیہ جاپان تھی، ممتاز صحافی۔ وہ مسکراتے ہوئے اس کے سامنے آ بیٹھی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ میرا آج مصروف دن ہے کوئی بھی اپائنٹمنٹ نہیں تھا پھر آپ اندر کیسے تشریف لے آئیں؟" اس نے مسکرا کر اسے گھورا۔

"بہت آسانی سے، میں گھبرا کر تمہاری ریسپشنسٹ کے پاس گئی اور اس سے کہا کہ سوری میں لیٹ ہو گئی خسرو صاحب نے مجھے بلایا تھا کیا چلی جاؤں۔ وہ بے چاری میری پریشانی سے خود گھبرا گئی اور میں اندر......" وہ ایک آنکھ دبا کر بولی۔

"قانون کی زبان میں اس کو چار سو بیسی کہتے ہیں اور آپ کی اطلاع کے لیے یہ قابل سزا جرم ہے۔"

"ضرورت ایجاد کی والدہ ہوتی ہے مائی ڈیئر خسرو، مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔"

"اور یقیناً وہ بات نازلی مرڈر کیس سے متعلق تو نہیں ہوگی...... ہے نا؟"

"اسی کے متعلق ہے۔" وہ اس بار سنجیدگی سے بولی۔ "تم مجھ پر اعتبار کر سکتے ہو اور تم یہ جانتے ہو۔ میں اپنی اطلاعات کا پٹارا لے کر یہاں اسی لیے آئی ہوں کہ تمہیں اس کا علم ہو اور میری خبر تصدیق شدہ ہو۔"

"اور وہ خبر کیا ہے؟"

"تم جانتے ہوگے کہ نازلی، جمشید علی خان سے طلاق لینے کا فیصلہ کر چکی تھی۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" وہ یک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"یہ مجھے بہت زیادہ مصدقہ ذرائع سے معلوم ہوا ہے۔ نازلی یہ فیصلہ کر چکی تھی اب یہ نہیں معلوم کہ اس نے جمشید کو یہ بتایا تھا یا نہیں۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ "اس فیصلے کے پیچھے جو وجہ تھی مجھے اس کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوئی ہیں۔"

"وہ کیا؟"

"نازلی کا کسی سے افیئر چل رہا تھا اور وہ اس سے شادی کرنا چاہتی تھی۔"

"یہ ناممکن ہے۔" خسرو بے اختیار بولا۔

"کیا...... افیئر چلنا یا شادی کرنا؟"

"میرا مطلب ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو پھر وہ وصیت کو اس طرح تبدیل کیوں کرواتی۔ اس نے اپنی تمام دولت جمشید کے نام کرنے کو کہا تھا۔" وہ بولا۔

"یہی تو میں بھی سوچ رہی ہوں اور اسی لیے میں نے اب تک اس خبر کو باہر نہیں آنے دیا۔ کہیں نہ کہیں کوئی چیز ہے جو ہماری نظروں سے اوجھل ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ ہم دونوں اسے تلاش کریں۔ ہم دونوں کا مقصد ایک ہی ہے۔ نازلی جمشید کے قاتل تک پہنچنا...... کیوں، ٹھیک ہے نا؟" وہ بولی۔

"ہاں، مجھے اس بارے میں سوچنے دو۔" خسرو چند لمحوں بعد بولا۔

"ٹھیک ہے تو اب میں چلتی ہوں۔" وہ کھڑی ہو گئی۔

"او کے اور اب جب آنا تو سیدھی چلی آنا جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں۔" خسرو ہنسا۔

"مگر اس بے چاری ریسپشنسٹ کو مت بتانا ورنہ اس کا دنیا پر سے اعتبار اٹھ جائے گا۔" وہ شرارت سے ہنستی باہر نکل گئی۔

خسرو اس کے جانے کے بعد دروازے کو گھورتا رہا۔ سعدیہ کو وہ کئی برسوں سے جانتا تھا وہ ایک ذمے دار صحافی تھی اگر وہ اتنے یقین سے ایک بات کہہ رہی تھی تو پھر اس میں کوئی نہ کوئی حقیقت ضرور تھی اور اگر ایسا تھا تو پھر یہ وصیت...... اس نے گہری سانس لے کر اپنے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ یہ سب اس کا دماغ گھمانے کے لیے کافی سے زیادہ تھا۔

اسے جمشید سے ملنے جانا تھا اس لیے وہ اس کے بعد دفتر میں نہیں رکا۔ جمشید ولا میں سلمٰی بی بی اور پھر جمشید کی آپا نے اس کا استقبال کیا۔

"آؤ خسرو، تم کیسی ہے؟" وہ پاندان کھولے بیٹھی تھیں۔

جمشید کی یہ اکلوتی بڑی بہن اسے بہت اچھی لگتی تھیں۔ کہانیوں کی ماں کے کرداروں جیسی..... شفیق اور مہربان۔ ان کے شوہر فوج کے اچھے عہدے دار رہے تھے اور اولاد کوئی تھی نہیں، شوہر کی وفات کے بعد بھی وہ وہیں اسلام آباد میں ان کے گھر میں رہنے کو ترجیح دیتی تھیں۔

"بہتر ہیں، آپ سنائیے اور جمشید کا کیا حال ہے، مجھے ان کا پیغام ملا تھا صبح۔" وہ صوفے پر ٹکتے ہوئے بولا۔

"اوہ..... اچھا، میں بھی تمہیں نادر نے بھیجا ہے۔"

"نادر نے..... وہ کیوں؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ارے وہی الیس پی پرویز..... وہ ایک گھنٹا پہلے آیا تھا۔"

"بغیر ہمیں مطلع کیے، وہ دوبارہ یہاں آیا تھا؟" خسرو اس اطلاع پر چونک گیا۔ "کیا اس نے جمشید سے پھر کوئی بیان لیا ہے؟"

"نہیں، وہ مجھ سے بیان لینے آیا تھا۔ چلو میاں یہاں تک تو ٹھیک ہے کہ پولیس کیس ہے تو پولیس تفتیش تو کرے گی ہی مگر وہ کم بخت تو بس یہ جاننا چاہتا تھا کہ دونوں میاں بیوی میں کوئی مسئلہ تو نہیں تھا۔ نازلی کے بارے میں الٹی سیدھی باتیں بھی کر رہا تھا۔ میں نے تو صاف کہہ دیا کہ شاید بھول گئے ہو میاں، پولیس میں ہو تو کیا ہوا، مرنا تو تمہیں بھی ہے اور پھر ہر غلط بات کا جواب دینا پڑے گا، کیوں کسی کو بدنام کرتے ہو اور باہر کا راستہ دکھا دیا اسے، میں نے ہی نادر کو فون کیا تھا۔" وہ سر دبا تے ہوئے بولیں۔

"مجھے اس کا علم نہیں تھا آپا، ورنہ جلدی آجاتا۔" خسرو بولا۔ "جمشید کہاں ہیں؟"

"کہاں ہوگا وہ؟ وہیں اپنی موئی اسٹڈی میں منہ باندھے بیٹھا ہوگا۔ کتنا سمجھایا ہے کہ بندہ عاجز ہے جو رب کا حکم ہو، وہ ہوتا ہے، بندے کا سب سے بڑا ہتھیار صبر ہے اور شکر سب سے افضل ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولیں۔

"میں ان سے مل لیتا ہوں۔"

"ہاں ہاں، تم جاؤ..... سلمٰی تم چائے وغیرہ کا بندوبست کرو، خسرو میاں دفتر سے آئے ہیں۔"

"نہیں آپا....." اس نے کہنا چاہا۔

"کیا نہیں، تم ہمارے معاملے میں مت بولو میاں۔" وہ اسے گھور کر بولیں تو خسرو کو مسکراتے ہوئے وہاں سے اٹھتے ہی بنی۔

"آگئے تم..... معاف کرنا میں نے تمہیں زحمت دی ہے۔"

"یہ کیا بات کی آپ نے۔" خسرو پریشان ہو کر بولا۔

"دراصل....." وہ ایک لمحے کو رکا جیسے سمجھ نہ پا رہا ہو کہ اپنی بات کس طرح بیان کرے۔ "میں چاہتا ہوں کہ تم جنید سے ملو، میری طرف سے نہیں بلکہ خود..... اسے اپنی ماں کے جانے کے بعد یہاں ہونا چاہیے تھا مگر وہ جنازے کے بعد واپس چلا گیا۔ مجھ سے اس کا کبھی جھگڑا نہیں ہوا مگر وہ مجھ سے ملنے نہیں آیا..... اب نہ جانے وہ کیا کر رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے میں دیکھوں گا۔" خسرو اس کی تکلیف سمجھ رہا تھا۔

"سب کچھ یکلخت بکھر سا گیا ہے۔ اسے سمیٹنے میں تھوڑا سا وقت لگے گا۔" اس نے سر جھٹکا۔ "میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔" شاید وہ اس سے تھکن دبانی چاہ رہا تھا۔

"یقیناً۔" خسرو مسکرایا۔

"میں یہ بات تم سے فون پر کہہ سکتا تھا مگر تم سے ملنا مجھے اچھا لگتا ہے، ہمت ملتی ہے اس لیے....."

"تو اچھا کیا۔ مجھے بھی آپ سے مل کر اچھا لگتا ہے۔"

خسرو چند چائے وہیں آگئی تھی، خسرو آدھے پونے گھنٹے بعد اٹھ کھڑا ہوا۔ آپا جی سے مل کر وہ دروازے سے باہر نکل ہی رہا تھا کہ گیٹ کھلا اور ایک ہرے رنگ کی لمبی سی شاندار کار اندر داخل ہوئی۔ خسرو اس کار کو دیکھ کر ساکت رہ گیا۔ کار کے تمام شیشے اور ونڈ اسکرین بھی ٹینڈ تھی، پورچ میں قدرے آگے آ کر کار رکی۔ خسرو کسی مسحول کی طرح پلکیں جھپکائے بغیر اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ دو لمحے بعد ڈرائیونگ سیٹ والا دروازہ کھلا اور کار سے فیصل سجاد باہر آتا نظر آیا۔ خسرو کو یکلخت اپنے پیچھے ہلکا سا کھٹکا محسوس ہوا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ سلمٰی اس کے پیچھے کھڑی تھی۔ خسرو ایک لمحے اس کو گھورتا رہا پھر سرد لہجے میں سرگوشی کی۔

"تو وہ فیصل سجاد تھا؟" یہ صرف سوال نہیں تھا۔ سلمٰی کا چہرہ یک دم سفید پڑ گیا۔ وہ ایک لمحے پتھریلی نظروں سے خسرو کو دیکھتی رہی اور پھر تیزی سے اندر مڑ گئی۔

☆☆☆

اس کے دماغ میں جھماکے سے ہو رہے تھے۔

فیروز خان کا بیان، وہ ہرے رنگ کی لمبی کار، سعدیہ کی خبر اور پھر سلمٰی کی نظریں..... وہ خیال جسے اب تک وہ الزام گردانتا آیا تھا حقیقت بن کر سامنے آتا نظر آ رہا تھا۔

انہی سوچوں میں الجھتا وہ گھر پہنچ گیا۔ دو گھنٹیاں بجانے کے بعد دروازہ تھوڑا سا کھلا اور اس درز سے ایک

ہاتھ باہر آیا۔

اس ہاتھ میں ایک ریوالور تھا جس کا رخ خسرو کی طرف تھا۔ خسرو اچھل کر پیچھے ہٹا پھر ثنا کے خیال نے اس کے وجود میں آگ سی بھر دی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور انجام کی پروا کیے بغیر اس نے ریوالور والے ہاتھ کو پوری طاقت سے دبوچ کر باہر کھینچ لیا۔

"ارے..... ارے چھوڑو۔" وہ ثنا کو اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"یہ سب کیا ہے ثنا؟"

"سوچا تھا کہ تمہیں ڈراؤں گی مگر تم نے تو میرا ہی دانی کرا اندر کر دیا۔" وہ ہاتھ سہلاتے ہوئے اندر آتے ہوئے بولی۔

"یہ ریوالور کہاں سے آیا ثنا؟" اس نے اندر آکر اسے اپنے سامنے بٹھاتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

"بھائی جان نے....." وہ سادگی سے بولی۔ "تم جانتے ہو کہ نازلی آپا کے حادثے کے بعد سے ہم سب ہی ڈر گئے ہیں، اگر وہ جنید ہے، پھر تو مجھے خطرہ ہے اس لیے یہ میں نے ان سے لیا ہے۔"

"تمہیں اس کی ضرورت نہیں ہے، میں ہوں نا تمہارے ساتھ..... اور پھر تم اور ہم دونوں اچھی طرح جانتے ہو نا کہ مجھے گھر میں ہتھیار رکھنا سخت ناپسند ہے۔" وہ سختی سے بولا۔ "تم یہ اسے واپس کر دو گی۔"

"خسرو جب تک یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا تب تک..... صرف تب تک تم مجھے اسے رکھنے دو..... تم ہر وقت گھر میں نہیں ہوتے اور میں اس کی وجہ سے خود کو محفوظ سمجھتی ہوں۔"

"او کے۔" خسرو نے ہتھیار ڈال دیے۔ "تمہیں اسے چلانا آتا ہے؟"

"ہاں بہت سال پہلے جمشید بھائی نے مجھے اور جنید کو سکھایا تھا۔"

"او کے..... ثنا بہت احتیاط سے کام لینا اور اس کی سیفٹی لگا کر رکھنا۔"

"ڈونٹ وری سر۔" وہ ریوالور کو اپنی بیڈ سائیڈ کی دراز میں رکھتے ہوئے بولی۔

☆☆☆

وہ ایک چھوٹا سا بنگلا تھا۔

دروازہ خود جنید نے ہی کھولا تھا۔ وہ ایک درمیانے قد و قامت کا قبول صورت نوجوان تھا۔ خسرو اسے کافی عرصے بعد دیکھ رہا تھا۔ وہ اس سے جب پہلے ملا تھا تو اس کے سر پر پونی جیسے لمبے بال تھے مگر اب وہ بالکل گنجا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں حلقوں میں مسلسل گردش کر رہی تھیں۔ اس نے ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور اسے سوالیہ نظروں سے گھور رہا تھا۔

"میں خسرو ہوں، تمہارے والد کا وکیل۔"

"انہوں نے بھیجا ہے تمہیں؟"

"نہیں، میں خود تم سے ملنا چاہ رہا تھا۔" خسرو بولا۔ "مجھے تم سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ چند لمحے سوچ کر بولا۔ "تمہارے پاس پانچ منٹ ہیں، اندر آجاؤ۔"

خسرو اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا لاؤنج میں داخل ہوا۔ اندر آرام دہ صوفے لگے ہوئے تھے، کمرے کو نفاست سے سنوارا گیا تھا۔ لاؤنج کے ساتھ ہی کچن کاؤنٹر اور پھر کچن تھا جہاں ایک خوب صورت دبلی پتلی لڑکی کھڑی چائے بنا رہی تھی۔

"یہ میری بیوی ہے آصفہ۔" وہ لاؤنج میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

"اور اچھا..... مگر شاید نازلی آپا اور جمشید کے علم....."

"یہ بات نہیں ہے، میں نے انہیں بتانا ضروری نہیں سمجھا۔" وہ اس کی بات کاٹ کر بے پروائی سے بولا۔ "اور میں اس حوالے سے کوئی تقریر سننا نہیں چاہتا۔ اچھا تو تم نے ہی لاش کو سب سے پہلے دیکھا تھا؟ پولیس والے کہہ رہے تھے کہ اسے گلا گھونٹ کر مارا گیا تھا؟"

"ہاں۔" خسرو نے جواب دیا۔

"مجھے پولیس نے بتایا تھا۔ جب تک اولڈ مین کا فون آیا اور الو کے پٹھے میری آدھی جان کھا چکے تھے، انہیں یقین تھا کہ خون میں نے ہی کیا ہے۔"

"اس کی وجہ شاید یہ تھا میرے پاس وہ نئی وصیت بھیجی تھی اس رات..... اس کی وجہ سے وہ سیدھے تمہارے پاس آئے تھے، کیا تمہیں اس وصیت کے بارے میں معلوم تھا؟" خسرو نے پوچھا۔

"نہیں، وہ مجھے اکثر اس بات کی دھمکیاں دیتی تھیں مگر مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ ایسا کر رہی تھیں۔"

"ہاں، انہوں نے وصیت بنوائی تھی مگر اس پر دستخط نہیں کر پائیں..... میں یہی سوچ کر یہاں آیا ہوں کہ شاید تم ان کے قاتل کی تلاش میں میری مدد کر سکو۔"

"مجھے کچھ بھی معلوم نہیں۔" اس کا چہرہ سخت ہو گیا۔

"کیا تمہیں نہیں لگتا کہ اس وقت جمشید کو تمہاری ضرورت ہے۔"

"تو.....؟" وہ یک دم چیخ پڑا۔ "تم ہو نا وہاں ان کے پاس۔"

آصفہ کچن سے نکل کر اس کے قریب آ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیلی ہوئی تھیں۔

"انہیں میری نہیں تمہاری ضرورت ہے جنید۔"

"تمہیں ان کی بہت فکر ہے۔"

"وہ ایک اچھے انسان ہیں۔"

"ہو سکتا ہے مگر تم جانتے ہو کہ میرا تجربہ کیا ہے مرد ناگ ہیں..... ہاتھ لگ جانے والے ایک چند شیک اور بس۔"

"جنید یہ سب ٹھیک مگر وہ سوال اپنی جگہ ہے کہ تمہاری والدہ کو کس نے قتل کیا؟"

"میں اس جاہل ایس پی کو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میں اس وقت یہاں گھر پر آصفہ کے ساتھ تھا۔ یہ میرے حق میں گواہی دے چکی ہے۔"

"ہاں۔" اس کی بیوی بولی۔ "مگر وہ پھر بھی ہمارے پیچھے پڑے ہیں۔" اس کی دخل اندازی سے جنید کچھ پرسکون ہوا تھا۔

"شاید تمہیں تم دونوں کے جھگڑے کے بارے میں معلوم ہو گیا ہو۔" خسرو بولا۔

"وہ جھگڑا..... میں نے تو صرف انہیں یاد دلایا تھا کہ ان کا خاندان انصاف کرنا ہی نہیں جانتا۔ ان کے والد ایک بے قصور کو پھانسی پر لٹکانے کی وجہ سے خبروں میں آئے تھے۔" وہ ہنسا۔ "ویسے مجھے ان سے کچھ چاہیے بھی نہیں..... اس لیے مجھے وصیت سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" پھر کچھ دیر توقف کے بولا۔ "اور جہاں تک میرے والد ین کا تعلق ہے تو بھول جاؤ، وہ شاعری، تصویریں بنانا یا پینٹنگ کر سکتا ہے قتل نہیں..... یہ اس کا کام نہیں ہے۔"

"صرف یہ وجہ..... وہ نازلی سے محبت کرتے تھے۔" خسرو نے اس کی تصحیح کی۔

"تم کس دنیا میں رہتے ہو خسرو، ہمارے گھر میں محبت صرف کتابوں میں موجود ہے، وہ دونوں میرے بچپن سے الگ رہتے ہیں، الگ الگ کمروں میں..... نہ جانے میں ان کی دنیا میں آ کیسے گیا۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا۔

"تمہارے خیال میں اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" اس کی آواز تیز ہوتی جا رہی تھی۔

"کیا نازلی آپا کی زندگی میں کوئی اور تھا؟" خسرو نے راست اقدام کا فیصلہ کیا۔

"نہیں۔" وہ سخت لہجے میں بولا۔

"کیا تم نے انہیں کبھی فیصل سجاد کے ساتھ دیکھا تھا؟"

"ہاں، وہ اکثر آتا تھا اور احمقوں کی طرح مجھ سے باتیں کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ دیکھو خسرو مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں کہ وہ کیا کرتی تھیں اور کیا نہیں۔"

"مگر....." خسرو نے کچھ کہنا چاہا۔

"بس... تمہارے پانچ منٹ پورے ہو چکے ہیں۔" وہ جارحانہ انداز میں بولا۔

"ٹھیک ہے میں چلتا ہوں۔" خسرو کھڑا ہو گیا۔

"اور ثنا کے ساتھ کیسی گزر رہی ہے؟" جنید نے بےتکلف پوچھا۔ "وہ حرفوں کی بنی ہوئی ہے محتاط رہنا اس سے۔"

"فی الحال تمہیں لفظوں کے استعمال میں احتیاط کی ضرورت ہے، تم ثنا کے شوہر سے بات کر رہے ہو۔" خسرو غصے کو دباتا ہوا سرد لہجے میں بولا۔ "اس سے جس سے وہ کچھ نہیں چھپاتی نہ حال نہ ماضی....."

"اوہ..... وہ....." جنید اس کا اشارہ سمجھ گیا تھا۔ "مجھے بھی افسوس ہے کہ وہ اس روز بھاگنے میں کامیاب ہو گئی ورنہ....." وہ خسرو کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تضحیک آمیز انداز میں ہنسا۔

غصے کی ایک تیز لہر خسرو کے وجود کو اچانک اپنے ساتھ بہا لے گئی۔ اس نے سامنے کھڑے جنید کی طرف دیکھا اور پھر اس کا زوردار گھونسا اس کے پیٹ میں لگا، جنید اوغ کی کریہہ آواز نکالتا ہوا دہرا ہو گیا۔ پھر وہ سیدھا کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے سے نکل رہے تھے۔

"نہیں جنید، نہیں۔" آصفہ اس کی جانب لپکی مگر وہ اسے دھکا دیتے ہوئے آگے بڑھا۔ اس کا مکا خسرو کی بائیں آنکھ کے نیچے لگا تھا۔ خسرو لڑکھڑایا پھر اس نے جنید کے چہرے پر تھپڑ مارا۔ جنید نے اس تھپڑ سے بچتے ہوئے اپنا سر اس کے سینے پر دے مارا۔ خسرو پیچھے ہٹا اور پھر اس کی لات گھومتی ہوئی جنید کے پیٹ پر پڑی۔ اس لات نے اسے زمین چٹا دی تھی۔ وہ نیم بے ہوش سا ہو کر وہیں پڑا کراہ رہا تھا۔ آصفہ اسے سہارا دے رہی تھی۔

"مجھے..... مجھے افسوس ہے۔" خسرو ہانپتا ہوا آصفہ سے بولا اور تیزی سے کمرے اور پھر مکان سے باہر نکل گیا۔

اس کی پسلیاں جنید کے سر کی ٹکر [illegible] ٹھنا رہی تھیں آنکھ کے نیچے [illegible] لگنے والی چوٹ سے خون رس رہا تھا۔ مگر وہ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس سب کے بارے میں نہیں سوچ رہا تھا۔ اسے فوری طور پر فیصل سجاد سے ملنا تھا۔

☆☆☆

فیصل سجاد کا بنگلا سفید ماربل سے سجا ہوا تھا۔ ملازم نے خسرو کو لیونگ روم میں پہنچا دیا تھا۔ وہ اس وقت وہیں بیٹھ کر فیصل سجاد کا منتظر تھا۔ جنید سے ہونے والے جھگڑے کے نتیجے میں اس کا سیدھا ہاتھ سوج رہا تھا۔ چہرے اور پسلیوں کی چوٹ الگ اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی۔

فیصل چند لمحوں میں آ گیا تھا۔ وہ غالباً کہیں جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ناگواری تھی۔

”تمہیں مجھ سے کیا کام ہے؟“ اس نے آتے ہی پوچھا۔

”تمہارے دس منٹ درکار ہیں مجھے۔“ خسرو بولا۔

”مجھے بیس منٹ میں کہیں پہنچنا ہے۔“ وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔

”یہ بات تمہارے کہیں بھی جانے سے اہم ہے۔“ خسرو ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔

”او کے، اور وہ ضروری بات کیا ہے۔ میں جان سکتا ہوں؟“

”نازلی جمشید سے تمہارا تعلق......“ خسرو نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ وہ غصے سے بولا۔ ”اگر تمہارا اشارہ اس کے جنازے والے دن میری بیوی کی احمقانہ باتوں کی طرف ہے تو میں نے اسی وقت سب کو سمجھا دیا تھا کہ وہ ایک احمق اور حاسد عورت ہے۔ وہ جو سوچ لیتی ہے اسے ہی سچ سمجھنے لگتی ہے۔ نازلی سے میرا تعلق دوستی کے علاوہ بس یہ تھا کہ میں اس کے فلاحی پروجیکٹس کے لیے کام کرتا تھا۔“

”مگر یہ بات تو کافی لوگ کر رہے ہیں۔ نازلی آپا کے بیٹے جنید نے بھی تمہیں اکثر ان کے ساتھ دیکھا تھا۔“ خسرو نے اندھیرے میں تیر چلایا۔

”میرے کام کی نوعیت کے حوالے سے ہمیں ملنا پڑتا تھا۔ جنید کے ساتھ کچھ مسئلہ رہا ہے۔ وہ اکثر انگری ینگ مین بنا گھومتا ہے مگر میں یہ سمجھ نہیں پا رہا کہ اس سب میں تمہاری دلچسپی کی کیا وجہ ہے؟“

بڑی چیز

جج نے شراب پینے کے الزام میں لائے جانے والے شخص سے کہا۔ ”تمہیں پولیس نے یقیناً شراب نوشی کی وجہ سے پکڑا ہے۔“

”آپ کا اندازہ درست ہے جناب۔“ شرابی نے جواب دیا۔

”شراب انتہائی بری چیز ہے۔ نشے میں بہت سے نقصانات ہیں۔ آدمی بہکنے لگتا ہے، دوستوں سے بے وجہ الجھ جاتا ہے یہاں تک کہ کوئی اپنی بیوی پر گولی چلائے تو نشانہ بھی خطا جاتا ہے۔ میں خود یہ بارہا کوشش کر چکا ہوں۔“

کراچی سے الجیلی

”میں اور نادر جمشید علی خان کے وکیل ہیں۔“

”تو تم یہاں کیا کرنے آئے ہو؟“ اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔

”تم کب سے نازلی آپا کے ساتھ کام کر رہے تھے؟“

”برسوں سے۔“

”اور تمہاری ان سے آخری ملاقات کب ہوئی تھی؟“

”پہلے تم مجھے بتاؤ کہ کیا اور جاننا ہے تم اس وقت یہاں ہو؟“

”شاید نہیں۔“

”اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو یہ نہ کرتا۔ کیا تمہیں اندازہ ہے کہ اس کے میری بیوی پر کیا اثرات ہوں گے؟“

”نہیں...... مگر میں ان سے بھی کچھ سوال کرنا چاہوں گا۔“

”بکواس مت کرو۔“ وہ یکلخت بپھر گیا۔ ”اب کان کھول کر میری بات سنو کیونکہ میں یہ بات دوبارہ نہیں کہوں گا۔ اب اگر تم نے میری بابت اس قسم کی بات کہیں بھی کی تو تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ میں تمہارا وکالت کا لائسنس ضبط کروا دوں گا۔“

”ضرور...... مگر اس سے پہلے تمہیں یہ بتانا ہوگا کہ اس شام جب نازلی آپا کا قتل ہوا تم کہاں تھے؟“ خسرو بولا۔

"میں تمہیں کچھ بھی بتانے کا پابند نہیں ہوں۔"

"ابھی نہیں...... مگر تم پولیس کو بھول رہے ہو۔ اسے تم تک پہنچنے میں بہت دیر نہیں لگے گی۔"

فیصل چند لمحے بالکل خاموش رہا جیسے خود پر قابو پا رہا ہو پھر سرد آواز میں بولا۔ "یہاں سے چلے جاؤ خسرو...... فوراً۔" خسرو اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی کھڑا ہو گیا تھا۔

☆☆☆

ثنا گھر میں داخل ہوئی تو خسرو کو صوفے پر لیٹے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"تم...... کیا ہوا؟" وہ تیزی سے اس کے قریب آئی اس کی نظر اس کے چہرے پر پڑے نیل اور خراش پر پڑی پھر اس نے اس کا سوجا ہوا ہاتھ دیکھا۔

"یہ سب کیا ہے؟ فوراً بتاؤ۔"

"میرا جنید سے جھگڑا ہو گیا ہے۔"

"اوہ...... یہاں......؟" وہ سنجیدہ پڑ گئی۔

"نہیں، اس کے گھر پر۔" وہ بولا۔ "اور تم ڈر کیوں رہی ہو، میں اسے زمین پر لٹا کر آیا ہوں۔"

"خسرو تم کیوں الجھ رہے ہو ان سب سے آخر......" پوری بات سن کر وہ چند لمحے چپ رہی پھر بولی۔ "تمہیں ڈاکٹر کے پاس جانا چاہیے۔"

"ہاں، یہ میں بھی سوچ رہا ہوں اور تمہیں فکرمند ہونے کی بالکل ضرورت نہیں ہے میری جھانسی کی رانی۔"

"تم میری جیسن مت بنو خسرو اور اپنا خیال رکھو۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"اگر تم مجھے ایک کپ گرما گرم کافی اور اسنیکس پلاؤ تو میں تمہاری درخواست پر غور کر سکتا ہوں۔" وہ مسخروں کی طرح بولا۔

کافی کے دوران اس کا فون بجا تھا۔

"بھائی جان ہیں۔" ثنا نمبر دیکھ کر بولی۔ خسرو کے کندھے اچکانے پر اس نے اسے گھورا اور موبائل کان سے لگا لیا۔

"جی بھائی...... جی گھر پر ہیں، آپ ان سے بات کریں گے؟ اچھا ضرور...... انہیں بہت اچھا لگے گا۔" پھر اس نے موبائل میز پر رکھ دیا۔ خسرو متوقع نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"بھائی جان آ رہے ہیں وہ ڈنر تمہارے ساتھ کریں گے۔" ثنا بولی۔ "مجھے وہ کچھ مضطرب لگ رہے تھے۔"

"شاباش...... وہ یقیناً مجھے ڈنر سرو فرمائیں گے۔" وہ بولا۔

"وہ میرے بھائی ہیں۔"

"خبر کا شکریہ...... کم از کم اس وجہ سے میں دل کی گہرائی سے اسے "سالا" تو کہہ سکتا ہوں۔" خسرو بولا۔ "میں ڈاکٹر کے پاس سے ہو کر آتا ہوں، تم دروازہ لاک رکھنا۔"

"اوکے اور پلیز ان سے لڑنا مت۔"

"یعنی......" خسرو ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔

"اچھا اچھا...... میرا مطلب ہے کہ رُڈ ایکٹ مت کرنا۔"

"ہوں، اب کچھ بہتر ہے۔" وہ سر ہلا کر بولا اور باہر نکل گیا۔

واپسی پر ثنا دروازے پر ہی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

"کیا ہوا؟"

"کچھ بھی نہیں...... بھائی جان آ گئے ہیں۔ کیا کہا ڈاکٹر نے؟"

"ہڈی ٹوٹی نہیں ہے شکر ہے، اس نے بینڈیج کر دی ہے۔" وہ بولا۔ "کہاں ہیں وہ......؟"

"اندر ڈرائنگ روم میں۔" وہ بولی۔ وہ قدرے دباؤ کا شکار نظر آ رہی تھی۔

"آ گئے تم......" نادر اسے دیکھ کر بولا۔ "تم سمجھ گئے ہو گے کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔"

"نہیں۔" خسرو نے معصومیت سے اسے دیکھا۔

"مجھے فیصل سجاد نے فون کیا تھا۔ وہ انتہائی غصے میں تھا۔ اس نے تم پر مقدمہ کرنے کی دھمکی دی ہے۔ تم نے آخر یہ حماقت کیوں کی؟ کیا تمہیں اس کے نتائج کا اندازہ نہیں تھا؟" وہ غرایا۔

"وہ کوئی مقدمہ نہیں کرے گا نادر اور تم یہ جانتے ہو۔"

"واہ، تم اس کی گارنٹی دے رہے ہو؟"

"ہاں، اول تو میں نے اس سے کوئی غلط بات کی ہی نہیں ہے دوسرے یہ کہ وہ تم سے زیادہ اس حقیقت کو چھپانے میں دلچسپی لے گا۔"

"کس حقیقت کی بات کر رہے ہو؟"

"یہ کہ نازلی اور اس کے درمیان تعلق تھا۔"

"اف میرے خدا!" نادر نے غصے میں میز پر مکا مارا۔ "اب تمہیں یہ وجدان کیسے ہوا؟!"

"سامنے کی بات ہے، جمشید شہر سے باہر تھا، جنید اس روز وہاں نہیں گیا پھر کوئی ایسی شخصیت رہ جاتی ہے جس سے نازلی تنگ ہو اور اس کے لیے ملازموں کو چھٹی بھی مل جاتی ہو، عارضی چوکیدار کے مطابق وہ بڑی بھی گاڑی پر دوسرے دن وہاں آئی تھی جو فیصل سجاد کی ہے۔ جنید نے بھی ان دونوں کو کئی مرتبہ ساتھ دیکھا ہے۔ فیصل 25 سال سے نازلی کے ساتھ کام کر رہا ہے اور اس کی بیوی اس سے اس حد تک حسد کرتی ہے کہ اس کی موت پر اس نے خوشیاں منائی ہیں۔ میری اطلاع کے مطابق نازلی حال ہی میں اپنی دوست سے طلاق حاصل کرنے کے حوالے سے معلومات بھی لیتی رہی ہیں۔"

"تمہارے خیال میں یہ ثبوت ہیں؟"

"میرے خیال میں یہ سب مذاق تھا مگر جب میں نے فیصل سے اس بابت سوال کیا تو اس نے عجیب و غریب رویہ اختیار کیا۔"

"تمہاری یہ تھیوری سب کچھ برباد کروا دے گی۔"

"وہ کیسے؟"

"وہ ایسے کہ اس طرح پولیس کو جمشید کے قاتل ہونے کا محرک مل جائے گا۔ بیوی کا عاشق...... تعلقات کا علم ہو جانے پر اس نے بیوی کو قتل کر دیا۔"

"مگر ہمیں ایک اور مشکوک نام بھی مل رہا ہے، اس وقت تو میڈیا اور پولیس دونوں ہی اس کے خلاف ہیں۔ جنید کے پاس گواہی موجود ہے۔"

"ہاں، جنید کے ساتھ تمہاری کیا بات ہوئی تھی، مجھے ساری تفصیل بتاؤ۔"

"اور پھر تمہاری اس سے لڑائی ہو گئی۔" وہ ساری تفصیل سن کر بولا۔ "میں تمہیں کس طرح سمجھاؤں، ہماری فرم کی اپنی ایک ریپوٹیشن ہے خسرو، ہم پاگلوں سے لڑتے نہیں اور نہ فیصل جیسے لوگوں کی بے عزتی کرتے ہیں کیونکہ اس طرح ہم کام نہیں کر سکتے۔ چھ سال میں بھی تم اپنی ذمے داری نہیں سمجھ سکے۔ میں نے اس فرم کو بنانے میں پوری عمر لگائی ہے اور میں تمہیں صرف اس لیے اسے تباہ کرنے کی اجازت نہیں دوں گا کہ تم نے میری بہن سے شادی کی ہے۔" وہ غرایا۔

خسرو اس بات کا جواب دے سکتا تھا مگر اس نے آخری لمحے پر اپنا منہ بند کر لیا۔ اسے ثنا سے اپنا وعدہ یاد تھا۔

"مسئلہ یہ ہے کہ جنید کو مشکوک افراد میں شامل کیے بغیر سارا الزام جمشید پر کر رہا ہے اور جنید اس قتل کا ذمے دار نہیں ہے۔"

"ابھی تم اس سے لڑ کر آئے ہو اور پھر بھی اس کی طرفداری کر رہے ہو۔"

"وہ پاگل ہے مگر مجھے یقین ہے کہ اس نے یہ قتل نہیں کیا۔"

"وہ جنونی ہے اور جنون میں کچھ بھی کر سکتا ہے، تم نے دیکھا نہیں کہ وہاں نازلی کی تصویر کا کیا حال تھا۔"

"اور اسی وجہ سے تم نے ثنا کو وہ ریوالور دیا۔"

"تو اور کیا کرتا...... تمہیں ایسے ایڈونچرز سے فرصت نہیں، میری بہن کو اسی گھر میں رہنا ہے تو اب اس کی حفاظت کے لیے کچھ تو ہو۔"

"میں نے اسے رکھنے کی فی الحال اجازت دے دی ہے مگر اگلی بار میرے گھر میں کسی ہتھیار کے داخلے سے قبل تمہیں مجھ سے پوچھنا چاہیے۔" خسرو سنجیدگی سے بولا۔

"میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔" نادر اس کی بات نظر انداز کرتا ہوا بولا۔ "کہ کمپنی کے سینئر پارٹنر کی حیثیت سے میں تمہیں اس کیس سے ہٹا رہا ہوں، کل تم اپنے دفتر جاؤ گے اور آرام سے بیٹھ کر شہر یار اینڈ کمپنی کے مقدمے کی تیاری کرو گے۔ جمشید اور نازلی کیس اب میں خود دیکھ رہا ہوں۔"

"تم انسانوں کو اپنی جاگیر بنا کر ان پر قبضہ کرنے اور پھر اس قبضے کو قائم رکھنے کے خبط میں مبتلا ہو نادر...... کیا تمہیں معلوم ہے؟" خسرو نے ملامت سے پوچھا۔ "اور اسے محبت کا نام بہرحال نہیں دیا جا سکتا۔"

"میں یہ بکواس......" نادر دہاڑا، عین اسی وقت ثنا کھانے کے لیے بلانے کمرے میں داخل ہوئی اور ٹھٹک کر اپنی جگہ کھڑی ہو گئی۔ اسے دیکھ کر نادر چپ ہو گیا پھر بولا۔ "بقیہ بات دفتر میں ہو گی۔ ثنا ہم آ رہے ہیں۔" اس کا لہجہ یک دم بدل گیا۔

کھانا خاموشی سے کھایا گیا۔ چائے پر وہ دونوں ہلکی پھلکی گپ شپ کرتے رہے اور پھر نادر رخصت ہو گیا۔ جاتے جاتے وہ اپنی بات دہرا گیا تھا۔

"ثنا اگلا ہفتہ خسرو کے لیے بہت اہم ہے، ہمارے ایک بڑے کلائنٹ شہریار اینڈ کو کا مقدمہ تیار کرنا ہے۔" وہ بات ثنا سے کر رہا تھا مگر اس کی نگاہیں خسرو پر تھیں۔ خسرو اس دوران لاتعلق بنا چائے پیتا رہا۔ ثنا، نادر کو چھوڑنے دروازے تک گئی تب ہی خسرو کا فون بجا۔

"خسرو...... کیا تم مجھ سے فوراً مل سکتے ہو؟" دوسری طرف ایک جانی پہچانی آواز اسے پکار رہی تھی۔

☆☆☆

خسرو نادر کے سامنے ہی ثنا کو دروازہ لاک رکھنے کی ہدایت دے کر گھر سے نکل گیا۔ جمشید اس کا منتظر تھا۔

”میں نے تمہیں بے آرام کیا...... اصل میں کچھ دیر پہلے جنید کا فون آیا تھا۔ وہ پاگل ہو رہا تھا مگر وہ بتا رہا تھا کہ تم نے اس سے فیصل سجاد کے بارے میں سوالات کیے ہیں؟“ وہ پوچھتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔

”ہاں، میں گیا تھا اور میں نے سوالات بھی کیے تھے۔“ خسرو نے سادگی سے کہا۔ ”مگر اب نادر نے آپ کا کیس مجھ سے واپس لے لیا ہے، اس کا خیال ہے کہ میں آپ کو نقصان پہنچا رہا ہوں۔“

”ایسا نہیں ہے۔“ وہ فوراً بولا۔ ”میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ حقیقت کا سامنا ہی سکون کا سبب بن سکتا ہے۔ فرار بے سکونی کا دوسرا نام ہے اور یہی میں نے ساری زندگی کیا ہے۔ میں یہ جنگ نہیں چلانا چاہتا تھا مگر مجھے چلانا پڑا۔ میں اسی لیے وہاں بھی زیادہ کامیاب نہیں ہو سکا اور نہ ہی یہاں...... تم جانتے ہو کہ ہماری شادی صرف دکھاوا تھی۔“ وہ کچھ لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ ”ہم کبھی ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہے۔ رہ ہی نہیں سکتے تھے۔ تمہیں معلوم ہے کل رات میں نے اس کے بارے میں شروع کے دنوں کی باتیں یاد کرنے کی کوشش کی تو کیا یاد آیا...... یہ کہ وہ ہمیشہ جھگڑتی رہنے والی تھی۔ یہی ہماری زندگی اور اس کا اثر جنید میں آیا۔ اس نے اچھے اور برے وقت نہیں دیکھے۔ میں ہر چیز سے لاتعلق رہا اور نازلی ہر چیز کو ملکیت کی طرح رکھتی۔ اس سب نے اسے ایسا بنا دیا۔“

”نادر اسے نازلی زیبا کا قاتل سمجھتا ہے۔“

”یہ سوچنا بھی بہت خوفناک ہے، یہ صرف وہ تھا جس کی وجہ سے یہ دکھاوا چلتا رہا۔“ وہ لرز کر بولا۔

”مگر ان کے پاس اس کی بیوی کی گواہی ہے۔“

”بیوی؟“

”ہاں اس نے شادی کر لی ہے اور وہ لڑکی اچھی ہے، اس کی پروا کرنے والی۔“

”یہی اسے چاہیے تھا...... تم نے دیکھا کہ اس نے ہمیں بتانا بھی گوارا نہیں کیا مگر شاید وہ بھی ٹھیک ہے۔ کیا تمہارا اس سے جھگڑا ہوا تھا؟“

”ہاں...... مگر وہ بات ختم ہو گئی ہے۔“ خسرو بولا۔

”میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا تھا۔“ وہ ہچکچایا پھر بولا۔ ”تم نے فیصل سجاد کی بات کیوں کی تھی؟“

”کیونکہ مجھے یہ نظر آ رہا ہے۔“ خسرو بھی ہچکچاتے ہوئے بولا۔

”وہ عرصے سے ساتھ تھے اور یہ ناممکن نہیں ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تم میرے لیے اس کا پتا چلاؤ۔“

”ناممکن...... نادر یہ کیس لے چکا ہے۔“

”مگر میں جاننا چاہتا ہوں، میں حقیقت جاننا چاہتا ہوں چاہے وہ کچھ بھی ہو، تم نے اخبار دیکھے؟ لوگوں کی باتیں سنیں؟ وہ مجھے قاتل سمجھ رہے ہیں مگر میں نے یہ نہیں کیا اور میں اس دھند میں رہنا نہیں چاہتا۔“

”ایس پی نے یہ معلوم کر لیا ہے کہ آپ نے نازلی کو دو منٹ نہیں بارہ منٹ کی کال کی تھی۔“ اسے یاد آیا۔

”ہاں، حماقت کی میں نے۔ اصل میں ہم فون پر لڑ رہے تھے، میں اس کے بارے میں بات نہیں کرنا چاہ رہا تھا ویسے بھی وہ سب ذاتی باتیں تھیں، الزامات، مایوسیاں اور کچھ بھی نہیں، حتیٰ کہ اس نے مجھے وصیت کے بارے میں بھی نہیں بتایا۔“ وہ بولا۔ ”خسرو مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

خسرو سوچ میں پڑ گیا پھر بولا۔ ”آپ کلائنٹ ہیں، آپ چاہیں تو نادر کو بتا سکتے ہیں کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔ اسے آپ کی بات ماننا ہی ہو گی۔“

”میں یہ کر لوں گا۔“ وہ فوراً بولا۔ ”تمہاری اس سے نہیں بن رہی تھی۔“

”چل رہا ہے سب...... میں ثنا کے وعدے کا پابند ہوں۔“

”اس نے ثنا کے ساتھ بھی یہی کیا ہے، ماں کی موت کے بعد اس نے ماں باپ بن کر پالا مگر اپنے حکم کا پابند رکھا۔ اسے صرف ہمارے گھر میں سوچ کی آزادی ملی تھی۔ مجھے تو حیرت ہے کہ اس نے تمہارے حوالے سے اتنا بڑا فیصلہ کیسے لے لیا، یہ اس کی زندگی کا واحد اپنا فیصلہ ہے۔“

”مجھے شروع ہی میں اسلام آباد چلا جانا چاہیے تھا۔“ خسرو مایوسی سے بولا۔

”اپنی محبت پر بھروسا رکھو...... نادر کی یہی سب سے بڑی خامی ہے، وہ دوسروں کی زندگیوں پر کنٹرول رکھنا چاہتا ہے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ میرے لیے کام کر کے تمہارا کیریئر اور شادی متاثر ہو مگر اب تمہارے سوا کوئی اور میری مدد نہیں کر سکتا۔“ وہ بے چارگی سے بولا۔

”میری شادی میری محبت ہے جو میری زندگی کے ساتھ ہے اور کیریئر بے شمار کلائنٹس ہیں اور کام بھی بہت مگر

ان میں سے چند ہیں جو مجھے پسند ہیں اور صرف ایک میرا دوست ہے اور وہ آپ ہیں۔'' خسرو بولا۔ ''یوں بھی میں وہ کرتا ہوں جو میں چاہتا ہوں، میرے بابا کہا کرتے تھے کہ زندگی کا حاصل یہ ہے کہ بندہ ایسے کام کرے جسے کر کے مطمئن ہو کر سو سکے۔''

''زبردست..... دیکھو میں نے اپنی ماتحتیوں میں سب کچھ بگاڑ رہا، اپنے بیٹے تک پر توجہ نہ دے سکا، تم ایسا مت کرنا۔''

''اس وقت میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں باقی کا پھر سوچوں گا۔'' خسرو دل کھول کر مسکرایا۔

''سچ؟'' اس کے سوال میں شکر، فکر اور اطمینان سب کچھ تھا۔ ''تم نہیں جانتے مجھے اس سے کتنا سکون ملا ہے اور تم نادر کی فکر مت کرنا، میں اس سے خود بات کرلوں گا۔''

''میں چلتا ہوں۔'' خسرو کھڑا ہوتا ہوا بولا۔

وہ گھر پہنچا تو ثنا صوفے پر سوئی ہوئی تھی۔ ریوالور اس کے سامنے میز پر پڑا تھا۔ خسرو اس کی نیند خراب نہیں کرنا چاہ رہا تھا اس لیے وہ بھی قالین پر تکیہ لگا کر لیٹ گیا۔

صبح ان دونوں کی آنکھ ایک ساتھ ہی کھلی تھی۔ رات کی بدمزگی کو یا دن کی روشنی میں غائب ہو گئی تھی۔ کافی عرصے بعد وہ دونوں صبح کی واک پر ساتھ گئے۔ حلوہ پوری کا ناشتا کیا اور گھر لوٹ آئے۔ ایک گھنٹے بعد جب خسرو دفتر کے لیے نکلا تب وہ بے حد خوش تھا۔

وہ گنگناتا ہوا اپنی گاڑی تک آیا۔ اندر بیٹھنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ ونڈ شیلڈ پر کوئی کاغذ چپکا ہوا ہے۔ وہ اس کی موجودگی میں کار نہیں چلا سکتا تھا۔ وہ نیچے اترا، اس نے کاغذ کو ونڈ شیلڈ سے اتارا اور بونٹ پر رکھ کر سیدھا کیا۔

وہ ثنا کی اخبار میں چھپی ہوئی ایک تصویر تھی۔ کسی نے اس کے ہونٹوں پر پنسل سے نشان بنا کر لٹکتی ہوئی زبان بنا دی تھی اور اس کی آنکھوں کی جگہ صرف دو سوراخ نظر آ رہے تھے۔

☆☆☆

وہ دیوانوں کی طرح دروازہ پیٹ رہا تھا۔

''تم..... کیا ہو گیا ہے؟'' ثنا دروازہ کھول کر حیران رہ گئی۔

''تم ٹھیک ہو نا؟'' خسرو اسے اپنے قریب کرتے ہوئے بولا۔

''ہاں، میں تو چیٹنگ شروع کر رہی تھی، کیا ہوا ہے خسرو؟''

''یہ.....'' وہ میز پر کاغذ بچھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ میری گاڑی کے ونڈ اسکرین پر لگا ہوا تھا۔''

ثنا چند لمحے خاموشی سے اسے دیکھتی رہی پھر کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''نازی آپا کی تصویر کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا نا؟''

''ہاں، یہ ہمیں ڈرانے کی کوشش ہے۔''

''مگر کیوں؟''

''یہ میں نہیں جانتا مگر اب تم یہاں اکیلی نہیں رہو گی۔ میں تمہیں صولت آپا کے گھر چھوڑتا ہوا جاؤں گا۔'' اس نے اپنے دوست کی بہن کا نام لیا۔ ''ان کا بھرا پرا کنبہ ہے تم وہاں محفوظ رہو گی۔''

''مگر ہمیں پولیس کو خبر کرنا چاہیے۔''

''وہ تو کریں گے ہی مگر تمہاری حفاظت پہلے ضروری ہے، کل رات جمشید نے مجھ سے اس کیس میں مدد مانگی ہے۔''

''اور تم نے حامی بھر لی؟'' اس نے پوچھا۔ ''بھائی جان کے منع کرنے کے باوجود؟''

''ہوں۔'' خسرو نے سر ہلایا۔ ''اسی لیے تمہاری حفاظت بہت ضروری ہے، پولیس حفاظت کر سکتی ہے مگر یہ ان کی اس طرح ترجیح نہیں ہوگی جیسے ہماری ہے۔''

وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر مضبوط لہجے میں بولی۔ ''مگر میں یہیں رہوں گی۔''

''پلیز ثنا! یہ ضد کا وقت نہیں ہے صرف اس معاملے کے حل ہونے تک ہمیں یہ کرنا ہے۔ تمہاری حفاظت کے علاوہ میں تمہیں اپنے اور نادر کے درمیان پریشان بھی دیکھنا نہیں چاہتا پھر تم خود سوچو تم کل رات اتنی خوف زدہ تھیں کہ پستول سامنے رکھ کر سوئی تھیں اور اب اس کے بعد.....''

''اور اگر تمہیں کچھ ہو گیا۔'' وہ رو پڑی۔

''کچھ نہیں ہوگا۔ میں محتاط رہوں گا۔'' وہ بولا۔

''آخر تم اور بھائی جان کب تک میرے لیے فیصلے کرتے رہو گے، میں تھک گئی ہوں اس سب سے، اب میں خود بتاؤں گی کہ مجھے کیا کرنا ہے۔'' وہ پھٹ پڑی۔

''خیر مجھ پر تو تم ہمیشہ سے ہی حکم چلاتی آئی ہو، نہ صرف اپنے فیصلے خود کرتی ہو بلکہ مجھے کیا کرنا ہے یہ بھی تم ہی طے کرتی ہو، یہ دیکھو، آج یہ شرٹ بھی تمہاری وجہ سے ہی پہنی ہے میں نے۔'' خسرو کے مسخرانہ انداز پر اسے غصے میں بھی ہنسی آ گئی۔

''پلیز ثنا! میرے پاس صرف تم ہو اور تم میرے لیے

کتنی قیمتی ہو۔ یہ تم جانتی ہو، ہم ساری زندگی لڑتے جھگڑتے رہیں گے مگر اس وقت تم میری بات مان لو۔"

"او کے، لیکن اگر تمہیں کچھ ہوا تو میں تمہیں چھوڑوں گی نہیں۔" وہ بولی اور کھڑی ہو گئی۔

اسے صولت آپا کے حوالے کر کے خسرو سیدھا پولیس اسٹیشن گیا۔ اس نے ایس پی کی میز پر وہ تصویر رکھ دی تھی۔

"تمہیں کسی پر شک ہے؟" اس نے اس "آرٹ ورک" کا معائنہ کر کے اس سے پوچھا۔

"نہیں.... اس کی واضح وجہ نازلی کیس ہے۔ ایس پی مجھے اپنی بیوی کے لیے پولیس پروٹیکشن چاہیے۔"

"اور تم ہمارے لیے کیا کرو گے؟" وہ غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ کیا تم مجھے اس ہری لمبی کار کے مالک کا نام بتا سکتے ہو جو نازلی سے روز ملنے آتا تھا۔ ہمیں اس بارے میں فیروز خان سے معلومات ملی ہیں، تم بھی تو ملے تھے ہو نا اس سے؟"

"یہ میرے علم میں نہیں ہے۔" خسرو بولا۔

"مطلب تم تعاون نہیں کرو گے۔" وہ سر ہلا کر بولا۔

"پھر تم اپنی بیوی کو کسی دوسرے شہر گھومنے بھیج دو۔"

"وہ میرے بغیر نہیں جائے گی اور میں نہیں جا سکتا، اس کے علاوہ حکومت تمہیں ہمارے ٹیکس سے تنخواہ اس لیے نہیں دیتی کہ ہم تمہیں تمہارے کیس حل کر کے دیں اور ہماری حفاظت تمہارا کام ہے۔" خسرو اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

"میں جانتا ہوں۔" اس نے کاغذ پر چند نمبر لکھ کر اس کی طرف بڑھائے۔ "یہ دو ایمرجنسی نمبرز ہیں، یہ میرا اور انسپکٹر جعفر کے نمبر ہیں۔ دن میں گھر پہ پولیس رہے گی، رات کو مجھے امید ہے کہ تمہاری موجودگی کافی ہو گی۔"

"ٹھیک ہے۔" خسرو بولا اور باہر نکل آیا۔

دفتر پہنچ کر بھی وہ مسلسل سوچ رہا تھا۔ اس کا ذہن اسے اس معاملے کی ایک الگ تصویر دکھا رہا تھا۔ بالآخر اس نے فون کا ریسیور اٹھا لیا۔

نو دس کالز اور معلومات کے حصول کے بعد وہ اب پروفیسر صفدر علی کو نمبر ملا رہا تھا۔

"پروفیسر میں خسرو بول رہا ہوں، مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ نے نظام انصاف پر دو اہم کتابیں لکھی ہیں، مجھے آپ سے جج شفیق احمد کے اس کیس کے بارے میں بات کرنی تھی جس کی وجہ سے انہیں کافی دباؤ کا سامنا کرنا پڑا تھا۔"

"ہوں، وہ تو کافی پرانی بات ہے۔"

"جی، میں ان کی بیٹی نازلی اور داماد جمشید کا وکیل ہوں۔ نازلی کو گزشتہ دنوں ان کے گھر میں قتل کر دیا گیا تھا۔"

"ہاں، میں نے پڑھا تھا شاید پولیس کو اس کے شوہر پر شک ہے، مگر تم کیا جاننا چاہتے ہو؟"

"میں نے اس کیس پر معمولی سی ریسرچ کی ہے، اس میں پھانسی پانے والے کا ایک چھ سات سال کا لڑکا بھی تھا۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ وہ اب کہاں ہے؟"

"نہیں۔"

"کوئی اور جو اس بارے میں کچھ تفصیلات بتا سکے۔"

"تقریباً سارے ہی لوگ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ ہاں منشی اسلم زندہ ہے وہ اس بارے میں سب کچھ بتا سکتا ہے۔"

"اس کا کوئی پتا ٹھکانا؟"

"منشی اسلم ریٹائرڈ ہو چکا ہے۔ کراچی کے مضافاتی علاقے میں رہائش پذیر ہے۔ میں اس کا پتا آپ کو دے سکتا ہوں۔" وہ پتا لکھواتے ہوئے بولا۔ "مگر وہ انتہائی بوڑھا ہو چکا ہے۔ ویسے وہ لڑکا، اگر زندہ ہوا تو پچاس سال سے زیادہ کا ہو چکا ہو گا۔"

"جی، مجھے اندازہ ہے۔" خسرو نے شکریہ ادا کرتے ہوئے فون رکھ دیا۔ اب اس کا رخ منشی اسلم کی رہائش گاہ کی طرف تھا۔

اسے منشی اسلم کا مکان تلاش کرنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی تھی۔ دروازہ خود اس نے کھولا تھا۔

"آپ کو مجھ سے کیا ضروری کام ہے؟" وہ اس کی بات سن کر بولا۔

"مجھے آپ سے جج شفیق احمد کے کیس کے بارے میں بات کرنی تھی۔"

"اس بات کو آدھی صدی ہو گئی ہے اور میں اس حوالے سے کچھ کہنا نہیں چاہتا۔"

"مگر نازلی جمشید کے حوالے سے شاید آپ کچھ کہنا چاہیں جو جج کی بیٹی تھیں اور ان کا قتل ہو گیا ہے، میں ان کے شوہر کا وکیل ہوں۔"

"اوہ...... مجھے افسوس ہوا۔" وہ بولا۔ "آپ جاننا کیا چاہتے ہیں؟"

"یہی کیا ہوا تھا اور اس شخص کے خاندان میں کون کون تھا۔ میں نے فائلز میں دیکھا ہے اس میں ایک بیٹے اور بیوی کا ذکر ہے، وہ بعد میں کہاں گئے؟"

"اتنی تفصیلات کا تو مجھے بھی علم نہیں، بس یہ معلوم ہے کہ یہ متنازع کیس بن گیا تھا۔ امروز خان جس بنگلے پر ملازم تھا اس کی مالکن کو کسی نے قتل کر دیا تھا اور اس پر یہ الزام ثابت ہو گیا تھا۔ وہ چلاتا رہا کہ یہ قتل اس نے نہیں کیا ہے مگر جج شفیق احمد اس پر برس پڑے اور انہوں نے اسے پھانسی کی سزا دی اور اسے پھانسی ہو گئی۔ اس کی بیوی ایک سات آٹھ سال کے لڑکے کے ساتھ آتی تھی۔ آخری پیشی پر اس کے الفاظ مجھے اب تک یاد ہیں، اس نے کہا تھا کہ ہمارے ہاں بدلہ پرانا ہوتا ہے نہ پرسہ۔ میں بے گناہ ہوں اور تم کو اس کا جواب دینا ہوگا۔" اور واقعی ایسا ہی ہوا، اس کیس کی وجہ سے بعد میں جو شور اٹھا وہ جج کی نیک نامی، شہرت، کرسی سب ساتھ لے گیا۔"

"اس کی بیوی اور بچہ؟ ان کی کوئی خبر؟"

"نہیں، آخری روز میری ان دونوں سے قدرے تفصیلی بات ہوئی تھی۔ وہ عورت عدالت میں بے ہوش ہو گئی تھی۔ میں نے ان دونوں کو پانی وغیرہ پلوایا تھا اور کچھ دیر انہیں کمرے میں جگہ دی تھی۔"

"وہ لڑکا دیکھنے میں کیسا تھا؟ کیا آپ کو اس کا نام یاد ہے؟" ایک خیال سوال بن کر خسرو کی زبان پر آ گیا۔

"ہاں..... شاید تھوڑا بہت۔ وہ عام پٹھان بچوں کی طرح تھا۔ ہاں اس کی داہنی آنکھ بھینگی تھی، اتنی زیادہ کہ پہلی نظر میں محسوس ہو جاتی تھی اور اس کا نام......" وہ ذہن پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "میں باتیں بھولتا نہیں ہوں مگر یہ خاصی پرانی بات ہے۔ شاید اس کا نام فیروز تھا ہاں اس کا نام فیروز خان ہی تھا۔" اس نے اس کے بعد بھی کچھ کہا تھا مگر خسرو کا ذہن دور ٹوٹی پھوٹی سڑک کی داہنی جانب کے جو تھے کوارٹر کی طرف سفر کر رہا تھا۔

☆☆☆

خسرو اب اسی ٹوٹی پھوٹی سڑک پر ڈرائیو کر رہا تھا۔ ثنا کی تباہ حال تصویر نے اس مسئلے کو اس کے لیے بہت زیادہ ذاتی بنا دیا تھا۔ شاید اسی چیز نے اسے اتنا بے خوف کر دیا تھا کہ وہ پولیس کو مطلع کیے بغیر تنہا دوبارہ فیروز خان سے ملنے نکل کھڑا ہوا تھا۔ وہ اپنے کوارٹر میں نہیں تھا۔ ایک پڑوسی کی نشاندہی پر خسرو کچھ آگے لگے نیم کے بہت بڑے درخت کے پاس پہنچا۔ وہ وہیں چارپائی ڈالے بیٹھا تھا۔

"تم..... پھر ادھر آ گیا؟" وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"کیا اس نے تمہیں پہچان لیا تھا؟" خسرو اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"تم نے مجھے پہچان لیا؟ کیسے؟"

"تفتیش سے..... اب کچھ بھی چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے فیروز خان..... تم ایک بہادر باپ کے بیٹے ہو، امید ہے جھوٹ نہیں بولو گے۔"

"ام نے اس کا خون نہیں کیا۔" وہ سچائی سے بولا۔

"تم نے اسے ڈھونڈا، وہاں ملازمت حاصل کی۔" خسرو نے کہا۔

"ہاں، اس نے امارے باپ کو بے گناہ مارا، اس پر الزام لگایا، بابا نے کہا تھا بدلہ اور پرسہ پرانا نہیں ہوتا۔"

"مگر اس نے ان کو نہیں مارا تھا۔ وہ ایک بے گناہ عورت تھی۔"

"اسی خیال نے ام کو روک دیا صیب، آخری دن روک دیا، ام خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہے ام نے اس کا خون نہیں کیا۔"

"تمہیں یہ پولیس کو بتانا چاہیے۔"

"ام کو کسی پر اعتبار نہیں ہے، غریب آدمی بے قصور ہو تب بھی سزا اسی کو ملتی ہے، ہمارا باپ کا مثال کافی ہے ہمارے لیے۔"

"کون یہ مانے گا..... تم نے اسے تلاش کیا اور پھر چھوڑ دیا؟"

"ہاں، کیونکہ وہ ایک ناخوش عورت تھا۔ وہ کئی بار امارے سامنے آیا..... ہر بار ام نے اس کو قتل کرنا سوچا مگر اس کو مارنا بزدلی لگا۔ اس روز صبح ام پیسا لینے گیا تھا، اس روز وہ ملازم عورت نہیں تھا اس نے ام کو پیسا دیا۔ ام واپس آیا جب ام باہر نکل رہا تھا تب بڑی کار اندر آیا..... ام کو اگلے روز رات دیر سے معلوم ہوا کہ اس کا خون ہو گیا ہے۔ یہی سچ ہے۔"

"فیروز خان جس نے نازلی جمشید کا خون کیا ہے اس نے میری بیوی کو قتل کرنے کی دھمکی بھی دی ہے۔"

"پھر پولیس کے پاس جاؤ آپ....." وہ بولا۔ "مگر امارا پیچھا چھوڑ دو، ام جانتا ہے امارا سچائی آپ کو نظر نہیں آئے گا مگر ام سچ کہہ رہا ہے اور اب اگر آپ نے ام کو تنگ کیا تو ام آپ کا خون کر دے گا۔ چاقو ہے امارے

پاس۔" وہ غرایا۔ "پولیس بھی آچکی ہے اور......"

خسرو کھڑا ہو گیا۔ "خان زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ہاں اپنے پیاروں کی حفاظت کے لیے میں سب پر شک کرنے پر مجبور ہوں۔ میں یہ ساری حقیقت پولیس کو بتاؤں گا اور اب میں جا رہا ہوں تم چاہو تو مجھے قتل کر دو۔" وہ یہ کہہ کر اپنی گاڑی کی طرف چل دیا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے درخت کی طرف دیکھا وہ اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں تھا مگر اس کی نگاہیں خسرو پر جمی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

خسرو نے راستے سے ایس پی کو فیروز خان اور اس کی بابت تفصیلات سے آگاہ کر دیا تھا۔ اس کے گھر پہنچنے سے پہلے پولیس نے اسے گرفتار بھی کر لیا۔ منطقی طور پر سب کچھ ٹھیک نظر آ رہا تھا۔ قاتل بھی مل گیا تھا اور وجۂ قتل بھی سامنے آ گئی تھی مگر خسرو کا دل مطمئن نہیں تھا۔ کہیں کچھ غلط تھا جو اسے پرسکون ہونے نہیں دے رہا تھا۔ گھر پہنچتے ہی اس نے اپنا فون بند کر دیا تھا۔ فون بند کرنے سے پہلے البتہ اس نے جمشید کو کال کی۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ چوکیدار ہی قاتل ہے؟" اس نے پہلا سوال یہی کیا جو اسے پہلے ہی مضطرب کر رہا تھا۔

"لگ تو یہی رہا ہے اور ایسا ہے تو آپ اس طوفان سے باہر آ گئے ہیں۔"

"ہاں، شکر ہے خدا کا...... تم بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہو، آرام کرو۔ ہم کل صبح بات کرتے ہیں۔" ثنا اس کے فون رکھنے کا انتظار کر رہی تھی۔

"تم کیا کرنا چاہتے ہو؟" اس نے کڑے تیوروں سے پوچھا۔

"میں تمہیں محفوظ دیکھنا چاہتا ہوں۔" خسرو بمشکل مسکرایا۔ "ثنا اس وقت میں بہت الجھا ہوا ہوں۔ اگر فیروز خان قاتل ہے تو اس نے مجھے صرف دھمکی دے کر کیوں چھوڑ دیا وہ وہاں اپنے علاقے میں مجھے آسانی سے مار سکتا تھا؟" وہ اپنی کنپٹیاں دباتے ہوئے بولا۔

"سوال یہ ہے کہ تم خودکشی کی کوششیں کیوں کر رہے ہو؟" ثنا پھٹ پڑی۔ "اگر وہ تمہیں مار دیتا تو تم مطمئن ہو جاتے کہ وہ قاتل ہے۔ فارگاڈ سیک یہ تمہارا کام نہیں ہے...... تمہیں میری پروا بھی نہیں ہے۔"

"مجھے صرف تمہاری پروا ہے میری میڈم...... اور اب بس آج کے لیے اتنا رولا کافی ہے اگر تمہیں اپنے شوہر کی نامداری کی فکر ہے تو مجھے کچھ کھلا دو ورنہ میں بھوکا ہی انتقال کر جاؤں گا کسی کی کوشش کے بغیر۔"

"تم کبھی نہیں سدھرو گے۔" وہ کچن کا رخ کرتے ہوئے بولی۔

☆☆☆

وہ فیروز خان کو اپنے سامنے دیکھ کر چونک گیا۔ اس کے ہاتھ میں بڑا سا خنجر تھا۔ اس نے قریب آ کر خنجر والا ہاتھ فضا میں بلند کیا۔ خسرو اس قدر خوف زدہ ہو گیا کہ اس کے منہ سے کوئی آواز بھی نہیں نکل پائی، پھر عجیب بات ہوئی۔

فیروز خان نے وہ خنجر اپنے سینے میں گھونپ لیا۔ اس کی شکوہ کناں آنکھیں خسرو کو گھور رہی تھیں جیسے وہی اس سب کا ذمے دار ہو۔

وہ ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ عجیب خواب تھا جس نے اسے پسینے میں بھگو دیا تھا۔ اسے خود پر قابو پانے میں کئی لمحے لگ گئے۔ اس نے برابر میں سوئی ثنا کی طرف دیکھا پھر اس کی نگاہ گھڑی پر پڑی۔ صبح کے ساڑھے سات بج رہے تھے۔

خسرو بستر سے نکل آیا۔ اس ایک خواب کے سوا وہ پرسکون نیند سویا تھا اور خود کو خاصا تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ کمرے سے باہر آ کر اس نے اپنا فون آن کیا۔ سعدیہ سلطان کی مس کالز دیکھ کر اس نے اس کا نمبر ملایا۔ چھٹی گھنٹی پر اس نے فون اٹھایا۔

"خسرو، یہ اخبار والوں کے سونے کا وقت ہے۔" وہ بڑبڑائی۔

"پھر وہ ہمارے سونے کے وقت میں مس کالیں کیوں کرتے ہیں؟"

"ہوں، تم کہاں غائب تھے؟ کیا تمہیں یقین ہے فیروز خان قاتل ہے؟" وہ پوری طرح بیدار ہو چکی تھی۔

"فی الحال...... مگر یہ یقین پکا ہے کہ جمشید نہیں ہے۔" وہ بولا۔

"زیادہ خوش مت ہو، میری اطلاع کے مطابق ایس پی کو بھی فیروز خان کے قاتل ہونے کا یقین نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اس کے پاس اپنے کہیں اور ہونے کی گواہی بھی موجود ہے۔"

"تو کیا وہ آزاد ہو گیا ہے؟" اس خبر سے اسے سکون سا ملا تھا۔

"نہیں، دیکھو کیا ہوتا ہے۔ مجھے تم سے اور بات بھی کرنی ہے۔" وہ بولی۔

"اوکے، ڈھائی بجے میرے دفتر میں۔" خسرو نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

"اگر فیروز خان بے گناہ ثابت ہو جاتا ہے تو پھندا پھر جمشید کی طرف ہی آنے والا تھا۔ اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ ناشتے کے بعد اس نے ایس پی کو فون کیا۔

"میں تمہیں فون کرنے ہی والا تھا، فیروز خان نے بیان دے دیا ہے اور اس نے اپنے دفاع میں ایک گواہی بھی پیش کی ہے۔"

"پھر......؟"

"پھر یہ کہ مجھے تمہارے بیان کی ضرورت ہے اور اس ہری گاڑی والے کی بھی...... اس کے تازہ بیان کے بعد اس کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے اور میں جانتا ہوں کہ تم اس کے بارے میں جانتے ہو۔"

"میں نہیں جانتا۔"

"خسرو...... یہ معاملہ اتنا سیدھا نہیں ہے اور تمہارا موکل قطعی محفوظ نہیں ہے۔"

"میں نے کہا۔" خسرو ہنسا "خیر میں چار بجے تک تمہاری طرف آتا ہوں، اس دوران میں تمہارے سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"یہ بہت بہتر ہے۔"

"ایک بات بتاؤ...... فیروز خان کی گرفتاری کے وقت کیا اس کے پاس کوئی چاقو تھا؟"

"ہاں، خاصا بڑا اور خطرناک...... کیوں؟"

"یعنی اگر وہ چاہتا تو اسے مجھ پر استعمال کر سکتا تھا؟"

"ہاں۔" اور اس نے فون بند کر دیا۔

یعنی اس کی پریشانی غلط نہیں تھی۔ فیروز خان قاتل نہیں تھا۔ تاسف نے اس کے دل کو آ گھیرا۔ اس احساس کو کم کرنے کی ایک ہی صورت تھی۔ اس نے ایک پرانے دوست کو فیروز خان کے معاملات سنبھالنے پر تیار کیا اور پھر مطمئن ہو کر چائے پینے بیٹھا ہی تھا کہ فون بج اٹھا۔

"خسرو، بھائی جان تم سے بات کریں گے۔" نینا اسے ریسیور تھماتے ہوئے بولی۔

"جی۔" وہ بولا۔

"تم کیا کرتے پھر رہے ہو خسرو؟" نادر زور سے بولا۔

"میں تم سے بات کر رہا ہوں۔"

"میں اپنی بہن کی بات کر رہا ہوں۔"

بوڑھا سینڈی بسترِ مرگ پر پڑا آخری سانسیں لے رہا تھا۔ اس کی بیوی نے اس کے سرہانے جھک کر بڑے پیار سے پوچھا۔ "کسی چیز کی خواہش ہے ڈارلنگ؟"

سینڈی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"کیا تمہاری کوئی بھی آخری خواہش نہیں ہے؟"

سینڈی نے بمشکل تمام آنکھیں کھول کر آہستہ سے کہا۔ "ایک پیچ اس پڈنگ کا کھلا دو جو ابھی تم نے تھوڑی دیر پہلے تیار کی ہے۔"

"نہیں ڈارلنگ، وہ پڈنگ نہیں مل سکتی۔" بیوی نے کہا۔ "وہ تو میں نے تمہارے کفن دفن میں شریک ہونے والے مہمانوں کے لیے تیار کی ہے۔"

☆☆☆

فیلڈنگ کے دوران میں ایک کھلاڑی بار بار امپائر کے قریب جا کر کھڑا ہو جاتا اور تقریباً ہر گیند پر آؤٹ کی اپیل کرتا مگر امپائر ٹس سے مس نہ ہوتا۔ اس کی اپیلیں جب شدت اختیار کر گئیں تو امپائر نے پلٹ کر کھلاڑی کو گھورتے ہوئے کہا۔ "پچھلے آدھے گھنٹے سے میں تمہاری حرکتیں دیکھ رہا ہوں۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" کھلاڑی نے سنجیدگی سے کہا۔ "آخر آپ کھیل کیوں نہیں دیکھتے؟"

☆☆☆

ڈاکٹر: "تمہارا مرض اتنی خطرناک صورت اختیار کر چکا ہے کہ آپریشن کے بغیر تم ہرگز صحت یاب نہیں ہو سکتے۔"

مریض: "آپریشن پر کیا خرچ آئے گا ڈاکٹر صاحب؟"

ڈاکٹر: "دس ہزار ڈالر۔"

مریض: "خدا کی پناہ! میرے پاس اتنی کثیر رقم کہاں ہے؟"

ڈاکٹر: "دیکھو، میں تمہیں ایک ترکیب بتاتا ہوں۔ پانچ ہزار ڈالر تم مجھے اس وقت دے دو اور باقی رقم دو سو ڈالر ماہانہ کے حساب سے اس وقت تک دیتے رہنا جب تک مکمل ادائیگی نہ ہو جائے۔"

مریض: "یہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی شخص قسطوں پر نئی کار خریدنے کا منصوبہ بنا رہا ہو۔"

ڈاکٹر: "تمہارا خیال درست ہے۔ میں نے آج ہی نئی کار خریدنے کا منصوبہ بنایا ہے۔"

گھونگی سے شکر واس کا منصوبہ

”میں اس کی حفاظت کی کوشش کر رہا ہوں۔ نازلی آپا کے قاتل کو پکڑنے کی کوشش کر رہا ہوں، پولیس سے نمٹنے کی کوشش کر رہا ہوں اور نیلی فون سے سر کھپا رہا ہوں اور یہ کوشش بھی کر رہا ہوں کہ مجھے سوچنے کے لیے تھوڑا سا وقت کس طرح مل سکتا ہے۔“

”جیکی تم کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں ہو اور سوچنے کے تو بالکل بھی نہیں۔“ دوسری طرف سے زہریلے لہجے میں کہا گیا۔

”میرا خیال ہے کہ تم نے صرف یہ بتانے کے لیے تو فون نہیں کیا ہوگا؟“

”نہیں، میں نے تمہیں یہ کہنے کے لیے فون کیا ہے تم اس کیس سے الگ۔“

”کیا جمشید نے تم سے بات نہیں کی؟“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اگر وہ زیادہ زور دیتا ہے تو ہم اس کی وکالت ہی چھوڑ دیں گے۔ تم نے سن لیا، اب تم اس چکر میں نہیں پڑو گے۔ میں آ رہا ہوں میرا انتظار کرو۔“ اس نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔

خسرو فون رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے فوراً نکلنا تھا۔ نکلنے سے پہلے اس نے فیصل سجاد کے دفتر کا نمبر ملایا۔ اس کی سیکریٹری کے مطابق وہ دفتر میں ایک میٹنگ میں مصروف تھا۔ خسرو نے مسکراتے ہوئے فون بند کر دیا۔ وہ فیصل سجاد کے گھر جانے کے لیے سڑک کی دوسری جانب مڑا تب اس نے نادر کی کالی سوک کو سامنے سے گزرتے دیکھا اس نے غالباً خسرو کو دیکھا نہیں تھا۔

☆☆☆

ساڑھے دس بجے وہ فیصل کے بنگلے پر اس کی بیوی نازوہ کے سامنے بیٹھا تھا۔ نازوہ چھوٹے قد کی نروس سی خاتون تھی۔ چمکتی ہوئی گوری رنگت، سیاہ بالوں اور اسمارٹ جسامت کے باوجود اس کی شخصیت میں کہیں کچھ کمی سی محسوس ہوتی تھی۔

”میرا خیال ہے کہ ہم ایک دوسرے کو نہیں جانتے۔“ وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

”میں خسرو ہوں۔ نازلی جمشید کے کیس میں جمشید احمد کا وکیل۔“ وہ ملائمت سے بولا۔

”تو......؟“ اس نے پوچھا۔ ”آپ کو مجھ سے کس موضوع پر بات کرنی ہے؟“

”آپ کے شوہر فیصل سجاد کے بارے میں۔“ وہ بولا۔ ”آپ کی شادی کو کتنے سال ہو گئے ہیں؟“

”آٹھ سال...... شروع میں وہ ایسا نہیں تھا۔“ وہ بے اختیار بولی...... ”مگر پھر رفتہ رفتہ سب بدلتا گیا۔“ اس کے چہرے پر مایوسی سی چھا گئی۔

”میں جانتا ہوں کہ مسئلہ کیا تھا؟“

”کیا؟“

”نازلی جمشید......“ خسرو نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میں اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی۔“ وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

”مگر آپ کو کرنی تو پڑے گی مسز نازوہ، آپ نے میری بیوی سے کہا تھا کہ اسے اپنی کرنی کا بدلہ ملا ہے اس کا کیا مطلب تھا؟“ خسرو نے سرد لہجے میں پوچھا۔

”مگر......“

”پلیز، آج آپ کو بولنا پڑے گا۔ یہ بات ہم دونوں کے درمیان رہے گی۔“

”میں کسی سے ڈرتی نہیں ہوں۔“ وہ یکلخت بولی۔

”اس نے میری زندگی تباہ کر دی۔ فیصل نے جب سے اس کے ساتھ کام شروع کیا اس کے ہونٹوں پر اسی کا نام رہتا وہ ہر چیز میں پرفیکٹ تھی اور میں...... میں کچھ بھی نہیں۔“

”پھر...... پھر بھی آپ ان کے ساتھ رہتی رہیں؟“

”کیا کرتی...... میں اس سے پیار کرتی تھی، پھر میری کوئی اولاد نہیں تھی۔ ماں باپ مر چکے تھے۔ میرے پاس پیسا ہے مگر زندگی کے لیے رشتے بھی درکار ہوتے ہیں۔ میں جانتی تھی کہ میرا شوہر نازلی کو پسند کرتا ہے اگر وہ فیصلہ کر لیتی تو فیصل اس سے شادی کرنے میں ایک دن کی بھی دیر نہیں کرتا مگر وہ سوچتی رہی اور فیصل انتظار کرتا رہا اور...... تم احمق وکیل...... تم شاید یہ سمجھ رہے ہو کہ اس نے نازلی کو قتل کیا ہے؟“ وہ دیوانہ وار ہنسی۔

”تو کیا نہیں کیا؟ وہ اس سے ملنے والا آخری شخص تھا۔“ خسرو نے پوچھا۔

”نہیں، وہ اپنی محبوبہ کو کیسے مار سکتا ہے۔ وہ تو اس کے لیے سب سے قیمتی تھی صرف میں جانتی ہوں کہ اسے کس نے مارا ہے۔“

”کس نے اور آپ کیسے جانتی تھیں؟“

”ایسے کہ میں اس وقت وہیں تھی۔ اس وقت جب اس کا قتل ہوا۔“ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

”اس کو کس نے قتل کیا تھا، اس چوکیدار نے؟“

”نہیں۔“ وہ عجیب انداز سے ہنسی۔ ”اسے تمہارے

پیارے دوست جمشید خان نے قتل کیا ہے۔"

"آپ یہ کیسے کہہ سکتی ہیں۔" خسرو خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

"میں نے بتایا نا کہ میں وہاں موجود تھی۔" اس کے جواب نے خسرو کو منجمد سا کر دیا تھا۔ "میں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ میں اس کا...... فیصل کا پیچھا کرتے ہوئے وہاں گئی تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ میں سو رہی ہوں مگر میں اسے تیار ہوتے دیکھ رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ، اس کی جلد بازی میرے دل میں آگ لگا رہی تھی جیسے ہی اس کی کار نکلی میں بھی اس کے پیچھے نکل گئی۔ ویسے بھی مجھے تو معلوم ہی تھا کہ وہ اسی چڑیل نازلی کی طرف گیا ہے۔ میں نے گھر سے کچھ فاصلے پر گاڑی کھڑی کی اور پھر پیدل گھر کے اندر گئی۔ دروازے پر چوکیدار نہیں تھا۔ میں پورچ کے ساتھ پودوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ فیصل کے جانے کے بعد آج میں اس سے نمٹ لوں گی۔"

"کیسے...... اسے قتل کر کے؟" خسرو نے پوچھا۔

"مجھ میں اتنی ہمت ہوتی تو میں اسے بہت پہلے قتل کر چکی ہوتی۔" وہ غرائی۔ "میں وہاں چھپی کانپتی اور روتی رہی۔ آخر کار فیصل میرے سامنے وہاں سے نکلا اور روانہ ہو گیا۔"

"یعنی فیصل سجاد نے نازلی جمشید کا خون کیا ہے؟"

"نہیں...... وہ جب وہاں سے نکلا وہ زندہ تھی، وہ دروازے تک آئی تھی...... وہ بہت خوش تھی۔ اس کے جانے کے بعد بھی میں نے اس کی آواز سنی تھی۔"

"آپ نے...... وہاں پورچ اور لان کے ساتھ لگے بڑے پودوں کے پیچھے سے اندر کی آواز سن لی؟" خسرو یقین نہ کرنے والے انداز میں بولا۔

"دروازہ کھلا تھا۔ فیصل کے جانے کے بعد میں نے سوچا کہ آج میں نازلی سے بات کر کے ہی جاؤں گی۔ میں پودوں کے پیچھے سے نکلی۔ برآمدے کے قریب پہنچی ہی والی تھی کہ میں نے گیٹ کے باہر کار کا ہارن سنا...... میں تیزی سے پچھلی طرف چھپ گئی وہاں سے مجھے باہر کا منظر پوری طرح نظر نہیں آ رہا تھا مگر میں نے جمشید کی کالی گاڑی کو اندر آتے دیکھا تھا۔ میں مزید پیچھے دبک گئی تب ہی کوئی گاڑی سے اتر کر اندر گیا تھا۔ میں نے نازلی کی واضح آواز سنی تھی وہ کہہ رہی تھی۔ 'تم...... مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم آ رہے ہو۔' اس جملے کے بعد دروازہ بند ہو گیا کچھ دیر بعد وہ شخص باہر نکلا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ میں گھبرا کر پیچھے سے نکلی اور بنگلے سے باہر آ گئی تب میں نے کار کو غور سے دیکھا تھا وہ کالی سوک تھی بالکل وہی جو جمشید بخش خان کے پاس ہے۔"

"مگر تم نے اس شخص کو نہیں دیکھا؟" خسرو کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"نہیں، مگر مجھے یقین ہے کہ یہ وہی تھا اور اس نے بالکل ٹھیک کیا۔ آخر وہ کیا کرتا؟" مازرہ ضدی لہجے میں بولی۔

"مسز سجاد میں اب آپ کو بتاتا ہوں کہ کیا ہوا ہو گا۔ تمہارے شوہر کا نازلی سے افیئر چل رہا تھا، ان کے درمیان کسی بات پر جھگڑا ہوا، تمہارا شوہر ایک غصہ ور شخص ہے جس کا مجھے بھی تجربہ ہو چکا ہے۔ یوں نازلی ماری گئی اور جب اسے ہوش آیا تو اس نے تصویر کی آنکھیں نکال کر اسے کسی جنونی کا کارنامہ قرار دینے کی کوشش کی۔" خسرو ملائمت سے بولا۔

"نہیں، ایسا نہیں ہوا۔"

"اور ہو سکتا ہے کہ تم نے یہ سب دیکھا ہو مگر تم اسے بچانا چاہتی ہو یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمہارے شوہر کے جانے کے بعد تم اندر گئی ہو، تمہارا جھگڑا ہوا ہو اور تم نے نازلی کا خون کر دیا ہو اور اس کے بعد اس کی تصویر پر اپنا غصہ نکالا ہو، آخر تم اسے تباہ و برباد ہی تو کرنا چاہتی تھیں۔" وہ بولے جا رہا تھا۔

"یہ سب بکواس ہے۔" وہ دیوانوں کی طرح چلائی اور یکلخت اس نے فروٹ کی ٹرے میں رکھا چاقو اٹھا کر خسرو پر حملہ کر دیا۔ خسرو اس کی امید نہیں کر رہا تھا اس لیے بچتے بچتے بھی چاقو کی نوک اس کے چہرے پر لکیر بناتی ہوئی چلی گئی۔ اس نے لپک کر مازرہ کا ہاتھ پکڑ کر موڑ دیا۔ چاقو لمحے میں اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور پھر اس نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

خسرو کے چہرے سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے سامنے موجود ٹشو کے ڈبے سے کافی سارے ٹشوز نکالے، ان کی تہہ بنا کر چہرے پر رکھی اور بولا۔

"خود پر قابو پایئے...... میں جا رہا ہوں۔"

"مگر وہ جمشید ہی تھا۔" وہ سر جھکائے جھکائے بولی۔

خسرو جواب دیے بغیر باہر نکل گیا تھا۔

☆☆☆

اس بار چہرے کا زخم آٹھ ٹانکوں سے سل پایا تھا۔ کلینک سے فارغ ہو کر خسرو سیدھا دفتر آیا اور اپنے کمرے میں بند ہو گیا۔ وہ بہت کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ یہ معمہ الجھتا ہی جا

جار ہا تھا۔ فون کی گھنٹی اس کی سوچ میں حائل ہوئی تو اس نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری جانب فیصل سجاد تھا۔

"خسرو! میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔" وہ خاصی سنجیدگی سے بول رہا تھا۔

"کیا تمہارے پاس اب کوئی نئی کہانی ہے؟"

"آج ساڑھے بارہ بجے...... کلب میں۔"

"میں مصروف ہوں۔" خسرو بولا۔

"یہ ہم دونوں کے لیے ضروری ہے۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

خسرو نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ اسے آج چار بجے ایس پی سے بھی ملنا تھا۔ اسے ہری گاڑی والے کی تلاش تھی۔ فیصل سجاد کا نام ایس پی کو بتانے سے قبل اس سے مل لینا بہتر ہے۔ خسرو نے فیصلہ کیا۔

وہ کلب پہنچا تب پونے ایک ہو رہا تھا۔ فیصل مخصوص میز پر اس کا منتظر تھا۔

"میں نے مائرہ کے لیے ایک نرس کا انتظام کر دیا ہے۔" وہ سلام دعا کے بعد بولا۔ "اب تم اس سے نہیں مل سکو گے۔"

"یہ حل نہیں ہے۔" خسرو نے سنجیدگی سے کہا۔ "حل یہ ہے کہ تم سچ بولو...... تم نے پہلے بھی مجھ سے جھوٹ ہی بولا ہے۔ آج یا تو تم نازلی جمشید کے حوالے سے سچ بولو گے یا میں جو کچھ جانتا ہوں وہ میں پولیس تک پہنچا دوں گا۔" وہ فیصلہ کن انداز میں بولا۔ "تم نے نازلی جمشید کو قتل کیا ہے؟"

"نہیں، یہ جھوٹ ہے۔" وہ بے ساختہ بولا۔ "بتانے کو میرے پاس کچھ ہے بھی نہیں۔" وہ گہری سانس لے کر بولا۔ "نازلی اور میں ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔"

"کب سے؟"

"میں تو برسوں سے...... مگر یہ افیئر صحیح معنوں میں چھ سال سے شروع ہوا تھا۔ باقی تفصیلات سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ تمہاری دلچسپی اور مجھے کی صرف دو باتیں ہیں ایک تو یہ کہ ہاں ہمارا افیئر تھا اور دوسری بات یہ کہ جب میں وہاں سے نکلا نازلی زندہ تھی، مسکرا رہی تھی۔" وہ افسردگی سے بولا۔ "ہم صرف ایک گھنٹا ساتھ رہے تھے اور بہت خوش تھے۔"

"کس بات پر...... جنید کو راستے سے نکال دینے پر؟"

"نہیں اس نے مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔"

"جب تم وہاں سے نکلے تو وہ زندہ تھی؟"

"ہاں...... اور بہت خوش تھی۔ میرے پاس اسے مارنے کی کوئی وجہ نہیں ہے خسرو، میں اس سے پیار کرتا تھا۔"

"اور تمہاری بیوی؟" خسرو نے اسے گھورا۔

"انسان زندگی بھر بدلتا رہتا ہے، میں نے اسے پسند کیا تھا اس سے شادی کی تھی مگر پھر رفتہ رفتہ مجھے نازلی سے عشق ہو گیا شاید یہ بات میں تمہیں سمجھا نہیں سکتا۔"

"مگر میں ایک بات ہر ایک کو سمجھا سکتا ہوں اور وہ یہ کہ مجھے اپنی بیوی سے محبت ہے، اگر کوئی اس کو دھمکی دیتا ہے تو میں اسے بآسانی قتل کر سکتا ہوں۔"

"یہ تمہاری مرضی ہے۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"میں نے تمہیں ساری حقیقت بتا دی ہے، نازلی، جمشید اور میں، ہم تینوں کے حق میں یہی بہتر ہے کہ یہ بات پولیس تک نہ پہنچے۔"

"اور فیروز خان جو بے گناہ بھی ہو سکتا ہے؟" خسرو نے پوچھا۔ "اور پھر نازلی کا قاتل...... جس کا اب تک پتا نہیں چل سکا۔"

"یہ میں نہیں جانتا...... دیکھو اس کے قاتل کی تلاش میں اگر تم مشکوک لسٹ بناتے ہو تو غالباً میں، جنید، مائرہ، فیروز خان اور جمشید اس کی زد میں آتے ہیں۔ اگر تم پولیس تک جاتے ہو تو مائرہ بھی پولیس کو بیان دے گی اور یوں جمشید پھانسی کے پھندے کے قریب پہنچ جائے گا۔" وہ صفائی سے بولا۔ "اس لیے بہتر یہی ہے کہ جو جیسا ہے ویسا رہنے دو اسی میں سب کی بہتری ہے۔"

خسرو اسے دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

دفتر واپس جاتے ہوئے خسرو کا دماغ سوچوں سے بھرا ہوا تھا۔ نام آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ غیر ارادی طور پر اس نے جنید کی طرف جانے کا فیصلہ کیا۔ دروازہ آصفہ نے کھولا تھا۔ وہ خسرو کو دیکھ کر کچھ پریشان ہو گئی۔

"مجھے تم سے کام ہے؟" خسرو بولا۔

"مگر جنید گھر پر نہیں ہے۔ اسے معلوم ہو گا کہ میں نے آپ سے بات کی ہے تو وہ ناراض ہو گا۔" وہ بے چارگی سے بولی۔

"میں سمجھتا ہوں مگر یہ ضروری ہے۔" خسرو کے کہنے پر اس نے اسے اندر بلا لیا۔

"آصفہ مجھے صرف ایک سوال کا جواب چاہیے، کیا اس روز جنید حقیقت میں تمہارے ساتھ تھا؟"

"میں پولیس کو یہ بتا چکی ہوں۔" وہ سادگی سے بولی۔

"میں تمہارا بیان نہیں لے رہا۔ حقیقت جاننا چاہتا ہوں۔ میرا قاتل تک پہنچنا اس لیے ضروری ہے کہ اس نے میری بیوی کی گردن مروڑی ہے۔" خسرو بولا۔

آصفہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ دروازے کے پاس آہٹ سنائی دی اور پھر کی ہول میں چابی گھومنے کی آواز کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔ جنید دروازے پر کھڑا تھا اور اس کی نگاہیں خسرو پر جمی ہوئی تھیں۔

"جنید، خود پر قابو رکھو۔ یہ صرف چند باتیں پوچھنے آئے ہیں۔" آصفہ اس کی طرف بڑھی مگر وہ اسے جھٹکتا ہوا خسرو کے سامنے سے گزر کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اس کی واپسی ایک لمحے بعد ہی ہوگئی تھی۔ اس بار اس کے ہاتھ میں ایک ریوالور تھا اور اس کی نال خسرو کی طرف تھی۔

"نہیں جنید۔" آصفہ چلائی۔ "گولی مت چلانا۔"

وہ تیزی سے خسرو کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اچانک جنید کی لات گھومی اور خسرو کے پیٹ پر پڑی۔ وہ دہرا ہوا تو اس نے پستول کا دستہ اس کے سر کے پچھلے حصے پر مارا۔ خسرو کو چکر سا آگیا اور وہ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔ آصفہ کو جیسے یک دم ہوش آگیا اس نے جنید کا بازو پکڑا اور اسے کھینچتے ہوئے اندر لے گئی۔ خسرو چند لمحے اسی پوزیشن میں بیٹھا رہا پھر دیوار کا سہارا لے بمشکل کھڑا ہوا اور لڑکھڑاتا ہوا باہر نکل گیا۔

خسرو کس طرح گاڑی تک پہنچا اور پولیس اسٹیشن تک کا سفر کس طرح کیا یہ وہ خود بھی ٹھیک سے نہیں جانتا۔ اس کی آنکھوں کے آگے بار بار اندھیرا سا آجاتا تھا۔ سر کا پچھلا حصہ اب بھی پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ پولیس اسٹیشن میں داخل ہو کر دوڑتا ہوا ایس پی کے کمرے کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھلتے ہی اسے ایس پی کی جھلک نظر آئی اور پھر چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔

خسرو کو ہوش آیا تو وہ صوفے پر لیٹا ہوا تھا اور ایک ڈاکٹر اس کا معائنہ کر رہا تھا۔

"میں گر گیا تھا۔" وہ ایس پی کی سوالیہ نظروں کے جواب میں بولا۔

"نہیں، تمہارے سر پر کسی سخت چیز سے وار کیا گیا ہے۔" انجکشن لگاتا ڈاکٹر اس کی تردید کرتے ہوئے بولا۔

"تم پورے احمق ہو۔" ایس پی اسے گھور کر بولا۔ ڈاکٹر کے جانے اور اس کے بیٹھنے کے قابل ہونے کے بعد تک وہ بالکل چپ رہا تھا۔

"تم کہاں تھے؟" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"قاتل کی تلاش میں۔" خسرو ہنسا۔ "یہ تو کسی جاسوس قلم کا نام ہو سکتا ہے۔"

"یہ مذاق نہیں ہے خسرو تم مر بھی سکتے تھے۔ اب تم مجھے اسی وقت اس ہری گاڑی والے کا نام بتاؤ گے اور ہمیں ہمارا کام کرنے دو گے، سمجھے؟"

"مسئلہ یہ ہے کہ فیروز خان قاتل نہیں ہے۔" خسرو بولا۔

"پھر..... قاتل کون ہے؟ جمشید؟" اس نے پوچھا۔

"پہلے تم مجھے ایک سوال کا جواب دو گے اور وہ یہ کہ تمہیں جمشید سے کیا دشمنی ہے؟" خسرو نے پوچھا۔

"تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے؟" وہ بولا۔

"کیونکہ مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم دونوں کے درمیان کچھ رہا ہے؟"

"یہ تم نے اپنے موکل سے کیوں نہیں پوچھا۔ ویسے وہ تمہیں بتاتا بھی کیا؟ کیا یہ کہ پانچ سال پہلے وہ جوا کھیلتے ہوئے پکڑا گیا تھا یا یہ کہ اس کے ساتھ کے سارے لوگ تھانے میں رہ گئے تھے جبکہ ایک گھنٹے میں تمہارا پارٹنر اور وہاں پہنچ کر اسے لے گیا تھا۔ اس نے مجھے کہا تھا کہ ہم جمشید کو نہیں روک پائیں گے اور پھر اس کے ایک فون نے ہماری ساری محنت اور ایمانداری کی جنگ ہار دی تھی مگر ہر بار ایسا نہیں ہوگا اگر وہ قاتل ہے تو اسے کوئی نہیں بچا سکتا۔" وہ سخت لہجے میں بولا۔

"مجھے افسوس ہے۔" خسرو چند لمحے بعد بولا۔ "میں یہ سب نہیں جانتا تھا مگر گزرے لمحے ہر ایک کی زندگی میں ہوتے ہیں پروبز..... ویسے اب میں تمہاری زیادہ عزت کرنے لگا ہوں۔"

"تو میرے سوالوں کا جواب دو۔"

"صرف ایک دن دو مجھے، میں تمہارے سوالوں کے جواب ڈھونڈ لاؤں گا۔" خسرو کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

"تم کہاں تھے؟ تمہیں کس نے مارا ہے؟" اس نے پکار کر پوچھا۔

"کسی نے نہیں اور یہ میں سیڑھی سے گر گیا تھا۔" وہ مسکرایا اور باہر نکل گیا۔

☆☆☆

خسرو دوبارہ سنبل بی بی کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ سرد نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"میں آپ کو پہلے ہی سب کچھ بتا چکی ہوں جو میں جانتی تھی۔" وہ بولی۔

"نہیں، آپ نے وہ بتایا تھا جو آپ نے درست سمجھا تھا، آپ کو یاد رکھنا چاہیے کہ انصاف اور سچ صرف الفاظ نہیں ہیں۔ نازلی آپا مر چکی ہیں اور اب ان کی خاطر جھوٹ بولنا مزید لوگوں کو موت کے منہ میں بھیجنے کے برابر ہے۔ اس کے علاوہ میں بہت کچھ پہلے ہی جان چکا ہوں، جیسے نازلی اور جمشید کے تعلقات کی سرد مہری اور فیصل سجاد...... اب میں آپ سے صرف سچ سننا چاہتا ہوں۔" وہ بولتا چلا گیا....

"کیا ان کی موت فیصل کی وجہ سے ہوئی تھی؟"

"نہیں۔" سنبل کافی دیر بعد بولی۔ "یہ میں کہہ نہیں سکتی مگر وہ ان کی زندگی میں اب بہت اہم ہو چکا تھا۔"

"اب......؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں، وہ بہت اچھی خاتون تھیں، بہت مہربان مگر جمشید صاحب اور ان کے درمیان کبھی کچھ ٹھیک نہیں رہا۔ وہ کافی اداس رہتی تھیں مگر کچھ سالوں سے ان میں تبدیلی آتی جا رہی تھی۔ فیصل سجاد کافی عرصے سے ان کے ساتھ تھا مگر جو آپ پوچھ رہے ہیں اس معاملے کو بہت وقت نہیں ہوا تھا۔" اس کی آواز بھیگنے لگی۔ "وہ بہت اچھی ہوئی تھیں مگر انہوں نے خوش رہنا بہرحال سیکھ لیا تھا۔"

"کیا جمشید یہ جانتا تھا؟"

"معلوم نہیں، انہوں نے کبھی کوئی ردعمل نہیں دیا۔ وہ کسی بھی بات پر کچھ بھی نہیں بولتے تھے۔" وہ بولی۔

"او کے، میں چلتا ہوں۔" خسرو کھڑے ہوتے ہوئے لہرایا۔

"آپ کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ کیا میں کسی کو آپ کے ساتھ بھیجوں؟" سنبل نے ہمدردی سے پوچھا۔

"نہیں۔" وہ مسکرایا۔

گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے ایک بار پھر اس کا سر چکرایا مگر اس نے خود کو سنبھال لیا۔ وہ جمشید کے بنگلے پر پہنچا تب تک رات کا اندھیرا ان کی روشنی کو شکست دینے لگا تھا۔

"تمہاری حالت بہت خراب لگ رہی ہے خسرو...... ہوا کیا ہے تمہیں؟" وہ اس کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"آپ کے بیٹے نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی ہے۔" خسرو مسکرایا۔

"اوہ...... تم پھر اس کی طرف گئے تھے یہاں آؤ، آرام سے بیٹھو...... میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔" وہ فون کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"نہیں، میں چیک اپ کرا چکا ہوں، مجھے آپ سے دو اہم باتیں پوچھنا تھیں۔"

"او کے۔" وہ اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ اس کے ہاتھ میں "وار اینڈ پیس" نامی کتاب تھی جسے اس نے نشان لگا کر احتیاط سے میز پر رکھ دیا۔

"پہلی بات یہ کہ کیا آپ جانتے تھے نازلی آپا کے فیصل سجاد یا کسی اور سے تعلقات تھے؟" خسرو نے راست اقدام کا فیصلہ کیا۔

"اور دوسری؟" وہ چند لمحے بھونچکا رہنے کے بعد بولا۔

"آپ پہلی بات کا جواب دیجیے کیونکہ دوسری بات پہلی بات سے جڑی ہوئی ہے۔" اس نے کہا۔

"کیا اس کا جواب دینا ضروری ہے؟"

"جی۔"

"ہاں...... خسرو ہم نے بہت شروع میں سمجھ لیا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے لیے نہیں بنے۔ نازلی کا فیصلہ تھا کہ ہم جنید کی خاطر ساتھ رہیں گے اور یوں ہم ریل کی دو پٹریوں کی طرح الگ الگ مگر ساتھ چلتے رہے۔ میں اس کے معاملات میں دخل نہیں دیتا نہ ہی وہ میری زندگی پر کوئی اثر ڈالتی۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "فیصل والی بات کا مجھے اندازہ تھا مگر اس سے زیادہ کچھ پتا نہیں۔ ہاں جب میں نے اسے فون کیا تھا تب ہم میں بحث ہوئی تھی۔ وہ مجھ سے کوئی ضروری بات فوراً کرنا چاہتی تھی۔ میں نے اس کو بتایا کہ میں شام کے بعد آؤں گا اس پر وہ ناراض ہوئی۔ میں نے جواب دیے بغیر فون بند کر دیا۔ بس یہ ہوا تھا۔"

"شاید وہ وصیت کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں؟"

"شاید...... مجھے افسوس ہے اگر میں اس کی بات سن لیتا تو شاید وہ زندہ ہوتی۔" وہ افسردگی سے بولا۔

"دوسری بات یہ ہے کہ کیا آپ نے...... انہیں قتل کیا ہے؟" خسرو ایک ایک لفظ چبا چبا کر بول رہا تھا۔

"نہیں۔" وہ چند لمحے اسے دیکھنے کے بعد بالآخر بولا۔

"ٹھیک ہے۔" خسرو بولا۔ "اب میں گھر جا رہا ہوں۔"

"میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔" جمشید کھڑے ہوتے

ہوئے بولا۔

''نہیں، میں چلا جاؤں گا۔ میرے سوالوں کا برا ست ماننے گا۔ میرے دماغ میں بہت کچھ چل رہا ہے اور مجھے جلد ہی ان سب کو کسی نتیجے پر پہنچانا ہے۔''

''اپنا خیال رکھو خسرو، اور اب تم جنید سے دور رہنا، میں اس سے خود بات کروں گا۔'' اس کے انداز میں غصہ بھرا ہوا تھا۔

خسرو وہاں سے نکلا تو پہلے سے زیادہ تھکا ہوا اور الجھا ہوا تھا۔ اب وہ فوراً گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ ثنا یقیناً اس سے ناراض تھی ورنہ اب تک اس کا فون آ چکا ہوتا، اس نے سوچا۔ گاڑی پارکنگ میں چھوڑ کر وہ تیزی سے اوپر چڑھا۔ ابھی وہ چند سیڑھیاں ہی چڑھا تھا کہ کوئی چیز زن سے اس کے پاس سے گزری۔ اس نے حیران ہو کر دیکھا سامنے موجود دیوار میں سوراخ سا ہو گیا تھا۔ وہ اس سب کو سمجھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ دو فائر اور ہوئے۔ خسرو تیزی سے گھر کی طرف دوڑا۔ اپارٹمنٹ کے دروازے کے پاس اسے پھر ہلکے سے دھماکے کی آواز آئی۔ اس کا ذہن ثنا کے نام کی تسبیح پڑھ رہا تھا۔ کانپتے ہاتھوں سے تالا کھول کر وہ بمشکل اندر داخل ہوا۔ چاروں جانب اندھیرے کا راج تھا اس نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ پھر وہ کسی چیز سے ٹکرایا اور زمین پر آ رہا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے اس کے ذہن میں آنے والی آخری سوچ ثنا کی ہی تھی۔

اس کی آنکھ کھلی تو ثنا اس پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

''شکر ہے تم ٹھیک ہو۔'' وہ بے ساختہ اٹھ بیٹھا۔

''لیٹے رہو۔'' وہ بھیگی ہوئی آواز میں بولی۔ ''تم اسپتال میں ہو۔''

''کیوں، میں ٹھیک ہوں۔''

''تم ٹھیک تو بالکل نہیں ہو۔'' انسپکٹر فیاض جو ایس پی بدو بزدکو اسسٹ کر رہا تھا کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔ ''ہوتے تو اس طرح خود کو خطرے میں ڈالتے نہ پھرتے۔''

''آپ یہاں کیاں؟'' خسرو نے اسے گھورا۔

''ہمیں آپ کا بیان درکار ہے۔'' وہ مسکرایا۔

''مجھ پر کسی نے چار فائر کیے تھے، اس سے پہلے میرا جنید سے اس کے گھر پر جھگڑا ہوا تھا۔ میں نے یہاں اسے دیکھا تو نہیں مگر مجھے شبہ ہے کہ شاید یہ وہی ہے۔'' خسرو بیان دیتے ہوئے بولا۔

''یہ وہی ہے۔'' ثنا تلخی سے بولی۔ ''اور یہ میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا۔''

انسپکٹر اس کا بیان لے گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے نتیجے میں جنید گرفتار ہو گیا ہوگا۔ اس کے آگے کیا تھا، وہ کچھ نہیں پا رہا تھا۔

ڈاکٹرز نے اس کے کئی ٹیسٹ کیے تھے، ان کے نتائج کی آمد تک اسے احتیاطی طور پر اسپتال میں ہی رہنا تھا۔ اس دوران کسی کو اس سے ملنے نہیں دیا جا رہا تھا لہٰذا ٹیلی فون مسلسل بج رہا تھا۔ خسرو نے صرف جمشید سے بات کی تھی، وہ بہت اداس اور پریشان تھا۔

''خسرو، میں تم پر سے اپنی ذمے داری ہٹا رہا ہوں۔ یہ سب بہت خطرناک ہوتا جا رہا ہے، تم یہ سب چھوڑ دو۔''

''اب یہ ممکن نہیں رہا۔'' وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

''نہیں تمہارے لیے یہی بہتر ہے، میں تمہاری اور ثنا کی جان خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔'' وہ حتمی انداز میں بولا۔

''ہم بیٹھ کر بات کریں گے۔''

''ٹھیک ہے اپنا خیال رکھو۔''

اس شام ڈاکٹرز نے اسے گھر جانے کی اجازت دے دی۔

''آپ ٹھیک ہیں فی الحال کوئی فریکچر نہیں ہے مگر یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ سر پر کوئی بھی ضرب یا چوٹ برین انجری کی وجہ بن سکتی ہے، آپ کو بہت احتیاط سے کام لینا ہوگا۔''

خسرو سر ہلاتا رہا۔ وہ خود بھی فی الحال آرام کرنا چاہتا تھا مگر گھر پہنچتے ہی اسے ایک نئی اطلاع ملی۔ جنید کو پولیس نے گرفتار ضرور کیا تھا مگر شام تک اسے عدم ثبوت کی بنا پر چھوڑنا پڑا۔

''اس کی بیوی اور کئی پڑوسیوں نے بیان دیا ہے کہ وہ تمام دن اور رات گئے اپنی گرفتاری تک گھر سے باہر نہیں نکلا، ہمارے پاس یہاں بھی کوئی ٹھوس شواہد موجود نہیں، ایسے میں اسے روکے رکھنا ممکن نہیں تھا۔'' انسپکٹر نے خسرو کو بتایا۔ ''ویسے ہم اس پر نظر رکھ رہے ہیں، آپ بھی محتاط رہیں۔''

''مجھے لگتا ہے کہ اب ہمیں اپنا نام مسٹر اینڈ مسز محتاط رکھ لینا چاہیے۔'' وہ فون بند کرتے ہوئے ثنا سے بولا۔

''وہ کیوں؟''

''کیونکہ ہر شخص ہمیں کسی نہ کسی سے محتاط رہنے کا

شعور دے رہا ہے۔"

"خیر تم کسی سے محتاط رہو یا نہ رہو مگر مجھ سے بچ کے رہنا کیونکہ اب اگر تم نے ایک بھی ایسی حرکت کی تو میں خود ہی تمہارا سر توڑ دوں گی۔"

"یعنی امید تھی تم سے ظالم عورت۔ ڈاکٹر نے تمہیں خطرے سے آگاہ کر رہا ہے لہٰذا اب تم میرے سر کے پیچھے پڑ گئی ہو۔" وہ دہائی دیتا ہوا بولا۔

خسرو کھانے کے بعد تالے چیک کر کے بستر پر لیٹنے ہی والا تھا کہ اس کا موبائل بجا۔ اسکرین پر جمشید کا نام دیکھ کر اس نے کال ریسیو کر لی۔

"خسرو! کیا تم مجھ سے ملنے آسکتے ہو؟" وہ گویا کسی گہرے کنویں سے بول رہا تھا۔

"خیریت...... آپ ٹھیک ہیں نا؟"

"شاید نہیں، میں تمہیں زحمت نہ دیتا مگر اس وقت یہ بات میں تمہارے سوا کسی اور سے نہیں کر سکتا۔" وہ بولا۔

"میں پہنچ رہا ہوں...... بات کیا ہے؟"

"مجھے...... شاہد نازلی کے قاتل کا نام معلوم ہو گیا ہے۔ میں برسوں بعد آج اس کے کمرے میں اس کا سامان دیکھ رہا تھا۔ الماری میں اس کی چھوٹی ڈائری ملی ہے، اس میں کچھ باتوں نے مجھے چونکا دیا ہے۔"

"کک... کون ہے وہ؟" خسرو نے بے اختیار پوچھا۔

"تم یہاں آجاؤ، ہاں شنا کو ساتھ مت لانا۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

خسرو چند لمحے احمقوں کی طرح فون کو گھورتا رہا پھر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

"تو اب تم جمشید بھائی کی طرف جا رہے ہو؟" شنا سب کچھ سن رہی تھی۔ "تم انہیں منع کر دیتے وہ بھی کمال کرتے ہیں، انہیں تمہاری حالت معلوم ہے پھر بھی تمہیں فون کر دیا۔"

"شاید یقیناً کوئی اہم بات ہے۔"

"پھر میں بھی تمہارے ساتھ چل رہی ہوں، کم از کم ڈرائیونگ تو کر ہی سکتی ہوں میں۔"

"نہیں۔" وہ اسے یہ بتانا نہیں چاہتا تھا کہ جمشید بھائی نے اسے لانے سے منع کیا ہے۔ "نہ جانے وہاں کیا حالات ہوں...... مگر۔" وہ سوچ میں پڑ گیا۔ "تم یہاں بھی اکیلی نہیں رہ سکتیں۔ تم مادر کو فون کر کے یہاں بلا لو۔"

"کیا مسئلہ ہے؟" وہ الجھ گئی... خسرو تیار ہو کر نکلا تب تک وہ مادر سے بات کر چکی تھی۔

"وہ آ رہے ہیں۔" اس نے خسرو کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اوکے، تم دروازہ لاک کر لو اور ان کی آواز سن کر کھولنا۔" وہ اسے ہدایات دے کر باہر نکل گیا۔

اس کی چھٹی حس کسی انہونی کا اشارہ دے رہی تھی۔ وہ جلد از جلد وہاں پہنچنا چاہ رہا تھا مگر رش ایک کی وجہ سے ٹریفک ہر جگہ جام مل رہا تھا۔ اسے جمشید کے گھر پہنچنے میں ایک گھنٹے سے زیادہ لگ گیا۔

گیٹ حسب معمول چوکیدار نے کھولا۔ اندر کا دروازہ کھلا پڑا تھا۔

"سلمیٰ بی بی شام ڈھلے چلی گئی تھی، صاحب لائبریری میں ہوگا۔" چوکیدار نے اسے مطلع کیا تو وہ سیدھا اسٹڈی کی طرف بڑھا۔

جمشید اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی کتاب "زار اینڈ پیس" زمین پر پڑی تھی۔ ریوالور اس کے پیروں کے پاس لڑھکا ہوا تھا۔ اس کا چشمہ اس کی گود میں پڑا تھا اور اس کے دونوں بازو کرسی کے ہتھوں پر تھے۔ اس کا چہرا خون خون تھا اس سے زیادہ خسرو سے دیکھا نہیں گیا۔ اس نے جمشید کا بازو تھام لیا۔

"کیوں؟" وہ زور سے بولا اور قالین پر بیٹھ گیا۔

اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ چند لمحے بعد وہ اٹھا۔ اس نے زمین پر پڑی کتاب اٹھائی۔ نشانی کے طور پر وہ سبز اسخت کاغذ کا لمبا سا ٹیگ استعمال کرتا تھا۔ خسرو نے ٹیگ کو پلٹ کر دیکھا وہاں کچھ لکھا تھا مگر وہ اتنا باریک تھا کہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اس نے بغیر سوچے سمجھے اسے اپنی جیب میں ڈال لیا۔ اس نے ایس پی پرویز کا نمبر ملایا۔ اسے مطلع کرنے کے بعد اس نے نادر کو فون کیا۔

فون بند کر کے وہ خالی الذہنی کی کیفیت میں لاؤنج میں بڑے صوفے پر گر پڑا۔ سب کچھ اتنا عجیب اور ناقابل فہم ہو رہا تھا کہ اس کے اعصاب جواب دیتے جا رہے تھے۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ جمشید اس طرح چلا گیا ہے۔

ایس پی اور پولیس چند منٹ میں جائے وقوعہ پر پہنچ گئے تھے۔

"ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جب بھی یہاں کوئی خون ہوتا ہے لاش تم ہی دریافت کرتے ہو؟" وہ خسرو کو گھورتے ہوئے بولا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"معلوم نہیں، شاید یہ میری قسمت میں لکھا ہے۔" وہ جل کر بولا۔ نادر بھی کچھ دیر میں وہاں پہنچ گیا تھا۔

"اب تم مطمئن ہو گئے۔" تنہائی ملتے ہی وہ خسرو سے بولا۔ "میں تم سے پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ اس سلسلے کو بند کر دو۔ جمشید یہ سب برداشت نہیں کر سکے گا۔ آخر اس نے خودکشی کر ہی لی۔" خسرو جواب میں اسے دیکھتا رہ گیا۔

اگلے دو دن تیز رفتاری سے گزر گئے۔ پولیس نے اپنی کارروائی مکمل کر لی تھی۔ جمشید کی موت کو خودکشی قرار دے کر فائل بند کی جا رہی تھی۔ اس کی تدفین ہو گئی تھی۔ تیسرے دن اس کی وصیت کھولی گئی تھی جس کے مطابق اس کے بینک اور کمپنی کے سارے اختیارات نادر کی ذمے داری بنائے گئے تھے۔ وہ حاصل شدہ منافع میں سے 50 فیصد اخراجات منہا کر کے جنید کو دینے کا پابند تھا جبکہ بقیہ سے ایک ٹرسٹ بنانے کی ہدایت دی گئی تھی۔ خسرو وہاں موجود تھا وہ سرسری انداز میں سب کچھ سن رہا تھا۔ تین دن سے اس کے ذہن کی سوئی ایک ہی نکتے پر اٹکی ہوئی تھی اگر جمشید کو خودکشی کرنا ہی تھی تو پھر اس نے اسے فون کر کے کیوں بلایا تھا۔ اس کی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ یک دم وہ خود کو اتنا کمزور محسوس کر رہا تھا کہ اس میں انگلی ہلانے کی ہمت نہیں تھی صرف اس کا دماغ مسلسل متحرک تھا۔

گھر پہنچ کر وہ آرام کرسی پر پڑا اسی حوالے سے سوچ رہا تھا کہ ایک خیال نے اسے چونکا دیا۔ وہ تیزی سے کھڑا ہوا اور کوٹ کی جیب سے وہ سنہرا اشتہاری کا ٹیگ نکالا، اس پر لمبائی میں نہایت باریکی سے کچھ لکھا تھا۔ خسرو نے میز کی دراز سے محدب عدسہ نکالا اور غور سے تحریر کو پڑھتا رہا۔ اس کے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ پھر وہ چابیاں اٹھا کر گھر سے باہر نکل گیا۔ اس کا رخ جمشید کے بنگلے کی طرف تھا۔

اسے جمشید کی اسٹڈی میں داخلے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ مکان میں چوکیدار اور ملازم دونوں موجود تھے۔ اسٹڈی میں داخل ہو کر وہ چند لمحے کھڑا رہا اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جمشید کہیں سے اچانک چلا آئے گا پھر اس نے اس خیال کو جھٹکا اور جمشید کی میز اور کتابوں کی تلاشی لینے لگا۔ اسے اس ڈائری کی تلاش تھی جس کا اس نے فون پر ذکر کیا تھا۔ کتابوں سے فارغ ہو کر خسرو نے میز کی تلاشی شروع کی۔ اس ڈائری کو کہیں ہونا چاہیے تھا اور اگر وہ یہاں تھی تو کہاں ہو سکتی تھی۔ اس نے اس کی کرسی کے کشن تک کی تلاشی لی مگر وہ کہیں نہیں تھی۔ وہ تھک کر جمشید کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کرسی پر بیٹھنے کے بعد اس کے پیر از خود میز کے نیچے رکھے لکڑی کے منقش پائیدان پر پڑے جو زمین سے ایک ڈیڑھ فٹ بلند تھا۔ اچانک ایک خیال اس کے ذہن میں سرسرایا۔

وہ کرسی سے زمین پر بیٹھ گیا اور اس نے پائیدان کے اوپری حصے کو ہلکا سا دھکا دیا۔ اس کی امید کے عین مطابق اس کا ڈھکن سا کھل گیا۔ اس کے تلے میں چھوٹی سی پاکٹ سائز ڈائری چمک رہی تھی۔

خسرو نے ہاتھ بڑھا کر ڈائری نکالی اور اس کی ورق گردانی شروع کی۔ جمشید نے اس میں چند صفحات کو موڑ رکھا تھا۔ انہیں پڑھ کر خسرو کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ وہ چند لمحے ڈائری کو دیکھتا رہا۔ اس کا دماغ دنیا کی تیز رفتار بلٹ ٹرین سے بھی تیزی سے اڑا جا رہا تھا۔ ایک ایک کر کے سارے معمے حل ہوتے جا رہے تھے اور اس کے ذہن میں اٹھنے والے سوالات کے جواب بھی گویا غیب سے وارد ہو رہے تھے۔ اس نے گہری سانس لی اور پھر کھڑا ہو گیا۔ چند لمحے وہ جمشید کی کرسی کو دیکھتا رہا۔ اس افسردہ شخص کے لیے وہ دل سے رنجیدہ تھا۔ اس نے ڈائری جیب میں ڈالی اور باہر نکل گیا۔

☆☆☆

"خیریت...... کیسے ہو تم؟" ایس پی پرویز اسے بغیر کسی اطلاع کے سامنے کھڑا دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"ہاں، تم نے کیس ختم کر دیا جبکہ وہ ابھی اپنے انجام کو نہیں پہنچا تھا۔" وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"وہ کیسے؟"

"وہ ایسے کہ جمشید نے خودکشی نہیں کی ہے۔ اسے قتل کیا گیا ہے۔" خسرو سکون سے بولا۔

"خسرو...... تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔" پرویز سر ہلا کر بولا۔ مگر اس کے مسلسل گھورنے پر جزبز ہو گیا۔ "تم یہ بات ثابت کر سکتے ہو؟"

"ہاں، تب ہی تو میں یہاں آیا ہوں۔" خسرو بولا۔ "نہ صرف میں یہ ثابت کر سکتا ہوں بلکہ نازلی کا قاتل بھی تمہارے حوالے کر سکتا ہوں۔"

"تو پھر بتاؤ۔"

"مسئلہ یہ ہے کہ میرے پاس واضح ثبوت کی کمی ہے اور اس کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔" وہ کچھ دیر اس سے گفتگو کرتا رہا اور پھر گھر کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ اسے اپنے قدم

کی سنجیدگی کا اندازہ وہ اور اس کے نتائج کی فکر تھی مگر جمشید کے لیے اسے بہرحال اس مسئلے کا صحیح حل تلاش کرنا تھا۔

وہ گھر پہنچا تو پارکنگ میں نادر کی سیاہ سوک پہلے سے موجود تھی۔

جمشید گھر میں داخل ہوا تو شہلا نے اس کا استقبال کیا۔ وہ کافی دنوں بعد بہت اچھے موڈ میں نظر آرہی تھی۔

"بھائی جان آئے ہوئے ہیں۔" وہ مسکرائی۔ "میں تم دونوں کے لیے کافی لے کر آتی ہوں۔ وہ ڈرائنگ روم میں ہیں۔"

خسرو تیزی سے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھا جب نادر میز کے پاس کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں وہ سنہرا لائٹر تھا جو خسرو وہیں بھول گیا تھا۔ نادر نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"یہ..... یہ تمہیں کہاں سے ملا؟"

"یہ سوال غلط ہے۔ تمہیں پوچھنا چاہیے کہ مجھے اس سب کا علم کیسے ہوا؟" وہ بولا۔

"خسرو کچھ معاملات اور کبھی کبھی ضرورت سے زیادہ علم سب کچھ تباہ کر دیتا ہے۔ میں تمہیں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ جو جیسا ہے اسے ویسا ہی چھوڑ دو اور اپنے کام پر توجہ دو۔" وہ دوسری طرف مڑتے ہوئے بولا۔

"مگر کیوں..... اور وہ سوالات کے جواب نہ ملیں تو وہ سمجھے بن جاتے ہیں۔ ویسے نواب میرے پاس ہر سوال کا جواب موجود ہے مگر اس کیوں کا جواب نہیں ہے۔"

"میرے پاس تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں ہے۔" وہ تلخی سے بولا۔

"تم نازلی سے محبت کرتے تھے؟" خسرو نے دانستہ اقدام کا فیصلہ کیا۔

"تم..... تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟" نادر دور سے بولا۔

"اس لیے کہ یہ میں جانتا ہوں..... جو لائٹر تمہارے ہاتھ میں ہے، یہ جمشید کو نازلی کے سامان سے ملا تھا جس پر انتہائی بارکی سے لکھا گیا ہے۔ "محبتوں کے ساتھ نادر۔"

"میرے پاس ان فضول باتوں کے لیے وقت نہیں ہے۔" وہ کھڑا ہو گیا۔

"مگر میرے پاس اس کا ثبوت بھی ہے۔" خسرو بھی کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

"کیا ثبوت؟" نادر نے چونک کر اسے دیکھا۔

"نازلی کی ڈائری اور جمشید کا تحریری بیان۔" اس نے سچ میں جھوٹ کی آمیزش کرتے ہوئے کہا۔

"جمشید کا بیان......؟"

"ہاں، یہ تو طے ہے کہ جمشید نے خودکشی نہیں کی اگر اسے خودکشی کرنا ہوتی تو وہ مجھے فون کر کے اس بات کی اطلاع نہ دیتا اور نہ ہی بلاتا۔" خسرو بولا۔ "اسے جو کچھ معلوم ہوا تھا وہ اس نے لکھ لیا تھا اور اب وہ میرے پاس ہے۔"

"تو پھر تم بھی اب زندہ نہیں بچو گے۔" نادر نے یکلخت جیب سے ریوالور نکال لیا۔

"سوال پھر وہی ہے کہ تم نے یہ سب کیوں کیا...... کیوں نادر؟"

"کیونکہ میں نازلی سے محبت کرتا تھا تب سے جب اس کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس سے قبل کہ میں اس کو پروپوز کرتا اس نے جمشید سے شادی کا فیصلہ کرلیا اور وہ اس کی بیوی بن گئی۔ وہ دونوں خوش نہیں تھے۔ یہ میں جانتا تھا اس لیے میں نازلی کو سہارا دیتا رہا اور وہ مجھے اپنا سب سے عزیز دوست مانتی رہی۔ میں نے اس پر دل کی بات کھول دی تھی مگر اس نے محبت سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ وہ جمشید کی خاطر جمشید کے ساتھ ہی رہے گی اور ہم اس بات کو بھول کر اچھے دوست رہیں گے۔ میں نے تب بھی اس کی بات مان لی..... مگر اس نے کیا کیا۔ وہ فیصل سجاد کی محبت میں مبتلا ہو گئی اور اس حد تک کہ اس سے شادی کا فیصلہ کرلیا۔" وہ پاگلوں کی طرح بول رہا تھا۔

"شادی کا فیصلہ؟" خسرو نے پوچھا۔

"ہاں، شادی کا فیصلہ۔ اس شام وہ میرے دفتر وصیت کے لیے نہیں آئی تھی، وہ چاہتی تھی کہ میں اس کے لیے جلد از جلد طلاق کے کاغذ تیار کرا دوں۔ وہ میرے جذبات اور اپنی احساسات دونوں کو بھول گئی تھی۔ میں اس دن وہاں سب یاد دلانے گیا تھا۔ اگر اسے طلاق لے کر شادی کرنا ہی تھی تو مجھ سے کرنی چاہیے تھی مگر اس نے میری بات سننے سے انکار کر دیا۔ بقول اس کے اسے سچی محبت ہو گئی تھی۔ وہ فیصل کے بغیر جی نہیں سکتی تھی۔ میرے سارے جسم میں آگ سی لگ گئی۔ غصہ، مایوسی، دکھ، انتقام نہ جانے کس کس جذبے نے مجھ پر قابو پالیا۔ مجھے ہوش آیا تو وہ مر چکی تھی۔"

"پھر تم نے جمشید کو پھنسانے کے لیے اس کی تصویر کو دو حصوں میں کیا تاکہ اسے کسی بھوتنی ڈاکا رامہ سمجھا جا سکے۔" خسرو بولا۔

"ہاں، اور بھائی کی بن گیا۔ سب خبط ہو جاتا اگر تم بیچ میں کود پڑے۔"

"نہیں، میں بیچ میں نہیں کودا تھا۔ تم نے جان بوجھ کر وہ وصیت تیار کر کے مجھے بھیجا۔ تمہیں معلوم تھا کہ اس طرح وہ جعلی وصیت پولیس تک پہنچ جائے گی یوں جنید پر شک مضبوط ہو جائے گا۔"

"ہاں مگر تم زمین کھودنے لگے اس لیے میں نے ثنا کی تصویر خراب کر کے تمہیں ڈرانا چاہا پھر گھر کے باہر تم پر فائرنگ کرائی۔"

"تم نے جمشید کو کیوں مار ڈالا...... وہ تو تمہارا دوست تھا؟"

"میں اس سے نفرت کرتا تھا ہمیشہ سے۔" وہ ہونٹ سکیڑ کر بولا۔ "جب ثنا نے مجھے بتایا کہ اسے نادیہ کے قاتل کا سراغ مل گیا ہے اور اس نے تمہیں بلایا ہے تو میں چوکنا ہو گیا۔ میرا گھر اس کے گھر سے قریب ہے یوں میں تمہارے پہنچنے سے پہلے وہاں پہنچا۔ پچھلے حصے سے بنگلے میں داخل ہوا۔ میرے پاس اس سے سوال جواب کرنے کا وقت نہیں تھا اور مجھے کسی ثبوت کے بارے میں علم بھی نہیں تھا اس لیے میں فوراً اپنا کام ختم کر کے نکل آیا۔ بس خسرو اب بہت ہو گیا۔ پسند تو میں نے تمہیں کبھی نہیں کیا۔ پھر بھی ثنا کی وجہ سے میں تمہیں برداشت کر رہا تھا مگر اب......" وہ پاگلوں کی طرح ہنسا۔ "مجبوری ہے تمہیں جانا پڑے گا اور میں...... تمہارے جانے کے بعد یہ ساری کہانی کردار بدل کر پولیس کو سنا دوں گا سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"تم ثنا کو بھول رہے ہو۔" خسرو نے کہا۔

"وہ تمہاری بیوی ہے مگر وہ میری بہن بھی ہے، میری بات اس کے لیے حرفِ آخر ہے۔" وہ ہنسا۔

"نہیں بھائی جان۔" ثنا کی لرزتی آواز پر وہ اور نادر ایک ساتھ دروازے کی طرف مڑے۔ اس کا چہرہ سپید ہو رہا تھا۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ "اس بار ایسا نہیں ہوگا۔ غلطی آپ کی ہے تو سزا خسرو کو کیوں ملے گی؟"

"میں تمہیں سب سمجھا دوں گا ثنا...... خسرو سب غلط کہہ رہا ہے۔"

"میں نے سب سنا ہے، آپ نے نادیہ آپا اور جمشید بھائی کو مارا ہے، آپ ان کے قاتل ہیں۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

"ثنا تمہیں یہ سب بھولنا ہوگا۔ یہ میں کہہ رہا ہوں تمہارا بھائی جان اور...... اور اس خسرو کو بھی... ہم نئے سرے سے زندگی شروع کریں گے اور تم بہت خوش رہو گی۔" وہ نخوت سے بولا۔ "اور اس معاملے میں مجھے بحث نہیں چاہیے اور تم خسرو صحیح معنوں میں تم اس سب کے ذمے دار ہو۔ میں نے جب تمہیں پہلی بار دیکھا تھا تب ہی سمجھ گیا تھا کہ تم ثنا کے قابل نہیں ہو...... تمہیں جانا ہی پڑے گا۔" اس نے پستول والا ہاتھ خسرو کی طرف بلند کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں، نہیں بھائی جان۔" ثنا تیزی سے اس کی طرف لپکی۔ عین اس لمحے جب اس نے ٹریگر دبایا ثنا اس کے بازو کو دھکا دینے میں کامیاب ہو گئی یوں گولی پستول سے نکلی مگر خسرو کو لگنے کے بجائے چھت کی طرف نکل گئی۔

نادر نے ثنا کو دوسری جانب دھکیلتے ہوئے دوسرے فائر کی کوشش کی اتنے میں خسرو اس پر چھلانگ لگا چکا تھا۔ اس نے قریب آتے ہی اپنا سر نادر کے پیٹ میں مارا...... نادر نے پلٹ کر پستول سے اس کے سر پر وار کیا۔ سر پر لگنے والی تکلیف اگرچہ ناقابل برداشت تھی مگر خسرو جونک کی طرح اس سے چمٹ گیا تھا۔ اس نے اس کے دائیں بازو کو اپنے ہاتھوں سے جکڑ لیا تھا اور بالآخر نادر کو پستول پھینکنا ہی پڑا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹے خود بھی زمین پر جا گرے پھر نادر خسرو پر غالب آ گیا اور اس نے اس کی گردن پکڑ لی۔ لمحے بھر میں خسرو کے لیے سانس لینا دوبھر ہو گیا۔

نادر وحشیانہ طاقت سے اس کی گردن دبا رہا تھا۔ اس کی انگلیاں گویا گوشت میں پیوست ہو کر رہ گئی تھیں۔ خسرو اس کے ہاتھ ہٹانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اس دوران زمین پر پڑے پستول پر اس کا ہاتھ پڑ گیا۔ اس نے بمشکل اسے اٹھایا اور نادر کے پیٹ پر رکھ کر ٹریگر دبا دیا۔

ٹریگر دبتے ہی اس کے گلے پر سے موت کا دباؤ کم ہوتے ہوتے ختم ہو گیا۔ نادر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں پھر وہ لڑکھڑاتے ہوئے زمین پر جا گرا۔ خسرو بری طرح کھانستا ہوا اٹھ کر بیٹھا تب تک نادر بے حس و حرکت ہو چکا تھا۔

دور سے پولیس سائرن کی آواز لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جا رہی تھی۔ شاید ایس پی پرویز کو اس کا میسج مل گیا تھا اور وہ حرکت میں آ چکا تھا۔ خسرو نے سامنے بت بنی ثنا کی طرف دیکھا اور لپک کر اسے خود سے لپٹا لیا۔ اس کی نگاہیں نادر کی لاش پر ٹکی تھیں اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔